بسم الله الرحمن الرحيم

انتخاب
تفسیر المیزان

(جلد: 3)

تالیف وتصنیف:

علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ

☆☆☆☆☆

مترجم:

علامہ سید افتخار حسین نقوی النجفی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں!

تعارف

نام کتاب:	انتخاب تفسیر المیزان
تالیف:	علامہ محمد حسین طباطبائیؒ
ترجمہ و حاشیہ:	سید افتخار حسین نقوی النجفی
معاونت:	مولانا محمد نقی
کمپوزنگ و فارمیٹنگ:	شاہد علی جعفری
فنی معاونت:	قرآن سنٹر، لاہور
جلد:	سوم
ناشر:	مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر لاہور: 042-37211214

معراج کمپنی لاہور: 042-37361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد: 0333-5234311

فہرست

سورۂ توبہ 39
سورہ کے مطالب 39
مشرکین سے بیزاری کا اعلان 39
چار مہینوں کی آزادی 40
مشرکین کا انجام 42
عمومی برأت سے استثناء 44
مقررہ مہلت کے بعد مشرکین کے قتل کا حکم 46
مشرکین کے لیے ایک سہولت 48
مشرکین سے عہد و پیمان 49
مشرکین کا رویہ 50
اللہ کی آیات کو بیچنا 51
عہد توڑنے والے 51
کفر اور شرک سے توبہ 52
عہد شکن مشرکین 53
مسلمانوں کو جنگ پر آمادہ کرنا 54
مومنین کے لیے خصوصی ہدایت 55

مشرکین پر مسلمانوں کا غلبہ........................ 55
مسلمانوں کو جنگ کی تشویق........................ 56
مشرکین کے لیے مساجد تعمیر کی ممانعت........................ 58
ایمان کی بنیاد پر مساجد کی تعمیر........................ 59
عمل کی برتری کا معیار........................ 61
کامیاب لوگ........................ 62
کامیاب افراد کے لیے خوشخبری........................ 63
جنت کی ابدی نعمتیں........................ 64
کافروں سے دوستی کی ممانعت........................ 64
گناہگاروں کا انجام........................ 66
جنگ حنین کا حوالہ........................ 67
مومنوں کے لیے سکینہ کا اُتارا جانا........................ 68
پیغمبرؐ اور مومنین پر اللہ کا احسان........................ 69
اللہ کی بخشش و مغفرت........................ 69
مسجد الحرام میں مشرکوں کے داخلے پر پابندی........................ 71
مشرکین اور اہل کتاب کے قتال کا حکم........................ 72
مشرکین کے بارے بیان........................ 73
یہود و نصاریٰ کے غلط عقائد........................ 75
عیسائی علماء کی غلط سوچ........................ 76
دین کی بقاء کی ضمانت........................ 77

دین اسلام کا غلبہ.. 78
اللہ کی راہ میں رکاوٹ بننے والوں کی سزا.................... 80
ذخیرہ اندوزوں کی سزا.................................... 82
بارہ مہینوں کا تذکرہ.. 83
کافروں کی حرکات.. 86
دُنیا و آخرت کا تقابل.. 87
جہاد پر نہ جانے والوں کی مذمت............................ 89
ہجرت کا واقعہ.. 90
جہاد کا حکم 92
سُست لوگوں کے بہانے...................................... 93
منافقوں کی حرکات.. 94
صاحبان تقویٰ.. 95
منافقوں کی حالت 95
جہاد میں سستی کرنے والوں کی سرزنش........................ 96
منافقین کی سزا.. 96
منافقوں کا رویہ 97
منافقین کے فتنہ کی بات.................................... 98
فتنہ میں پڑنے والے لوگ.................................... 99
کامیابی یا شکست پر منافقوں کا ردعمل 100
منافقوں کی بات کا جواب....................................101

مصیبت کا اذن الٰہی سے آنا.. 102
مومن کے لئے دو اچھائیوں میں سے ایک.. 103
منافقین کا انفاق، اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں.. 104
منافقین کے انفاق کی عدم قبولیت کی وجہ.. 105
منافقین کے مال و اولاد کی کثرت پر تعجب نہ کرو.. 106
منافقین کی قسمیں.. 106
منافقین کی کیفیت.. 107
صدقات کی تقسیم کا معاملہ.. 108
منافقوں پر طنز.. 109
زکوۃ کے مصارف.. 110
نبیؐ کو اذیت دینے والے.. 111
خدا اور رسولؐ کی خوشنودی.. 113
منافقین کی اندرونی کیفیت.. 114
منافقین کی سرزنش.. 115
منافقین کی بہانہ تراشیاں.. 116
منافقوں کی حقیقت.. 117
کفار اور منافقین کا انجام.. 118
منافقوں کا انجام گذشتہ اُمتوں جیسا.. 119
سابقہ اُمتوں پر آنے والے عذاب.. 120
مومنوں کا آپس کا تعلق.. 121

ایمان کا ثمر...123
کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کا حکم.................................124
کفار کے ساتھ جہاد کا معنی...124
منافقین کے ساتھ جہاد کا معنی..124
جھوٹی قسمیں اٹھانے والے مطلبی......................................126
اللہ سے عہد کرنے والے...128
عہد شکنی...128
منافقت اور جھوٹ کی سزا..129
علم الٰہی..130
راہ خدا میں صدقے دینے والے..131
منافقین کے لیے استغفار کا کوئی فائدہ نہیں..............................132
جہاد پر نہ جانے والے منافقین کی سرزنش...............................133
کم ہنسنا اور زیادہ رونا...134
جنگ میں نہ جانے والوں کی بات.......................................135
منافقین کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کا حکم...................................136
مال و اولاد کی کثرت پر تعجب نہ کرو....................................137
جہاد سے فرار کرنے والے..137
جہاد سے فراری..138
کامیاب لوگ...139
بڑی کامیابی..140

بدو لوگوں کی عذر تراشیاں 141
جہاد سے مستثنیٰ افراد 142
جہاد میں شریک نہ ہونے پر غمگین مومنین 143
جہاد پر نہ جانیوالے مالداروں کی سرزنش 144
جہاد پر نہ جانے والوں کی معذرت قبول نہیں 145
جہاد سے فراری، قسمیں اٹھانے والے 146
جنگ سے فرار ہونیوالوں سے اللہ راضی نہیں 147
بادیہ نشین اعراب کا کفر و نفاق 148
عرب بدوؤں کی حالت بارے بیان 148
ایمان لانے والے بادیہ نشین عرب 149
سبقت لے جانے والے مہاجرین و انصار 150
مومنین کے درمیان موجود منافقین 152
گناہ کا اعتراف کرنے والے 153
زکوۃ پاکیزگی کا سبب 154
زکوۃ دینے کی تشویق 154
مومن، کافر اور منافق کے لئے عمومی خطاب 155
مومنین کے اعمال کے حقائق 156
اللہ کے فیصلے کے منتظر لوگ 157
مسجد ضرار 158
تقویٰ کی بنیاد پر بنی مسجد 159

دو مسجدوں کا موازنہ 160

منافقین کی حالت 161

مومنین کیلئے اچھی خبر 162

مومنوں کے اوصاف 163

مشرکین کے لئے دُعا کرنا 164

چچا کے لیے ابراہیمؑ کی دُعا 165

خدا کسی قوم کو بغیر بتائے گمراہ نہیں کرتا 166

اللہ کی مالکیت 167

پیغمبرؐ اور مومنین پر اللہ کی رحمت 169

تین معصیت کاروں کا تذکرہ 170

تقویٰ اور صادقین کی ہمراہی 171

رسول اللہؐ کی مخالفت سے منع 173

عمل سے بہتر جزاء 174

دینی تعلیم سیکھنے کے لیے سفر کرنے کا حکم 175

عمومی جہاد کا حکم 177

آیات اُترنے سے ایمان میں اضافہ 178

بیمار دلوں کی بات 179

توبہ نہ کرنے والے 179

منافقین کی کیفیت 180

رسول اللہؐ کی خصوصیت 181

رسول پاکؐ کی حوصلہ افزائی.. 182

سورہ یونس.. 184

سورت کے مطالب.. 184

کتاب حکیم قرآن کا تعارف.. 184

رسول اللہؐ پر وحی کا نزول.. 185

کافروں کی تہمت کا جواب.. 187

معاد کا سچا وعدہ.. 188

سورج اور چاند کی خلقت کا مقصد.. 190

دن اور رات میں اللہ کی نشانیاں.. 191

روز جزا کے منکروں اور کافروں کا انجام.. 193

صالح مومنین کے لیے اللہ کی ہدایت.. 194

اہل بہشت کی دعاء اور ان کا سلام.. 195

سرکش افراد کی حیرت اور گمراہی.. 197

تکلیف پہنچنے پر انسان کا مزاج.. 198

کفار اور مکذبین کا انجام.. 200

مجرموں کے بعد آنے والی اقوام کی آزمائش.. 200

معاد کے منکروں کی بے جا درخواست.. 201

کافروں پر اعتراض.. 202

اللہ پر بہتان باندھنے والوں کا انجام.. 203

مشرکین کو تنبیہ 204
لوگوں کا اختلاف 206
قرآن کے علاوہ دوسرے معجزے کا مطالبہ 207
سختیوں کے بعد رحمت کی بے قدری 209
جنگل اور دریا اللہ تعالیٰ کی نعمتیں 211
انسان کی ناشکری 213
دنیاوی زندگی کی مثال 214
ہدایت اللہ کی طرف سے 215
نیکی کرنے والوں کے لیے اچھا بدلہ 217
برے اعمال کا انجام برائی 218
مشرکین کی بات 219
مشرکین کے معبودوں کا ان سے اظہار لاتعلقی 220
قیامت میں انسان کے اعمال کا ظاہر ہو جانا 221
اللہ کی حاکمیت 222
کافروں کو تنبیہ 224
فاسقوں کے بارے میں فیصلہ 224
مشرکین کو تنبیہ 225
صحیح راستہ بتلانے والے کی پیروی 226
کافروں کی اکثریت کا رویہ 228
قرآن کی حقانیت 229

قرآن کی حقانیت کے بارے میں چیلنج..230

ستمگاروں کا انجام..232

بعثت رسول خداؐ کے وقت لوگوں کے دو گروہ..233

فیصلہ کن مرحلہ..234

حق کو قبول نہ کرنے والے ہٹ دھرم افراد..235

بے بصیرت افراد..236

اللہ لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا..236

معاد کو جھٹلانے والے خسارے میں ہیں..237

اُمت کی بازگشت اللہ کی جانب..238

قضائے الٰہی..239

پیغمبرؐ سے مشرکین کا سوال..240

ہر اُمت کیلئے معین وقت..240

عذاب الٰہی کو جلد مانگنے والے مجرمین..242

وقت گزرنے کے بعد ایمان لانا..243

ظالموں کے لیے دائمی عذاب..244

حتمی عذاب..244

عذاب جہنم کی شدت..245

برحق الٰہی وعدہ..246

حیات وممات اللہ کے اختیار میں..248

موعظہ الٰہی اور دلوں کی شفاء..248

رحمت اور فضل الٰہی 250
اللہ کی طرف سے رزق کی فراہمی 251
اللہ پر افتراء باندھنا بڑا گناہ 253
علم الٰہی 254
اولیاء اللہ کی خصوصیات 255
اولیاء اللہ کی دوسری صفت 257
اولیاء اللہ کے لیے بشارت 257
پیغمبرؐ کی حوصلہ افزائی 258
پروردگار کی مالکیت 259
رات اور دن کا فلسفہ 260
مشرکین کے شبہ کا جواب 261
اللہ پر افتراء باندھنے والے فلاح نہیں پاتے 262
کفر کا انجام، سخت عذاب 262
نوح پیغمبرؑ کا واقعہ 263
معاوضہ کے بغیر اللہ کا پیغام پہنچانا 264
قوم نوحؑ کا ان کی دعوت کو ٹھکرانا 265
نوحؑ کے بعد آنے والے انبیاء الٰہی 266
موسیٰؑ اور ہارونؑ کا واقعہ 268
حق کا انکار 268
حضرت موسیٰؑ کا سوال 269

فرعونیوں کا موسیٰؑ کو جواب............................ 270
فرعون کا جادوگروں کو اکھٹا کرنا............................ 270
جادوگروں سے موسیٰؑ کی گفتگو............................ 271
جادوگروں کی ناکامی............................ 271
حق کی سچائی............................ 272
قوم موسیٰؑ کے مومن افراد............................ 273
اللہ پر بھروسہ کرنے کی سفارش............................ 274
مومنین بنی اسرائیل کا جواب............................ 275
موسیٰ اور ہارونؑ کیلئے فرمان الٰہی............................ 276
اللہ سے موسیٰؑ کی درخواست............................ 277
موسیٰؑ کی دعا کی قبولیت............................ 278
فرعون کے ایمان کا اعلان............................ 279
اللہ تعالیٰ کا فرعون کو جواب............................ 280
فرعون کے جسد کا محفوظ رہنا............................ 281
بنی اسرائیل کے حالات............................ 282
شک وتردید سے بچنے کی تاکید............................ 283
آیات الٰہی کو جھٹلانے والے خسارے میں............................ 284
جھٹلانے والوں کی وضاحت............................ 284
آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کا مزاج............................ 285
قوم یونسؑ کا تذکرہ............................ 286

اللہ کے نزدیک جبری ایمان مطلوب نہیں.................................. 287
اللہ تعالیٰ کا اختیار مطلق.................................... 288
زمین و آسمان میں اللہ کی نشانیاں.............................. 289
آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کا عذاب.............................. 289
انبیاء اور مومنین کی نجات کا حتمی فیصلہ.............................. 290
دین الٰہی کی پیروی.. 291
مشرکین سے برائت.. 292
بتوں میں نفع یا نقصان پہنچانے کی صلاحیت نہیں.......................... 292
نفع و نقصان پہنچانا اللہ کا اختیار.................................. 293
حق کا اثبات.. 294
رسول خداؐ کو وحی کی پیروی کرنے کا حکم.............................. 295

سورۂ ھود.. 295
اس سورت کے مطالب.. 296
کتاب کا تعارف.. 296
رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد...................................... 297
قرآن کے نزول کا ہدف.. 298
ساری مخلوقات کی بازگشت اللہ کی طرف................................ 300
اللہ مشرکین کے اعمال سے آگاہ ہے.................................. 301
علم الٰہی کی وسعت.. 302

کائنات کی خلقت 303
اللہ کے عذاب کو کوئی نہیں روک سکتا 306
ناشکرا انسان.. 307
نعمت ملنے پر انسان کا اترا جانا 308
صابر نیکوکاروں کیلئے بخشش اور ثواب.. 309
رسول اللہؐ کیلئے تسلی.. 311
قرآن کی جیسی دس صورتیں لانے کا چیلنج 313
علم الٰہی سے قرآن کا نزول.. 314
طالب دُنیا کو دُنیا کا مل جانا.. 315
طالب دنیا کا آخرت کے اجر سے محروم ہونا 316
قرآن کی حقانیت.. 317
اللہ پر افتراء باندھنے والے ظالم 319
اللہ کی راہ روکنے والے ستمگار.. 320
ستمگاروں کیلئے دوگنا عذاب 321
نافرمانوں کا خسارہ.. 323
قیامت میں نقصان اُٹھانے والے 324
عمل صالح انجام دینے والے بہشتی مومنین.. 325
دو گروہوں کی مثال 325
نوحؑ کا پیغام رسانی کا عمل.. 326
نوحؑ کی رسالت کی توضیح 327

قوم نوحؑ کی اشرافیہ کا جواب.......................... 328

حضرت نوحؑ کا بیان.......................... 329

کافروں کی تہمت کا جواب.......................... 330

اللہ کے ہاں مومنوں کا احترام.......................... 331

برتری کا معیار.......................... 332

قوم نوحؑ کے کافروں کی بات 334

عذاب کا مشیت الٰہی پر موقوف ہونا 334

بندوں کے امور کی تدبیر اللہ کے اختیار میں.......................... 335

کفار کا اللہ پر افتراء باندھنا.......................... 336

قوم نوحؑ کے ایمان نہ لانے کی خبر 337

نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم.......................... 338

نوحؑ کا کشتی بنانا.......................... 339

کفار کیلئے رسواء کرنے والا عذاب 340

کشتی نوحؑ کے سوار.......................... 341

کشتی کا اللہ کے نام سے چلنا اور ٹھہرنا.......................... 342

نوحؑ کی بیٹے کو کشتی پر سوار ہونے کی دعوت.......................... 343

نوحؑ کے بیٹے کا غرق ہونا.......................... 344

کشتی کا کوہ جودی پر آکر رکنا.......................... 345

بیٹے کے لیے نوحؑ کی دعا.......................... 346

فرزند نوحؑ کے بارے اللہ کا حکم 347

اللہ کی تنبیہ پر نوحؑ کا بیان.. 349
نوحؑ پر اللہ کا انعام.. 350
پیغمبر اسلامؐ کو خطاب.. 351
قوم عاد کا قصہ.. 352
حضرت ھودؑ کا بیان.. 353
قوم کے لیے ھودؑ کی خیر خواہی.. 354
قوم ھودؑ کا جواب.. 355
حضرت ھودؑ کا امتحان.. 356
حضرت ھودؑ کا کھلا چیلنج.. 356
حضرت ھودؑ کا واضح اعلان.. 357
اپنی قوم کو ھودؑ کا جواب.. 358
ھودؑ پر ایمان لانے والوں کی نجات.. 359
قوم عاد کا واقعہ.. 360
رحمت حق سے دُوری کا سبب.. 361
قوم صالحؑ کا قصہ.. 362
قوم صالحؑ کا بیان.. 364
اللہ کی نافرمانی واضح خسارہ.. 365
ناقۂ صالح اللہ کی نشانی.. 366
ناقۂ صالح کو نحر کرنے پر حتمی عذاب.. 366
صالحؑ اور مومنین کی عذاب سے نجات.. 367

ستمگروں کا عذاب میں مبتلا ہونا.. 368
قوم ثمود کا انجام.. 368
ابراہیمؑ کو فرشتوں کی بشارت 369
فرشتوں کے کھانا نہ کھانے پر ابراہیمؑ کا رد عمل 370
فرشتوں کی بشارت پر سارہ کا رد عمل.. 371
ابراہیمؑ کی بیوی کا تعجب 373
ابراہیمؑ کی بیوی کو فرشتوں کا جواب 373
فرشتوں کے ساتھ ابراہیمؑ کی گفتگو.. 374
ابراہیمؑ کے اوصاف 375
ابراہیمؑ کو فرشتوں کا جواب.. 376
فرشتوں کی آمد پر لوط کی پریشانی.. 377
لوطؑ کے پاس قوم کے بدکاروں کی آمد.. 378
لوطؑ کی پیشکش کا جواب 378
لوطؑ کا اپنی بے کسی کا اعلان.. 379
فرشتوں کا اعلان.. 380
قوم لوط پر آنے والے عذاب کی کیفیت.. 382
قوم لوط پر برسنے والے پتھروں کی خصوصیات 382
قوم شعیبؑ کی داستان 383
اپنی قوم کو شعیبؑ کی نصیحت 385
اپنی قوم سے شعیبؑ کی دو ٹوک بات 386

اہل مدین کا شعیبؑ کو جواب 387

شعیبؑ کا اپنی قوم سے مکالمہ 389

شعیبؑ کا اپنی قوم کو خطاب 392

قوم کے لیے ایک تجویز 392

قوم کا شعیبؑ کو جواب 393

قوم کو شعیبؑ کا جواب 395

قوم کو شعیبؑ کی دھمکی 396

قوم شعیبؑ پر عذاب 396

عذاب کا نتیجہ 397

موسیٰ علیہ السلام کی رسالت 397

موسیٰؑ فرعون کے دربار میں 398

آل فرعون کے لیے دردناک عذاب 399

برائی کا انجام 400

پیغمبر اکرمؐ کو خطاب 401

اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا 402

ظالم بستیوں پر اللہ کی سخت گرفت 403

آخرت کا خوف رکھنے والوں کے لیے نشانیاں 404

قیامت کے آنے کا معین وقت 405

قیامت، نیک بخت اور بد بختوں کی جدائی کا دن 406

قیامت میں بد بختوں کی حالت 408

بد بختوں کیلئے جہنم کا ابدی عذاب 409
خوش بختوں کے لیے ابدی بہشت 411
پیغمبرؐ اکرم کو خطاب 412
تورات کے متعلق یہودیوں کا اختلاف 413
اعمال کا پورا بدلہ 415
رسول اللہؐ کیلئے خصوصی خطاب 415
ظالموں سے دُوری 416
پنجگانہ نماز کے اوقات 418
صبر کا حکم 419
سابقہ اقوام کی بات 420
اللہ نیکوکاروں کو ہلاک نہیں کرتا 421
اگر اللہ چاہتا تو سارے انسان ایک دین پر ہوتے 422
جہنم کو ظالموں سے پُر کرنے کا وعدہ 423
پیغمبروں کے حالات بیان کرنے کا مقصد 424
کافروں کو انتباہ 425
پوشیدہ امور کے متعلق اللہ کا علم 426
سورۂ یوسف 427
اس سورت کے مطالب 427
کتاب کا تذکرہ 428

قرآن کا عربی زبان میں نزول 429
قرآن میں بہترین قصے 430
یوسفؑ کے ماجرا کا آغاز 431
بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع 432
روشن مستقبل کی بشارت 433
یوسفؑ اور ان کے بھائیوں میں نشانیاں 435
یوسفؑ کے بھائیوں کا اعتراض 436
یوسفؑ کے خلاف بھائیوں کی سازش 437
یوسفؑ کے قتل کی راہ میں رکاوٹ 438
یوسفؑ کو اپنے ساتھ لے جانے کی منصوبہ بندی 439
یوسفؑ کو سیاحت کے لیے لے جانا 439
حضرت یعقوبؑ کی پریشانی 440
یوسفؑ کے بھائیوں کا جواب 441
یوسفؑ کے متعلق بھائیوں کا اجماع 442
والد کے سامنے واقعہ کو بیان کرنا 443
حضرت یعقوبؑ کا جواب 444
حضرت یعقوبؑ کا صبر 444
یوسفؑ کا کنوئیں سے نجات پانا 447
یوسفؑ کا بازار میں فروخت ہونا 447
یوسفؑ کا خریدار 448

یوسفؑ کے لیے علم و حکمت 450
یوسفؑ کو زلیخا کی گناہ کی دعوت........................ 451
اللہ کی بندگی کا اعلیٰ نمونہ 452
اللہ کا یوسفؑ کو بے حیائی کے عمل سے بچانا........................ 453
حضرت یوسفؑ کا فرار ہونا........................ 456
یوسفؑ کا اپنی صفائی پیش کرنا........................ 457
یوسفؑ کی قمیض کا پھٹ جانا........................ 458
عزیز مصر کا فیصلہ 458
عزیز مصر کی اپنی زوجہ اور یوسفؑ کو نصیحت........................ 459
مصر کی عورتوں کی طعنہ زنی 460
زلیخا کے ہاں مصر کی عورتوں کی دعوت 461
زلیخا کی عورتوں پر چڑھائی 463
حضرت یوسفؑ کی مناجات........................ 465
یوسفؑ کی دعا کی قبولیت 466
یوسفؑ کا زندان جانا 467
دو نوجوانوں کا خواب........................ 468
خواب کی تعبیر........................ 469
یوسفؑ کا اپنے آباء واجداد کا تذکرہ........................ 470
زندان کے ساتھیوں کو دعوت توحید........................ 471
بے حیثیت خود ساختہ معبود 473

قیدی ساتھیوں کے خواب کی تعبیر 474
بادشاہ کے پاس سفارش کی درخواست 475
بادشاہ کا خواب دیکھنا 477
خواب کی تعبیر بارے درباریوں کا بیان 477
زندانی ساتھی کا اعلان 478
یوسفؑ کے پاس اُن کے ساتھی کا آنا 479
بادشاہ مصر کے خواب کی تعبیر 480
آئندہ کی مشکلات کے لئے انتظام 481
قحط کے بعد نعمتوں کا نزول 481
بادشاہ کا یوسفؑ کو بلانا 483
مصر کی عورتوں کا بیان 484
حضرت یوسفؑ کا بیان 485
یوسفؑ کے بیان کا تسلسل 486
بادشاہ کا فیصلہ 487
یوسفؑ کی پیشکش 487
یوسفؑ پر اللہ کا انعام 488
مومنین کے لیے آخرت کا بہترین صلہ 489
یوسفؑ کے بھائیوں کا مصر آنا 489
بھائیوں سے یوسفؑ کی درخواست 490
حضرت یوسفؑ کا فیصلہ 491

بھائیوں کا جواب 491
حضرت یوسفؑ کا اقدام 492
والد سے یوسفؑ کے بھائیوں کی درخواست 492
حضرت یعقوبؑ کا جواب 493
سرمایہ کی واپسی 494
یوسفؑ کے بھائیوں کا والد سے عہد 495
یعقوبؑ کا بنیامین کو بھیجنے کے لیے راضی ہو جانا 496
یوسفؑ کے بھائیوں کا مصر میں داخلہ 497
بنیامین سے یوسفؑ کی ملاقات 498
بنیامین کو روکنے کا منصوبہ 499
بادشاہ کے جام کے گم جانے کے اعلان 500
یوسفؑ کے بھائیوں کا اظہار لاعلمی 500
چور کی سزا کا اعلان 501
بادشاہ کے جام کی تلاش 502
بھائیوں کا بنیامین سے بیزاری کا اظہار 504
یوسفؑ کے بھائیوں کی درخواست 505
حضرت یوسفؑ کا جواب 506
یوسفؑ کے بھائیوں کی آپس میں گفتگو 506
بڑے بھائی کا مکالمہ 507
اپنی بے گناہی کی گواہی 508

حضرت یعقوبؑ کا بیان 508
یعقوبؑ کا بیٹوں سے منہ پھیرنا 509
فرزندان یعقوبؑ کا والد سے مکالمہ 510
یعقوبؑ کا بیٹوں کو جواب........................ 510
یعقوبؑ کی بیٹوں کو ہدایت 511
برادران یوسفؑ کا مصر میں داخلہ 512
یوسفؑ کا بھائیوں کو برے اعمال کی یاددہانی........................ 513
یوسفؑ کے بھائیوں کا تعجب کے ساتھ سوال 513
یوسفؑ کے بھائیوں کا اعتراف 514
یوسفؑ کا بھائیوں کو درگزر کرنا 514
کرتہ والد کی آنکھوں پر لگانے کا حکم........................ 515
یعقوبؑ کا یوسفؑ کی خوشبو محسوس کرنا 516
لوگوں کا رد عمل........................ 517
یوسفؑ کی قمیض سے یعقوبؑ کا بینا ہو جانا........................ 518
والد سے برادران یوسفؑ کی درخواست........................ 518
یعقوبؑ کا بیٹوں کے لیے استغفار کا وعدہ 519
خاندان یعقوبؑ کا مصر میں آنا 520
یوسفؑ کے والدین تخت سلطنت پر........................ 521
حضرت یوسفؑ کی دُعا........................ 523
پیغمبر اکرمؐ کو خطاب........................ 524

لوگوں کی اکثریت کا بے ایمان ہونا..525
لوگوں سے اجر رسالت نہ مانگنا..526
اللہ کی نشانیاں..526
مومنوں کا شرک..527
اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچ سکتا..528
حضور پاکؐ کا اعلان..529
رسولوں کا بھیجا جانا..530
مومنین کی نجات کا وعدہ..531
ماضی کے واقعات بیان کرنے کا مقصد..532

سورۂ رعد..533
اس سورت کے مطالب..533
قرآنی آیات کے بارے..534
معاد پر ایمان..535
اشیاء عالم اللہ کی نشانیاں..538
نظام عالم میں اللہ کی نشانیاں..539
معاد پر شک و تردید باعث تعجب ہے..540
عذاب الٰہی پر جلدی کرنے پر تعجب!..543
قرآن کے علاوہ دوسرے معجزہ کی طلب..543
اللہ کے ہاں ہر شئے کی معین مقدار..545

اللہ ظاہر و پوشیدہ سے آگاہ ہے 546

علم الٰہی میں سب برابر ہیں 547

انسان کے محافظین 548

بادلوں کی چمک دمک 550

کائنات کی ہر شئے کا اللہ کی حمد و تسبیح بجالانا 550

کافروں کی حقیقت 551

تمام موجودات کا اللہ کو سجدہ کرنا 553

اللہ کی وحدانیت پر دلیل 555

حق اور باطل کی مثالیں 557

دعوت الٰہی پر لبیک کہنے والوں کا اچھا انجام 559

اہل حق اور اندھے برابر نہیں 560

عہد الٰہی کو پورا کرنا ایمان کی نشانی 561

مومنین کے اوصاف 563

"اُولوالالباب" کیلئے بہشتِ جاوید 565

نیک لوگوں کے لیے سلامتی 565

عہد الٰہی کو توڑنے والوں کا انجام 566

دُنیا و آخرت کا تقابل 567

قرآن کے علاوہ دوسرے معجزے کی طلب 568

ذکر الٰہی باعث اطمینان قلوب 569

نیک مومنین کے لیے خوشخبری 570

رسول خداؐ کی رسالت 571
قرآن کی خصوصیت 572
رسولوں کا مذاق اڑانے والوں کی سزا 573
اللہ کا شریک گھڑنا کھلی گمراہی 574
مشرکین کے لیے عذاب الٰہی 576
متقین اور کفار کے انجام کا تقابل 576
یہود و نصاریٰ کے بارے 577
رسول اللہؐ کے لیے فرمان 578
معجزہ رسول کے اختیار میں نہیں 580
لوح محو و اثبات 580
رسول اللہؐ کی ذمہ داریاں 582
زمین کے کناروں کا گھٹنا 582
کافروں کی سازشیں اور اللہ کا ان کو جواب 583
رسول اللہؐ کی تکذیب کرنے والوں کو جواب 584

سورۂ ابراہیم 587
اس سورت کے مطالب 587
کتاب اُتارنے کا سبب 588
آسمان اور زمین اللہ کی ملکیت 590
کافروں کے اوصاف 591

ہر قوم کیلئے اسی قوم کا اہل زبان نبی...... 592
موسیٰؑ کا معجزات کیساتھ مبعوث ہونا...... 593
موسیٰؑ کا اپنی قوم سے خطاب...... 595
شکر نعمت اور کفران نعمت...... 595
حضرت موسیٰؑ کی گفتگو...... 596
پیغمبروں کو جھٹلانے پر گذشتہ اقوام کی ہلاکت...... 598
پیغمبروں کو جھٹلانے کا رویہ...... 599
پیغمبروں کا اپنی قوم کو جواب...... 601
مومنین کا بیان...... 602
رسولوں کے بارے کافروں کا بیان...... 604
اللہ کا پیغمبروں سے خطاب...... 605
پیغمبروں کی دُعا...... 605
دُنیاوی عذاب کے بعد دوزخ کا عذاب...... 606
عذاب کی کیفیت...... 606
کافروں کے اعمال کا نتیجہ...... 607
اللہ کی قدرت...... 608
اللہ کا امر...... 609
مستکبرین اور مستضعفین کی گفتگو...... 610
شیطان کا بیان...... 613
مومنین کی حالت...... 614

کلمہ طیبہ..615

اللہ تعالیٰ کی مثالیں..616

کلمہ خبیثہ..617

دنیا و آخرت میں مومنین کا ثبات و قرار..618

اللہ کی نعمت کو بدلنے والوں کا انجام..619

مشرکین کیلئے واضح اعلان..620

ایمان والوں کیلئے پیغام..621

انسان کے لیے مخلوقات الٰہی کی آفرینش..623

شب و روز توحید ربوبی کی دلیل..624

اللہ کی ان گنت نعمتیں..625

حضرت ابراہیمؑ کی دعا..626

بتوں سے دُوری اختیار کرنے کا سبب..627

اپنی اولاد کے لیے ابراہیمؑ کی دعا..629

اللہ آشکار و پنہان سے آگاہ ہے..630

فرزند عطا کرنے پر حمد الٰہی..630

نماز پڑھنے کی تاکید..631

والدین اور مومنین کیلئے دعا..631

آیات میں لطیف اشارے..632

اللہ تعالیٰ، ظالموں کے کاموں سے بے خبر نہیں..633

قیامت میں ظالمین کی حالت..633

ظالمین کے لیے دُنیاوی عذاب 634
سابقہ ظالموں کا تذکرہ.. 635
کفار کی سازشیں.. 636
اللہ کا وعدہ ضرور پورا ہوگا.. 637
قیامت کے دن زمین کا بدل جانا.. 638
قیامت میں مجرموں کی حالت.. 640
قیامت، عمل کا نتیجہ ملنے کا دن.. 640
قرآن، لوگوں کے لیے اللہ کا اعلان.. 641
سورۂ حجر.. 643
اس سورت کے مطالب 643
قرآن کتاب مبین.. 644
ایمان نہ لانے پر کافروں کی پشیمانی 645
کافروں کے متعلق رسول اللہؐ کو دستور 645
بستیوں کی ہلاکت کا سبب 646
طے شدہ مدت پر اُمتوں کی ہلاکت 646
رسول اللہؐ پر دیوانگی کا الزام 647
فرشتے لانے کا تقاضا.. 647
کافروں کی درخواست کا جواب 648
قرآن کی حفاظت کا وعدہ.. 649

رسول اللہؐ کی حوصلہ افزائی.......... 650
رسولوں کے ساتھ کفار کا رویہ.......... 651
قرآن کا نفوذ.......... 651
کفار قرآن پر ایمان لانے والے نہیں.......... 652
کفار کبھی ایمان نہیں لائیں گے.......... 652
بروج، آسمان کی زینت.......... 654
آسمان کا شیاطین سے محفوظ ہونا.......... 655
زمین کے حوالے سے.......... 655
زمین، انسان کے روزگار کا وسیلہ.......... 656
ہر شئے کے خزانے اللہ کے پاس ہیں.......... 656
ہواؤں کا کام.......... 658
تمام اُمور کی تدبیر اللہ کے اختیار میں ہے.......... 658
اگلے اور پچھلوں کا علم اللہ کے پاس ہے.......... 659
سب کو محشور کرنے والا رب کائنات.......... 659
کھنکتی ہوئی مٹی سے انسان کی خلقت.......... 660
آگ کے شعلے سے جنات کی خلقت.......... 660
انسان کی خلقت کا اعلان.......... 661
فرشتوں کو انسان کیلئے سجدہ کرنے کا حکم.......... 662
فرشتوں کا آدمؑ کے لیے سجدہ کرنا.......... 663
ابلیس کا آدمؑ کو سجدہ نہ کرنا.......... 664

ابلیس کی قیامت تک مہلت کی التجاء 665

ابلیس کی درخواست کی منظوری 667

ابلیس کا اعلان 668

مخلص بندوں کا استثناء 669

اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ 670

اللہ کے خالص بندوں پر شیطان کا اختیار نہیں 671

جہنم، شیطان اور اس کے پیروکاروں کا ٹھکانہ 672

جہنم کے سات دروازے 673

اہل بہشت کا تذکرہ 674

اللہ کی رحمت اور اس کا عذاب 675

ابراہیمؑ کیلئے بیٹے کی خوشخبری 676

حضرت ابراہیمؑ کا تعجب 677

اللہ کی رحمت سے ناامیدی گمراہی ہے 678

ابراہیمؑ کا فرشتوں سے دوسرا سوال 679

مجرمین کی ہلاکت 679

لوطؑ کے پاس فرشتوں کی آمد 680

قوم لوط کا معاملہ 681

لوطؑ کے متعلق فیصلہ 682

مجرموں کے متعلق اللہ کا فیصلہ 682

لوطؑ کے گھر پر مجرموں کا حملہ 684

اصحاب الایکہ کی داستان 686

اصحاب الحجر.. 687

آسمانوں اور زمین کی برحق خلقت.................................. 689

اللہ کی خالقیت.. 689

پیغمبر اکرمؐ پر قرآن کا نزول.. 690

پیغمبر اکرمؐ کے لیے خصوصی ہدایت.................................. 691

پیغمبر اکرمؐ کیلئے ایک اور دستور 692

پیغمبر اکرمؐ کیلئے مزید وضاحتی بیان.................................. 693

رسول اللہؐ کیلئے واضح حکم نامہ.................................... 695

نبی مکرمؐ کو اللہ کی تسبیح کرنے کا حکم.................................. 696

یقین آنے تک اللہ کی عبادت کرنے کا حکم 697

سورۂ توبہ[1]

(مدنی۔ کل آیات 129)

سورہ کے مطالب

اس سورہ میں درج ذیل کلی مطالب ذکر ہوئے ہیں: مشرکین سے برائت کا اعلان، اُن سے بیزاری اور جدا رہنے اور اُن کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم۔ اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم، منافقین کا تذکرہ، مسلمانوں کو جہاد کی آمادگی پر تیار کرنا، جنگ سے فرار کرنے یا جنگ سے پیچھے رہ جانے والوں کا حکم، کافروں سے دوستی اور ولایت کی بحث اور زکوۃ کے متعلق احکام۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؕ﴿۱﴾

"اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں سے بیزاری ہے جن سے تم نے عہد کیا تھا"۔

مشرکین سے بیزاری کا اعلان

"بَرَآءَةٌ" بیزاری اور ایک چیز سے خود کو جدا کرنا اور اُن کے ساتھ رہنے کو ناپسند کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ خطاب مومنوں کو ہے یا مومنین اور رسول اللہ ﷺ دونوں کو ہے۔ یہ آیات قانون سازی کے لئے نہیں بلکہ یہ بعینہٖ حکم ہے اور اللہ کی جانب سے اعلان ہے

[1] قرآن کی 114 سورتوں میں یہ ایسی سورہ ہے جس کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سورہ کا آغاز مشرکین سے برائت اور اُن سے قطع تعلق سے ہوا ہے اور یہ بات رب تعالی کی رحمانیت اور رحمیت کے مقام کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی تھی اس لئے اس سورہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لائی گئی۔ (مترجم)

کہ جیسے ہی یہ آیت نازل ہو تو فوراً مشرکین سے بیزاری کا اظہار کیا جائے۔ جن مشرکین کو امان دی ہوئی تھی ان سے امان نامہ اُٹھالیا جائے۔ یہ حکم بلاوجہ اور بے جہت نہیں بلکہ اس کی دلیل ہے اور وہ یہ ہے کہ مشرکین کسی بھی عہد و پیمان کی پابندی نہیں کرتے تھے اور وہ عہد شکن تھے، خائن تھے، ان میں سے اکثر فاسق تھے اور حدود و قیود کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ اس آیت میں مشرکین کی عہد شکنی کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کو کہا جارہا ہے کہ تم نے مشرکین کے ساتھ ایک پیمان باندھا ہوا ہے اور ان کے ساتھ امان کا معاہدہ کیا ہوا ہے وہ ختم کر دو کیونکہ مشرکین کی اکثریت نے اس پیمان کو توڑ ڈالا ہے۔ اس لیے اب اس پیمان پر باقی رہنا لغو اور باطل ہے۔ اب مشرکین پر بھی اعتماد اور بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور مسلمان ان کے شر اور مکاری اور سازشوں سے محفوظ نہیں ہیں۔

پیغام: مشرکین سے لاتعلق رہا جائے اور جو اللہ کے دشمن ہیں ان کو اپنا دشمن سمجھا جائے۔

فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝٢

''سو اس ملک میں چار مہینے پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکو گے، اور بے شک اللہ کافروں کو ذلیل کرنے والا ہے''۔

چار مہینوں کی آزادی

سال کے چار مہینے امن کے مہینے ہیں۔ ان میں کوئی دوسرے پر حملہ آور نہیں ہوگا اور جو بھی تم اپنے لئے منفعت جانو اسے انجام دو، زندگی یا موت یعنی ان چار مہینوں میں پیمان معتبر ہے اس کے علاوہ نہیں ہے۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکتے، تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ شرک کو ترک کرو اور توحید کو قبول کرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ

کافروں کو ذلیل و خوار کرتا ہے اور ان پر اللہ کا تسلط اور غلبہ ہے۔ اس سے نصیحت پکڑو اور اپنے ہاتھ سے خود کو برباد نہیں کرو، تکبر کرکے اپنے لئے تباہی کا سامان مہیا نہ کرو اور خود ہی اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ لے جاؤ اور اللہ کی رسوائی اپنے لئے نہ لو۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ آیات نویں ہجری کو نازل ہوئیں اور چار ماہ سے مراد ماہ ذوالحجہ کے دسویں دن سے آخر تک، محرم، صفر اور ربیع الاول اور ربیع الثانی کے دس دن۔ تفسیر کشاف میں ان آیات کے نزول کے سبب کے متعلق لکھا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر کو موسم حج، ہجرت کے نویں سال مکہ بھیجا اور کہا کہ یہ آیات مکہ والوں کو پہنچا دو۔ وہ مدینہ سے کچھ دور ہی گئے تھے کہ آپؐ نے علی علیہ السلام کو ابوبکر کے پیچھے بھیجا اور فرمایا کہ اُن سے یہ آیات لے لو اور آپ جا کر مشرکین پر یہ آیات پڑھو۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کیا کہ ابوبکر یہ آیات نہ پڑھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے دستور دیا ہے کہ یہ ذمہ داری یا تو میں خود انجام دُوں یا میرے خاندان کا آدمی انجام دے اس کے علاوہ کوئی اور انجام نہ دے۔ یہی بات اور یہی روایت ابن کثیر نے بھی اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ [1]

---

[1]۔ رسول اللہ ﷺ نے چند موارد میں امیر المومنین علیہ السلام کو معاصرین پر برتری دی۔

۱۔ سورہ برائت مشرکین پر پڑھنے میں۔

۲۔ شب ہجرت امیر المومنین علیہ السلام کو اپنے بستر پر سولانے میں۔

۳۔ فتح خیبر میں پرچم کو پیغمبر اسلام ﷺ نے امیر المومنین علیہ السلام کے ہاتھ میں دیا اور امیر المومنین علیہ السلام نے اس کو فتح کیا اور مرحب کو قتل کیا، قلعہ خیبر کو کھولا۔ (مصحح)

۴۔ جنگ خندق میں جب آپ کو روانہ کیا تو کہا: سارے کا سارا ایمان پورے کے پورے کفر کی طرف جا رہا ہے اور جب عمرو بن عبدو کا سر قلم کرکے واپس آئے تو آپ کے لئے ہی یہ فرمایا کہ ضربۃ علی یوم الخندق افضل من عبادۃ الثقلین۔ خندق کے دن کی علیؑ کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت سے افضل ہے۔ مولود کعبہ ہونا یہ بھی آپ کی برتری ہے۔ جنگ احد میں آپ کے لیے تلوار کا آنا اور آپ کی مدح میں یہ پڑھا جانا لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار۔ اسی طرح اور بہت سارے مواقع ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے علی علیہ السلام کو باقیوں پر برتری عطا کی اور بالخصوص جب خم غدیر کے مقام پر علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا جس جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؑ مولا ہیں۔ تو یہ فضائل مولا علی علیہ السلام میں مزید دیکھا جا

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳﴾

''اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑے حج کے دن لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں، پس اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے بہتر ہے، اور اگر نہ مانو تو جان لو کہ تم اللہ کو ہرگز عاجز کرنے والے نہیں، اور کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو''۔

مشرکین کا انجام

یہاں ''اذان'' اعلان کرنے اور خبر دینے کے معنی میں ہے۔ سب لوگوں کے لئے اعلان ہے کہ اللہ اور اللہ کا رسولؐ مشرکین سے بیزار ہیں۔ اس آیت کا پچھلی آیت کے ساتھ یہ

سکتا ہے۔ اور علی مولا علیہ السلام کے یہ وہ فضائل ہیں جن کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور سب قبول کرتے ہیں اور یہ بھی علی علیہ السلام کی شان ہے کہ آیۃ تطہیر میں آپ ہیں، آپؑ کی شان ہے کہ آیت مباہلہ میں نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مصداق آپ ہیں۔ آپؑ ہی کی شان میں ہے کہ جب کہا گیا کہ صدقہ دے کر پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے راز کی بات کرو تو فقط علی علیہ السلام ہی تھے جو صدقہ دینے والے تھے اور رکوع کی حالت میں زکوۃ دینا علی علیہ السلام کے حصے میں آیا، جس کے لیے آیا کہ تمہارا ولی وہ ہے جو حالت رکوع میں زکوۃ دیتا ہے اور علی علیہ السلام کے فضائل اور آپ کی برتری کے حوالے سے بہت زیادہ مواد موجود ہے، دشمنوں نے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود بھی اس قدر آپ کے فضائل ہیں کہ جس کو ہزاروں صفحات میں جمع کیا جائے تو کم پڑ جائیں۔ (اردو مترجم)

فرق ہے کہ پچھلی آیت میں خود مشرکین سے برأت کا اعلان ہوا ہے لیکن اس آیت میں مشرکین کے علاوہ تمام لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ اس مطلب کو جان لیں اور امر خدا پر عمل کریں، یعنی چار مہینے گزرنے کے بعد مشرکین کو قتل کرنے کے واسطے ان سے جنگ کے لیے آمادہ رہیں۔ کیونکہ یہ بات 10 ذوالحجہ کو بتادی گئی تھی، اس بنا پر 10 ربیع الثانی کو چار مہینے ختم ہو رہے تھے۔ ان چار مہینوں کے بعد مشرکین کے قتل کے حکم پر عمل کرنا تھا اور اس کی تیاری کرنی تھی۔ ابن کثیر نے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علی علیہ السلام کو ابو بکر کی جگہ بھیجا تا کہ مکہ والوں کے پاس جائیں اور چار باتوں کا اعلان کریں:۔

۱۔ اس سال کے بعد شرک کی حالت میں مکہ میں داخل نہ ہوں۔

۲۔ خانہ کعبہ کے گرد ننگا طواف نہ کریں۔

۳۔ مسلمان کے علاوہ کوئی بہشت میں داخل نہیں ہوگا۔

۴۔ ہر وہ شخص جس کا پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ کوئی معاہدہ ہے تو اس کی مدت تک وہ معاہدہ برقرار رہے گا۔

حج اکبر کے دن کے متعلق مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ آئمہ اہل البیت علیہم السلام کی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے نویں ہجری کی عید قربان کا دن مراد ہے۔ کیونکہ یہ آخری سال تھا جس میں مسلمانوں اور مشرکین نے مل کر حج کیا تھا۔ اہل سنت کی روایات کے مطابق حج اکبر سے ہر سال کا دسویں ذوالحجہ کا دن مراد ہے۔ کچھ کے نزدیک روز عرفہ یعنی 9 ذوالحجہ، حج اکبر کا دن ہے۔

بہر حال اس دن کے حوالے سے سب لوگوں کو یہ خبر دے دی گئی ہے کہ وہ مشرکوں سے بیزاری کا اظہار کریں اور ان سے لاتعلق ہو جائیں اور یہ بات باقی افراد تک بھی پہنچائیں کہ اسلام ہدایت اور زندگی کا راستہ ہے۔ یہ دوسروں کو بے خبری کے عالم میں مارنے اور قتل و غارت کا دین نہیں۔ جیسے دو حکومتوں کے درمیان روابط اور تعلقات ہوتے ہیں اسی

لئے کہا گیا ہے کہ دیکھیں اگر توبہ کرکے ایمان لے آؤ تو ٹھیک ہے۔ نصیحت قبول کرنا تمہارے لئے بہتر ہے اور ایمان تمہارے فائدے میں ہے، اگر اس سے منہ موڑتے ہو اور ایمان نہیں لاتے ہو اور اللہ کی دعوت کو ٹھکراتے ہو تو جان لو کہ خدا کو تم عاجز نہیں کر سکتے ہو اور وہ اللہ تمہاری ہلاکت پر قادر ہے اور تم اللہ کی قدرت اور قہاریت اور مشیت کے تابع ہو اور تمہارے اوپر اس کی قدرت مطلق ہے۔ پھر ان کا استہزاء کرتے ہوئے پیغمبر کو حکم دیا کہ ان کافروں کو بتادو کہ تمہارے لئے دردناک عذاب تیار ہے اور یہ عذاب تمہارے ایمان نہ لانے اور شرک پر قائم رہنے کی وجہ سے ہے اور تمہارا یہ رویہ ذلت اور خوارگی کا سبب ہوگا اور آخرت میں جہنم کی زنجیر اور بیڑیاں تمہارے انتظار میں ہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴

"مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی قصور نہیں کیا اور تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد نہیں کی سو ان سے ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کردو، بے شک اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے"۔

عمومی برائت سے استثناء

پچھلی آیت میں مشرکین سے برائت کا جو حکم آیا تھا اس آیت میں اس حکم سے بعض مشرکین کو استثناء کیا گیا ہے۔ وہ مشرکین جن کا مسلمانوں کے ساتھ کوئی معاہدہ تھا اور وہ اس معاہدہ کے پابند رہے تھے اور انہوں نے کھلے انداز میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ بھی نہیں کی تھی اور نہ ہی پوشیدہ طور پر مسلمانوں کے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا جس طرح مشرکین مکہ نے بنی

خزاعہ کے خلاف بنی بکر کی مدد کی۔ بنی بکر کا قریش کے ساتھ عسکری اور دفاعی معاہدہ تھا۔ بنی خزاعہ رسول اللہ ﷺ کے ہم پیمان تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا معاہدہ تھا۔ اس عمل سے انہوں نے حدیبیہ کا جو پیمان تھا اس کو توڑ دیا اور یہ فتح مکہ کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ بنا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ایسے مشرکین جنہوں نے کسی سازش میں شرکت نہیں کی ہے اور نہ ہی تمہارے دشمنوں کا ساتھ دیا ہے تو لازم ہے کہ تم اُن کے ساتھ جو معاہدہ ہے اس کی وفاداری کرو اور جب معاہدہ کی مدت ختم ہو تو پھر اس کو ختم کردو کیونکہ معاہدوں کا احترام اور ان کی حفاظت تقویٰ کے مصادیق میں سے ہے۔

لہٰذا اللہ تبارک و تعالیٰ نے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اس میں مومنین کو یہ شوق دلایا گیا ہے کہ جب کسی سے عہد باندھیں تو اس کی پابندی کریں۔ گویا اس میں اس حکم کی علت اور اس کا سبب بھی بیان کیا گیا ہے کہ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے معاہدہ کیا جائے اس کی پابندی کی جائے۔

پیغام: دوسروں سے معاہدہ کرتے وقت اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، کسی کافر سے بھی معاہدہ کیا ہے تو اس معاہدہ کی پابندی کرو مگر یہ کہ کافر خود معاہدے کو توڑ دے تو پھر اس کے ساتھ ویسا سلوک کرو جیسا وہ کرے۔

فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥﴾

"پھر جب عزت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کردو اور پکڑو اور انہیں گھیر لو اور ان کی تاک میں ہر جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں

اور زکوۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

مقررہ مہلت کے بعد مشرکین کے قتل کا حکم

اس آیت میں چار مہینوں سے سیاحت کے چار مہینے مراد ہیں جنہیں اس سے پہلی والی آیات میں مشرکین کے لیے مہلت کے طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اب فرما رہے ہیں کہ جب یہ مدت ختم ہو جائے تو پھر مشرکین کو جہاں پاؤ انہیں قتل کر دو۔ اس جملے کے ذریعے مشرکین سے حقیقی برأت کا اظہار کیا گیا ہے، کیونکہ ان کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ اس مدت کے بعد اُن کی جانوں کی حرمت ختم ہو جائے گی اور ان کا خون مباح ہو گا۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اب انہیں جہاں بھی پاؤ خواہ حرم میں پاؤ یا حرم سے باہر پاؤ ان کا محاصرہ کرو، انہیں پکڑو اور انہیں قتل کرو۔ ہر جگہ ان کی تاک میں رہو تاکہ ان پر مکمل کامیابی حاصل کر لو۔ اس حکم کی قانون سازی اس حوالے سے تھی کہ کافروں کا خاتمہ کیا جائے اور بتدریج ان کی نجاست سے زمین کو پاک کیا جائے اور لوگ ان کی صحبت اور ان کے ساتھ رہن سہن سے نجات پائیں۔

اس آیت میں کفار کو نابود کرنے اور کفار کے شر سے بچنے کے جو راستے بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک راستہ یہی ہے تاکہ لوگ ظالم حکمرانوں کی بندگی سے نکل آئیں اور سرکش لوگ ہدایت کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔

پھر فرمایا گیا کہ اگر مشرکین توبہ کر لیتے ہیں اور شرک کا لباس اُتار پھینکتے ہیں اور توحید کا لباس زیب تن کر لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں یعنی ایمان لانے کے بعد عمل بھی کرتے ہیں، اللہ اور بندے کا رابطہ قائم ہو جاتا ہے، زکوۃ دیتے ہیں معاشرے کی مشکلات حل کرنے میں مال خرچ کرتے ہیں، دین اسلام کے احکام کی پیروی کرتے ہیں، اپنے خالق کی جانب واپس پلٹ آتے ہیں تو اس صورت میں ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور مہربان ہے۔ اس جملہ کے ذریعے کفار کو آمادہ کیا گیا ہے

کہ وہ ہدایت کی طرف آجائیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ان کے ساتھ جنگ اُن کو ڈرانے کے لئے نہیں ہے بلکہ ان کو سمجھانے کے لئے ہے کہ یہ اُن پر جو حملے کا حکم دیا گیا ہے یہ اس لئے ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف پلٹ آئیں۔ ابن کثیر نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ چار گروہوں کے ساتھ جنگ کے لئے مبعوث ہوئے۔ (چار تلواروں کے ساتھ مبعوث ہوئے) :۔

پہلا گروہ: مشرکین، سورہ توبہ آیت ۵ میں حکم دیا: ''مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی تم مشرکین کو پاؤ''۔

دوسرا گروہ: اہل کتاب، ان کے ساتھ بھی جنگ کرنے کا حکم ہے۔ ''ان کے ساتھ جنگ کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے قیامت پر ایمان نہیں لاتے، جو اللہ نے حرام کیا ہے اللہ کے رسول نے حرام کیا ہے اس کو حرام نہیں قرار دیتے، دین حق کی پیروی نہیں کرتے؛ ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی کہ اب ان کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اور ذلت و رسوائی کی حالت میں رہیں''۔ (سورہ توبہ، آیت ۲۹)

تیسرا گروہ: منافقین۔ ''اے نبی! کافروں اور منافقین کے ساتھ جنگ کرو'' (سورہ التوبہ، آیت ۷۳)

چوتھا گروہ: باغی۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ''اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی صلح کراؤ، اور اگر ان میں سے ایک بغاوت پر اُتر آئے تو جو باغی ہے تو اس کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے امر کی طرف پلٹ آئے'' (سورہ حجرات آیت ۹)۔

پیغام: اللہ پر ایمان لے آئیں، ایمان لانے کے ساتھ جو احکام ہیں ان پر عمل کرو بالخصوص نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اس پر خصوصی توجہ دو۔ بغیر عمل کے ایمان کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مشرکین، منافقین اور کفار سے لاتعلق رہو۔

وَ اِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ اسۡتَجَارَکَ فَاَجِرۡہُ حَتّٰی یَسۡمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبۡلِغۡہُ مَاۡمَنَہٗ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶﴾

"اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ اللہ کا کلام سنے پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہنچادو، یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگ بے سمجھ ہیں"۔

مشرکین کے لیے ایک سہولت

اس آیت میں کہا جارہا ہے کہ اگر مشرکین میں سے کوئی آپ کے پاس آکر اسلام کے پرچم تلے پناہ مانگے اور اسلام کی طرف آجائے اور پناہ مانگ لے تو اسے امان دے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے اور اسلام کی دعوت کو سن لے کیونکہ اس دعوت کا ہدف لوگوں کو گمراہی کے راستے سے رشد وہدایت کے راستے پر لانا ہے۔ اس ہدف تک پہنچنے اور جہالت کا پردہ ہٹانے اور اتمام حجت کرنے کے لیے جس راستہ سے بھی ممکن ہو اقدام کرنا ضروری ہے۔ ان راستوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُن تک اسلام کی دعوت پہنچادی جائے اور اگر وہ آپ کے پاس آکر امان لیتے ہیں تو انہیں امان دے دو تاکہ آپ کے پاس آکر آپ کی باتیں سنیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین جاہل لوگ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی باتیں سننے کے بعد حق کو قبول کر لیں۔

البتہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر مشرکین آپ کے پاس آجائیں اور آپ سے پناہ مانگیں اور آپ کی بات سننا چاہیں تو ان کو ایسے نہیں چھوڑو بلکہ ان کو ان کی اپنی جگہ پر پہنچادو تاکہ وہ آزادانہ پہنچ جائیں اس کے بعد اپنی مرضی سے اسلام لے آتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر شرک پر باقی رہتے ہیں اور تکبر کرتے ہیں تو پھر ان کے لئے امان نہ دی جائے اور ان کے نجس وجود سے زمین کو پاک کرنا ہوگا۔ یہ دستورات قرآن کی طرف سے انسانیت کی فضیلت، کرامت اور

شرافت کے اصولوں کے مطابق ہیں اور رحمت کے پھیلاؤ کے لئے ہیں۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷

"بھلا مشرکوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے ہاں عہد کیونکر ہو سکتا ہے ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے نزدیک عہد کیا ہے، اگر وہ قائم رہیں تو تم بھی قائم رہو، بے شک اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے"۔

مشرکین سے عہد و پیمان

اس آیت میں استفہام، استفہام انکاری ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ مشرکین کس طرح معاہدے کے پابند ہوں گے جبکہ وہ اللہ کی عبودیت اور اللہ کی بندگی پر عقیدہ نہیں رکھتے اور اللہ کے راستے سے ہم آہنگی نہیں رکھتے؟ لیکن بلافاصلہ وہ مشرکین جو وعدوں کے پابند ہیں اُن کا استثناء کیا گیا کہ وہ لوگ جن کے ساتھ آپ نے مسجد الحرام کے پاس پیان باندھا اور وہ اس پر وفادار رہے تو جب تک وہ اپنے معاہدے کے وفادار ہیں تو آپ بھی ان کے معاہدے کی پابندی کریں اور یہ پابندی اُن کے مدمقابل ہے جو عہد شکن نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ دینی تقویٰ کی لوازمات میں سے ہے۔ اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ متقین سے محبت کرتا ہے تو اہل تقویٰ کو چاہیے کہ وہ معاہدوں کی پابندی کریں، جن کے ساتھ معاہدہ کیا ہے اگر وہ اپنے معاہدے پر پابند رہتے ہیں تو تم بھی اس معاہدے کی پابندی کرو۔ لیکن جو پابند نہیں رہتے تو پھر ان کے ساتھ وہی رویہ اپنایا جائے جو انہوں نے اختیار کیا ہے۔

كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۚ﴿۸﴾

"کیونکر صلح ہو اور اگر وہ تم پر غلبہ پائیں تو نہ تمہاری قرابت کا لحاظ کریں اور نہ عہد کا، تمہیں اپنی منہ کی باتوں سے راضی کرتے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے اور ان میں سے اکثر بدعہد ہیں"۔

مشرکین کا رویہ

"اِلًّا" قرابت، رشتہ داری اور تعلق کے معنی میں ہے۔ "ذِمَّةً" ایسی چیز جس کا لحاظ نہ کرنے پر انسان کی مذمت کی جائے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ اگر یہ لوگ آپ پر غلبہ پالیں تو پھر ان کو کسی معاہدہ کا خیال نہیں رہتا اور اس کی رعایت نہیں کرتے، خواہ ان معاہدوں کی بنیاد تکوینی ہو جیسے رشتہ داری اور قرابت داری، خواہ یہ معاہدے قرارداد کی بنیاد پر باندھے گئے ہوں جیسے عہد و پیمان کی قسمیں۔ یہ ان میں سے کسی کی بھی پابندی نہیں کرتے نہ کسی کا کچھ لحاظ رکھتے ہیں۔ پھر کہا گیا کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ پابند نہیں ہیں معاہدوں کے نہ رشتہ داریوں کے نہ زبان کے، زبان دے کر پھر جاتے ہیں تو اس وجہ سے ہے کہ یہ زبان سے تو بڑے چرب زبان ہیں، اچھی اچھی باتیں بھی کریں گے، پیار و محبت کا اعلان کریں گے۔ لیکن ان کے دل میں نفرتیں ہیں، ان کا دل اور زبان ایک نہیں ہے۔ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں وہ دل سے نہیں کہتے۔ ان کی بات فریب اور دھوکہ کے سواء کچھ نہیں ہے، ان کی اکثریت پیمان شکن اور فاسق ہے۔

اِشۡتَرَوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹﴾

''انہوں نے اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا پھر اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، بے شک وہ برا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں''۔

اللہ کی آیات کو بیچنا

یہ آیت بعد والی آیت کا مقدمہ ہے اور یہ دونوں آیات مل کر ''اَكۡثَرُهُمۡ فٰسِقُوۡنَ'' کی تفسیر کر رہی ہیں۔ فسق کے مصادیق میں سے ایک یہ ہے کہ یہ اللہ کی آیات کو معمولی فائدے کے عوض بیچ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر اپنے باطل خیالات اور نفسانی خواہشات کو مقدم کرتے ہیں اور فسق کا دوسرا مصداق اللہ کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنا اور اللہ کے راستے سے روکنا ہے۔ یہ اعمال بہت برے ہیں لہٰذا نہایت ہی بُرا انجام ان کے انتظار میں ہے۔

لَا یَرۡقُبُوۡنَ فِیۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُعۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰﴾

''یہ لوگ کسی مومن کے حق میں نہ رشتہ داری کا خیال کرتے ہیں اور نہ عہد کا، اور یہی لوگ حد سے گزرنے والے ہیں''۔

عہد توڑنے والے

پچھلی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس آیت میں مشرکین کے فسق کے مصادیق میں سے ایک اور مصداق بیان کیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی مومن کے ساتھ باندھے گئے عہد و پیمان کا لحاظ نہیں کرتے، رشتہ داریوں کا لحاظ بھی نہیں کرتے، قرابت داری بھی ان کے لئے کوئی

اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ جب ایسی بات ہے تو پھر یہ خیال نہ کرو کہ ان کے ساتھ معاہدہ توڑتے ہو اور لحاظ نہیں کرتے تو آپ نے ان پر کوئی ظلم و زیادتی کی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ خود انہوں نے اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کی ہے کیونکہ انہوں نے کینہ، بغض اور دشمنی کو چھپا کر رکھا ہوا ہے، اب عمل میں ظاہر ہوا ہے، ان کا لحاظ نہیں کرنا چاہیے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾

''اگر یہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں، اور ہم سمجھ داروں کے لیے کھول کھول کر احکام بیان کرتے ہیں''۔

کفر اور شرک سے توبہ

کفار اور مشرکین کی توبہ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لے آئیں، اللہ کی آیات کی طرف پلٹ آئیں اور نماز قائم کریں جو کہ عبودیت کا اہم ترین مظہر ہے۔ نماز اور زکوۃ ایک دینی معاشرے کی مضبوطی کے دو ستون ہیں ان میں اہم ترین ستون زکوۃ ہے، اس آیت میں اس کی ادائیگی کی بات کی گئی ہے۔ اگر کفار اور مشرکین توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکواۃ دے دیں تو ان میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں رہے گا اور وہ بھی تمہاری طرح ہو جائیں گے، تمہارے دینی بھائی شمار ہوں گے۔ ہم اپنی آیات کو ان لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جو جانتے ہیں اور علم رکھتے ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کے درمیان حقیقی برادری کا قانون قرار دیا ہے جس کے عقلی اور دینی آثار بالکل اسی طرح ہیں جس طرح نسبی برادری کے عقلی اور دینی آثار ہوا کرتے ہیں۔ اس بارے سورہ حجرات آیت: ۱۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ''

ترجمہ: ''مومنین تو بس آپس میں بھائی بھائی ہیں''۔

اس طرح جب کوئی شخص کفر کو چھوڑ کر اسلام کے دائرے میں آجاتا ہے تو پھر اسے اپنا بھائی سمجھو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کا موقع دیا ہے اور اس نے توبہ کر لی ہے اور ہدایت پر آگیا ہے اب اس کی پچھلی باتوں کو بھلا دو۔

وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾

"اور اگر وہ عہد کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین میں عیب نکالیں تو کفر کے سرداروں سے لڑو، ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں تاکہ وہ باز آئیں"۔

عہد شکن مشرکین

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اگر مشرکین اپنے پیمان کو توڑ دیں اور آپ کے دین کے خلاف سازش کریں تو ان کے ساتھ جنگ کرو۔ اس آیت میں مشرکین سے مراد سابقہ بیان شدہ گروہ نہیں ہے بلکہ ان مشرکین سے مراد وہ ہیں جنہوں نے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا ہے اور اس معاہدے کو توڑا ہے۔ خدا نے ان کی قسموں کو لغو اور باطل قرار دیا ہے۔ کفر کے سربراہ کا نام اس لیے لیا گیا ہے کیونکہ یہ باقیوں کی نسبت زیادہ کفر پر قائم ہیں اور دوسرے ان کی پیروی کرتے ہیں، یہ کفار کے بڑے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کے ساتھ جنگ کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عہد شکنی کی ہے اور دین کے خلاف سازشیں کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کو دین کے خلاف سازشیں کرنے سے روکیں۔

اَلَا تُقَاتِلُوۡنَ قَوۡمًا نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَهُمۡ وَ هَمُّوۡا بِاِخۡرَاجِ الرَّسُوۡلِ وَ هُمۡ بَدَءُوۡكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخۡشَوۡنَهُمۡ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشَوۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۳﴾

"خبر دار! تم ایسے لوگوں سے کیوں نہ لڑو جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور پیغمبر کو جلا وطن کرنے کا ارادہ کیا اور انہوں نے پہلے تم سے عہد شکنی کی، کیا تم ان سے ڈرتے ہو، اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو"۔

مسلمانوں کو جنگ پر آمادہ کرنا

اس آیت میں مسلمانوں کو مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ کفار جن جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں ان کا علاج یہی ہے۔ کیونکہ کفار پیمان شکن ہیں اور انہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ سے نکالنے کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کا آغاز بھی انہوں نے کیا۔ پھر تم کیوں ان کے خلاف جنگ کے لیے تیار نہیں ہو جاتے؟ ان کے ساتھ جنگ کرو۔ کیا تم ان سے ڈر رہے ہو اس لیے ان کے مقابلے میں نہیں اٹھتے تو اگر تم میں ایمان ہے تو اللہ سے ڈرو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اللہ ہر خیر وشر کا مالک ہے، ہر نفع و نقصان کا مالک اللہ ہے۔ اس لیے اللہ ہی سے ڈرا جائے اور کسی سے نہ ڈرا جائے۔ اس آیت میں مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مشرکین کے خلاف جنگ کریں اور ان کو کوئی رعایت نہ دے یں۔

قَاتِلُوۡهُمۡ یُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَیۡدِیۡكُمۡ وَ یُخۡزِهِمۡ وَ یَنۡصُرۡكُمۡ عَلَیۡهِمۡ وَ یَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿ۙ۱۴﴾

''ان سے لڑو تاکہ اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے اور انہیں ذلیل کرے اور تمہیں ان پر غلبہ دے اور مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرے''۔

مومنین کے لیے خصوصی ہدایت

مومنین کو کہا جارہا ہے کہ جنگ کا جو حکم دیا جارہا ہے اس پر عمل کرو کیونکہ مشرکین نے جو جرائم کیے ہیں وہ قابل معافی نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ مشرکین کو مومنوں کے ہاتھوں قتل کرے اور مومنوں کے ذریعے ان کو عذاب دے۔ مومنین کے ہاتھ، اللہ کے ہاتھ ہیں۔ مشرکین ذلیل ہونگے اور مومنین کو اللہ کی نصرت ملے گی اور وہ غالب آئیں گے اور مومنوں کے دلوں میں موجود پریشانی دور ہو جائے گی اور ان کے دل روشن ہونگے۔ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ مومنوں کو مشرکین کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا جائے تاکہ وہ اپنے اور اللہ کے دشمنوں سے انتقام لیں اور اس انتقام میں انہیں کوئی پریشانی نہ ہو اور نہ ہی وہ سستی دکھائیں۔ کیونکہ اللہ کی مدد اور نصرت ان کے ساتھ ہے۔

وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾

''اور ان کے دلوں سے غصہ دور کرے، اور اللہ جسے چاہے توبہ نصیب کرے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے''۔

مشرکین پر مسلمانوں کا غلبہ

یہاں بتایا جارہا ہے کہ مسلمان جب مشرکین پر غالب آئیں گے تو ان کے دلوں سے غصہ دور ہو جائے گا۔ پھر بتایا جارہا کہ جنگ کا حکم متعلق ہونے کے باوجود ہر جگہ جاری نہیں ہوگا بلکہ جو لوگ توبہ کرلیں اور اللہ کی طرف پلٹ آئیں تو پھر تم ان سے درگزر کرو اور ان کو

اپنے ساتھ ملالو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کے حالات سے آگاہ ہے۔ اللہ کا ہر فیصلہ صحیح اور درست ہے کیونکہ اللہ علیم ہے، جانتا ہے اور اللہ کے احکام بے ہودہ اور بے مقصد نہیں ہوتے بلکہ ان کے پیچھے ایک ہدف ہوتا ہے، ایک مقصد ہوتا ہے جس کو مد نظر رکھ کر فیصلہ دیا جاتا ہے۔

پیغام: ہر مومن کو چاہیے کہ وہ ایسا کام کرے جس سے دوسرے مومنوں کے دلوں کو خوشی محسوس ہو۔ مومن ایک دوسرے کے مدد گار بنیں۔ اسی طرح مومن کو چاہیے کہ وہ دشمن شناس ہو اور اپنے دشمنوں کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ لَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوْلِهٖ وَ لَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

”کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے ایسے لوگوں کو جدا ہی نہیں کیا جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہیں بنایا، اور اللہ تمہارے سب کاموں سے باخبر ہے“۔

مسلمانوں کو جنگ کی تشویق

اس آیت میں بھی مسلمانوں کو جنگ کے لیے آمادہ کرنے اور انہیں جنگ کا شوق دلانے کے لیے کہا گیا ہے کہ دنیا امتحان کا گھر ہے، اس میں ناپسندیدہ حالات سے گزرنا پڑتا ہے، تکلیف دہ مسائل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ کہ انسانوں کی خلقت کے آغاز سے لے کر انجام تک خیر و شر ساتھ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا قُرب فقط ان لوگوں کو عطا ہوتا ہے جو اللہ اور اللہ کی آیات پر خالص ایمان رکھتے ہیں۔ اور ایمان کا خلوص، امتحان سے واضح ہوتا ہے۔ امتحان میں

مومن مقام عمل میں نمایاں ہوتا ہے یعنی مقام عمل میں مومن کو امتحان نمایاں کرتا ہے اور پاک کو ناپاک سے جدا کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تم خیال کرتے ہو تمہیں ایسا ہی چھوڑ دیا جائے گا اور خدا ایمان والے اور مجاہدین کو بے ایمان اور جہاد نہ کرنے والوں سے جدا نہ کرے گا؟

"وَلِيْجَةً" اس سہارے کو کہتے ہیں جو آدمی کے اپنے خاندان سے نہ ہو۔ اس جگہ علم خدا سے مراد علم فعلی ہے یعنی تم یہ خیال کرتے ہو کہ واقع اور حقیقت میں معلوم نہیں ہوگا کہ کون جہاد کرتا ہے اور کون جہاد نہیں کرتا؟ اور کون اللہ اور اللہ کے رسول کو چھوڑ کر کسی اور کو سہارا بناتا ہے اور اس سے دوستی کرتا ہے اور کون ایسا نہیں کرتا؟ اللہ علم ذاتی رکھتا ہے جو کچھ تم انجام دیتے ہو اس سے آگاہ ہے اور باخبر ہے۔ لہٰذا تمہارا امتحان جنگ اور جہاد کے ذریعہ ہوگا تاکہ تمہارے ایمان کی اصلیت روشن ہو جائے۔ اور یہ بھی بات واضح ہو جائے کہ دشمنوں کے ساتھ تمہارا رابطہ کیسا ہے؟ یہاں پر مومنوں کو متوجہ کیا جارہا ہے کہ غیر خدا کو اپنا سہارا نہ بناؤ اور ایمان کا خلوص ظاہر کرنے کے لیے جنگ و جہاد کے لیے آمادہ ہو جاؤ۔

پیغام: غیر خدا کو اپنا سہارا نہیں بنانا چاہیے ا۔للہ پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝١٧

"مشرکوں کا کام نہیں کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں، ان لوگوں کے سب اعمال بے کار ہیں اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے"۔

مشرکین کے لیے مساجد تعمیر کی ممانعت

مشرکین کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مساجد تعمیر کریں۔ کیونکہ اگر وہ کفر اور اللہ اور اللہ کی عبادت کے ساتھ دشمنی کی حالت میں مساجد تعمیر کرنا چاہیں تو حقیقت میں یہ دو متضاد امور کو آپس میں ملانا ہوگا، یعنی ایک طرف تو خدا کو نہیں مانتے اور دوسری طرف خدا کی عبادت کے لیے مسجد بنا رہے ہوں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ دو چیزیں اکھٹی نہیں ہو سکتیں کیونکہ دو متضاد چیزوں کا اکھٹا ہونا محال ہے۔ یہاں پر مساجد سے مطلق مساجد مراد ہیں جس میں مسجد الحرام اور دوسری مساجد سب شامل ہیں۔ لہٰذا کفار اپنی زبان سے کفر کرتے ہیں یا بتوں کی عبادت کرکے عملی طور پر کفر کی گواہی دے رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا عمل باطل اور بے اثر ہے، اس کے نتیجہ میں ان کو کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ کفر کی بنیاد پر انجام دیا گیا عمل بے اثر ہے اور ایسے عمل سے سعادت اور بہشت نہیں ملتی، بلکہ ان کے اعمال ایسے ہیں جو انہیں آتش جہنم میں لے جائیں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس آیت سے درج ذیل نکات استنباط کئے جا سکتے ہیں:۔

۱۔ کلی طور پر جائز عمل وہ عمل ہوتا ہے جو عمل کرنے والے کو کوئی اچھا فائدہ دے رہا ہو۔ شریعت میں کوئی بھی بے ہودہ اور بے مقصد عمل وضع نہیں کیا گیا۔ اور یہ قانون طبیعت سے مطابقت رکھتا ہے کہ کوئی شے بغیر مقصد کے خلق نہیں ہوئی۔

۲۔ کوئی بھی عمل اس وقت جائز ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو انجام دینے کی اجازت دے دی ہو اور اس عمل سے نہ روکا ہو۔ مشرکین کے اعمال میں ان میں کوئی ایک بھی خصوصیت موجود نہیں ہے۔ عبادت، عقیدہ اور ایمان کا نام ہے۔ مساجد تعمیر کرنے والوں کو اس کی تعمیر کا اس وقت فائدہ ہوگا جب ان کے دل توحید سے آباد ہوں۔ اگر ان کے دل توحید سے خالی اور ویران ہوں تو ان کے مساجد تعمیر

کرنے کی کوئی اہمیت اور قدر نہیں ہے۔

پیغام: مشرکین سے اپنی عبادت گاہیں تعمیر نہ کروائیں کیونکہ وہ خود اس عبادت کے قائل نہیں ہیں تو ان سے کیسے مسجد کی تعمیر کروائی جائے۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾

"اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان لایا اور نماز قائم کی اور زکوۃ دی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا، سو وہ لوگ امیدوار ہیں کہ ہدایت والوں میں سے ہوں"۔

ایمان کی بنیاد پر مساجد کی تعمیر

یہاں پر "اِنَّمَا" حصر کا معنی دے رہا ہے۔ اس جگہ ممکن تھا کوئی یہ خیال کرے کہ مومنین بھی مساجد بنا سکتے ہیں اور مشرکین بھی بنا سکتے ہے۔ اس وہم کو دور کرنے کے لیے کلمہ حصر لا کر بتایا گیا ہے کہ مساجد تعمیر کرنے کا حق فقط مومنین کو حاصل ہے۔ مشرکین مساجد تعمیر نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ جن کا اللہ پر ایمان ہے، قیامت پر ایمان ہے، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے ، انہیں اللہ کی مساجد تعمیر کرنے کا حق ہوگا اور جن میں یہ چیزیں نہیں ہے خاص کر نماز اور زکوۃ جو دین کے احکام ہیں اور جن کو کسی بھی حال میں چھوڑا نہیں جا سکتا اور جو ان الٰہی آیات کے کافر ہیں اور یہ کفر جو عمل کے مرحلے میں ہے نہ کہ عقیدے کے مرحلے میں تو ایسے لوگ جو خدا اور قیامت پر ایمان بھی رکھتے ہوں تو مساجد کی تعمیر ایسے لوگوں کو کوئی فائدہ نہ دے گی، اگرچہ وہ مسلمان ہوں اور

زبان سے اللہ اور قیامت کا انکار نہ کرتے ہوں لیکن عمل میں اپنے اموال سے زکوۃ نہ دیتے ہوں، نماز قائم نہ کرتے ہوں تو وہ کافر ہیں۔ لیکن زبان سے اقرار کرنے کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوگا لیکن عمل کے اثر سے محروم رہے گا۔

اس تعبیر سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اس آیت میں خشیت اور خوف سے دینی خشیت اور دینی خوف مراد ہے اور یہ وہی عبادت کی حالت میں پیدا ہونے والا خوف ہے۔ایسے افراد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں جن کے ہدایت یافتہ ہونے کی امید ہے۔ یہ امید مخاطبین کے لئے خاص ہے یا بطور عام سب کے لیے ہے۔اس امید کی نسبت اللہ کی طرف دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کے بارے میں امید وار وہی ہوسکتا ہے جو مطلوب سے آگاہ نہ ہو لیکن جس کو اپنے مطلوب کے بارے میں علم ہے اس کی طرف امید کی نسبت دینا صحیح نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ ہر چیز کے بارے میں جانتا ہے کہ کون کس حالت میں ہوگا۔اللہ تعالیٰ ہر قسم کے جہل سے پاک و منزہ ہے لہٰذا اس جگہ امید کی جو بات کی گئی ہے وہ مخاطبین کے حوالے سے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے۔ اللہ امید نہیں کررہا ہے کہ ایسا ہو بلکہ جن کو خطاب کیا جارہا ہے مومنین ایسی امید رکھتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہوں۔ گویا ان کے ہدایت یافتہ ہونے کی امید ہے قطعی نہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ہدایت، عقیدہ اور عمل کے ساتھ مل سکتی ہے اور جب بھی یہ شرط پوری ہوجائے اور برقرار بھی رہے تو اس صورت میں نتیجہ حتمی ہے وہ شخص ہدایت یافتہ ہوگا۔ اگر اس شرط میں دوام نہ ہو تو پھر یہی کہا جاتا ہے کہ انشااللہ امید ہے کہ وہ ہدایت پر ہوں گے۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞ ١٩

''کیا تم نے حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد حرام کا آباد کرنا اس کے برابر کر دیا جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں لڑا، اللہ کہ ہاں یہ برابر نہیں ہیں، اور اللہ ظالم لوگوں کو راستہ نہیں دکھاتا''۔

عمل کی برتری کا معیار

''سِقَایَۃ'' اُس جگہ یا ظرف کو کہا جاتا ہے جہاں سے حاجی پانی پیتے ہیں۔ یہاں پر یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا مصدری معنی مراد ہو یعنی پانی دینا۔ زمانہ جاہلیت میں حاجیوں کو پانی پلانا ایک فخر کی بات تھی اور اس عمل پر مباہات کی جاتی تھی۔ عمارت کی تعمیر سے، مسجد الحرام کے امور کی اصلاح مراد ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضور پاک ﷺ کے چچا عباس حاجیوں کو پانی پلانے پر فخر کرتے تھے اور شیبہ مسجد کی آبادکاری اور تعمیر پر فخر کرتے تھے۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد کی دیکھ بھال کرنا اور عمارت کی صفائی ستھرائی کرنا، اللہ اور روز قیامت پر ایمان لانے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے کے برابر نہیں ہے۔

پھر فرمایا کہ اللہ پر ایمان اور جہاد کے بغیر ان اعمال کی کوئی قیمت اور ارزش نہیں ہے۔ عمل کی قیمت اور اس کی قدر ایمان کی بناء پر ہے۔ عمل ایمان کے بغیر ایک ایسا جسد ہے جس میں رُوح نہ ہو۔

نقل ہوا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اس آیت کو بطور شاہد پیش کیا اور عباس اور شیبہ کو خطاب کیا کہ جب وہ حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد کی تعمیر پر فخر کرتے تھے تو مولا علی علیہ السلام نے فرمایا کہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ بچپن میں جو نعمت مجھے عطا ہوئی ہے وہ کسی کو نہیں ملی۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ علی علیہ السلام نے فرمایا میں تمام لوگوں سے چھ ماہ

پہلے رو بہ قبلہ ہو کر نماز پڑھتا تھا اور میں راہ خدا کا مجاہد ہوں اور اس قدر تلوار کے ساتھ تمہارا مقابلہ کیا کہ یہاں تک کہ تم اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان لے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت عباس، حضرت علی علیہ السلام کے بارے شکایت لے کر پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس گئے تو اس وقت سورہ التوبہ کی آیات ۱۹ سے ۲۳ نازل ہوئیں۔

واضح ہے کہ عمل کی روح ایمان ہے۔ ہر گز شرک اور ایمان میں برابری نہیں ہے۔ اسی لئے آخر میں فرمایا کہ اللہ کے ہاں یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ستمگاروں کو ہدایت نہیں کرتا۔ اس مطلب سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس جگہ ظلم سے شرک مراد ہے اور سقایت اور عمارت شرک کی حالت میں ہوں تو وہ بے فائدہ ہیں۔ یہ بھی بتایا جارہا ہے کہ ان کا عمل ان کو کوئی فائدہ نہیں دے گا اور ان کی سعادت اور بلندی درجہ کا ذریعہ نہیں بنے گا۔ اور نہ ہی رستگاری اور جنت الٰہی کی طرف انہیں لے جاسکے گا۔ ایمان کے بغیر عمل بے فائدہ ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ ۝۲۰

''جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑے اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں سے جہاد کیا اللہ کے ہاں ان کے لیے بڑا درجہ ہے، اور وہی لوگ مراد پانے والے ہیں''۔

کامیاب لوگ

اس آیت میں پچھلے سوال کا جواب دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہے اور جان اور مال سے راہ خدا میں جہاد کیا ہے اور اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ نثار کیا ہے، خدا کے ہاں ان کا درجہ اور مرتبہ بالاتر ہے۔

اس کو جمع کی شکل میں لا کر اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ فضیلت کا معیار یہی اوصاف ہیں۔ لہٰذا ایمان اور عمل جب دونوں اکٹھے ہوں تو مرتبے کی بلندی کا سبب بنتے ہیں۔ بغیر ایمان کے عمل کی کوئی ارزش اور قیمت نہیں ہے۔آخر میں خداوند تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ رستگاری اور کامیابی فقط ان کے لئے ہے جن میں یہ اوصاف موجود ہیں، جن میں یہ اوصاف نہیں وہ کامیاب نہیں بلکہ ناکام ہیں۔

پیغام: کامیاب لوگ وہ ہیں جو ایمان کے ساتھ نیک اعمال بھی انجام دیتے ہیں۔ ایمان کے بغیر عمل اور عمل کے بغیر ایمان بے فائدہ ہے۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۙ﴿۲۱﴾

"انہیں ان کا رب اپنی طرف سے مہربانی اور رضامندی اور باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں انہیں ہمیشہ کا سکون آرام حاصل ہوگا"۔

کامیاب افراد کے لیے خوشخبری

اس آیت میں جو کامیابی ذکر ہوئی ہے یہ وہی کامیابی ہے جو پچھلی آیت میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں اور جان و مال سے جہاد کرتے ہیں اُن کے لئے اللہ تعالیٰ ایسی رحمت کی بشارت دیتا ہے جو قابل توصیف نہیں ہے۔ اور اپنی اس رضا، خوشنودی اور رضوان کی خوشخبری دیتا ہے جس کے وصف کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے لیے نعمات سے بھرپور بہشتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾

"ان میں ہمیشہ رہیں گے، بے شک اللہ کے ہاں بڑا ثواب ہے"۔

جنت کی ابدی نعمتیں

بہشت کی نعمتیں دائمی اور پائیدار ہیں اور کبھی زائل نہیں ہوں گی۔ مومنین اسی بہشت جاوداں میں جائیں گے اور ان کے لئے وہاں مدت معین نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ بہشت میں رہیں گے۔ کیونکہ مومنین کو جو بشارت دی گئی ہے، دُنیاوی نعمات میں اس کی مثال نہیں ملتی اس لیے یہ مقام تعجب اور استبعاد ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ مومنین کو ایسی نعمات کی بشارت دے رہا ہے جس کی دنیوی نعمات میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔ اور یہ اخروی نعمات ہی بڑا اجر ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ان کے عقیدے اور عمل کے نتیجے میں عطا کیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

"اے ایمان والو! اپنے آباء اور بھائیوں سے دوستی نہ رکھو اگر وہ ایمان پر کفر کو پسند کریں، اور تم میں سے جو ان سے دوستی رکھے گا سو وہی لوگ ظالم ہیں"۔

کافروں سے دوستی کی ممانعت

اس آیت میں کافروں سے دوستی کرنے اور ان کی ولایت اور سرپرستی لینے سے منع کیا گیا ہے۔ خواہ وہ کافر تمہارا باپ یا تمہارے بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔ جب تک وہ کافر ہیں مومنین کو حق نہیں کہ ان کے ساتھ دوستی رکھیں یا ان کے ساتھ تعلقات بنائیں۔ رشتہ داروں میں سے بھائی اور باپ کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہ دو رشتے انسان کے نزدیک

سب سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ انسان کی زندگی کے امور میں تصرف کر سکتے ہیں اور مومنین کی سرپرستی کر سکتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو کفار کی سرپرستی لینے سے منع کیا ہے تاکہ کفار مومنین کے داخلی معاملات میں مداخلت نہ کر سکیں۔ جبکہ باقی راشتہ داروں جیسے بیوی، بیٹا اور بہن سے اتنا خطرہ متوقع نہیں کیونکہ عام طور پر بیوی یا بیٹا باپ یا شوہر کے کام میں مداخلت نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی سرپرستی کر سکتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ جو مومنین کافروں کے دوست ہونگے وہ بھی ظالموں میں سے ہونگے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہدایت کی نعمت کو حرام کیا ہے اور وہ کفار کی ولایت لے کر ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں کیونکہ کفار کے ساتھ دوستی اس بات کا سبب بنے گی کہ وہ مومنین کی زندگی کے معاملات میں مداخلت کریں اور بتدریج ان کے دل پر اثر انداز ہوں گے جس کے نتیجے میں مومنین کفار کے مقابلے میں قیام نہیں کر سکیں گے جو کہ کھلا جرم ہے۔ ایسے لوگ نعمت الٰہی سے محروم ہیں اور ان کا کوئی بھی صالح عمل سعادت اور کامیابی میں موثر نہیں ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۠﴿۲۴﴾

''کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور کاروبار جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں لڑنے سے زیادہ

پیارے ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے، اور اللہ نافرمانوں کو راستہ نہیں دکھاتا"۔

گناہگاروں کا انجام

اس آیت میں اللہ تعالیٰ رسول خدا ﷺ کو کہہ رہے ہیں کہ ان سے کہہ دو کہ اگر ان کے آباء، ان کی بیویاں، ان کے بھائی، اولاد، اقوام، قبیلہ، خاندان، اموال، گھر، رہائش گاہیں، زیادہ محبوب ہیں اللہ، اللہ کے رسول ﷺ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تو پھر امر الٰہی کا انتظار کرو۔ اس آیت میں جو افراد بیان کیے گئے ان میں سے بعض سے انسان کا سببی تعلق ہے اور بعض سے نسبی تعلق ہے، ان افراد سے دوستی، اموال اور رہائش گاہیں یہ سب دنیاوی زندگی کی زینت ہیں۔ یہ چیزیں معاشرے میں انسان کے قوام اور مضبوطی کا سبب بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر یہ سارے امور تمہارے لئے اتنے محبوب ہیں کہ اگرچہ وہ کافر بھی ہوں تب بھی تم ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہو، ان کے ساتھ تعلق رکھتے ہو اور ان سے تعلق نہیں توڑتے ہو تو پھر منتظر رہو کہ اللہ اپنا فیصلہ دے گا۔ یہ امر الٰہی یا تو اللہ کا عذاب ہے کہ انہوں نے خدا اور اللہ کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد سے منہ موڑا ہے تو اس کی سزا میں مبتلاء ہوں گے یا کوئی اور چیز ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اُن کی مخالفت کی وجہ سے دین کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی کرے گا۔

آخر میں فرمایا کہ خداوند فاسق گروہ کو جو گناہ گار ہیں، ہدایت نہیں کرتا۔ کفار کے ساتھ محبت رکھنا اور اللہ کے امر اور اللہ کے رسولؐ کے امر سے نکلنا فسق اور گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ان کے اعمال کی بناء پر ان کو ہدایت دے، انہیں اپنی نصرت کی توفیق دے اور رسول اللہ ﷺ کی مدد کی توفیق دے اور دین کا کلمہ بلند ہو، شرک کے آثار محو ہوں۔ ان چیزوں کی توقع ایسے لوگوں سے نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ تو خود کافروں کے دوست بن بیٹھے ہیں۔ انہیں تو

اپنی رہائش گاہیں محبوب ہیں، اپنے اموال محبوب ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے امر سے مراد جس کا انتظار کرنے کا کہا گیا ہے یا تو اللہ کے دین کی مدد اور نصرت مراد ہے یا اللہ کے کلمہ کے سربلندی مراد ہے جس سے یہ لوگ ذلیل و خوار ہوں گے جنہوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کے امر کو پس پشت ڈالا ہے اور دُنیاوی عیش و عشرت کو زیادہ پسند کیا ہے اور اس کو زیادہ چاہا ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ﴿۲۵﴾

”اللہ بہت سے میدانوں میں تمہاری مدد کر چکا ہے، اور حنین کے دن، جب تم اپنی کثرت پر خوش ہوئے پھر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور تم پر زمین باوجود اپنی فراخی کے تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹ گئے“۔

جنگ حنین کا حوالہ

” مَوَاطِنَ“ موطن کی جمع ہے، ٹھہرنے کی جگہ کو کہتے ہیں، ایسی جگہیں جہاں انسان سکونت اختیار کرتا ہے۔ ” حُنَيْنٍ“ مکہ اور طائف کے درمیان ایک صحرا کا نام ہے جہاں پر معروف غزوہ حنین وقوع پذیر ہوا۔ اس جنگ میں ہوازن اور ثقیف قبیلوں کی مسلمان افواج کے ساتھ جنگ ہوئی ۔اس جنگ میں مسلمانوں پر بہت سخت دن گزرے۔اس جنگ میں مسلمانوں نے پہلے تو شکست کھائی، ان کو ہزیمت ہوئی اور اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ مسلمانوں افراد کی کثرت پر مغرور تھے اور خوش تھے اور وہ اللہ پر اعتماد اور توکل اور اللہ کی قدرت کا سہارا بھول گئے تھے، انہوں نے اپنی تعداد پر بھروسہ کرلیا تھا۔ لیکن ان کی کثرت نے ان کو بے نیاز

نہ کیا اور واضح ہو گیا کہ جس ظاہر پر انہوں نے تکیہ جو کیا تھا وہ ایک وہم و خیال تھا اور اس کثرت نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا اور دشمن نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا اور ان کا محاصرہ کر لیا جس کے نتیجہ میں یہ لوگ تو یہ وہاں سے فرار ہوئے اور فرار کے علاوہ ان کو کوئی خیال ہی نہیں آیا اور اس طرح انہوں نے شکست کھائی۔ یہ سارے مصائب اس وجہ سے آئے کہ انہوں نے اپنی تعداد کی کثرت پر اطمینان کر لیا تھا اور خیالی اسباب کو ہی سب کچھ سمجھ لیا تھا اور مسبّب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات سے خود کو علیحدہ کر لیا تھا۔ بہر حال جنگ کے اختتام میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت واسعہ اور اپنے عظیم احسان سے ان کی مدد فرمائی اور ان کے دلوں میں اطمینان ڈالا اور فرشتے ان کی تائید اور حمایت کے لئے بھیج دیے اور ان کو معافی اور مغفرت کا وعدہ دیا۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶

"پھر اللہ نے اپنی طرف سے اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر تسکین نازل فرمائی اور وہ فوجیں اتاریں کہ جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو عذاب دیا، اور کافروں کی یہی سزا ہے"۔

مومنوں کے لیے سکینہ کا اُتارا جانا

"سکینہ" اس قلبی حالت اور کیفیت کو کہتے ہیں جو سکون نفس اور ثبات قلب کا باعث بنتی ہے۔ انسان کے اندر یہ حالت ایمان اور تقویٰ کے اضافے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جس سے وہ محرمات الٰہی سے دوری اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اطمینان اور سکون مومنوں کے دلوں پر ڈالتا ہے تاکہ اُن کا ایمان اور بڑھ جائے۔

پیغمبرؐ اور مومنین پر اللہ کا احسان

پیغمبرؐ اور مومنین پر سکون اور اطمینان اتارنے کا معنی ہر گز یہ نہیں ہے کہ رسولؐ خدا مضطرب یا متزلزل ہوئے ہوں۔ یہاں پر سکینہ، ایمان اور تقویٰ کے اضافے کے معنی میں ہے جو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے بچنے کا سبب بنتا ہے۔ نہ دیکھے جانے والے لشکر سے مراد وہ فرشتے ہیں جو جنگ کے دوران مومنین کے دلوں کو مضبوط کرنے کے لئے اُتارے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین اور فرشتوں کے ذریعے کافروں کو عذاب دیا اور کافر اسی کے مستحق تھے۔ بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ دیا ہے یہ وعدہ قطعی نہیں ہے تاکہ مومنین کے دلوں سے خوف و خشیت کے نکلنے کا سبب بنے۔ اسی طرح اُس کا عدم اور محقق نہ ہونا بھی قطعی اور یقینی نہیں ہے تاکہ مومنین کے دلوں سے اُمید اور رجاء کی حالت کے زائل ہو جانے کا سبب بنے۔ بلکہ یہ وعدہ مومنین کے دلوں میں خوف و رجاء کی درمیانی کیفیت ایجاد کرتا ہے جس کے واسطے سے ان میں ایک تربیتی حالت پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب وہ حقیقی سعادت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ توبہ، مغفرت اور رحمت الٰہی کا اجمالی وعدہ ہے جو بعد والی آیت میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۷﴾

''پھر اس کے بعد جسے اللہ چاہے توبہ نصیب کرے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

اللہ کی بخشش و مغفرت

جو بندہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی عنایت اور توفیق سے اسے توبہ کی توفیق دیتا ہے۔ اللہ کی جانب رجوع کرنے کی توفیق ملنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے وسائل مل جاتے ہیں جن سے وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور توبہ کرلیتا ہے۔ پھر اللہ

تعالیٰ اپنی رحمت اور عفو کے ذریعے بندے کی طرف پلٹتا ہے بندے کی توبہ قبول کرلیتا ہے، اسے بخش دیتا ہے۔ جیسے ہم نے کہا کہ بندے کی توبہ اللہ تعالیٰ کی دو توبہ کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ پہلی توبہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ملتی ہے اور وہ توبہ کرتا ہے۔ پھر اللہ اس کی اس آواز کو سنتا ہے اور اپنی رحمت اور بخشش سے اپنے بندے کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔

"مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ" سے ان کا غیر خدا پر بھروسہ کرنا یا جنگ سے فرار کرنا مراد ہے۔ تمہاری اس خطاء کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف کردیا۔ "عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ" کے ذریعے اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں خوف اور رجاء کی درمیانی حالت ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندے کی طرف رجوع کرنے کا مطلب ہے کہ مسلمان جب توبہ کے وسیلے سے گناہوں اور معصیت سے پلٹتے ہیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ بھی ان کی طرف اپنی رحمت کا رخ کرتا ہے۔ کافروں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا بندے کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ اپنا کفر اور شرک چھوڑتے ہیں اور توحید کی طرف آجاتے ہیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت ان کے شامل حال ہو جاتی ہے اور اللہ کی رحمت انہیں ملتی ہے۔ آخر میں اللہ کی دو صفات بیان کی گئی ہیں کہ وہ غفور ہے، بہت بخشنے والا اور رحیم ہے، بہت مہربان۔ اللہ کا بخشش اور معاف کرنے کا فیض ہمیشہ توبہ کرنے والوں کے لئے جاری و ساری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے فیوضات اور برکات سے فیض پہنچاتا رہتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡمُشۡرِكُوۡنَ نَجَسٌ فَلَا يَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَـرَامَ بَعۡدَ عَامِهِمۡ هٰذَا ۚ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ عَيۡلَةً فَسَوۡفَ يُغۡنِيۡكُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖۤ اِنۡ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۸﴾

"اے ایمان والو! مشرک تو پلید ہیں سو اس برس کے بعد مسجد حرام کے نزدیک نہ آنے پائیں، اور اگر تم تنگدستی سے ڈرتے ہو تو آئندہ اللہ اگر چاہے تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا، بے شک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے"۔

مسجد الحرام میں مشرکوں کے داخلے پر پابندی

"نَجَسٌ" ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان کی طبیعت نفرت کرے۔ مشرکین اپنے افکار اور زندگی کی روش کے لحاظ سے کیونکہ دین حق کے خلاف حالت جنگ میں ہیں اس لیے وہ نجس ہیں۔ انہیں مسجد الحرام کے قریب نہیں جانا چاہیے۔ مسجد الحرام مطہر اور پاکیزہ جگہ ہے جبکہ مشرکین نجس اور پلید ہیں۔ مومنین کو چاہیے کہ ان کو مسجد الحرام میں داخل نہ ہونے دیں۔ ان کی نجاست اس حوالے سے نہیں ہے کہ ان کی رطوبت اور تری مسجد کو لگے، بلکہ یہ نجاست باطنی ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے ظاہری نجاست مراد ہے۔ اگر مشرکین کے مسجد الحرام میں داخل ہونے سے ان کی رطوبت منتقل ہوتی ہے تو انہیں مسجد الحرام میں داخل ہونے نہ دیا جائے۔ لیکن کافر باطنی طور پر نجس ہوتا ہے۔ اگر وہ ایمان لائے گا تو اس کی باطنی طہارت ہو جائے گی۔ جس سال اللہ تعالیٰ نے برأت والی آیات اتاریں اور علی علیہ السلام، ابوبکرؓ کی جگہ یہ آیات اہل مکہ کو پہنچانے کے لئے مشرکین کے پاس گئے کہ آج کے بعد پھر وہ ننگا طواف نہیں کر سکیں گے اور حج بجا نہیں لا سکیں گے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ مطلب خود مجھے پہنچانا ہو گا یا میرے خاندان میں سے کسی فرد کو پہنچانا ہوگا۔ ہمارے علاوہ کوئی اور نہیں پہنچا سکتا اسی لئے اللہ کے حکم سے حضرت ابوبکرؓ سے یہ حکمنامہ واپس لے لیا گیا اور راستے سے ہی حضرت ابوبکرؓ واپس آ گئے اور علی علیہ السلام مکہ گئے اور انہوں نے مشرکین کے درمیان یہ اعلان کیا۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ حج کے معطل ہونے سے کساد بازاری ہو جائے گی، فقر اور مالی تنگدستی آجائے گی تو خداوند بہت جلدی تمہیں اپنے فضل سے بے نیاز کر دے گا اور فقر اور بھوک سے تمہیں محفوظ رکھے گا کیونکہ وہ ہی خالق اسباب ہے، سارے وسائل اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور وہ اللہ تمہارے حالات سے بھی آگاہ ہے اور جو وہ احکام صادر کرتا ہے وہ صحیح ہوتے ہیں، وہ حکیم ہے۔ اللہ اپنے وعدے میں سچا ہے لہٰذا مشرکین کی تھوڑی ہی تعداد باقی رہ گئی۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾

"ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اسے حرام جانتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور سچا دین قبول نہیں کرتے ان لوگوں میں سے جو اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ عاجز ہو کر وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں"۔

مشرکین اور اہل کتاب کے قتال کا حکم

اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ اللہ اور قیامت کے بارے میں ان کا عقیدہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جو الٰہی پیغمبروں کے درمیان فرق رکھے اور روز جزاء پر اس کا ایمان نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا اللہ پر صحیح ایمان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کا حکم دیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّ نَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿۱۵۱﴾ (سورۃ النساء، آیت: ۱۵۰-۱۵۱)

''جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور رسولوں کے درمیان تفریق ڈالنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے اور وہ اس طرح کفر و ایمان کے درمیان ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ حقیقی کافر ہیں''

مشرکین کے بارے بیان

یہ لوگ عمل کے مقام پر اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں جانتے۔ اس جگہ رسول سے یا تو ان کے دین کا رسول مراد ہے جس کی نبوت کے وہ قائل ہیں یا رسول اللہ ﷺ مراد ہیں جن کی نبوت کی بشارت توارایت اور انجیل میں پڑھ چکے تھے۔ یہ امر پروردگار کی شان میں ان کی نہایت بے شرمی کو ثابت کرتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا یہ لوگ جو دین حق کی طرف میلان نہیں رکھتے اور شریعت حقہ کے پیرو نہیں جو ان کو حق کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور دین حق کے قائل نہیں ہیں اور نظام حقہ اور سنت الٰہی کے قائل نہیں یہ وہی اہل کتاب ہیں۔ لیکن کیونکہ ان لوگوں نے اللہ کے ہاں مقبول دین کو قبول نہیں کیا ہے اور جو کچھ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے حرام کیا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے روکا ہے ان سے رکتے نہیں ہیں اور فطرت انسانی کے خلاف فساد پھیلاتے ہیں اور دین حق جو کہ دین فطرت ہے اس کے پابند نہیں ہیں تو یہ بھی کافر ہیں۔

دوسری طرف عقیدتی لحاظ سے مبداء اور معاد پر محکم ایمان اور صحیح نظریہ نہیں رکھتے، کیونکہ حضرت عیسیٰؑ یا عزیر کو اللہ کا بیٹا سمجھتے ہیں، اس لحاظ سے بھی یہ کافروں کے مشابہہ ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کہا ہے ''لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ'' کہ یہ اللہ

پر ایمان نہیں رکھتے تاکہ ان کے ساتھ جنگ کا جو فیصلہ ہے اس کی حکمت واضح ہو جائے اور لوگوں کو اس بات پر اُبھارا جائے اور تشویق کی جائے کہ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک وہ ذلت کے ساتھ جزیہ دینے پر تیار نہ ہو جائیں۔ جزیہ وہ مالی ٹیکس ہے جو اہل ذمہ سے لیا جاتا ہے جو اسلامی حکومت میں رہتے ہیں اور اسلامی حکومت ٹیکس لے کر ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لے لیتی ہے۔ اسلامی حکومت ان سے جزیہ اس لئے لیتی ہے کہ ان کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوتی ہے اور ان کا خون محترم شمار ہو جاتا ہے، اس لحاظ سے ان سے لیا گیا جزیہ ان ہی پر خرچ ہوتا ہے۔

''صٰغِرُوْنَ'' سے مراد یہ ہے کہ وہ اسلامی طریقے اور اسلامی حکومت کے سامنے آکر جھکیں اور اسلامی حکومت کے عدل کے سامنے جھک کر جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے آگے صف باندھ کر ذلت کا سر جھکائیں۔ اس طرح وہ آزادانہ طور پر اپنے خرافاتی عقائد کی تبلیغ نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی اپنی نفسانی خواہشات اور میلانات کو رواج دے سکیں گے۔ اسلام میں جزیہ اسی لئے قرار دیا گیا ہے کہ دین حق کا غلبہ ظاہر کیا جائے، عدل کی روش قائم ہو۔ لہٰذا وہ اپنے دین کے مطابق عمل کرنے میں آزاد ہیں شرط یہ ہے کہ دینِ توحیدی کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے اور دین اسلام کے خلاف مزاحمت بھی ایجاد نہیں کریں گے۔ یہ عدل و انصاف کا اعلیٰ درجہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے متعلق وضع فرمایا ہے۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۞

''اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ

ان کی منہ کی باتیں ہیں، وہ کافروں کی سی باتیں بنانے لگے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں، اللہ انہیں ہلاک کرے، یہ کدھر الٹے جارہے ہیں"۔

یہود و نصاریٰ کے غلط عقائد

اس آیت میں یہود و نصاری کی سوچ کو بیان کیا گیا ہے اور ان کی مذمت کی گئی ہے۔ "عزیر" ایک شخص کا نام ہے جسے یہودی "عزرا" کہتے ہیں۔ اس نے دین یہود کی تجدید کی اور تورایت کی جو کتابیں بابل کے بادشاہ بخت النصر کے زمانے میں مکمل طور پر ختم ہو گئی تھیں، اس نے اُن کو اکٹھا کر کے ایک کتاب کی شکل دی۔ اسے اللہ کا بیٹا کہنا شاید ایک تشریفاتی لقب ہے نہ کہ نسبی۔ دوسری طرف مسیحیوں نے عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دے کر کفر کیا۔ ان کے اس عقیدے کے باطل ہونے کے متعلق سورہ آل عمران میں بحث گزر چکی ہے۔

بہرحال ان کے عقائد باطل ہیں اور ان کی زبان پر جاری ہونے والی گفتگو افتراء ہے۔ مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے بے حیثیت ہے۔ ان کی باتیں ان کافروں کی باتوں کے مشابہہ ہیں جو ان سے پہلے تھے جیسے ہندو، بت پرست، چین اور مصر قدیم کے بت پرست جو ثالوث نام کے ایک معبود کے قائل تھے۔ بہر صورت اہل کتاب کے خرافاتی عقائد بت پرستوں کے عقائد سے لیے گئے ہیں۔ آخر میں ان پر نفرین کی گئی ہے اور اس آیت کا اختتام اس پر ہوا ہے کہ خدا انہیں مارے، انہوں نے کس طرح حق کا چہرہ بگاڑ دیا اور اس سے منحرف ہو گئے اور باطل کے گرویدہ ہو گئے اور اس کی طرف چل پڑے اور حقیقت سے انحراف کر لیا۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

"انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کے سوا خدا بنالیا ہے اور مسیح مریم کے بیٹے کو بھی، حالانکہ انہیں حکم یہی ہوا تھا کہ ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے"۔

عیسائی علماء کی غلط سوچ

راہبان، راہب کی جمع ہے، وہ جس نے رہبانیت کا لباس پہن لیا ہے، ایسا لباس جس سے ظاہر ہو کہ وہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ یہ لفظ نصرانیوں کے عبادت گذاروں پر استعمال ہوتا ہے۔ "احبار" حبر کی جمع ہے اس کا معنی دانشمند عالم ہے لیکن یہ لفظ زیادہ تر یہودی علماء پر بولا جاتا ہے۔ اس بناء پر اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ یہودی علماء اور مسیحیوں کے بڑے عبادت گذاروں نے لوگوں کو اللہ کی اطاعت اور عبادت کی طرف بلانے کی بجائے یہود و نصاریٰ کو اپنی اطاعت کرانا شروع کر دی۔ یہود و نصاریٰ کے علماء اپنے آپ کو خدا کے قریب جانتے تھے اور یہودی اور مسیحی عبادت گذاروں سے بغیر قید و شرط کے اپنی باتیں منوانا شروع کر دیں۔ حالانکہ اللہ کے سوا نہ کسی کی عبادت جائز تھی اور نہ ہی کسی کی اطاعت صحیح تھی۔

مسیحیوں نے حضرت مریم کے بیٹے کو رب بنالیا اور ان کی عبادت شروع کر دی اور یہ جملہ جو انہوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے جبکہ مسیح تو حضرت مریم کے بیٹے ہیں وہ اللہ کی مخلوق ہے، وہ تو کسی کا بیٹا ہے وہ رب کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کو ایک خدا کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ کسی چیز کی عبادت کرنا اس کی ربوبیت کا عقیدہ رکھنے کے مساوی ہے۔ اور بغیر قید و شرط کے کسی کی اطاعت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے رب مانا جائے اور کسی کو بغیر کسی قید و شرط کے رب قرار دینا یہ خود اس کی عبادت کے مساوی ہے۔ کیونکہ رب وہی ہوتا ہے جو معبود ہوتا ہے۔ " لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ" سابقہ جملے میں بیان شدہ توحید کو کامل کر رہا ہے اور عبادت کو اللہ تعالیٰ کی

ذات سے مخصوص کر رہا ہے فقط اللہ کی عبادت ہو سکتی ہے اور کوئی عبادت کے لائق ہے ہی نہیں اور عبادت اسی کی ہوتی ہے جس میں کوئی نقص نہ ہو، کوئی عیب نہ ہو اور جو ہر عیب، نقص سے پاک ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہر طرح کے عیب و نقص سے پاک و منزہ ہے۔ یہود و نصاریٰ کی باتوں کا لازمہ اللہ تعالیٰ میں عیب و نقص کا ہونا ہے جس سے وہ ذات مقدس پاک و منزہ ہے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ مسیح رب ہے۔ نقل ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عدی بن حاتم کو دیکھا کہ اس کی گردن میں سونے کی صلیب ہے تو آپؐ نے اس سے کہا کہ کیا تم نصرانی ہو کہ جنہوں نے حرام چیزوں کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا تو اس نے کہا کہ نہیں تو حضرت نے فرمایا کہ جو تیرا عمل ہے وہ تو ہی بتا رہا ہے کہ تم نصرانی ہو۔

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿٣٢﴾

"چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں، اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا اور اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں"۔

دین کی بقاء کی ضمانت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ دین کا نور باقی رہے گا اور کوئی اسے ختم نہیں کر سکتا۔ "اِطفاء" آگ بجھانے یا نور اور روشنی کو بجھانے کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا کہ اہل کتاب کی یہ خواہش ہے کہ وہ اللہ کے نور کو جو کہ دین اسلام کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اپنی باتوں سے اس کا خاتمہ کریں جس طرح چھوٹے چراغ اور دیئے بجھا دئے جاتے ہیں۔ وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس کو بھی اسی طرح بجھا دیں۔ اس میں ان کی تحقیر ہے کہ وہ اس نور کو چھوٹا شمار کرتے ہیں کیونکہ منہ کی پھونک کے ذریعے

چھوٹے چراغ ہی کو بجھایا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی نور عالم افروز ہو تو اس کو منہ کی پھونک سے نہیں بجھایا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سوچ کو گھٹیا قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ کتنے کمزور ہیں کہ چاہ رہے ہیں اللہ کے دین کی روشنی کو ختم کردیں۔ جبکہ یہ نور عالم افروز ہے اور اللہ کا وعدہ ہے جو ضرور پورا ہونا ہے اور اللہ نے اسے کمال کی حد تک پہنچانا ہے۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾

"اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اسے سب ادیان پر غالب کرے اور اگرچہ مشرک ناپسند ہی کریں"۔

دین اسلام کا غلبہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کے غلبے کی بات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت دے کر بھیجا ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ دین اسلام کو باقی تمام ادیان پر غلبہ دے گا۔ "دین حق سے" دین اسلام مراد ہے جو حقیقت و واقعیت کے مطابق ہیں۔ خدا ہی وہ ذات ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو آیات و معجزات دیے اور اسے دین فطرت دے کر بھیجا جو انسان کی آفرینش کے مطابق ہے تاکہ یہ دین سارے ادیان اور ان تمام نظاموں پر غالب آجائے جو انسان کی نفسانی خواہشات کی پیداوار ہیں۔ اگرچہ مشرکین ایسا نہیں چاہتے۔ ان دو آیتوں میں حقیقت میں مومنوں کو اہل کتاب اور دین کے دشمنوں کے خلاف جنگ کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے۔

خداوند تبارک و تعالیٰ کا یہ ارادہ ہے کہ دین اسلام پورے عالَم میں منتشر ہو، اس کا لازمہ یہ ہے کہ اس کے لیے کوشش اور جدوجہد کی جائے، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ کر اس

ہدف کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ علمی، سیاسی اور اقتصادی حوالے سے ہر میدان میں اسلام کو غلبہ دینے کے لئے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ مسلمان اپنی توانائی کے مطابق کام کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت کا وعدہ موجود ہے اور اللہ نے طے کیا ہوا ہے کہ اس نظام کو دوسرے تمام نظاموں پر غلبہ دے۔ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے عمل کر یں۔ اللہ ان کا یاور ومددگار ہے۔ مسلمانوں کی سعی وتلاش سے ان کو علمی میدان میں بھی غلبہ حاصل ہوگا اور عملی میدان میں بھی یقیناً غلبہ حاصل ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

جبکہ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مسلمان ذلیل وخوار ہیں تو یہ مسلمانوں کی اپنی بدعملی کا نتیجہ ہے۔ لیکن انشاء اللہ وہ وقت آئے گا کہ یہی مسلمان جب خواب غفلت سے بیدار ہوں گے اور اسلام کی بالادستی کے لئے کام کریں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد آپہنچے گی اور حضرت امام مہدی علیہ السلام کی قیادت میں پورے عالم پر اسلام کا نفاذ ہوگا۔

پیغام: اسلام کے غلبہ اور اسلام کی بالادستی کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے اور اسلام کے پیغام کو عام کرنا چاہیے۔ بے عملی سے نکلنا چاہیے، صالحین کی جماعت بنانی چاہیے اور حالات بنائے جائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ذریعہ مسلمانوں کی عزت و حرمت رفتہ کو بحال کردے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳۴﴾

''اے ایمان والو! بہت سے عالم اور درویش لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی

راہ سے روکتے ہیں، اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے"۔

اللہ کی راہ میں رکاوٹ بننے والوں کی سزا

یہ آیت، آیت ۲۹ میں بیان شدہ مطالب کی مزید وضاحت ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہودی علماء اور مسیحیوں کے راہب اور عبادت گذاروں کا ایمان صحیح نہیں ہے۔ وہ خدا کے حرام کیے ہوئے کو حرام قرار نہیں دیتے اور دین حق کی پیروی نہیں کرتے۔ اب اس آیت میں ان کے غلط عقائد کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ یہودی علماء اور مسیحیوں کے راہب، لوگوں کے اموال میں ناجائز طور پر تصرف کرتے ہیں جو کہ محرمات الٰہی کو حلال کرنے کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ ہے کہ کسی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ اپنے زہد کو ظاہر کر کے لوگوں کے مال میں تصرف کرتے ہیں، سود کھاتے ہیں، رشوت لیتے ہیں اور اپنے مخالفین کے اموال کو غصب کرتے ہیں تاکہ اُن کے خلاف ناحق فیصلہ دیں۔ یا غلط فیصلہ دینے کے لئے لوگوں سے پیسے لیتے ہیں اور پھر اُن کو نجات کا پروانہ دیتے ہیں، پیسے لے کر بہشت کو بیچتے ہیں، حالانکہ یہ ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بہشت نیک اعمال کے نتیجے میں ملے گی پیسوں سے نہیں ملے گی۔

یا اس کا معنی یوں کریں کہ یہودی علماء اور مسیحی راہب سلاطین اور دولت مندوں سے پیسے لیتے تھے اور اس کے مقابلے میں اللہ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے تھے اور ان کے غلط اعمال کی تائید کرتے تھے یا غلط فیصلے دینے کے لیے رشوت لینا مراد ہے۔ ان کا ظلم اور تعدی اسی سے تھا کہ وہ لوگوں کی مغفرت اور ان کو بہشت کا وعدہ دے کر اس کے مقابلے میں مال لیتے تھے اور اس طرح اللہ کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرتے تھے۔ حکومت الٰہی کے سامنے رکاوٹ کھڑی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دینی عادلانہ حکومت قائم نہیں ہونے دیتے بلکہ

ظالم حکومتوں کے مددگار بنتے تھے۔ حکومت کا کام لوگوں کی اصلاح کرنا اور ان کی خوش بختی کے اسباب مہیا کرنا ہے، وہ اس پر توجہ نہیں دیتے تھے بلکہ حکمرانوں کی غلط کاریوں میں ان کی مدد کرتے تھے۔ وسائل اکٹھے کرکے دینداروں کے خلاف جنگ کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے جیسا کہ صلیبی جنگوں میں ایسا ہی ہوا، علماء نے کشور کشائی میں ظالم حکمرانوں کی مدد اور اُن کی تائید کی۔ یہ ہمیشہ اسی روش پر تھے اور آج بھی ہیں اور دین خدا میں کارشکنی کرنا اور دین کو اپنے مقاصد اور رجحانات کے لیے استعمال کرنا ان کا وطیرہ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ فساد اور انحطاط کا شکار رہا۔ اس طرح معاشرے کے لوگ پست حیوانی خواہشات اور پیٹ پوجا اور مادی مسائل میں سرگرم رہے۔ اسلام کے خلاف اس طرح کی کارشکنیاں اور سازشیں آج تک جاری وساری ہیں۔

پھر بتایا گیا کہ مال اندوزی اور ذخیرہ اندوزی فقط اہل کتاب سے مختص نہیں ہے بلکہ یہ ایک کلی مطلب کے طور پر بیان ہوا ہے جو ان مسلمانوں کو بھی شامل ہے جو سونا اور چاندی کے انبار لگاتے ہیں اور اسے ذخیرہ کرکے رکھتے ہیں اور لوگوں میں مال پھیلانے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور اقتصادی معاملات میں اسلام کے قوانین پر عمل نہیں کرتے۔ اس طرح سوسائٹی میں معاشی طور پر استحکام نہیں آتا اور یہ ذخیرہ اندوزی کرنے والے رکاوٹ بنتے ہیں اور بازار میں مہنگائی آتی ہے، خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور جب جہاد کے لئے کہا جاتا ہے اور دین کے مفاد اور منافع کی حفاظت کی بات کی جاتی ہے تو یہ لوگ اس میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں، اپنے اموال کو چھپاتے ہیں۔ اے ہمارے پیغمبر !انہیں خبر دو کہ تمہارے اموال دردناک عذاب کا موجب بنیں گے کیونکہ یہ لوگ فقط اپنے اور اپنی اولاد کے مفاد کی فکر میں ہیں۔ دینی معاشرہ اور دینی سوسائٹی کی ضروریات کو پورا کرنے کی فکر میں نہیں اور نہ ہی دینی سوسائٹی کو پروان چڑھانا ان کے مقاصد میں شامل ہے۔ اور یہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ پر مقدم سمجھتے ہیں اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے امر میں خیانت کرتے ہیں تو ان کے لئے سخت و

دردناک عذاب ہے۔

يَّوۡمَ يُحۡمٰى عَلَيۡهَا فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكۡوٰى بِهَا جِبَاهُهُمۡ وَجُنُوۡبُهُمۡ وَظُهُوۡرُهُمۡ‌ؕ هٰذَا مَا كَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡنِزُوۡنَ ﴿۳۵﴾

''جس دن اس مال کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس مال سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پشتیں داغی جائیں گی، یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا سو اس کا مزہ چکھو جو تم جمع کرتے تھے''۔

ذخیرہ اندوزوں کی سزا

یہ آیت ذخیرہ اندوزی کرنے والوں، مال چھپانے والوں اور معاشرے میں بے عدالتی اور کساد بازاری کا سبب بننے والوں کے متعلق ہے۔ اس دردناک عذاب کی خبر اس حوالے سے ہے کہ ان کے جمع شدہ سونا اور چاندی کو آتش جہنم میں گرم کیا جائے گا اور اس کے بعد یہی گرم شدہ سونا اور چاندی ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشت پر داغا جائے گا۔ ان سے ان پر نشان لگیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی اموال ہیں جو تم نے دنیا میں اکٹھے کئے تھے اب اس کا مزہ چکھو!۔

سونا چاندی اس لئے کہا گیا ہے کہ پرانے زمانے میں معاملات دینار و درہم سے کئے جاتے تھے۔ درہم اور دینار سونے اور چاندی کے تھے، آج کاغذ کے ہیں اگرچہ کاغذ کی قدر و ویلیو درحقیقت سونا و چاندی سے ہی بنتی ہے لیکن کرنسی کاغذ میں آگئی۔ پہلو، پیشانی اور پشت کا نام اس لیے لیا گیا ہے تاکہ اس سے اس بات کی جانب اشارہ کیا جائے یہ ہمیشہ پیسوں کے آگے جھکتے تھے اور سجدہ پیشانی سے کیا جاتا ہے۔ اس لیے ان کی پیشانی کو داغا جائے گا کیونکہ وہ لوگ پیسوں

کی پرستش کرتے تھے۔ پشت کا نام اس لئے لیا گیا ہے کیونکہ وہ پیسوں کو پشت و پناہ سمجھتے تھے، اسی لئے ان کی پشت کو داغا جائے گا۔ اور کیونکہ وہ پیسوں کو اپنا سہارا سمجھتے تھے اس لئے ان کے پہلوؤں کو داغا جائے گا۔ اسی حوالے سے ان کے یہی اعضاء گرم شدہ پیسوں سے داغے جائیں گے۔ اور یہ ان کی سزا ہو گی۔ آخر میں کہا گیا ہے کہ یہ وہی چیز ہے جس کو تم نے ذخیرہ کیا تھا اب اس کا مزہ چکھو۔ اپنے ہاتھ سے ہی اس کو تم نے آگے بھیجا تھا اس میں تمہارا اپنا ہی قصور ہے۔

پیغام: ذخیرہ اندوزی نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی سزا جہنم کا سخت عذاب ہے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾

"بے شک اللہ کے ہاں مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہیں اللہ کی کتاب میں جس دن سے اللہ نے زمین اور آسمان پیدا کیے، ان میں سے چار عزت والے ہیں، یہی سیدھا دین ہے، سو ان میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو، اور تم سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب تم سے لڑتے ہیں، اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے"۔

بارہ مہینوں کا تذکرہ

اللہ تبارک و تعالیٰ اس آیت میں فرما رہا ہے کہ سال کے مہینوں کی تعداد بارہ ہے اور مہینوں کی یہ تعداد اُس دن سے ہے جس دن سے آسمانوں اور زمینوں کو اللہ تعالیٰ نے خلق کیا۔

کتاب آفرینش اور تکوین میں یہی چیز شروع دن سے قرار دی گئی۔ زمین، سورج کے گرد اور چاند، زمین کے گرد حرکت کرتی ہے۔ زمین کی سورج کے گرد اور چاند کی زمین کے گرد حرکت کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح قرار دیا ہے کہ اس سے مہینوں کی تعداد وجود میں آتی ہے۔ اس سے مراد وہی قمری مہینے ہیں۔ اگرچہ شمسی سال کا حساب دقیق تر ہے لیکن قمری سال سارے لوگوں کے لئے جو دُورافتادہ ترین جگہوں پر رہتے ہیں اُن کے لئے بھی قابل استفادہ ہے۔ اس مطلب کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بارہ مہینوں میں سے چار مہینے محترم ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُمت اسلام میں اتفاق ہے کہ چار مہینے یعنی (۱) ذوالقعدہ (۲) ذوالحجہ (۳) محرم اور (۴) رجب ماہ حرام ہیں۔ یہ شمسی مہینے تو نہیں ہیں بلکہ قمری مہینے ہیں۔ ان چار مہینوں میں جنگ و قتال سے منع کیا گیا ہے۔

"حرام" ممنوع کے معنی میں ہے۔ "قیم"[1] اسے کہتے ہیں جو لوگوں کے معاملات کی اصلاح کے لئے اٹھتا ہے اور ان کے امور کی اصلاح کرتا ہے اور ان کی زندگی کے جتنے بھی معاملات ہیں اُن کی حفاظت اور نگہداری کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ دین قیم ہے یعنی اس میں چار قمری مہینوں کی حرمت کا حکم دیا گیا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ ایک ایسا دین ہے جو لوگوں کے فائدے اور ان کے مصالح کی ضمانت دیتا ہے۔ پھر اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔ یہ ظلم، جنگ اور معصیت اور گناہ سب کو شامل ہے۔ لیکن پچھلی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہاں پر ظلم سے جنگ اور قتال مراد ہے۔ ان چار مہینوں میں جنگ و قتال مت کرو۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان چار ماہ حرام میں جنگ و قتال ممنوع ہے۔ اس میں جنگ نہ

---

[1] ۔ شیعہ امامیہ کے نزدیک اس آیت کا باطنی معنی یہ ہے کہ بارہ مہینوں سے پیغمبر اکرم ﷺ کے بارہ جانشین اور بارہ خلفاء مراد ہیں جن کے توسط سے دین مضبوط ہوا اور دین کی اصلاح ہوئی۔ (ان میں چار محترم شخصیات وہ ہیں جن کے علی نام اور چار کے نام محمد ہیں)۔ (مصحح)

کی جائے، ایک دوسرے پر زیادتی نہ کی جائے۔ تاکہ عمومی طور پر امن رائج ہو اور لوگ مادی، معنوی اور عبادتی امور میں مصروف ہو جائیں۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے۔ آیت کے اس حصے سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جنگ کی حالت میں بھی پرہیز گاری اور تقویٰ کو مت چھوڑو اور حدود الٰہی سے تجاوز نہ کرو۔ اگر تم متقی بنو گے تو اللہ کی نصرت تمہارے شامل حال ہو گی۔[1]

ان مہینوں کی حرمت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہے۔ عرب ان مہینوں کے اوقات تبدیل کرتے رہتے تھے لیکن یہ طے شدہ مہینے ہیں یہ تبدیل نہیں ہو سکتے۔ پھر فرمایا کہ تمام مشرکین کے ساتھ جنگ کرو۔ کیونکہ وہ سب مل کر تمہارے کے خلاف جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس طرح وہ تمہارے خلاف جنگ کرتے ہیں تو تم بھی ان کے ساتھ جنگ کرو اور شرک اور فساد کی جڑ کو اکھیڑ پھینکو۔ یہاں مسلمانوں کو اس بات کی تشویق دلائی جارہی ہے کہ مل کر اُن کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے اٹھیں اور مقابلہ بمثل کریں، کفر ملت واحدہ ہے وہ متحد ہیں ان کا ہدف یہ ہے کہ دین اسلام جہاں بھی ہو ہر زمان و مکان میں؛ اسے نابود کیا جائے، تو تم بھی متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہو جاؤ اور مشرکین کا خاتمہ کر دو۔

إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَّ يُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِينَ ﴿۳۷﴾

”یہ مہینوں کا ہٹا دینا کفر میں اور ترقی ہے، اس سے کافر گمراہی میں پڑتے ہیں کہ اس مہینے کو ایک برس تو حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے برس اسے حرام رکھتے ہیں تاکہ

[1] ۔ شیعہ مفسرین نے اس آیت کو بارہ آئمہ معصومین علیہ السلام پر دلیل قرار دیا ہے، البتہ یہ اس کا باطنی معنی ہے۔ (مترجم)

ان بارہ مہینوں کی گنتی پوری کرلیں جنہیں اللہ نے عزت دی ہے پھر حلال کر لیتے ہیں جو اللہ نے حرام کیا ہے، ان کے برے اعمال انہیں بھلے دکھائی دیتے ہیں، اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں کرتا"۔

کافروں کی حرکات

اس آیت میں کفار کی اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزیوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ "نسِیء" کسی چیز کو موئخر کرنے یا دیر سے انجام دینے کے معنی میں ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ وہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار حرام مہینوں کو اپنی مرضی سے تبدیل کرتے تھے اور ہر مہینے کے ساتھ کسی چیز کی حرمت کو مختص کرتے تھے اور جس مہینے کی حرمت اٹھا لیتے تھے اس کو "نسِیء" کا نام دیتے تھے۔ یہ عمل ایک قسم کا اللہ کے احکام میں تصرف اور دخل اندازی تھی۔ عرب سارے کافر تھے لہٰذا خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس "نسی" کے عمل کو ان کے کفر کے اوپر اضافہ کا نام دیا ہے۔ حرام مہینوں کا مقصد یہ تھا کہ ان مہینوں میں ایک دوسرے کے ساتھ جنگ وجدل نہ کریں نہ کہ اس عمل "نسی" کے ذریعے حج کو موئخر کریں۔ یہ عمل ایک قسم کا عملی کفر تھا اور یہ عقیدتی کفر کے علاوہ تھا۔ یہ سبب بنتا تھا کہ کافر اس طریقے سے گمراہ ہوں اور دوسرے لوگ حلال و حرام مہینوں کو نہ پہچان سکیں۔

مشرکین مکہ اگرچہ حلال مہینوں کو حرام اور حرام مہینوں کو حلال کرتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے چار مہینوں کو حرام مہینوں کے طور پر قرار دیا ہوا تھا تاکہ اس طرح اپنے آپ کو ابراہیمی شریعت کے موافق بنا سکیں۔ یعنی وہ چار مہینوں کے محترم اور حرام ہونے کو مانتے تھے اور اس کا خیال بھی رکھتے تھے لیکن کون سا مہینہ ہے حرام مہینہ ہے؟ اس کو اپنی مرضی سے معین کرتے تھے تاکہ اپنی مرضی کے مطابق جنگ و غارت کریں اور ساتھ ساتھ چار مہینوں کی حرمت اور تحریم کی سنت کے بھی پابند رہیں۔ اس برے عمل کو شیطان نے ان

کے لئے جلوہ دیا تھا اور وہ اس عمل کو پسندیدہ جانتے تھے۔

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں کرتا یعنی ان کے فسق اور گناہ کی سزا ان کا گمراہی پر باقی رکھنا اور انہیں ہدایت نہ کرنا ہے۔ پس ان کا فسق اور ان کی تباہ کاری ان کا ہدایت سے محروم ہونے کا سبب ہے۔ یہ گمراہی شیطان کی وجہ سے ہے جس وقت شیطان دیکھتا ہے کہ اللہ کا ہدایت والا ہاتھ اس بندے کے سر پر نہیں ہے تو وہ بندے کے برے اعمال کو اس کے لیے خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے اور اسے گمراہ کرتا ہے۔ کافر کیونکہ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہدایت سے محروم تھے تو شیطان نے بھی ان کے لئے خوب ان کے برے اعمال کو خوبصورت بنا کر پیش کیا اور اُن کے دل میں ہدایت کے جو دلائل تھے ان کو موثر نہ ہونے دیا۔ اس طرح وہ شیطان کے ہاتھ میں اسیر اور گمراہ ہوئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٣٨﴾

''اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوا جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں کوچ کرو تو زمین پر گرے جاتے ہو، کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہو، دنیا کی زندگی کا فائدہ تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے''۔

دُنیا و آخرت کا تقابل

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے کوتاہی کرو گے تو اس کا مطلب ہے کہ تم دُنیا کو آخرت پر ترجیح دے رہے ہو۔ ''نفر'' کوچ کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں پر اس سے جہاد کی نیت سے سفر کرنا مراد ہے۔ ''متثاقل در زمین'' زمین پر

رہنے کا رجحان اور تمایل، جہاں پر موجود ہو وہیں پر رکے رہنا۔

یہ آیت در حقیقت ان لوگوں کے متعلق ہے جنہیں جب جہاد اور قیام کا حکم دیا جاتا تو وہ سستی اور کاہلی دکھاتے اور وہاں سے چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان سے کہا جارہا ہے کہ اے مومنو! جب ہمارا رسول ﷺ تم سے کہہ رہا ہے کہ جہاد کے لیے نکلو تو تم سستی کرتے ہو۔ گویا جہاد کا حکم تمہارے لیے نہیں ہے اور تم آخرت کی ہمیشہ رہنے والی زندگی کے بدلے دنیا کی عارضی زندگی کو کافی سمجھ بیٹھے ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے دنیاوی زندگی کی محبت اور دنیاوی لذات اور دنیاوی مال و متاع اور منافع کو آخرت پر ترجیح دی ہے۔ اور اسی جگہ ٹھہرنے کو پسند کرلیا ہے اور یہی راہ تمہیں اچھی لگ رہی ہے۔ تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے آخرت کی زندگی حقیقی اور زندگی جاوید ہے۔ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی مفادات، دنیاوی اور مادی زندگی اور دنیوی عیش و عشرت بہت ہی حقیر، معمولی اور ناچیز ہے ۔لہٰذا مومن کو جہاد کے لیے نکلنے کا جو امر ہوا ہے اس میں سستی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ سستی ایمان کے سست ہونے کی نشانی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا ایمان کمزور ہے۔ روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ یہ آیات جنگ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ کیونکہ اس جنگ میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم ہوا تو وہ جہاد کے لیے نکلنے میں سستی کر رہے تھے کیونکہ بہت دور جانا تھا تو اس آیت میں ان کو تنبیہ کی گئی ہے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾

"اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کرے گا اور تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

جہاد پر نہ جانے والوں کی مذمت

اس آیت میں مومنین کو سخت تنبیہ اور ان کی مذمت کی گئی ہے جو اللہ کے حکم کی اتباع نہیں کرتے اور جہاد کے لیے نہیں نکلتے اور جہاد پر جانے کے لیے سستی کرتے ہیں تو اللہ تعالی نے ان کو عذاب کا وعدہ دیا ہے۔ یہاں پر مطلق عذاب بیان ہوا ہے اس لیے اس سے فقط آخرت کا عذاب مراد نہیں ہے۔ کیونکہ جہاد کے امر میں سستی کرنا اور دشمنوں کو اپنے سے دور نہ کرنا مسلمانوں کی عزت بیچنے اور مسلمانوں کی عزت کا دفاع نہ کرنے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اگر تم جہاد کے لیے نہ نکلو گے تو اللہ تعالیٰ ایک اور قوم لے آئے گا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے گی، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے میں سستی نہیں کرے گی۔ یہ تمہارا برا عمل ہے کہ تم اللہ کی اتباع میں سستی کرتے ہو، تم عہد شکنی کر رہے ہو تو اس سے اللہ کو تو کوئی نقصان نہیں ہونا، یہ نقصان تو خود تمہارا اپنا ہے۔ اللہ کے اوامر کی اطاعت کروگے تو اس کا فائدہ خود تم ہی کو ہوگا۔ اللہ تعالی تو ہر امر پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ تمہیں عذاب دے اور تمہاری جگہ ایک اور قوم کو تمہارا جانشین بنادے جو جہاد کا عقیدہ رکھتے ہونگے اور دشمن خدا پر تابڑ توڑ حملے کریں گے اور کلمہ حق کو سر بلند کریں گے۔

اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ فَقَدۡ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذۡ اَخۡرَجَهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ثَانِىَ اثۡنَيۡنِ اِذۡ هُمَا فِى الۡغَارِ اِذۡ يَقُوۡلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا‌ ۚ فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَـتَهٗ عَلَيۡهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا السُّفۡلٰى‌ ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الۡعُلۡيَا‌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝٤٠

''اگر تم رسول کی مدد نہ کروگے تو اس کی اللہ نے مدد کی ہے جس وقت اسے کافروں نے نکالا تھا کہ وہ دو میں سے دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا تو غم نہ کھا بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اپنی طرف سے اس پر تسکین اتاری اور اس کی مدد کو وہ فوجیں بھیجیں جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو پست کر دیا، اور بات تو اللہ ہی کی بلند ہے، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے''۔

ہجرت کا واقعہ

مومنوں کو خطاب ہے کہ اگر تم پیغمبر ﷺ کی مدد نہیں کروگے تو خدا ان کی مدد کرے گا۔ ذرا اس وقت کو یاد کرو جب دشمنوں نے پیغمبرؐ کا احاطہ کرلیا تھا اور وہ پیغمبرؐ کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو اس وقت کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں تھا، روایات کے مطابق دو آدمی تھے ایک پیغمبر اکرم ﷺ اور ان کے ساتھ ابو بکرؓ تھے جو غار ثور پہنچے تھے۔ اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ تو کوئی تھا ہی نہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے ابو بکرؓ کو کہا کہ غم مت کھاؤ اور ڈرو مت۔ پیغمبرؐ نے ابو بکرؓ میں غم اور پریشانی کے حالات دیکھے تو ان سے خوف نہ کھانے کا کہا۔ یہ کس چیز کا خوف تھا؟ یہ تنہائی اور بے کسی، دشمنوں کی کثرت جو ان کے پیچھے آرہے تھے کا خوف تھا۔ اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ اس سے غم مت کھاؤ، اللہ ہمارے ساتھ ہے اور اللہ ہمیں دشمنوں پر غلبہ دے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے اطمینان اور سکون کو پیغمبرؐ پر اتار دیا اور فرشتوں کے ذریعے اپنے پیغمبرؐ کی مدد فرمائی اور فرشتوں نے آپؐ کو آپ کا پیچھا کرنے والوں سے مخفی کیا اور اللہ تعالیٰ نے کفر کی بات کو حقیر اور پست بنایا اور کفار اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جس طرح کفار کا وہ اتحاد بھی ان کے کسی کام نہ آیا جس میں انہوں نے متحد ہو کر

پیغمبر اکرم ﷺ کو قتل کرنے اور نور حق کو بجھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی بات بلند رہی اور اس کو برتری حاصل ہوئی۔ لہٰذا اب بھی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی نصرت، دین کی ہدایت اور دین کو پورا کرنے اور اس کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کے وعدے پر قادر ہے۔ وہ شکست ناپذیر اور حکیم ہے۔ وہ جو چاہتا ہے عمل کرتا ہے، اس میں اشتباہ نہیں کرتا اور اپنے اولیاء کو ذلیل اور خوار نہیں کرتا، ان کی مدد کرتا ہے جن کا حق ہے اسی کی مطابق ان کے لیے حکم جاری کرتا ہے اور اللہ کا کلمہ حق ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے اور کفر کا کلمہ ناکام ہوگا۔ عربی گرامر کے اعتبار سے "کفر" "جعل" کے مفعول کے طور پر منصوب ہے۔ جبکہ "کلمتہ اللہ" مبتداء ہونے کی بنا پر مرفوع ہے اور اس کا جعل کے فعل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔[1]

اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ وَ اَنۡفُسِكُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۱﴾

"نکلو تم ہلکے ہو یا بوجھل اور اپنے اموال اور جانوں سے اللہ کی راہ میں لڑو، یہ

---

[1] ۔ (جس رات پیغمبر اکرم ﷺ ابوبکر کے ہمراہ غار ثور میں تھے تو حضرت علیؑ پیغمبر اکرم ﷺ کے بستر پر سو رہے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ دشمن پیغمبر اکرم ﷺ پر حملہ کرکے آپؐ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس رات کو لیلۃ المبیت یعنی سونے کی رات کا نام دیا گیا ہے۔ یہ واقعہ مولا علیؑ کے لیے بے حساب فضائل کا موجب بنا اور مولا علیؑ بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ سوئے۔ جس طرح جنگ احد میں مولا علیؑ وہ واحد شخص تھے جو پیغمبر اکرم ﷺ کا دفاع کر رہے تھے۔ مشہور یہی ہے کہ غار ثور میں ابوبکرؓ پیغمبرؐ کے ہمراہ تھے۔ لیکن تاریخی حقائق میں یہ بات بھی موجود ہے کہ یہ دوسرے ابوبکر تھے۔ جبکہ ابوبکر بن ابی قحافہ اور حضرت عمر حضرت رسول ﷺ سے پہلے مدینے پہنچے ہوئے تھے اور مدینہ میں وہ آپؐ کا استقبال کرنے والوں میں شامل تھے۔ بنی امیہ کے دور میں اس واقعہ پر اس قدر تاکید کی گئی کہ دوسری خبر بالکل غائب ہو گئی اور اس خبر کو حضرت ابوبکر کی فضیلت کے طور پر بیان کیا گیا اور اسی کو ہی ذکر کیا گیا ہے کیونکہ شہرت اسی طرح کی ہے تو اسی کو ہی بیان کیا گیا ہے) (مترجم)

تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھتے ہو"۔

جہاد کا حکم

اس آیت میں حکم ہے کہ اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ اس راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ جہاد کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹیں درج ذیل امور میں سے کوئی ہو سکتی ہے: روزمرہ کی مصرفیات، مالی امور کی دیکھ بھال، خاندان، تعلق داری، وسائل اور راستے کا خرچ کا نہ ہونا۔ یہاں پر بتایا گیا ہے کہ دیکھو ہلکے یا بڑے وزن کے ساتھ جہاد کے لیے نکلو، بہانے تراشی مت کرو اور ان بہت ساری رکاوٹوں کو جنہیں تم دیکھ رہے ہو ان کی پرواہ نہ کرو اور اپنے آپ کو ان مصروفیات میں مشغول مت کرو بلکہ جس حالت میں ہو نکل کھڑے ہو اور حتی کہ اپنی جان اور مال سے بھی ہاتھ اٹھا لو۔ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ البتہ تمہارا جہاد قومی تعصب اور قبیلہ اور خاندان کے لیے نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی ریاکاری اور دیکھاوے کے لیے ہو بلکہ راہ خدا میں جہاد کرو۔ تمہیں معلوم ہو کہ جہاد کی مشقت تمہاری راحت اور سکون سے بہتر ہے۔ جہاد کے بہت بڑے فوائد ہیں جو جہاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے جن میں نفسانی اور دفاعی صلاحیتوں کی تربیت، دین کا استحکام اور دشمنوں کی نابودی شامل ہے۔ اس میں جہاد کی اہمیت بتائی گئی ہے کہ جہاد کے لیے نکلو اور اس میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرو۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

"اگر مال نزدیک ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تیرے ساتھ ہوتے لیکن انہیں

مسافت لمبی نظر آئی، اور اب اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم سے ہو سکتا تو ہم تمہارے ساتھ ضرور چلتے، اپنی جانوں کو ہلاک کرتے ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں"۔

سُست لوگوں کے بہانے

اس آیت میں ان لوگوں کا حوالہ ہے جو جنگ اور جہاد کے لیے نہیں نکلتے تھے۔ "عرض" جلد ختم ہونی والی چیز کو کہا جاتا ہے اور عام طور پر دنیا کے مال کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ "عرض قریب" کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی دنیاوی مال ملنا قریب ہوتا ہے تو پھر یہ لوگ آپ کے ساتھ فوراً چل پڑتے ہیں۔ "قصد" درمیانہ اور حد وسط کے معنی میں ہے۔ "سفر قاصد" ایسا سفر جو زیادہ دور کا نہ ہو۔ "شقة" سے مسافت مراد ہے کیونکہ مسافت طے کرنے میں مشقت اور سختی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جب انہیں دعوت دیتے ہو اور ان کو کوئی نقد مالی فائدہ نظر آرہا ہو یا کوئی فائدہ مل رہا ہو تو فوراً لبیک کہتے ہیں۔ لیکن جب انہیں طولانی اور دشوار گزار راستے کو طے کرنا ہو اور ان کو کوئی نقد فائدہ نظر نہیں آرہا تو اس میں سستی کرتے ہیں۔ یہ منافقوں کی حالت ہے۔ امت میں جو منافق تھے کہ ان میں ارادے کی کمزوری تھی، فیصلے کی کمزوری تھی۔ جنگ تبوک کا واقعہ اسی طرح پیش آیا کہ رسول خداصلى الله عليه وآله وسلم کے امر کی مخالفت کی گئی۔ جب آپ جنگ سے واپس آجاؤ گے تو قسم اٹھا کر کہیں گے کہ اگر توانائی ہوتی تو ہم بھی آپ کے ساتھ آجاتے وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کیونکہ مجبور تھے ہم میں توانائی نہیں تھی اتنا لمبا سفر طے کرنے کی ہم میں طاقت نہیں تھی اس لیے ہم جنگ میں شامل نہ ہوسکے۔ یہ اپنی بات اور اپنے عمل سے خود کو ہلاک کر رہے ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ وہ جو بہانے تراشیاں کر رہے ہیں وہ سب جھوٹ پر مبنی ہے۔ اور وہ جو قسم اٹھارہے ہیں جھوٹی قسم اٹھارہے ہیں۔ اللہ

تعالیٰ ان کے جھوٹ کی وجہ سے خود انہیں برباد کر دے گا۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

''اللہ نے تمہیں معاف کر دیا (لیکن) تم نے انہیں کیوں رخصت دی یہاں تک کہ تیرے لیے سچے ظاہر ہو جاتے اور تو جھوٹوں کو جان لیتا''۔

منافقوں کی حرکات

اس آیت میں ''اذن'' سے پیغمبرؐ کا ان کو جنگ پر نہ آنے اور اپنے گھروں میں بیٹھنے کی اجازت دینا مراد ہے۔ کیونکہ یہ جملہ استفہام کی شکل میں بیان ہوا ہے اس لیے اس میں سرزنش اور توبیخ کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر اس آیت کا معنی یہ ہو گا کہ اگر آپ ان کو اجازت نہ دیتے کہ وہ تیرے امر کی مخالفت کریں تو ان کا جھوٹ اور ان کی رسوائی روشن ہو جاتی۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ جو پیچھے رہ جانے والے جھوٹے اور منافق ہیں وہ تھوڑے سے امتحان سے رسوا ہو جائیں گے۔ حقیقت میں پیغمبر جو کہ اس آیت کے مخاطب ہیں ان کی وجہ سے ان کی حیثیت محفوظ رہی ہے اور وہ رسوا ہونے سے بچ گئے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدبیر میں کوئی کمزوری اور نقص نہیں تھا اور نہ ہی امر الٰہی میں آپ نے کوتاہی کی تھی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ان کو اجازت نہ دیتے تو بہت جلد ان کی مخالفت اور ان کا جھوٹ ظاہر ہو جاتا اور وہ رسوا ہو جاتے۔ پیغمبرؐ کے اجازت دینے کی وجہ سے ان کی رسوائی فوری طور پر ظاہر نہیں ہوئی۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾

''جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہیں وہ تم سے رخصت نہیں مانگتے اس سے کہ اپنے اموال اور جانوں سے جہاد کریں، اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے''۔

صاحبان تقویٰ

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے صاحبان تقویٰ جنہیں معلوم ہے کہ جہاد کا امر واجب ہے انہیں اجازت لینے کی ضرورت نہیں اور وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ جہاد سے پیچھے رہیں۔ منافق تقویٰ کی صفت سے عاری ہیں اسی لیے وہ اجازت طلب کرتے ہیں۔ ان کے دل میں شک و تردید ہے اس وجہ سے وہ اجازت مانگتے ہیں۔ لیکن متقین ایسے نہیں ہیں۔

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

''تم سے رخصت وہی مانگتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں سو وہ اپنے شک میں بھٹک رہے ہیں''۔

منافقوں کی حالت

یہاں پر منافقوں کی بات بتائی جارہی ہے کہ ان کا ایمان پختہ نہیں ہے، ان کا دل ایمان سے خالی ہے، وہ شک و تردید کی حالت میں ہیں اور حق پر ایمان نہیں لائے۔ وہ حیران اور سرگردان ہیں اسی لیے جہاد سے بچنے کے لیے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہمارے گھر میں مشکلات ہیں۔ وہ اس طرح جہاد سے بچنا چاہتے ہے اور جہاد پر نہیں جانا چاہتے اور آپ سے اجازت مانگتے ہیں۔ یہاں پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منافقوں کی

اصلیت سے آگاہ کیا جارہا ہے یہ تین چار آیتیں ۴۵، ۴۴، ۴۳، اور بعد والی آیتیں سب جنگ تبوک کے متعلق ہیں۔ ان آیات میں منافقین کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّ لٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

"اور اگر وہ نکلنا چاہتے تو اس کے لیے کوئی سامان ضرور تیار کرتے لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہ کیا سو انہیں روک دیا اور حکم ہوا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو"۔

جہاد میں سستی کرنے والوں کی سرزنش

"انۢبِعَاثَ" تیزی سے روانہ ہونے کے معنی میں ہے۔ "عُدَّةً" وسائل اور تجہیزات کو کہتے ہیں۔ "ثَبَّطَ" کسی ناپسندیدہ امر سے روکنا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منافقین کے اس دعوے کا جواب دیا ہے جس میں وہ کہتے تھے کہ اگر ہم میں توانائی ہوتی تو ہم بھی تمہارے ساتھ جہاد کے لیے آتے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اگر وہ جہاد کے لیے نکلنا چاہتے تو اس کے لیے کوئی سامان ضرور تیار کرتے اور خود کو جنگ کے لیے آمادہ کرتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور نہ ہی جہاد پر جانے کی تیاری کی۔ جو سفر پر جانا چاہتے ہیں وہ سفر کی تیاری کرتے ہیں۔ جہاد کے امر کو سننے کے بعد منافقین میں کوئی جوش وخروش نہیں تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جنگ کے لیے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

منافقین کی سزا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے ان کی یہ حرکت پسند نہیں تھی اسی لیے ان کو جنگ پر جانے سے روک دیا۔ اس کی وجہ ان کا نفاق اور ان کا فساد پھیلانے کا ارادہ تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں جہاد کرنے کی توفیق عطا نہیں کی۔ یہ ان کے نفاق کا بدلہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان

کو مومنین کے درمیان رہ کر فتنہ و فساد کرنے اور ان کے اتحاد کو تفرقہ میں تبدیل کرنے سے روکا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف اللہ کے رسول ﷺ اور مومنین کے لیے منت تھی۔ تکوینی طور پر (یعنی غیر تشریعی طور پر) انہیں امر ہوا کہ تم بھی عورتوں، بوڑھوں اور معذوروں کی طرح جنگ کی طرف نہ جاؤ اور بیٹھ جانے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ اس امر کا منبع اور سرچشمہ تمہارا خبیثِ باطن اور تمہارا شک و تردید اور تمہاری ناپسندیدہ نفسانی خصوصیات تھیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمہیں تکوینی طور پر یہ دستور دیا کہ تم بھی عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کی طرح جو جنگ پر جانے کی صلاحیت نہیں رکھتے جہاد پر نہ جاؤ اور بیٹھ جانے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ یہ تشریعی حکم نہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹھ جانے پر مکلّف نہیں کیا کیونکہ اس صورت میں یہ امر اللہ تعالیٰ کے اس امر کے ساتھ منافات رکھتا جس میں اللہ نے تمام مسلمانوں کو جہاد پر جانے کا حکم دیا تھا۔ اور یہ چیز ان کے جہاد میں شرکت نہ کرنے کے لیے اچھا بہانہ بن جاتا۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

"اگر وہ تم میں نکلتے تو سوائے فساد کے اور کچھ نہ بڑھاتے اور تم میں فساد ڈلوانے کی غرض سے دوڑے دوڑے پھرتے، اور تم میں ان کے جاسوس بھی ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے"۔

منافقوں کا رویہ

اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرما رہا ہے کہ اگر یہ منافقین آپ کے ساتھ جنگ کے لیے

آ بھی جاتے تو یہ مومنین کے درمیان فتنہ و فساد پھیلانے اور ان کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کے علاوہ تمہیں کوئی فائدہ نہ دیتے۔ "خبال" رائے کے باطل اور فاسد ہونے کے معنی میں ہے۔ "ایضاع" جلدی سے شر کی طرف جانے کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ منافقین اگر آپ کے ساتھ جنگ کے لیے آجاتے تو وہ فتنہ و فساد پھیلاتے اور تمہارے درمیان اختلاف و تفرقہ ڈالتے کیونکہ تمہارے درمیان ایسے افراد ہیں جو ان کی باتوں کو جلد مان جاتے ہیں اور ان کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ستمگاروں کی حالت سے آگاہ ہے، اس نے ان کے امر کو آشکار کیا اور ان کی بری نیت کی وجہ سے انہیں رسوا کیا۔

لَقَدِ ابۡتَغَوُا الۡفِتۡنَةَ مِنۡ قَبۡلُ وَ قَلَّبُوۡا لَكَ الۡاُمُوۡرَ حَتّٰى جَآءَ الۡحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمۡرُ اللّٰهِ وَهُمۡ كٰرِهُوۡنَ ﴿۴۸﴾

"یہ پہلے بھی فساد کے طالب رہے ہیں اور بہت سی باتوں میں تمہارے لیے الٹ پھیر کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ حق آ پہنچا اور اللہ کا حکم غالب ہوا اور وہ ناخوش ہی رہے"۔

منافقین کے فتنہ کی بات

اس آیت میں منافقین کی ایک اور حالت بیان کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ منافقین جنگ سے پہلے ہی منصوبہ بنا رہے تھے کہ تمہارے درمیان فتنہ پھیلائیں اور تفرقہ ڈال دیں۔ جیسا کہ جنگ احد میں عبداللہ بن ابی بن سلول نے لشکر اسلام کے ایک تہائی حصہ کو جنگ سے منصرف کر دیا اور انہیں مدینہ کی طرف واپس لوٹا دیا اور انہیں رسول اللہ ﷺ کی مدد کرنے نہیں دیا۔ جی ہاں یہ منافقین ہمیشہ رسول ﷺ کے خلاف معاملات کو الٹ پلٹ کر دیتے تھے۔ مسلمانوں کے درمیان اختلاف ڈالتے، معصیت اور گناہ کی طرف دعوت دیتے،

یہودیوں اور مشرکین کو مسلمانوں کی جاسوسی کرنے اور ان کے معاملات کو خراب کرنے پر بڑھکاتے تھے، تاکہ حق کامیاب نہ ہو۔ لیکن اللہ کا امر غالب آیا اور ان کی سازشیں ناکام ہوئیں اور اللہ نے اپنے دین کی برتری چاہی اور ویسے ہی ہوا اور مسلمان کافروں پر غالب آئے۔ اگرچہ کفار حق کے غلبہ اور حق کے ظہور سے ناخوش تھے لیکن خدا اپنے امر اور اپنے فیصلے کو غلبہ دیتا ہے۔

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّیۡ وَ لَا تَفۡتِنِّیۡ ؕ اَلَا فِی الۡفِتۡنَۃِ سَقَطُوۡا ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیۡطَۃٌۢ بِالۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۴۹﴾

"اور ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ مجھے تو اجازت ہی دیجیے اور فتنہ میں نہ ڈالیے، خبردار! وہ فتنہ میں پڑ چکے ہیں، اور بے شک دوزخ کافروں پر احاطہ کرنے والی ہے"۔

فتنہ میں پڑنے والے لوگ

کچھ منافق پیغمبرؐ کے پاس آکر کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ایک طرف بیٹھ جائیں اور جنگ کے لیے نہ جائیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں جنگی غنائم کی لالچ دلا کر جنگ پر مت لے جاؤ، یا جہاد پر لے جا کر ہمیں مشکل اور مصیبت میں نہ ڈالو۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ جو بات انہوں نے کہی ہے وہ عملی فتنہ، کفر، نفاق اور بد باطنی ہے اور شیطان نے انہیں دھوکہ، گمراہی اور نفاق میں ڈالا ہوا ہے اور وہ فتنہ کی بلند ترین حالت میں پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے لیے دنیاوی عذاب ہے، آخرت میں وہ جہنم کی آگ میں جھونک دئے جائیں گے۔ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں ہلاکت ہے۔ ممکن ہے اس سے یہ استفادہ ہو کہ جہنم ابھی بھی ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے جس طرح تجسم اعمال پر دلالت کرنے والی آیات اس بات پر دلالت کرتی

ہیں۔ نقل ہوا ہے کہ جد بن قیس کو پیغمبر اکرم ﷺ نے جنگ پر نہ آنے کی اجازت دی تھی کیونکہ اس نے آپ سے عرض کی تھی کہ اگر میں جنگ پر جاؤں گا تو بنی اسفر کی عورتوں کے مقابلے میں مقامت نہ کرسکوں گا اور ان کے مکر و فریب میں گرفتار ہو جاؤں گا۔

اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡكَ مُصِيۡبَةٌ يَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ يَتَوَلَّوۡا وَّهُمۡ فَرِحُوۡنَ ﴿۵۰﴾

''اگر تمہیں آسائش حاصل ہوتی ہے تو انہیں بری لگتی ہے، اور اگر کوئی مشکل پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو اپنا کام پہلے ہی سنبھال لیا تھا اور خوشیاں مناتے لوٹ جاتے ہیں''۔

کامیابی یا شکست پر منافقوں کا رد عمل

سیاق کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں ''حَسَنَة'' سے کامیابی، مال غنیمت، دشمن کو قیدی بنانا اور ان کو قتل کرنا مراد ہے اور اس کے مقابلے میں ''مُصِيۡبَة'' سے قتل ہونا، زخمی ہونا اور شکست کھانا مراد ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے فرمارہا ہے کہ اے پیغمبرؐ! یہ منافقین آپ کے بدخواہ ہیں اور یہ آپؐ کے لیے خیر و خوبی نہیں چاہتے۔ لہٰذا اگر جنگ میں آپ کو کامیابی ملے اور آپ کو غنیمت حاصل ہو جائے تو انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ اور اگر آپ شکست کھاؤ، زخمی ہو جاؤ یا آپ کے ساتھی مارے جائیں تو کہتے ہیں ہم نے پہلے ہی کہا تھا کہ جنگ پر جانے سے احتیاط کرنی چاہیے اور چوکنا رہنا چاہیے لیکن ہماری بات نہیں مانی گئی، ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس میں تکلیف ہوگی، نقصان ہوگا۔ لہٰذا اب جب تمہارا نقصان ہوا تو وہ خوشحال ہوئے ہیں کہ ان کو نجات ملی ہے اور آپ سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

قُلۡ لَّنۡ یُّصِیۡبَنَاۤ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ۚ ہُوَ مَوۡلٰىنَا ۚ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۱﴾

''کہہ دو ہمیں ہر گز نہ پہنچے گا مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا، وہی ہمارا کارساز ہے، اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ پر بھروسہ کریں''۔

منافقوں کی بات کا جواب

منافق پیغمبرؐ اکرم سے کہتے تھے اگر تم خدا کی طرف سے ہو تو پھر ظاہری وسائل تمہارے پاس کم تر کیوں ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کا جواب دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان منافقوں سے کہہ دو جو بھی حالات پیش آتے ہیں خواہ اچھے ہوں یا برے وہ سب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ ہمارے سارے امور کا اختیار اللہ کے پاس ہے، ان سب کی ولایت اور سرپرستی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ان ظاہری اسباب و وسائل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ ہمارا معاملہ اللہ کی طرف سے طے شدہ ہے تو ہم کیوں نہ جہاد کے متعلق اللہ کے حکم کی اطاعت کریں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت اپنا فیصلہ جاری کرے گا، اور یا ہمیں کامیابی دے گا یا کچھ اسباب کی وجہ سے ہمیں شکست کھانی پڑے گی۔ ہم نے اپنی ذمہ داری انجام دی ہے۔ اور اب ہم نے اپنے معاملات کی تدبیر اللہ کے سپرد کر دی ہے اور اسی پر توکل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کا سرپرست ہے ان پر لازم ہے کہ وہ اللہ پر توکل کریں۔ اپنے سارے امور اللہ کے سپرد کر دیں، اپنا معاملہ اس کے حوالے کریں۔ اگر ان کو کامیابی اور اچھائی ملی تو یہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے احسان اور مہربانی ہے اور اگر مصیبت آگئی تو وہ بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔

لہٰذا خواہ ہمیں کامیابی ملے یا شکست کھانی پڑے ہم اس سے ناراحت نہیں اور ہمیں

اس سے کوئی تکلیف بھی نہیں ہے اور نہ ہی ہم غمگین ہیں کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہے:

''مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ'' (سورۂ تغابن، آیت ۱۱)

ترجمہ: ''مصائب میں سے کوئی مصیبت اللہ کے اذن کے بغیر نازل نہیں ہوتی۔''

مصیبت کا اذن الٰہی سے آنا

البتہ یہ امر اس بات کے منافی نہیں ہے کہ اللہ نے انسان کو اختیار دیا ہے۔ ان اسباب کو استعمال میں لے آنا انسان کے اختیار میں ہے۔ جب انسان ان اسباب کو استعمال میں لے آتا ہے تو ان اسباب کا نتیجہ اللہ کی طرف سے طے شدہ ہے اور وہی ہونا ہے جو اللہ تعالیٰ نے طے کیا ہے، اس سے ہٹ کر نہیں ہونا۔ لہٰذا ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان جو عمل کرے گا اس کا نتیجہ ملے گا۔ اور یہ نتیجہ اللہ کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ اب اگر اللہ نے جہاد کا حکم دیا ہے تو ہم نے جہاد پر جانا ہے، جنگ لڑنی ہے اور اس جنگ میں اگر کسی کمزوری کی وجہ سے ہمیں شکست کھانی پڑے تو یہ شکست پہلے سے طے شدہ تھی۔ اور اگر ہمیں فتح و نصرت ملے تو یہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے ملی ہے۔ کیونکہ اس نے وہ اسباب ہمارے ہاتھ میں دیئے جو ہماری کامیابی کا سبب بنے۔

قُلۡ هَلۡ تَرَبَّصُوۡنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡدَى الۡحُسۡنَيَيۡنِ ؕ وَ نَحۡنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمۡ اَنۡ يُّصِيۡبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنۡ عِنۡدِهٖۤ اَوۡ بِاَيۡدِيۡنَا ۖ فَتَرَبَّصُوۡۤا اِنَّا مَعَكُمۡ مُّتَرَبِّصُوۡنَ ﴿۵۲﴾

''کہہ دو تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک کے منتظر ہو، اور ہم تمہارے حق میں اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ اپنے ہاں سے تم پر کوئی عذاب نازل کرے یا ہمارے ہاتھوں سے، تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں''۔

مومن کے لئے دو اچھائیوں میں سے ایک

"حُسْنَيَيْنِ" سے حسنہ اور نیکی یا مصیبت مراد ہیں، دونوں میں سے ایک ملنی ہے۔ اگر ہمیں ظاہری فتح ملے تو بھی ہمارے لئے اچھی اور اگر ظاہری طور پر ہمیں شکست ہوتی ہے تو بھی ہمارے لئے اچھا ہے۔ منافقین کیونکہ ان دو موارد میں سے ایک کے انتظار میں تھے جب کہ مومن کے لئے تو دونوں مورد ہی اچھے ہیں کیونکہ دونوں خدا کی جانب سے ہیں۔ دوست کی طرف جو کچھ ملے اچھا ہے اگر کامیابی ملے تو دنیاوی نیکی ہے اور اگر کامیابی نہیں ملے تو آخرت کا بڑا اجر ہے۔ اگر زخمی ہو جائیں یا قتل ہو جائیں تو شہادت اور اللہ کی رضا ملے گی، تکلیف اٹھائی ہے تو اللہ کی رضا میں اٹھائی ہے، جس کا ثواب دائمی اور بڑا اجر ملے۔ یہ دونوں مومن کے لئے حسنہ ہیں، دونوں اچھائیاں ہیں۔ لیکن منافقین کے لئے سوائے آسمانی عذاب یا ہمارے ہاتھوں سے جو عذاب ان کو ملا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ مومنین ہمیشہ کامیاب ہیں، جبکہ منافقین ہمیشہ نامراد ہیں، ان کے لئے عذاب الٰہی ہے۔ خواہ یہ عذاب الٰہی آخرت کا ہو یا خدا کے امر سے ہم منافقوں کو قتل کر دیں اور ان کو دنیا ہی میں عذاب ملے اور زمین کو ان کی نجاست سے پاک کر دیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ منافقین سے کہو تم بھی اپنے انجام کا انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۵۳

"کہہ دو تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا، بے شک تم نافرمان لوگ ہو"۔

منافقین کا انفاق، اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں

اس جگہ لفظ امر شرط کے عنوان سے آیا ہے۔ "طَوْعًا" او "کَرْهًا" سے تعمیم دینا مراد ہے۔ ہر صورت میں چاہے تم مرضی سے خرچ کرو یا بغیر مرضی کے دونوں صورتوں میں تمہارے خرچ کئے ہوئے کو اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔ تمہارا یہ عمل لغو، بے اثر اور بے فائدہ ہے کیونکہ یہ ظاہری عمل ہے اور حقیقت سے خالی ہے۔ تمہارے انفاق کے قبول نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تم لوگ فاسق ہو، گناہگار ہو اور اللہ کی بندگی کی حدود سے نکلے ہوئے ہو اور تمہاری روش عبودیت کی روش نہیں ہے لہٰذا تمہارے عمل پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ خداوند تبارک و تعالیٰ صرف متقین سے قبول کرتا ہے جو اللہ کا تقویٰ رکھتے ہیں، جو اللہ کے غضب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہوتے ہیں۔

"اللہ فقط اہل تقویٰ سے عمل کو قبول کرتا ہے فاسقوں کے عمل کو قبول نہیں کرتا"

(سورہ المائدہ آیت ۲۷)

اُن کے انفاق کی قبولیت کی ممانعت اس کے سوا نہیں تھی کہ انہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کا کفر کیا، نماز کو سستی کی حالت میں بجالاتے ہیں، مجبوری کی حالت میں انفاق انجام دیتے ہیں۔

وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ وَ لَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَ لَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾

"اور ان کے خرچ کے قبول ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا اور نماز میں سست ہو کر آتے ہیں اور

ناخوش ہو کر خرچ کرتے ہیں"۔

منافقین کے انفاق کی عدم قبولیت کی وجہ

اس آیت میں منافقین کے عمل اور ان کے انفاق کے قبول نہ ہونے کی شرح دی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے فسق کے مظاہر کو بیان کیا گیا ہے اور اس بات کی توضیح دی گئی ہے کہ یہ لوگ منافق ہیں اور اُن کے نفاق کے موارد ذکر ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اللہ اور اللہ کے رسول کا کفر کرتے ہیں۔ نماز کو بے توجہی سے اور سستی کی حالت میں انجام دیتے ہیں، ان کا انفاق رضایت اور خوشی سے نہیں ہوتا بلکہ کراہت اور ناپسندیدگی اور مجبوری کی حالت میں انفاق کرتے ہیں۔ جو عمل کر رہے ہیں اسے دل سے نہیں چاہتے، دکھاوے کے لئے کر رہے ہیں۔ ان کا یہ عمل اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے جب ان کا عمل دکھاوے کے لئے ہے تو ان کے قول و فعل میں تضاد ہے، ان کے دل میں نفاق بھرا ہوا ہے، ان کے دل میں نفرت ہے، اللہ کے احکام پر ان کا اعتراض ہے۔ لہٰذا اگر ان کے اموال اور ان کی اولاد کی کثرت تمہیں اچھی نہ لگے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ انہیں ان کی دُنیاوی زندگی کے وسائل کی وجہ سے ان کو سخت عذاب دے اور کفر کی حالت میں ان کی جان لے لے۔

فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ ۝۵۵

"سو تو ان کے مال اور اولاد سے تعجب نہ کر، اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں انہیں عذاب دے اور کفر کی حالت میں ان کی جانیں نکلیں"۔

منافقین کے مال و اولاد کی کثرت پر تعجب نہ کرو

"اعجاب" کسی چیز کے حسن و جمال یا اس کے اندر کوئی کمال دیکھ کر خوش ہونے کے معنی میں ہے۔ "زھوق" مشکل سے نکلنے کے معنی میں ہے اور عام طور پر یہ لفظ جان نکلنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ ظاہری خطاب پیغمبر اکرم ﷺ کو ہے لیکن حقیقت میں مومنوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ منافقین کی اولاد اور اموال کی کثرت پر شیفتہ نہ ہوں اور نہ ہی ان کو دیکھ کر تعجب کریں اور حیران ہوں۔ یہ سب کچھ ان کے لئے نعمت نہیں ہے بلکہ نقمت اور عذاب ہے اور یہ چیزیں انہیں شقاوت اور بدبختی کی جانب کھینچ کر لے جائیں گی۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت ملی ہوئی ہے اور تدریجاً یہ ہلاکت کی جانب جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مادی وسائل میں سرگرم کیا ہے تاکہ وہ ان مادی وسائل میں مشغول ہو کر اللہ کے ذکر سے غافل ہوں اور بندگی کی روش سے پھر جائیں اور یہی ان کے عذاب کا سبب ہے۔ جب ان کی موت کا وقت آجائے گا تو یہ کفر کی حالت میں دُنیا سے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی جان کفر کی حالت میں لے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دُنیاوی نعمات میں غرق ہو کر اللہ کی یاد سے غافل رہے۔

وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾

"اور اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ بے شک تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ایسی قوم ہے جو ڈرتے ہیں"۔

منافقین کی قسمیں

اس میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ منافقین جب تمہارے پاس آتے ہیں تو قسمیں اٹھا

کر کہتے ہیں کہ ہم تم میں سے ہیں، جبکہ وہ جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں کیونکہ وہ تم سے نہیں ہیں۔ "فَرِق" احتمالی ضرر سے پریشان ہونے کو کہتے ہیں، دل کی گھبراہٹ۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے منافقین قسم اٹھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ اُن کا دل منافقت کی وجہ سے یہ نہیں چاہ رہا ہوتا اور منافقت ان کے ہمراہ ہوتی ہے۔ جب وہ تمہارے ہاں آتے ہیں یا تمہارے ہاں سے جاتے ہیں تو ان کے دل میں منافقت ہوتی ہے جبکہ نفاق ایمان کے ساتھ اکٹھا نہیں ہو سکتا۔ ان میں ہمیشہ گھبراہٹ ہوتی ہے کہ ان کی دوروئی فاش نہ ہو جائے۔ وہ اپنی اس اندرونی کیفیت کو چھپانے کے لئے قسمیں اٹھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں حالانکہ ان کا باطن خراب ہے اور ان سے خیر کی کوئی توقع نہیں ہے۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَ هُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

"اگر وہ کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا گھسنے کی جگہ پائیں تو دوڑتے ہوئے ادھر جائیں"۔

منافقین کی کیفیت

"مَلْجَاً" پناہ لینے کی جگہ کے معنی میں ہے۔ "مَغَار" چھپنے کی جگہ یا غار کو کہا جاتا ہے۔ "مدَّخَل" ایسا راستہ جس سے گزرنا مشکل ہو۔ "جِماح" ادھر اُدھر دیکھے بغیر تیزی سے پلٹنے کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں منافقین کی کیفیت بتائی گئی ہے، یہ منافق ناچاری اور مجبوری کی وجہ سے آپ کے ساتھ دوستی کا اظہار کر رہے ہیں۔ باطن میں وہ تم سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر ان کے پاس فرار کی جگہ ہوتی یا کوئی غار ہوتا یا کوئی سوراخ ہوتا جہاں جا چھپ جاتے ہیں یا کوئی پناہ گاہ ہوتی تو وہ وہاں چلے جاتے اور آپ کا ذکر تک بھی نہ کرتے اور آپ کا ساتھ بھی نہ دیتے، آپ کو معلوم بھی نہ ہونے دیتے۔ اگر وہ تمہارے پاس ہیں تو اس کی وجہ

یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، اس لئے قسمیں اٹھا اٹھا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿٥٨﴾

"اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو خیرات میں تجھے طعنہ دیتے ہیں، سو اگر انہیں اس میں سے کچھ مل جائے تو وہ راضی ہوتے ہیں اور اگر نہ ملے تو فورًا ناراض ہو جاتے ہیں"۔

صدقات کی تقسیم کا معاملہ

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب صدقات تقسیم ہو رہے ہوتے ہیں تو منافقین کی صورتحال یہ ہوتی ہے کہ یہ بڑے غور سے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ ہمیں کچھ ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ مل جائے تو خوش ہوتے ہیں اور اگر نہ ملے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ "لمز" عیب جوئی، خردہ گیری اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اعتراض کرنا اور آنکھ سے اشارہ کرنے سے کنایہ ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ جب آپ منافقین کو صدقات نہیں دیتے تو وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے عدالت نہیں کی۔ لیکن اگر آپؐ انہیں کچھ دے دیتے تو خوشحال اور راضی ہو جاتے ہیں اور پھر حق اور عدالت اور دیانت کی بات نہیں کرتے۔ اور جب آپؐ ان کے استحقاق نہ رکھنے کی وجہ سے انہیں کچھ نہیں دیتے ہیں تو غصے میں آجاتے ہیں اور ناراض ہو جاتے ہیں، یہ ان کی کیفیت ہے۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۙ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

"اور کیا اچھا ہوتا اگر وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انہیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے، اور کہتے ہمیں اللہ کافی ہے وہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی، ہم اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں"۔

منافقوں پر طنز

"لَو" آرزو کے معنی میں آتا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ کیا اچھا ہوتا اگر وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انہیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے، اور کہتے ہمارے لیے اللہ کافی ہے وہ ہمیں اپنے فضل سے اور دے گا اور اس کا رسول بھی، ہم اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ آیت میں "ایتا" عطا کرنے کی نسبت اللہ اور رسول دونوں کی طرف دی گئی ہے جبکہ فضل کے کافی ہونے اور رغبت کو صرف اللہ کی جانب نسبت دی گئی ہے، یہ توحید کا لازمہ ہے کیونکہ مسبّب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے وہ چاہے تو تمام اسباب سے بے نیاز کر سکتا ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

"زکوۃ مفلسوں اور محتاجوں اور اس کا کام کرنے والوں کا حق ہے اور جن کی دلجوئی کرنی ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے قرض میں اور اللہ

کی راہ میں اور مسافر کو، یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے''۔

زکوۃ کے مصارف

یہاں صدقات سے مراد واجب زکوۃ ہے کیونکہ آخر میں فرمایا ہے یہ اللہ کی طرف سے تم پر فرض ہے۔ لہٰذا یہاں پر زکوۃ کے مصارف بیان کئے ہیں اور وہ آٹھ ہیں:۔

۱۔ فقراء۔ فقیر، نادار کو کہتے ہیں جو اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔

۲۔ مساکین: مسکین اسے کہتے ہیں جو اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا اس کے ساتھ بے چارگی کی حالت میں ہوتا ہے، بہت ہی بے حال ہے، اس کی حالت فقیر سے زیادہ بری ہوتی ہے۔

۳۔ عاملین: وہ لوگ جو زکوۃ وصول کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

۴۔ مؤلفۃ القلوب: وہ ہیں جن کو زکوۃ دے کر ان کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ مسلمان ہو جائیں یا کم از کم مسلمانوں کو ان کے دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھیں یا مسلمانوں کی بعض ضروریات کو پورا کریں۔ یا کمزور ایمان والے مسلمانوں کو اُن کے ایمان کی تقویت کے لیے زکوۃ دی جائے۔

۵۔ غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے زکوۃ صرف کی جائے۔

۶۔ غارمین: جو مقروض ہیں اپنی ضروریات کے لئے قرض لیا ہے اور اب قرضہ ادا نہیں کر سکتے تو ان کا قرض ادا کرنے کے لئے زکوۃ دے سکتے ہیں۔

۷۔ فی سبیل اللہ: یہ ایک عمومی مصرف ہے، ہر وہ چیز جس کا فائدہ اسلام اور مسلمانوں کو ہو جیسے اللہ کی راہ میں جہاد کرنا، سڑکیں بنانا، پل بنانا، ہسپتال بنانا، مسافر خانہ بنانا۔

۸۔ ابن سبیل: وہ افراد جو اپنے وطن سے دُور ہیں، پردیس میں ہیں، خالی ہاتھ ہیں، وطن میں

تو پیسے والے تھے لیکن پردیس میں خالی ہاتھ ہیں تو ان کو اتنی زکوۃ دی جائے کہ اپنے گھر واپس جا سکیں۔

زکوۃ کے یہ آٹھ مصارف ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ زکوۃ فرض ہے اور اللہ کی حکمت اور علم کی بنیاد پر اس کا قانون بنایا گیا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ منافقین اپنی مرضی سے اس کو بدل نہیں سکتے اور نہ ہی اس پر کوئی اعتراض کر سکتے ہیں۔

وَ مِنْهُمُ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ النَّبِیَّ وَ یَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ لَّكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ یُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۶۱﴾

"اور بعض ان میں سے پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص نرا کان ہے، کہہ دے وہ کان تمہاری بھلائی کے لیے ہے اللہ پر یقین رکھتا ہے اور مسلمانوں کی بات کا یقین کرتا ہے اور تم میں سے ایمان والوں کے حق میں رحمت ہے، اور جو لوگ رسول اللہ کو ایذا دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

نبیؐ کو اذیت دینے والے

کچھ منافقین نبیؐ پاک کو اذیت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ تو کان کی مانند ہے ہر ایک کی بات سنتا ہے، جو بھی ان سے کہہ دیا جائے وہ اسے قبول کر لیتے ہیں، اس کے متعلق سوچتے نہیں ہیں۔ اس آیت میں اللہ نے ان کا جواب دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ان کا کان ہونا تمہارے لئے بہتر ہے کیونکہ وہ ان چیزوں کو سنتا ہے جس میں تمہاری بھلائی ہوتی ہے، جیسے وحی الٰہی کو سنتا ہے، تمہاری اچھائی کی باتوں کو سنتا ہے اور وہ باتیں جو صحیح نہیں ہوتیں ان کو بھی سنتا ہے لیکن ان پر کان نہیں دھرتا اور تمہاری ہتک حرمت نہیں کرتا۔

اس کا خدا پر ایمان ہے اور مومنین کی تصدیق کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے آنے والی وحی کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ اس سے عام ہے کہ اُن کی بات کی تصدیق کرے یا نہ کرے۔ یہ مومنین کے لئے خیر کا سبب ہے۔ اسی طرح وہ مومنین کے لئے رحمت ہے کہ انہوں نے انہیں شقاوت اور ہلاکت سے نجات دی ہے اور انہیں فطرت کا راستہ دکھایا ہے اور ان کے لئے ایسا دین لایا ہے جو فرد کی بھی حمایت کرتا ہے اور معاشرے کی بھی حمایت کرتا ہے۔

اس آیت میں رحمت سے عملی اور فعلی رحمت مراد ہے عملی طور پر پیغمبر اکرمؐ کا وجود مومنین کے لیے رحمت ہے، مومنین اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن سورۃ انبیاء کی آیت : ۱۰۷ میں جو کہا گیا ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۷﴾

"اور (اے رسول) ہم نے آپ کو بس عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔

میں رحمت سے شانی رحمت مراد ہے یعنی آپ کی شان رحمت ہے دوسرے لفظوں میں پیغمبرؐ کا وجود ہی ایسا ہے کہ پورا عالم ان کے وجود کی رحمت سے فیضاب ہو رہا ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو پیغمبرؐ کو زبان یا ہاتھ اور پاؤں سے اذیت دیتے ہیں یا ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

يَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَكُمۡ لِيُرۡضُوۡكُمۡ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَحَقُّ اَنۡ يُّرۡضُوۡهُ اِنۡ كَانُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۶۲﴾

"تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کریں، اور اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرنا بہت ضروری ہے اگر وہ ایمان رکھتے ہیں"۔

خدا اور رسولؐ کی خوشنودی

یہاں پر اللہ تعالیٰ کے مقام ربوبیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے "یرضوھما" کے بجائے "یرضوہ" کہا گیا ہے۔ کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کے ہم سنگ نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہاں پر فرمایا گیا ہے کہ منافقین اللہ کی قسمیں اٹھاتے ہیں تاکہ مومنوں کو خوش کر سکیں اور ان کے دل موہ لیں۔ حالانکہ اگر ان میں ایمان ہوتا تو یہ بات زیادہ مناسب تھی کہ وہ ایسے کام کرتے جس سے اللہ اور اللہ کا رسول ان سے راضی ہو جاتے۔ کیونکہ ہر مومن پر واجب ہے کہ وہ اللہ او راللہ کے رسول کو خوشنود کرے، کسی اور کی خوشنودی ضروری نہیں۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی رضایت دوسروں کو راضی کرنے سے بہتر ہے، اوّلویت رکھتی ہے۔

اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّهٗ مَنۡ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیۡهَا ؕ ذٰلِكَ الۡخِزۡیُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۶۳﴾

"کیا وہ نہیں جانتے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے تو اس کے واسطے دوزخ کی آگ ہے اس میں ہمیشہ رہے گا، یہ بڑی ذلت و رسوائی ہے"۔

"محادّہ" مخالفت کرتے ہوئے تجاوز کرنا اور حد سے بڑھنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ دشمنی، مخالفت اور دوری کرنے کا ہم معنی ہے۔ یہاں پر استفہام تعجبی کی شکل میں لایا گیا ہے کہ یہ کس طرح نہیں جانتے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی دشمنی اور ان کو ناراض کرنے کا نتیجہ آتش جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہنا ہوگا؟ جب ایسا ہے تو ہر مومن پر لازم ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کو خوشنود کرے تاکہ خود کو بڑی رسوائی اور آتش جہنم سے نجات دلا سکے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ط قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾

''منافق اس بات سے ڈرتے ہیں کہ مسلمانوں پر کوئی ایسی سورۃ نازل ہو کہ انہیں بتا دے جو منافقوں کے دل میں ہے، کہہ دو ہنسی کیے جاؤ، جس بات سے تم ڈرتے ہو اللہ اسے ضرور ظاہر کر دے گا''۔

منافقین کی اندرونی کیفیت

منافقین جب بہت زیادہ سعی وتلاش کے باوجود اپنی پلید نیتوں اور اپنے بناوٹی اعمال کو پیغمبر سے مخفی نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سب کچھ پیغمبر اکرم ﷺ کو بتا دیتا تھا، کیونکہ منافقین کا وحی پر ایمان نہ تھا اس لیے وہ خیال کرتے تھے مومنین میں سے کوئی جاسوس ہے جو ان کی خبریں پیغمبر اکرم ﷺ کو بتاتا ہے، اور پیغمبر اکرمؐ انہیں قرآنی آیات کی شکل میں بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی اندرونی منافقت اور باطنی خباثت کے آشکار ہونے سے بہت خوفزدہ اور ہراساں رہتے تھے وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی ساری اندرونی خباثتیں آشکار ہو جائیں اور ان کی رسوائی اور ہلاکت کا سبب بنیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی ان پر حکومت تھی اور وہ کوئی بھی حکم ان کے بارے میں جاری کر سکتے تھے لہٰذا وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ کو ان کے کفر اور اسلام کے خلاف ان کی سازشوں کا پتہ چل جائے تو ان کے خلاف سخت قسم کا فیصلہ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو خطاب کیا کہ ان سے کہہ دو تم جتنا چاہو استہزاء کرو، اس جگہ استہزاء سے مراد ان کا نفاق اور وہ چیز ہے جسے وہ چھپانا چاہتے تھے اور اس کے آشکار ہونے سے ڈرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تعجیزی صورت میں بتایا ہے کہ تم جس قدر نفاق کرو اور اس کو چھپانا چاہو اللہ تعالیٰ اس کو برملا کرے گا، تم

جتنا چھپاؤ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے اسے ظاہر کردے گا اور اپنے رسولؐ کو باخبر کردے گا۔

وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوۡضُ وَ نَلۡعَبُ ؕ قُلۡ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوۡلِهٖ كُنۡتُمۡ تَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۶۵﴾

"اور اگر تم ان سے دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم یونہی بات چیت اور دل لگی کر رہے تھے، کہہ دو کیا اللہ سے اور اس کی آیتوں سے اور اس کے رسول سے تم ہنسی مذاق کر رہے تھے"۔

منافقین کی سرزنش

"خوض" پانی یا کسی مائع چیز کے اندر چلے جانے کے معنی میں ہے اور یہاں پر قابل مذمت اور برے کام کا اقدام کرنے سے کنایہ ہے۔ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ منافقین کے دل میں کوئی بدنیتی تھی اور وہ رسول خدا ﷺ کو قتل کرنے کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے۔ لیکن جب وہ اپنے منصوبہ میں کامیاب نہ ہوسکے اور ان کا منصوبہ فاش ہو گیا اور رسول ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم کیا کر رہے تھے؟ کہنے لگے ہم تو کھیل تماشہ میں مصروف تھے حالانکہ ایک مومن انسان یا وہ جو ایمان کا اظہار کرتا ہے وہ تو کھیل تماشہ کی تائید نہیں کرسکتا اور وہ بھی اس عمل کے حوالے سے جو اللہ اور اللہ کے رسول سے مربوط ہو۔ لہٰذا رسول ﷺ نے ان کو ڈانٹ پلائی اور کہا کہ تمہارا یہ عمل اللہ اور اللہ کی آیات اور اللہ کے رسول ﷺ کا مذاق اڑانا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے برے عمل کے لیے اس عمل سے زیادہ برا عذر پیش کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات اور اس کے رسولؐ کا مذاق اڑانا حقیقت میں کفر ہے۔

نقل ہوا ہے کہ منافقین میں سے ایک کہا کرتا تھا کہ قرآن کی کوئی سورۃ نازل نہیں ہوتی مگر یہ کہ ہم باطنی طور پر اسے جھٹلاتے تھے لیکن زبان سے اس کی تائید کرتے تھے۔ ہم

جب مومنین کو دیکھتے تھے تو ان کی بات کو قبول کر لیتے تھے۔ جب رسول خدا ﷺ ہم سے پوچھتے کہ تم کیا کر رہے ہو تو ہم کہتے تھے کہ ہم کھیل تماشے میں مصروف ہیں۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً ۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿٦٦﴾

”بہانے مت بناؤ ایمان لانے کے بعد تم کافر ہو گئے، اگر ہم تم میں سے بعض کو معاف کر دیں گے تو بعض کو عذاب بھی دیں گے کیونکہ وہ گناہ کرتے رہے ہیں“۔

منافقین کی بہانہ تراشیاں

اس آیت میں منافقین کو خطاب ہے اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ تمہاری بہانے تراشیاں اور تمہارے منصوبے بے ثمر ہیں۔ تمہارے کفر کے بارے میں ہمارے فیصلے کے بعد اب عذر پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ”تم ایمان کے بعد کافر ہوئے ہو“ اس سے مراد یہ ہے کہ تم جس ایمان کا اظہار کرتے تھے اس کے بعد کافر ہو گئے یا وہ کمزور ایمان جو تم میں تھا وہ بھی ختم ہو گیا اور تم کافر ہو گئے۔ اس کے بعد فرمایا اگر کچھ مصلحتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تم میں سے کچھ لوگوں کے گناہ سے درگزر کیا تو یقینی طور پر دوسرے گروہ کو اسی دنیا میں ہی سزا ملے گی کیونکہ وہ گناہ گار اور عذاب کے مستحق ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس آیت میں منافقوں کو عفو و درگزر کرنا، دین کے مفادات کے پیش نظر ان کو عذاب نہ دینے کے معنی میں ہے۔ ان کو معاف کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے توبہ کرنے کی وجہ سے ہم نے ان کو معاف کر دیا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ یہ آیت پیغمبر اکرم ﷺ کی بات کا تتمہ ہو اور عفو یا عذاب سے رسول خداؐ کی طرف سے ادب سکھانے کے لیے ان کو عذاب دینا

یا کچھ سے در گزر کرنا مراد ہو۔ لیکن بعد والی آیات کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو اللہ تعالیٰ کی ہے جو منافقین سے کہی گئی ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾

''منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس ہیں، برے کاموں کا حکم کرتے ہیں اور نیک کاموں سے منع کرتے ہیں اور ہاتھ بند کیے رہتے ہیں، وہ اللہ کو بھول گئے سو اللہ نے انہیں بھلا دیا، بے شک منافق وہی نافرمان ہیں''۔

منافقوں کی حقیقت

منافقین ایمان کو ظاہر کرنے اور کفر کو چھپانے اور اعمال کی خباثت میں ایک دوسرے کی مانند ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ واضح سی بات ہے کہ جب عمل کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں تو ان کی عاقبت بھی ایک جیسی ہوگی۔ ان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ منکر اور برائی کا حکم دیتے ہیں اور اچھائی سے روکتے ہیں، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے منع کرتے ہیں، خدا کی یاد سے غافل ہیں اور اللہ بھلایا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ فاسق ہیں اور عبودیت کی روش سے نکلے ہوئے ہیں، خدا نے بھی ان کو بھلا دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر کرنے والے بندوں کو جو ثواب عطا کیا ہے اس سے انہیں محروم کیا ہے۔ یہ لوگ حقیقی معنوں میں فاسق اور گنہگار ہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ هِیَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿ۙ۶۸﴾

"اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں کو دوزخ کی آگ کا وعدہ دیا ہے پڑے رہیں گے اس میں، وہی جہنم ان کے لئے کافی ہے، اور اللہ نے ان پر لعنت کی ہے، اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے"۔

کفار اور منافقین کا انجام

اگر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کافر کو منافق پر عطف کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ منافق بھی حقیقت میں کافر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جہنم کا وعدہ کیا ہے اور اپنے پلید اعمال کی وجہ سے وہ اسی کے لائق ہیں۔ ان کے لیے یہی سزا کافی ہے، یہ ایسی سزا ہے جو ان کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں ملے گی۔ خدا نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ ان کے لیے ایسا عذاب ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

كَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

"جس طرح تم سے پہلے لوگ تم سے طاقت میں زیادہ تھے اور مال اور اولاد میں

بھی زیادہ تھے، پھر وہ اپنے حصہ سے فائدہ اٹھا گئے اور تم نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا جیسے تم سے پہلے لوگ اپنے حصہ سے فائدہ اٹھا گئے اور تم بھی انہیں کی سی چال چلتے ہو، یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے، اور وہی نقصان اٹھانے والے ہیں"۔

منافقوں کا انجام گذشتہ اُمتوں جیسا

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آج کے دور کے منافقین گذشتہ امتوں کے ان افراد کی طرح ہیں جو تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ تھے اور ان کی اولاد اور ان کا مال بھی بہت زیادہ تھا، لیکن وہ اپنی کافرانہ طبیعت کے لحاظ سے آج کے دور کے منافقین جیسے تھے،انہوں نے بھی دنیاوی مفادات اٹھائے اور تم نے بھی دنیاوی لذتیں اٹھائیں، ہر ایک نے مال دنیا سے اپنا حصہ لیا اور اس سے بہرور ہوئے۔ تم نے جس طرح اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا اور خدا کی دعوت کو ٹھکرایا وہ بھی اسی طرح کرتے تھے۔ تمہارے اعمال دنیا اور آخرت میں انہی کے اعمال کی مانند باطل اور بے اجر ہیں اور ان کا کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ یہی بڑا نقصان اٹھانے والے ہیں۔ حالانکہ وہ تم سے زیادہ طاقتور تھے، ان کے اعمال بے ثمر ہوئے اور ان کی سعی و کوشش بے فائدہ ہوئی اور خدا کو راضی نہیں کر سکے، تم تو ان کی نسبت بے بس اور پست تر ہو لہٰذا تم بھی خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور خدا تمہیں بھی ان کی مانند دوزخ میں ڈال دے گا جہاں تم ہمیشہ رہو گے۔

اَلَمْ یَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِیْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝

"کیا انہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے تھے نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم کی قوم اور مدین والوں کی اور ان بستیوں کی خبر جو الٹ دی گئی تھیں، ان کے پاس ان کے رسول صاف احکام لے کر پہنچے، سو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے"۔

سابقہ اُمتوں پر آنے والے عذاب

اس آیت میں سابقہ اقوام کے حالات بیان ہوئے ہیں اور کہا جارہا کہ اے ہمارے رسولؐ! کیا ان منافقین نے سابقہ اقوام کی داستانیں نہیں سنی؟ قوم نوح نے حضرت نوحؑ کی بات نہیں مانی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں طوفان میں غرق کردیا۔ ہودؑ کی قوم، عاد کو اللہ تعالیٰ نے زندہ درگور کیا۔ صالحؑ کی قوم ثمود کو اللہ تعالیٰ نے زلزلہ کے ذریعے تباہ و برباد کردیا۔ قوم ابراہیم کے بادشاہ نمرود کو اللہ تعالیٰ نے قتل کیا اور ان سے نعمتیں چھین لی۔ خدا نے قوم شعیب کو بھی ہلاک کیا جو مدین میں رہتے تھے۔ کیا انہوں نے قوم لوط کی ویران کی گئی بستیوں کے بارے میں نہیں سنا کہ ان کو کس طرح اللہ تعالیٰ نے تباہ کیا؟ یہ وہ اقوام تھیں ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے رسول روشن دلیلیں لے کر آئے لیکن انہوں نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا۔ خدا نے ان کے اعمال کے سبب انہیں ہلاک کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کرنے میں ان پر کوئی ظلم نہیں کیا کیونکہ ان پر حجت تمام ہوچکی تھی، حق اور باطل، ہدایت اور ضلالت ان پر واضح ہوچکی تھی۔ وہ دنیاوی لذات میں اس قدر غرق تھے کہ اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے، اللہ کے رسول کو جھٹلاتے تھے۔اس بناء پر گویا انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا اور یہی چیز ان کی ہلاکت کا سبب بنی۔

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

''اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا، بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے''۔

مومنوں کا آپس کا تعلق

اس آیت میں مومنین کے آپس کے تعلق کے بارے گفتگو ہوئی ہے۔ سابقہ آیت میں منافقوں کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا اس آیت میں اس کے مقابلے میں مومنوں کے حوالے سے بات ہو رہی ہے۔ مومنوں کے اوصاف یہ ہیں کہ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ایک دوسرے کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے امور کو سنبھالتے ہیں۔ ان کا اللہ اور عقائد حقہ پر ایمان ہے۔ معاشرے کی اصلاح کے لئے وہ ایک دوسرے کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اپنے خالق سے رابطہ برقرار رکھنے کے لئے نماز قائم کرتے ہیں۔ اپنے اور اپنی نوع کے افراد کے درمیان تعلق اور ہمدردی کا اظہار کرنے کے لئے زکوۃ دیتے ہیں۔ ظاہر اور باطن میں ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت کرتے ہیں۔ اللہ کے احکام اور دستورات کی اطاعت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ اللہ کی طرف سے بیان

کیا ہے؛ اس پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔ معاشرے کی اصلاح کے لئے حضور پاک ﷺ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو عملی جامہ پہناتے ہیں جیسا جہاد کا حکم ہے یا جھگڑوں میں حضور پاک ﷺ کے فیصلے کی اطاعت کرتے ہیں۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ ان اوصاف کے حامل افراد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ محقق ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرے گا اور ان کو اپنی رحمت کے دائرے میں لے لے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی دلیل یہ ہے کہ اللہ عزیز اور غلبہ والا ہے اور سلطنت اسی کی ہے لہٰذا کوئی رکاوٹ اس کے حکم اور فیصلہ کے سامنے نہیں آسکتی۔ اللہ حکیم ہے لہٰذا اس کے کاموں اور فیصلوں میں اشتباہ، کمزوری اور سستی نہیں ہوتی اور اس کا کوئی بھی حکم بے ہدف اور بے مقصد نہیں ہوتا، اس کے تمام احکام بامقصد ہیں۔

پیغام: مومنوں کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہیے۔ ان کو چاہیے کہ نماز قائم کریں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کریں۔ اپنے تمام امور میں احکام الٰہی کی اطاعت کریں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے رسول کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کریں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ مَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍؕ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۠ ﴿۷۲﴾

''اللہ نے ایمان دار مردوں اور ایمان والی عورتوں کو باغوں کا وعدہ دیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور عمدہ مکانوں اور ہمیشگی کے باغات میں، اور اللہ کی رضا ان سب سے بڑی ہے، یہی وہ بڑی کامیابی

ہے"۔

ایمان کا ثمر

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں خواہ مرد ہوں یا عورتیں، اُن کو ان کے عمل کا بہترین اجر ملتا ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اُن کو بہشت میں داخل کیا جائے گا جہاں پاکیزہ محلات اور باغات ہونگے اور ان باغات کے نیچے نہریں جاری ہونگی۔ اللہ کی رضا بھی ان کے لئے ہے اور رضوان الٰہی تمام نعمات سے بالاتر ہے۔ رضوان الٰہی کا اندازہ لگانا انسان کے بس میں نہیں ہے، اس کے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ رضوان خدا کیا ہے؟ حقیقت میں یہ بہت بڑی کامیابی ہے کیونکہ بندگی کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ، اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اس کی پرستش کرے، اللہ کی عبادت بہشت کی لالچ یا دوزخ کے خوف میں نہ ہو، اور یہ حقیقی سعادت ہے۔ جو اللہ کا محب ہے اور اللہ کی رضا چاہتا ہے تو وہ پھر اللہ کے سوا کسی اور سے محبت نہیں کرتا، اس کا ہر کام رضائے الٰہی کے لئے ہوتا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ ایسے بندے کو جنتوں سے بھی بڑھ کر رضوان الٰہی عطا کرتا ہے۔ ظاہر ہے جنت تو ہر مومن کے لئے ہے کیونکہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ اگر کوئی جنت کی نیت سے یا جہنم کے خوف سے عمل بجالائے تو اس کا عمل ٹھیک ہے اور عبادت شمار ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت میں بھی اس نے اللہ کے حکم پر عمل کیا ہے۔ لیکن جو جنت کی خواہش یا جہنم کے ڈر سے عبادت نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے عبادت کرے تو اس کے لئے زیادہ اجر ہے اور رضوان الٰہی ایسے ہی افراد کو ملے گا۔

يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾

''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے لڑائی کر اور ان پر سختی کر، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بری جگہ ہے''۔

کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کا حکم

یہاں پر رسول پاک ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ کافروں اور منافقین کے خلاف سنجیدگی اور پوری کوشش کے ساتھ جہاد کرو۔ جہاد، انتہا درجے کی کوشش اور مقاومت کرنے کے معنی میں ہے، چاہے زبان سے ہو یا ہاتھ سے ہو یہاں تک کہ جنگ کی حالت پیش آجائے۔

قرآن میں جہاں بھی جہاد کا لفظ استعمال ہوا ہے تو اس سے جنگ مراد لی گئی ہے۔
کفار سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام کے خلاف علی الاعلان دشمنی کرتے ہیں اور اسلام کے مخالف ہیں۔

کفار کے ساتھ جہاد کا معنی

قرآن میں جہاں بھی جہاد کا لفظ آیا ہے اس سے فقط کافروں کے ساتھ جنگ مراد ہے۔ کیونکہ منافق مکاری اور دھوکہ دے کر مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو چکے ہوتے ہیں اور خود کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں لہٰذا ان کے ساتھ جنگ معنی نہیں رکھتا۔ لہٰذا جہاد ان کے ساتھ جنگ کے معنی میں نہیں ہوگا۔

منافقین کے ساتھ جہاد کا معنی

منافقوں کے ساتھ جہاد کا معنی اُن کی سازشوں کے خلاف اقدام کرنا ہے جیسا مصلحت کا تقاضا ہو ویسا ان کے ساتھ رویہ اپنایا جائے، ان کی سازشوں کا توڑ کیا جائے، اور اُن کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ پوری کوشش کرکے ان کی سازشوں کو ناکام بنایا جائے

جیسے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا روکا جائے، ان سے معاشرتی بائیکاٹ کیا جائے یا ان کو وعظ و نصیحت کی جائے یا ان کو شہر بدر کیا جائے اور اگر اُن کا مرتد ہونا عملی طور پر ثابت ہو جائے تو پھر ان کو قتل کر دیا جائے۔ ان کے ساتھ ویسا ہی رویہ اپنایا جائے جیسا جیسا وقت اور موقعیت کا تقاضا ہو۔ ان پر سختی کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے لئے کوئی نرمی نہیں ہونی چاہیے، ان کے مقابلے میں سخت رویہ اپنایا جائے۔ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور دوزخ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ اُن کے اعمال کے مطابق ہی ان کا اجر ہے جو ان کو جہنم کی شکل میں ملے گا۔ یہ افراد اسی سختی کے مستحق ہیں۔

ان کے خلاف جہاد کیا جائے، ان کے ساتھ نرمی نہ برتی جائے۔ اس آیت میں کفار اور منافقین دونوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ان دونوں کے بارے جہاد کا معنی مختلف ہو گا۔ کافروں کے خلاف جہاد جنگ کے معنی میں ہے جبکہ منافقوں کے خلاف جہاد ان کے خلاف سخت اقدام کرنے کے معنی میں ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَ مَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

"(وہ لوگ) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے ایسا نہیں کہا، اور بے شک انہوں نے کفر کا کلمہ کہا ہے اور مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو گئے ہیں اور انہوں نے قصد کیا

تھا ایسی چیز کا جو وہ نہیں پا سکے، اور یہ سب کچھ اسی کا بدلہ تھا کہ انہیں اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے دولتمند کر دیا، سو اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہے، اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو اللہ انہیں دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا، اور انہیں روئے زمین پر کوئی دوست اور کوئی مددگار نہیں ملے گا"۔

جھوٹی قسمیں اٹھانے والے مطلبی

اس آیت میں منافقین کے ایک برے عمل کا تذکرہ ہوا ہے جس کے وہ مرتکب ہوئے تھے۔ انہوں نے برا عمل انجام دینے کے بعد کوئی غلط بات بھی کی تھی جس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کی سرزنش کی تو انہوں نے اللہ کی قسم کھالی کہ ہم نے تو ایسا نہیں کہا۔ جیسا کہ آیت ۶۵ میں ذکر ہوا انہوں نے کہا کہ ہم تو کھیل کود میں مصروف تھے اور گناہ سے زیادہ بدتر عذر پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دونوں موارد پر جھٹلایا اور کہا کہ انہوں نے زبان پر کفر کا کلمہ جاری کیا اور سچ میں وہ کافر ہو گئے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے زبان سے اسلام کا اقرار کیا تھا اور مسلمانوں میں شامل ہوئے تھے لیکن اپنے اس عمل اور اپنی اس گفتگو کی وجہ سے وہ پوری طور پر کافر ہو گئے ہیں اور اسلام سے خارج ہو گئے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن جب وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوئے تو کہنے لگے ہم تو کھیل کود میں مصروف تھے۔ قسمیں اُٹھا کر کہنے لگے کہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: ان کا اس کینہ اور اس بدبختی میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انہیں تونگر کیا، انہیں امن کی نعمت دی، ان کو فراواں روزی نصیب ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے اچھی زندگی کے لیے حالات بنا دیے، آسمان و زمین کی برکات ان پر کھول دی گئیں، انہیں ہدایت دی گئی، لیکن اُنہوں نے اللہ کی ان ساری نعمات کا کفران کیا، الٰہی آیات کو جھٹلایا۔ آیت میں "مِنۡ

فَضْلِهٖ" کہا گیا ہے اللہ کے فضل سے، نہ کہ "مِنْ فَضْلِهِمَا" اللہ اور رسول کے فضل سے نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر فضل اللہ کی جانب سے ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فضل و کرم بھی حقیقت میں اللہ کی جانب سے ہے۔

اس کے بعد کہا گیا ہے کہ اگر یہ توبہ کرلیں تو اللہ کی بخشش ان کو بھی شامل ہو گی اور وہ بہشت جاوید میں جا پہنچیں گے۔ یقینی امر ہے کہ اسی میں ان کی خیر ہے۔ ان تمام برے اعمال کو انجام دینے کے بعد بھی اگر یہ لوگ توبہ کرلیں تو خدا انہیں معاف کر دے گا۔ توبہ کا دروازہ گناہگاروں کے لئے ہر وقت کھلا ہے۔ لیکن اگر توبہ نہ کریں اور منہ موڑ لیں تو دُنیا میں بھی انہیں سزا ملے گی اور پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف سے انہیں تنبیہ ہو گی یا استدراج الٰہی کا شکار ہوں گے۔ آہستہ آہستہ عذاب ان کو پہنچتا رہے گا۔ دُنیا کا کمترین عذاب یہی ہے کہ وہ اپنے نفاق کی وجہ سے اس کائنات کا جو نظام ہے اس میں چل رہے ہوتے ہیں جو نظام حق پر مبنی ہے اور سچ پر تنظیم ہوا ہے اور یہی سلسلہ کائنات کے علل و اسباب کا ہے یہی سلسلہ انہیں رسواء کرے گا اور وہ ذلیل ہوں گے اور دُنیا میں یہی عذاب ان کے لئے کافی ہے۔ اور آخرت میں اُن کے لئے دوزخ ہے اور پھر روئے زمین پر کوئی نہیں ہو گا جو اُن کی سرپرستی کرے اور ان سے وہ عذاب ٹال سکے، ان کا کوئی یاور نہیں ہو گا جو ان کی مدد کرے عذاب کا جو وعدہ دیا گیا ہے وہ ان سے دُور کر سکے کیونکہ ان کے عقائد اور اعمال غلط تھے اور عالم وجود کے سارے اسباب سے وہ کٹ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے باطل راستہ کا انتخاب کرلیا تھا تو پھر اسی کی ان کو سزا ملی ہے۔

پیغام: اللہ تعالیٰ کی بے حساب نعمات میں جب زندگی گزار رہے ہو تو منافقت نہیں کرنی چاہیے، جس چیز کا زبان سے اقرار کیا ہے دل سے بھی اس کو تسلیم کرلو اور اللہ کی اطاعت میں وقت گزارو۔ اللہ کی نافرمانی میں وقت نہ گزارو ورنہ اسی دنیا میں رہ کر اپنے لیے جہنم تیار کر رہے ہو۔

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰىنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۷۵﴾

"اور بعض ان میں سے وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے دے تو ہم ضرور خیرات کیا کریں گے اور ضرور نیکوں میں سے ہو جائیں گے"۔

اللہ سے عہد کرنے والے

یہ آیت ثعلبہ بن حاطب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ شخص حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا اور آپؐ سے درخواست کی کہ اللہ سے دعا کریں کہ اسے بہت زیادہ روزی عطا کرے۔ اس نے عہد کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے مال اور ثروت عطا کیا تو یقینی طور پر میں مساکین اور فقراء کو ان کا حق دوں گا اور زکوۃ بھی دوں گا اور نیک اور اچھے لوگوں میں سے ہوں گا۔ اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے اللہ سے عہد کیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اسکے لیے دعا کی تھی۔ اگلی آیت میں اس کا رویہ بتایا جارہا ہے۔

فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَ تَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۷۶﴾

"پھر جب اللہ نے اپنے فضل سے دیا تو وہ اس میں بخل کرنے لگا اور منہ موڑ کر اپنی بات سے پھر گیا"۔

عہد شکنی

اللہ تعالیٰ نے اسے مال دیا، دولت مند بنا دیا لیکن وہ اپنے پیمان کو بھول گیا، جب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے زکوۃ وصول کرنے والے اس کے پاس گئے کہ اس سے واجب

صدقہ لیں تو اس نے بخل کیا اور منہ موڑ لیا اور حکم زکوۃ قبول مہ کیا اور زکوۃ دینے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ زکوۃ بھی جزیہ کی مانند ٹیکس ہے اور ان دو میں کوئی فرق نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات سن کر فرمایا: اے ثعلبہ! وائے ہو تم پر۔

پیغام: اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب نعمت اور روزی فروان ہو تو مال و دولت سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے اس میں سے زکوۃ دینے میں کنجوسی نہ کی جائے، خمس جب واجب ہوا ہو تو خمس دینے میں بھی کنجوسی نہ کی جائے۔ اللہ کی طرف سے جو مالی واجبات ہیں ان کو ادا کیا جائے۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾

"تو نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اس دن تک جب اللہ سے ملیں گے اس لیے کہ انہوں نے جو اللہ سے وعدہ کیا تھا اسے پورا نہ کیا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے"۔

منافقت اور جھوٹ کی سزا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے پلید اور غلط اعمال کی سزا کی جانب اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جو بخل کرے اور اللہ سے کیئے گئے وعدے کو پورا نہ کرے اور جھوٹ بولے تو جس دن تک وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا یا اپنے بخل کے نتیجہ کو دیکھے گا اور بخل کی جزا اس کے سامنے ہو گی اللہ تعالیٰ اس کے دل میں منافقت ڈال دے گا اور یہ منافقت اس کی موت تک جاری رہے گی اور اس منافقت کی حالت میں رہنا بھی ایک قسم کا اللہ کی طرف سے عذاب ہے جو اسے اسی دُنیا میں ملے گا۔

اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ سِرَّہُمۡ وَ نَجۡوٰىہُمۡ وَ اَنَّ اللّٰہَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ﴿ۚ۷۸﴾

''کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ان کا بھید اور ان کا خفیہ مشورہ جانتا ہے اور یہ کہ اللہ غیب کی باتیں جاننے والا ہے''

علم الٰہی

اس آیت میں جو استفہام ہے وہ استفہام توبیخی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے آگاہ ہے؟ یہ جو کام کرتے ہیں خواہ چھپ کریں یا آشکار ،اللہ ان کے سب اعمال سے آگاہ ہے۔ کون سی چیز ہے جس سے اللہ آگاہ نہیں ہے۔ کیا انہیں پتہ نہیں کہ اللہ علام الغیوب ہے تمام غیبی امور سے اللہ آگاہ ہے، پوشیدہ امور سے بھی آگاہ ہے۔ کوئی امر اللہ کے لیے پوشیدہ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کے اندرونی اور باطنی نفاق سے بھی آگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دوروںی اور ان کی سب سازشوں کو جانتا ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر یہ اپنی خفیہ کاریاں اور مخفیانہ سازشیں کس سے چھپاتے ہیں؟

پیغام: اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ جو بھی عمل کرتا ہے،اسے پتہ ہونا چاہیے کہ اللہ اس سے آگاہ ہے اور اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ کونسی جگہ ہے کہ جہاں اللہ موجود نہیں ہے؟ لہٰذا اس کی نافرمانی نہیں کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ سے حیاء کرنی چاہیے۔ جو گناہ کرتے ہیں حقیقت میں وہ بے حیاء ہوتے ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ یَلۡمِزُوۡنَ الۡمُطَّوِّعِیۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ اِلَّا جُهۡدَهُمۡ فَیَسۡخَرُوۡنَ مِنۡهُمۡ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنۡهُمۡ ۫ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۷۹﴾

"وہ لوگ جو ان مسلمانوں پر طعن کرتے ہیں جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی محنت کے سوا طاقت نہیں رکھتے پھر ان پر ٹھٹھا مذاق کرتے ہیں، اللہ بھی ان سے ویسا ہی کرتا ہے جیسے وہ کرتے ہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے"۔

راہ خدا میں صدقے دینے والے

"تطوع "رضاکارانہ عمل اور ایسا مستحب عمل جسے انسان اپنی مرضی سے انجام دیتا ہے۔ اس آیت میں کہا جارہا ہے کہ وہ لوگ مالدار مومنین کا مذاق اڑاتے ہیں جو رضاکارانہ طور پر زکوۃ دیتے ہیں اور ان مومنین کا بھی مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس زکوۃ یا صدقہ دینے کیلئے مال کم ہوتا ہے تو خدا بھی ان کے ساتھ ویسا ہی رویہ اپنائے گا۔ زکوۃ دینے والوں کی عیب جوئی کرنے والوں کے لیے سخت اور دردناک عذاب ہے۔ منافق خود بھی راہ خدا میں کچھ نہیں دیتے اور جو مالدار مومنین رضاکارانہ طور پر زکوۃ دے رہے ہوتے ہیں ان کے متعلق بھی باتیں بناتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور جن کی مالی پوزیشن کمزور ہے وہ بھی زکات دے رہے ہوتے ہیں تو ان پر بھی اعتراض کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد کے لیے دردناک عذاب کا وعدہ دے رکھا ہے۔

پیغام: اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کا مذاق نہ اڑایا جائے چاہے تھوڑا خرچ کریں، بلکہ صدقہ وخیرات اور مالی واجبات ادا کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ان کے لئے اللہ کی

طرف سے انعامات ہیں۔ دُنیا میں بھی ان کا خرچ کرنا رزق میں اضافے کا سبب بنے گا اور آخرت میں بھی بڑا اجر ملے گا۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

"تو ان کے لیے بخشش مانگ یا نہ مانگ اگر تو ان کے لیے ستر دفعہ بھی بخشش مانگے گا تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا، یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا کفر کیا ہے اور اللہ نافرمانوں کو راستہ نہیں دکھاتا"۔

منافقین کے لیے استغفار کا کوئی فائدہ نہیں

اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ جنہوں نے جرم کیا ہے ان کے لیے آپؐ کا استغفار کرنا کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ ان لوگوں کے لیے آپ کا استغفار کرنا یا استغفار نہ کرنا برابر ہے، کیونکہ آپ کا ان کے لیے استغفار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پیغمبرؐ کبھی بھی بے ہودہ اور بے فائدہ عمل نہیں کرتے جبکہ وہ جانتے ہیں کہ منافقین کو بخشا نہیں جائے گا اور وہ ہدایت نہیں پائیں گے تو پھر کبھی بھی ان کے لیے طلب مغفرت نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امر کی تاکید کے لیے فرمایا ہے کہ اگر آپؐ ستر بار بھی ان کے لیے مغفرت کی درخواست کرو گے تو خدا ان کو معاف نہیں کرے گا۔ اور آپ کا ان کے لیے استغفار کرنا بے اثر ہو گا، ان کو مغفرت نہیں ملے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل فاسد ہو چکے ہیں۔ ان کا ٹھکانہ معین ہو چکا ہے۔ ان کا کفر ان کی مغفرت کی راہ میں رکاوٹ بنا ہے کیونکہ جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا کفر کرے اسے استغفار کرنے سے مغفرت نہیں مل سکتی چاہے

مغفرت کی درخواست کی پیغمبر ہی کیوں نہ کرے۔ انہوں نے بندگی کی روش چھوڑ دی ہے اور وہ فاسق ہو گئے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ ہر گز انہیں معاف نہیں کرے گا اور انہیں ابدی سعادت کی ہدایت بھی نہیں دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت عین بہشت ہے اور یہ اپنے اعمال کی وجہ سے بہشت سے محروم ہو چکے ہیں۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

"جو لوگ پیچھے رہ گئے وہ رسول اللہ کی مرضی کے خلاف بیٹھ رہنے سے خوش ہوتے ہیں اور اس بات کو ناپسند کیا کہ اپنے اموال اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کہا کہ گرمی میں مت نکلو، کہہ دو کہ دوزخ کی آگ کہیں زیادہ گرم ہے، کاش یہ سمجھ سکتے"۔

جہاد پر نہ جانے والے منافقین کی سرزنش

اس آیت میں ان منافقین کی بات کی گئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جہاد کے لئے نہیں گئے اور اس عمل میں رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی اور اس مخالفت پر خوش بھی تھے، وہ اپنی جان اور مال راہ خدا میں خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، اسی لئے پیچھے رہ گئے۔ وہ نہ صرف خود جہاد پر جانے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ دوسروں کو بھی جہاد پر جانے سے روکتے تھے۔ کبھی کہتے تھے ابھی تو سخت گرمی ہے اس گرمی میں جہاد کے لئے نہ جاؤ، اس طرح وہ اسلام کی قوت کو کمزور کر رہے تھے اور ان کا مقصد رسول اللہ ﷺ کو شکست دینا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے رسول خدا ﷺ سے فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ تم خیال کرتے ہو کہ جہاد پر نہ جا کر

تم گرمی کی تپش سے نجات پالو گے؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے اس عمل کی وجہ سے جہنم کی جو آگ تمہارے لئے تیار کی گئی ہے اس کی تپش اس گرمی سے بہت زیادہ ہے۔ اگر تمہیں یہ خبر ہوتی تو پھر تم جہاد سے پیچھے نہ رہتے۔ لفظ "لَو" تمنا اور آرزو کے لئے ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تعقل اور فہم کی کوئی اُمید نہیں ہے۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

"سو وہ تھوڑا سا ہنسیں اور زیادہ روئیں، یہ بدلہ ہے ان کے اعمال کا جو وہ کرتے رہے ہیں"۔

کم ہنسنا اور زیادہ رونا

کم ہنسنے سے دُنیا کی ناپائیداری اور فانی خوشی مراد ہے جو جہاد پر نہ جانے اور جہاد سے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ان کو ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ منافقین اس عارضی خوشی پر خوشحال نہ ہوں۔ زیادہ رونے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے عذاب کو یاد کرکے روئیں کیونکہ دوزخ کے عذاب اور وہاں کی شدید ترین گرمی اور تپش کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے یہی اعمال ان کے جہنم جانے کا سبب بنیں گے۔ اپنے ان اعمال کو مد نظر رکھ کر وہ روئیں کہ ہم نے کون سے غلط اعمال انجام دیے کہ جس کی وجہ سے ہمیں اتنی بڑی سزا ملے گی۔ لہٰذا خوش کم ہوں اور زیادہ روئیں کیونکہ آخرت میں ان کو ان کے عمل کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا اور ان کو ان کے اعمال کی سزا ملنی ہے۔ لہٰذا اس سزا کو یاد کرکے انہیں رونا چاہیے، خوش نہیں ہونا چاہیے۔

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ

لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ ﴿۸۳﴾

''سو اگر تجھے اللہ ان میں سے کسی فرقہ کی طرف پھر لے جائے پھر تجھ سے نکلنے کی اجازت چاہیں تو کہہ دو کہ تم میرے ساتھ کبھی بھی نہ نکلو اور میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے مت لڑو، تمہیں پہلی مرتبہ بیٹھنا پسند آیا سو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو''۔

جنگ میں نہ جانے والوں کی بات

اس آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت جنگ تبوک کے متعلق ہے، جب پیغمبر اکرم ﷺ جنگ تبوک سے واپس مدینہ منورہ تشریف لا رہے تھے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان سے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ تجھے مدینہ واپس لے آئے اور وہ لوگ جو جہاد پر نہیں آئے تیرے پاس آئیں اور کہیں کہ ہمیں بھی جہاد کے لئے نکلنے کی اجازت دیں تو ان سے کہو کہ نہیں! تمہیں جہاد میں حاضر ہونے کا شرف نہیں ملے گا۔ کیونکہ اس سے پہلے جب تمہیں غزوہ تبوک کے لیے بلایا گیا تھا تو تم جہاد کے لیے نہیں نکلے۔ لہٰذا اس کے بعد بھی تمہیں ہرگز جہاد کے لئے نہیں لے جایا جائے گا۔ اور تم کبھی بھی میری سربراہی میں دشمن کا سامنا نہیں کرو گے۔ کیونکہ خداوند تبارک و تعالیٰ اپنے دین کی نصرت کا شرف اور افتخار ہر ایک کو نہیں دیتا۔ اب تم عورتوں، بیمار لوگوں اور چھوٹے بچوں کی طرح پیچھے رہنے والوں اور بیٹھنے والوں کے ساتھ رہو۔ ایک احتمال یہ ہے کہ ''خالفین'' سے وہ لوگ مراد ہوں جو بغیر کسی عذر کے جہاد پر نہیں گئے۔ کچھ مفسرین کے ''خالفین'' سے فسادی (فتنہ پھیلانے والے) مراد لیا ہے، جیسا کہ تفسیر المنار جلد ۱۰ میں ذکر ہوا ہے۔

وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾

''اور ان میں سے جو مر جائے کسی پر کبھی نماز نہ پڑھ (مرنے کے بعد ان کے لئے دعا نہ کرنا) اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہو، بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا اور نافرمانی کی حالت میں مر گئے''۔

منافقین کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کا حکم

اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ منافقین کی نماز جنازہ نہ پڑھائیں اور ان کے لئے دعا بھی نہ کریں۔ اس کی وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ انہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کا کفر کیا ہے اور اس کی بندگی سے عدول کیا ہے اور نفاق و فسق کی حالت میں مرے ہیں۔ لہٰذا ان کے احترام کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ ان کی قبر پر جا کر کچھ نہیں پڑھنا چاہیے، ان کے لئے استغفار بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان کے لئے استغفار کرنا بے فائدہ ہے۔ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مومنین کے جنازے پر نماز پڑھتے تھے اور ان کی قبروں پر بھی جاتے تھے اور ان کے لئے طلب مغفرت بھی کرتے تھے۔ منافقوں کے لئے ایسا کرنے سے آپؐ کو روک دیا گیا ہے۔

وَ لَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

''اور ان کے اموال اور اولاد سے تعجب نہ کرو، اللہ یہی چاہتا ہے کہ انہیں ان چیزوں کے باعث دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں نکلیں ایسے حال میں کہ وہ کافر ہی

ہوں"۔

مال واولاد کی کثرت پر تعجب نہ کرو

اس آیت کی تفسیر اسی سورہ کی آیت ۵۵ کی مانند ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا ہے کہ منافقین کی دُنیاوی نعمات کو دیکھ کر حیرت میں نہ پڑیں اور نہ ہی تعجب کریں۔ خدا نے ارادہ کیا ہے کہ ان نعمتوں کی وجہ سے ان کو عذاب دے کیونکہ یہ نعمت کا شکر بجالانے کے بجائے کفرانِ نعمت کرتے ہیں اور یہی چیز ان کی ہلاکت کا سبب بنے گی۔ کیونکہ نعمت انسان کو شکر کی طرف نہ لے جائے تو حقیقت میں وہ اس کے لئے عذاب ہے۔ اگر انسان نعمت الٰہی سے استفادہ کر رہا ہو اور اس پر اللہ کا شکر بجا نہیں لا رہا تو یہی نعمت اس کی تباہی اور بد بختی کا سبب بنے گی۔ ان کے اسی کفران نعمت کی وجہ سے خداوند تبارک و تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ وہ کفر کی حالت میں ہی دُنیا سے جائیں اور آخرت میں ان اعمال کے نتیجے میں اُن کو سخت ترین عذاب دیا جائے گا۔

وَ اِذَآ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ جَاهِدُوۡا مَعَ رَسُوۡلِهِ اسۡتَاۡذَنَكَ اُولُوا الطَّوۡلِ مِنۡهُمۡ وَ قَالُوۡا ذَرۡنَا نَكُنۡ مَّعَ الۡقٰعِدِيۡنَ ﴿۸۶﴾

"اور جب کوئی سورہ نازل ہوتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو تو ان میں سے دولت مند بھی تجھ سے رخصت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہ جائیں"۔

جہاد سے فرار کرنے والے

"طوْل" قدرت اور نعمت کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو جہاد سے فراری ہیں۔ کہا گیا ہے کہ جب کوئی سورہ نازل ہوتی ہے جس میں اللہ پر ایمان

لانے اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جہاد کے لیے نکلنے کا حکم دیا جاتا ہے تو ثروت مند اور صاحب قدرت اور مالدار تیرے پاس آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم جہاد کے لئے نہ جائیں اور ہم پیچھے رہنے والوں کے ساتھ رہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر عورتوں، چھوٹے بچوں، بیمار افراد، بوڑھوں اور عاجز افراد کو اجازت ہے تو ہمیں بھی اجازت دے دیں۔ ان کو اپنے اموال اور اپنی جان پیاری ہوتی ہے اور اس طرح وہ ذلت اور رسوائی کو قبول کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر ایمان لانے کو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جہاد کرنے کے برابر قرار دیا ہے۔ اسی سے استفادہ ہوتا ہے کہ اُن کا ایمان ہی ٹھیک نہیں تھا ورنہ وہ جہاد سے پیچھے نہ رہتے۔

رَضُوۡا بِاَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَوَالِفِ وَ طُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا یَفۡقَهُوۡنَ ﴿۸۷﴾

”وہ خوش ہیں کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے دلوں پر مہر کردی گئی ہے سو وہ نہیں سمجھتے“۔

جہاد سے فراری

یعنی جہاد سے پیچھے رہنے والوں نے عورتوں، بچوں اور معذور افراد کی طرح رہنے کو پسند کیا ہے اور جہاد کی فضیلت کو نظرانداز کیا ہے اور وہ اسی پر ہی خوش ہیں۔ حالانکہ یہ ان کے لئے انتہائی پستی اور ذلت کی بات تھی۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کے دلوں کو کفر نے گھیر رکھا تھا اور ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی تھی، اسی لئے وہ جہاد پر نہ جاسکے اور اس بڑی سعادت سے محروم رہے اور اب دُنیا و آخرت میں انہیں کچھ بھی نہیں ملے گا جو ان کو فائدے دے۔ یہ ظاہری چند روزہ فائدے ان کو حقیقی کرامت، عظمت اور حرمت و احترام نہیں دے سکیں گے۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْخَیْرٰتُ ؗ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸۸

"لیکن رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان والے ہیں وہ اپنے اموال اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں، اور انہیں لوگوں کے لیے بھلائیاں ہیں، اور وہی نجات پانے والے ہیں"۔

کامیاب لوگ

اس آیت میں مومنین اور رسول خداﷺ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اس نے ان کے دلوں کو نفاق کی نجاست سے پاک اور ایمان کے نور سے مزین کیا ہے۔ اسی بناء پر وہ اپنی ایمانی ذمہ داریاں اور فرائض کو بجالاتے ہیں، راہ خدا میں مال بھی خرچ کرتے ہیں، اپنی جان بھی راہ خدا میں دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جہاد کے لئے نکلتے ہیں۔ جبکہ ان کے برعکس منافقین بخل کرتے ہیں، جہاد سے پیچھے رہ جاتے ہیں، سستی اور کاہلی اور اپنے ان اعمال کی وجہ سے انہوں نے اپنے لئے ذلت اور رسوائی کا انتخاب کرلیا ہے۔ مومنین اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے جہاد کرتے ہیں، ان کی جنگ قومی تعصب یا زمانہ جاہلیت کے تعصب یا مال و دولت، نام، عنوان اور منصب کے لئے نہیں بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے ان کے لئے بہت زیادہ فوائد ہیں، ان کے لئے خوبصورت زندگی ہے، نور ہدایت ہے، شہادت ہے۔ یہ ساری اچھائیاں ان کے لئے ہیں اور یہ اللہ کے قریب ہیں اور ان کے لئے ابدی اور ہمیشہ کی سعادت ہے جو بڑی کامیابی ہے اور یہی لوگ ہی کامیاب ہیں۔

اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۸۹﴾

"اللہ نے ان کے لیے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے"۔

بڑی کامیابی

"اعداد" کسی چیز کو تیار کرنے یا اس کو آمادہ کرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں وعدے کے بجائے اعداد اس لیے کہا گیا ہے تاکہ یہ بات سمجھائی جائے کہ ایمان لانے والوں کا انجام معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس دُنیا سے کامیاب جائیں، ہو سکتا ہے ناکام جائیں۔ اگر وہ ایمان کامل کے ساتھ دُنیا سے جائیں گے تو ان کے لئے جنتیں ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے لیکن اگر ایمان کامل کے ساتھ دُنیا سے نہ گئے دُنیا سے کفر اور نفاق لے کر گئے تو پھر ان کے لئے جہنم ہے۔ اگر وعدہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تو وعدہ حتمی، واجب اور تخلف ناپذیر امر ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کو وعدہ دیا گیا ہے چاہے وہ ایمان کی حالت میں دنیا سے جائے یا ایمان کے بغیر دنیا سے جائے دونوں صورتوں میں وعدے پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔ اس لئے یہاں پر یہ نہیں کہا گیا کہ مومنوں کے لئے جنات ہیں بلکہ کہا گیا کہ ان کے واسطے جنات آمادہ ہیں جن کی وصف یہ ہے کہ نہریں ان کے لئے نیچے جاری ہیں جن میں ہمیشہ رہیں گے تو یہ ان کے لئے ہیں جو ایمان کی حالت میں اس دُنیا سے جائیں گے۔ لہٰذا اس آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بعض مومنین کا عقیدہ تبدیل ہو سکتا ہے اور وہ دستوراتِ الٰہی کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لئے جو نعمات آمادہ کر رکھی ہیں وہ ایسے مومنین کے

شامل حال نہیں ہوں گی کیونکہ انہوں نے ایمان کا تقاضا پورا نہیں کیا۔ جو حقیقی مومنین ہیں وہ ایمان پر قائم رہتے ہیں، نیک عمل بجالاتے ہیں اور ہمیشہ اُن کے لئے اچھائیاں ہیں اور وہ جاودانی بہشتوں میں وارد ہوں گے اور یہی اُن کے لئے بڑی کامیابی ہے۔ انسان کے لیے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ ایمان کی حالت میں اس دُنیا سے جائے اور اللہ تعالیٰ نے جو جنت الفردوس تیار کر رکھی ہے وہ وہاں پہنچ جائے یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِیُؤْذَنَ لَهُمْ وَ قَعَدَ الَّذِیْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۹۰﴾

"اور بہانے کرنے والے گنوار آئے تاکہ انہیں رخصت مل جائے اور وہ بھی بیٹھے رہے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا تھا، ان میں سے جو کافر ہیں تو عنقریب انہیں دردناک عذاب پہنچے گا"۔

بدولوگوں کی عذر تراشیاں

"مُعَذِّرُوْنَ" سے وہ بے بضاعت افراد مراد ہیں جن کے پاس خرچہ اور جنگ کے لئے اسلحہ نہیں تھا، لیکن ان میں شوق جہاد تھا لہٰذا پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس اجازت لینے کے لیے آئے اور ان سے معذرت خواہی کی۔ یہ لوگ دل کے اندھے منافقوں کی طرح نہ تھے جو اپنی باتوں میں جھوٹے تھے اور کوئی بات ان پر اثر نہیں کرتی تھی۔ ان کے دل کے فاسد ہونے اور ان کی پستی کے لیے یہی بات کافی تھی وہ بغیر کسی عذر کے خدا اور رسول اللہ کو جھٹلاتے تھے اور جنگ میں شرکت کرنے سے فرار کرتے تھے اور جہاد سے پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے ایسے کافروں کو دردناک عذاب کا وعدہ دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بہت جلد پورا ہوگا اور وہ دردناک عذاب میں ہونگے۔

لَیۡسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَی الۡمَرۡضٰی وَ لَا عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ مَا یُنۡفِقُوۡنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوۡا لِلّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ؕ مَا عَلَی الۡمُحۡسِنِیۡنَ مِنۡ سَبِیۡلٍ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۹۱﴾

''ضعیفوں اور مریضوں پر اور ان لوگوں پر جو نہیں پاتے جو خرچ کریں کوئی گناہ نہیں ہے جبکہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیر خواہی کریں، نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

جہاد سے مستثنیٰ افراد

اس آیت میں ''ضُعَفَآء'' سے وہ لوگ مراد ہیں جن میں جہاد کرنے کی توانائی نہیں ہے، جیسے معذور افراد۔ ''مَرۡضٰی'' سے وہ افراد مراد ہیں جو وقتی طور پر بیماری میں مبتلاء ہیں اور سفر نہیں کر سکتے۔ ''الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ مَا یُنۡفِقُوۡنَ'' وہ افراد جن کے پاس سفر کرنے کے لیے مالی اخراجات موجود نہیں اور جنگ کرنے کے لیے ان کے پاس اسلحہ بھی موجود نہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان افراد سے جہاد کے وجوب کا حکم اُٹھالیا ہے کیونکہ ان افراد پر جہاد کا واجب ہونا ان کے لیے مشقت اور تکلیف کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان افراد سے جہاد کے وجوب کے حکم کو اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس کے لوازمات یعنی دُنیا میں مذمت اور آخرت میں عقوبت کو بھی اٹھالیا ہے کیونکہ حقیقت میں ان پر جہاد کی مخالفت صدق نہیں کرتی۔ ان افراد کے لیے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے لئے خیر خواہی کی شرط اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ اُن کے دل خیانت اور دھوکہ سے دُور ہوں اور فاسد منافقوں کی طرح اللہ کے امر کی مخالفت کے مرتکب کرنے والے نہ ہوں اور اسلامی معاشرے میں فتنہ نہ پھیلائیں۔ اگر وہ منافقوں جیسا کریں گے

تو پھر دُنیا میں مذمت اور آخرت میں عذاب کے مستحق ہوں گے۔

آخر میں ان افراد سے تکلیف کو اٹھائے جانے کی وجہ بیان کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ نیک لوگوں کا کوئی مواٗخذہ نہیں ہوگا اور کوئی ان کی مذمت بھی نہیں کر سکتا اور انہیں نقصان بھی نہیں پہنچا سکتا۔ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے اور وہ انہیں ہر مکروہ اور ناپسندیدہ حالت سے محفوظ رکھے گا۔

وَّ لَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾

”اور ان لوگوں پر بھی کوئی گناہ نہیں کہ جب وہ تیرے پاس آئے کہ تو انہیں سواری دے تو تم نے کہا میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ تمہیں اس پر سوار کردوں، تو وہ لوٹ گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ موجود نہیں تھا“۔

جہاد میں شریک نہ ہونے پر غمگین مومنین

کچھ افراد ایسے بھی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر عرض کرتے ہیں کہ ہمیں جہاد پر جانے کے لیے سواری دیں تو ہم آپؐ کے ساتھ جہاد کے لئے جانے کے لیے تیار ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ آپ کے پاس سواری نہیں ہے تو تم واپس چلے جاؤ۔ اس پر وہ بڑے غمگین اور رنجیدہ تھے اور رو رہے تھے کہ ہمارے پاس توشۂ راہ اور سواری نہیں ہے ورنہ ہم بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے، جنگ پر بھی جاتے۔ ان افراد سے تکلیف ساقط ہے۔ ان کو اللہ تعالٰی نے علیحدہ اس لئے ذکر کیا ہے کہ یہ خیر خواہی، سچائی اور اخلاص کے درجے پر

فائز ہیں لہٰذا ان کے لئے بڑا اجر ہے اور ان کو جہاد میں شرکت کا ثواب بھی ملے گا کیونکہ وہ دل سے جہاد پر جانے کے لیے آمادہ تھے لیکن مجبوری کی وجہ سے اس میں شرکت نہیں کر سکے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کا خصوصی ذکر کیا ہے۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَ هُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

"الزام ان لوگوں پر ہے جو تم سے اجازت طلب کرتے ہیں جبکہ وہ مالدار ہیں، اس بات سے وہ خوش ہیں کہ پیچھے رہنے والیوں کے ساتھ رہ جائیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے لیکن وہ اس بات کو نہیں سمجھتے"۔

جہاد پر نہ جانیوالے مالداروں کی سرزنش

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ وہ لوگ قابل مذمت ہیں جو نفاق اور دل پر مہر لگ جانے کی وجہ سے حقیقت کے ادراک سے عاجز ہیں اور مالی طور پر مستحکم اور جسمانی طور پر بھی ٹھیک ہونے کے باوجود جہاد سے فراری ہیں، وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ عورتوں اور بچوں اور معذور افراد کے ہمراہ شہر میں باقی رہ جائیں اور جہاد کے لئے نہ جائیں۔ حقیقت میں یہ لوگ شعور اور سمجھ سے عاری ہیں اور صحیح بات کو سمجھتے اور جانتے بھی نہیں ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ وہ اپنے آپ کو کتنی بڑی خیر سے محروم کر رہے ہیں اور ہمیشہ کی سعادت اپنے ہاتھ سے دے رہے ہیں۔ یہی لوگ قابل مذمت ہیں اور یہ قابل بخشش بھی نہیں ہیں ان کو ان کے اس رویہ کی سزا بھی ملنی ہے۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ
لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ
تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

"جب تم ان کی طرف واپس جاؤگے تو تم سے عذر کریں گے، کہہ دو عذر پیش مت کرو ہم تمہاری بات ہر گز نہیں مانیں گے تمہارے سب حالات اللہ ہمیں بتا چکا ہے، اور ابھی اللہ اور اس کا رسول تمہارے کام کو دیکھے گا پھر تم غائب اور حاضر کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤگے سو وہ تمہیں بتادے گا جو تم کر رہے تھے"۔

جہاد پر نہ جانے والوں کی معذرت قبول نہیں

رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کو کہا گیا ہے کہ جب آپ جہاد سے واپس آجاؤگے تو جہاد پر نہ آنے والے معذرت کرنے آئیں گے۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ ہم ہر گز تمہاری معذرت کو قبول نہیں کریں گے۔ ان کی معذرت ان کے گناہ سے بدتر ہے۔ عنقریب ان کا سارا عمل اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے سامنے مشہود اور ظاہر ہوگا اور قیامت کے دن تمہارے اعمال کے حقائق سے تم آگاہ ہوگے اور خداوند تبارک و تعالیٰ دانا، علیم اور حکیم ہے اور تمام پوشیدہ باتوں سے بھی آگاہ ہے اور وہاں پر تمہارے اعمال کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ یہاں پر کہا گیا ہے کہ جو لوگ جہاد پر نہیں گئے تھے اور اب اپنے لئے عذر خواہی کرنے کے لئے آئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ یہ جھوٹے اور منافق ہیں، ان کی کسی بات کو نہیں ماننا، قیامت کے دن ان کے یہی اعمال اور ان کا نفاق عذاب کی شکل میں انہیں نصیب ہوگا۔

سَیَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَكُمۡ اِذَا انۡقَلَبۡتُمۡ اِلَیۡهِمۡ لِتُعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ ؕ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ ؕ اِنَّهُمۡ رِجۡسٌ ۫ وَّ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ ﴿۹۵﴾

"تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم ان کی طرف پھر جاؤ گے کہ تم ان سے در گزر کرو، سوان سے در گزر کرو، بے شک وہ پلید ہیں، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اس کے بدلے میں جو کرتے رہے ہیں"۔

جہاد سے فراری، قسمیں اٹھانے والے

اس آیت میں پچھلی آیت میں ذکر شدہ مطلب کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جب آپ جہاد سے واپس آؤ گے تو یہ لوگ اللہ کی قسم اٹھا کر کہیں گے کہ ہماری ملامت اور سرزنش نہ کیجئے، ہمیں حقیر نہ سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو ان سے تعلق رکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ اس لائق ہی نہیں کہ آپ ان کی ملامت و سرزنش کریں یا ان کو حقیر اور گھٹیا سمجھیں یا ان کی بات پر توجہ دیں۔ آپ ان سے ہاتھ اٹھا لیں، نہ اس وجہ سے کہ آپ ان کے عذر کی تصدیق کر رہے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کا باطن پلید ہے، ان کا عقیدہ غلط ہے اور ان کے اعمال نجس، پلید اور ناپاک ہیں۔ ان کے قریب کبھی نہیں جاؤ اور ان سے دُوری اختیار کرو۔ ان کے پاک کرنے کا کوئی راستہ موجود ہی نہیں ہے اور یہ ان اعمال کی وجہ سے جن کے وہ مرتکب ہوئے ہیں، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

یَحۡلِفُوۡنَ لَكُمۡ لِتَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ ۚ فَاِنۡ تَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَرۡضٰى عَنِ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۹۶﴾

''وہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تا کہ تم ان سے خوش ہو جاؤ، اگر تم ان سے خوش ہو بھی جاؤ تو بھی اللہ نافرمانوں سے خوش نہیں ہوتا''۔

جنگ سے فرار ہونیوالوں سے اللہ راضی نہیں

یہ آیت بھی اسی حوالے سے ہے کہ یہ آپ کو خوش کرنے کے لئے، آپ کو راضی رکھنے کے لیے قسمیں اُٹھائیں گے کہ اگر آپ ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان سے بالکل راضی نہیں۔اس صورت میں تمہاری رضایت اللہ کی خوشنودی کے خلاف ہو گی کیونکہ خدا فاسق اور فاجر لوگوں سے خوش نہیں اور نہ ہی ان سے راضی ہوتا ہے۔ کسی مومن کے لئے یہ بات شائستہ نہیں کہ وہ ایسا کام کرے جو اللہ کی ناخوشنودی یا غضب کا سبب ہو۔ ان تین آیات میں جس بات کی تاکید کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد پر نہیں گئے اور رسول اللہ ﷺ جب جہاد سے واپس آئے تو انہوں نے قسمیں اُٹھا کر معذرت پیش کی تو اللہ نے واضح بتا دیا کہ یہ جھوٹے ہیں، منافق ہیں، یہ گناہگار ہیں، یہ تمہیں راضی کرنے کے لئے قسمیں اُٹھا رہے ہیں، تمہاری منتیں کر رہے ہیں، یہ حقیر اور پست ہیں ان کو منہ نہ لگاؤ اور ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتو۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾

''گنوار لوگ کفر اور نفاق میں بہت سخت ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان احکام سے واقف نہ ہوں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے''۔

بادیہ نشین اعراب کا کفر و نفاق

یہ آیت بادیہ نشین اعراب کے بارے میں ہے۔اس میں کہا جارہا ہے کہ بادیہ نشین اعراب کفر اور نفاق میں بدترین ہیں۔ کیونکہ یہ تہذیب و تمدن سے دُور ہیں اور انسانی برکات جیسے علم، ادب سے محروم ہیں لہٰذا یہ دوسروں سے زیادہ سنگ دل اور جفاء کار ہیں اور یہ اللہ کی حدود کو نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کیا ہیں، احکام کیا ہیں، شرعی قوانین کیا ہیں، حلال و حرام کیا ہے ۔ کیونکہ ان کی کیفیت ایسی ہے تو آپ ان سے دُور ہی رہو اور ان کو اپنے ساتھ مت ملاؤ۔ اللہ ان کے اقوال، ان کے حالات سے آگاہ ہے اور جو کچھ فیصلہ دیتا ہے وہ سب صحیح ہوتا ہے۔

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ یَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآىِٕرَ ؕ عَلَیْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۹۸﴾

"اور بعض گنوار ایسے ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور تم پر زمانہ کی گردشوں کا انتظار کرتے ہیں، انہیں پر بری گردش آئے، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے"۔

عرب بدوؤں کی حالت بارے بیان

بیابانی بدو عربوں کی حالت یہ ہے کہ اگر وہ کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے تاوان سمجھتے ہیں۔جو کچھ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو وہ اسے راہ خدا میں خرچ کرنا نہیں سمجھتے بلکہ اپنے لئے مالی خسارت اور نقصان قرار دیتے ہیں اور اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ آپ کے لئے کوئی برا واقعہ پیش آئے تاکہ وہ خود کو آپ کی حکومت سے نجات دلائیں اور شرک اور گمراہی کی جو رسومات تھیں ان کی طرف پلٹ جائیں؛ یہ ان کی باطنی خواہش تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان پر نفرین کرتا ہے کہ برے حالات ، ذلت و مصیبت ان پر ہی آئے۔ خدا بات سننے والا اور

دلوں کے رازوں سے آگاہ ہے۔

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَیُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۹﴾

"اور بعض عرب بادیہ نشین ایسے ہیں کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں اور وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے نزدیک ہونے اور پیغمبر کی دعاؤں کا وسیلہ قرار دیتے ہیں، خبردار! بے شک وہ ان کے لیے نزدیکی کا سبب ہے، عنقریب انہیں اللہ اپنی رحمت میں داخل کرے گا، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

ایمان لانے والے بادیہ نشین عرب

ان بیابانوں میں رہنے والوں میں سے کچھ توحید پرست ہیں اور اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں حساب و جزاء کی تصدیق کرتے ہیں، اللہ کی راہ میں جو خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے قرب اور پیغمبرؐ کی دعاء کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ تو آگاہ رہو کہ ان کے انفاق کا نتیجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے لئے دعا کرتے ہیں اور یہ دعاء حق تعالیٰ کے قرب کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ ان کو وعدہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی رحمت میں داخل ہوں گے، اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا، ان کے عیبوں پر پردہ ڈالے گا، ان کے گناہوں کو معاف کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ عیبوں کو چھپانے والا اور مومنوں اور اطاعت کرنے والوں کے لیے مہربان ہے۔

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۰۰

”اور جو لوگ قدیم میں پہلے ہجرت کرنے والوں اور مدد دینے والوں میں سے ہیں اور وہ لوگ جو نیکی میں ان کی پیروی کرنے والے ہیں، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے اور ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بڑی کامیابی ہے“۔

سبقت لے جانے والے مہاجرین وانصار

سبقت لے جانے والے پہلے لوگوں سے مراد وہ مہاجرین اور انصار ہیں جو ایمان لانے میں دوسروں پر سبقت لے گئے اور جنہوں نے دین کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ وہ مہاجرین جنہوں نے کافروں کے شکنجے سے نکل کر اپنے گھروں کو چھوڑا، اپنے مال کو چھوڑا اور حبشہ کی جانب ہجرت کی، مدینہ کی طرف ہجرت کی اور سفر کی تکالیف کو برداشت کیا، اپنا مال چھوڑنے کو برداشت کیا، عزیز و اقارب اور اپنے وطن کو دین کی خاطر چھوڑا۔ اسی طرح وہ انصار جنہوں نے مدینہ میں مہاجرین کو رہائش دی، مہاجرین کو خوش آمدید کہا اور ان کی مدد کی۔ یہ ہیں سابقون واولون پہلے لوگ جنہوں نے حبشہ کی جانب ہجرت کی اور مدینہ کی جانب ہجرت کی؛ یہ سابقون و اولون ہیں اور انصار جنہوں نے ان کی مدد کی اور کیونکہ یہ حق کے پیرو تھے اور ان کے بعد جو مسلمان ہوئے جنہوں نے ان کی پیروی کی جن کے دل کفر و نفاق سے خالی تھے تو ان کو بھی وہ چیز شامل ہے جو آگے بتائی جارہی ہے کہ خدا ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں۔

یہاں پر "رضایت" سے مراد نفس کا کسی امر کے ساتھ اس طرح موافق اور ہم آہنگ ہونا کہ اس میں کوئی تضاد یا ٹکراؤ نہ ہو، بندے کی رضایت اپنے رب سے یہ ہے کہ خدا جو اس کے لئے چاہے اسے ٹھیک سمجھے اور جو خدا کی پسند ہو وہ اس کی پسند ہو، اگر کوئی امر ظاہری طور پر اس کے لیے اچھا نہ ہو اور ناپسندیدہ ہو لیکن وہ اس لئے اسے پسند کرے کہ اس میں خدا کی رضایت ہے۔ یہ رضایت قضاء و قدر الٰہی پر راضی ہونا ہے اور جو کچھ تکوینی حادثات ہیں جو کائنات میں رونما ہوتے رہتے ہیں اور لگاتار ظاہر ہو رہے ہیں اور اسی طرح جو شریعت کے احکام ہیں ان سب پر راضی اور خوش ہیں کیونکہ اللہ کی رضا اس میں ہے، وہ اللہ کی رضا پر راضی ہیں، اللہ کے تکوینی اور تشریعی فیصلوں پر ناراحت نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے ہر فیصلہ پر خوش ہوتے ہیں۔

اس آیت کا مضمون یہ نہیں ہے کہ ہر وہ شخص جس پر مہاجر، انصار یا تابعی کا عنوان صدق کرے۔اس سے اللہ راضی ہے اور کبھی بھی اس سے ناخوش نہیں ہوگا چاہے وہ اچھا عمل کرے یا برا عمل کرے کیونکہ خداوند متعال نے اپنی ذات کو کسی ایسے وصف کے ساتھ توصیف نہیں کیا جس میں تبدیلی یا تغیر کا شائبہ ہو، اللہ کی رضایت اس معنی میں ہے کہ وہ اپنے محسن بندہ سے راضی ہے۔اپنی رحمت اور نعمت اس پر اُتارے گا۔ لیکن اگر یہ چیز تبدیل ہو جائے اور اس کا ایمان کفر اور فسق میں بدل جائے اگر ایمان نہ رہے تو پھر اللہ کی رحمت اور نعمت بھی نہیں رہے گی۔ اگر ایمان نفاق اور کفر میں بدل گیا، ان کا عمل فاسد ہو گیا تو پھر یہی رحمت نقمت میں بدل جائے گی، رضایت ناخوشنودی میں بدل جائے گی۔ اگر وہ ایمان اور عمل صالح میں پائیدار رہیں تو پھر اللہ تعالیٰ انہیں ان بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں جہاں انہوں نے ہمیشہ رہنا ہے۔ یہ بڑی کامیابی ہے جو صالح اور باایمان افراد کو نصیب ہو گی۔

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕۛ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ؔۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ ۚ﴿۱۰۱﴾

''اور تمہارے گرد و نواح کے بعض عرب بادیہ نشین (گنوار) منافق ہیں، اور بعض مدینہ والے بھی، نفاق پر اڑے ہوئے ہیں تم انہیں نہیں جانتے، ہم انہیں جانتے ہیں، ہم انہیں دوہری سزا دیں گے پھر وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے''۔

مومنین کے درمیان موجود منافقین

اس آیت میں مومنین اور پیغمبر اکرم ﷺ کو خطاب ہے کہ بعض بادیہ نشین جن میں سے کچھ مدینہ کے اطراف میں رہتے ہیں اور بعض خود مدینہ میں رہتے ہیں یہ نفاق میں گھسے ہوئے ہیں، وہ منافقت کی انتہاء پر ہیں اور پیغمبر اکرم ﷺ کے فرامین کی نافرمانی کرتے ہیں اور ان کی اطاعت سے نکلنا ان کی عادت بن چکی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو کہا گیا ہے کہ تم انہیں نہیں جانتے ہو کیونکہ یہ بڑے مسکین بن کر بیٹھتے ہیں، عبادت گزار بن کر اپنا بڑا پن ظاہر کرتے ہیں، لیکن ہم ان کے نفاق کو جانتے ہیں۔ ہم ان کو دنیا میں قیدی بنا کر یا قتل کرکے عذاب دیں گے اور قبر میں بھی انہیں عذاب دیا جائے گا اور آخرت کا بڑا عذاب اس کے علاوہ ہے۔

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۰۲﴾

''اور کچھ مزید بھی ہیں کہ انھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا ہے انہوں نے اپنے نیک اور بد کاموں کو ملا دیا ہے، قریب ہے کہ اللہ انہیں معاف کر دے، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

گناہ کا اعتراف کرنے والے

یہ آیت ابولبابہ اور اس کے کچھ ساتھیوں کے بارے میں ہے۔ جنگ تبوک میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے سرپیچی کی اور آپؐ کے حکم کو نہیں مانا۔ جب پیغمبر اکرم ﷺ جنگ سے واپس آرہے تھے تو انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا اور قسم اٹھالی کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی انہیں نہیں کھولے گا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے انہیں ستونوں سے کھول دیا اور ان کی توبہ قبول کرلی۔ انہوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ یہ باقی منافقین کی طرح چالاکی سے نہیں آئے تھے اور نہ ہی ان کا یہ عمل ریا اور دکھاوے کے لیے تھا بلکہ ان کا اچھا عمل ان کے پہلے انجام دئے گئے عمل کے ساتھ مل گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دل میں یہ اُمید ڈال دی کہ ان کی بخشش ہو سکتی ہے اور اُن کی یاس و نااُمیدی کو ختم کر دیا۔ جب ان کی ایسی حالت تھی تو خدا نے بھی ان کی توبہ قبول کرلی۔ اسی لیے آخر میں فرمایا اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

''ان کے اموال میں سے زکوۃ لے لو کہ اس سے ان کے ظاہر کو پاک اور ان کے باطن کو صاف کر دو اور انہیں دعا دو، بے شک تیری دعا ان کے لیے تسکین ہے، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے''۔

زکوۃ پاکیزگی کا سبب

اس جگہ صدقہ سے واجب صدقہ یعنی زکوۃ مراد ہے جو سونا، چاندی اور جانوروں یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری اور اناج یعنی گندم، جو، کھجور، کشمش پر واجب ہے جو کل نو چیزیں ہیں۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کے اموال سے زکوۃ لو اور اس زکوۃ کے ذریعے ان کو پاکیزہ کرو تاکہ ان کے مال میں برکت ہو اور ان کے حق میں دعائے خیر دو کہ اللہ ان کے مال میں خیر و برکت عطا کر اور تیری دعا ان کے لئے سکون کا سبب ہے اور سرمایہ رحمت ہے اور ان کے دلوں میں اطمینان اور اعتماد پیدا ہوگا۔ یہ ایک قسم کا اُن کے عمل کا تشکر ہے۔ اللہ سننے اور جاننے والا ہے اور وہ اپنے بندوں کے دلوں کی آواز کو بھی سنتا ہے۔ اس مطلب کو پڑھنے سے ان کو سکون اور آرام ملتا۔

پیغام: جب آپ کسی سے واجب مال وصول کرتے ہیں تو جو وصول کر رہا ہے وہ ان کے لئے دعا دے، اللہ سے دعا کرے کہ اللہ ان کے مال میں برکت دے، اللہ ان پر رحمت اُتارے، ان کے گناہ معاف کر دے۔ حکم یہ ہے کہ جب آپ واجب مال وصول کریں تو پھر اس کے لئے دعا بھی کریں جس سے مال وصول کر رہے ہو۔

اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ ہُوَ یَقۡبَلُ التَّوۡبَۃَ عَنۡ عِبَادِہٖ وَ یَاۡخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰہَ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۰۴﴾

"کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور صدقات لیتا ہے اور بے شک اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے"۔

زکوۃ دینے کی تشویق

اس آیت میں استفہام، استفہام انکاری ہے تاکہ لوگوں کو واجب زکوۃ کی ادائیگی اور

توبہ کرنے کا شوق دلایا جائے۔ کیونکہ توبہ کرنے سے انسان کی جان پاک ہوتی ہے اور زکوۃ مال کو پاک کرتی ہے اور اسے بابرکت بناتی ہے لہٰذا توبہ اعمال کا صدقہ ہے اور زکوۃ مال کا صدقہ ہے، زکوۃ مال کو پاک کرتی ہے اور توبہ انسان کے دل کو پاک کرتی ہے اور توبہ انسان سے گناہ کی نجاست کو دور کرتی ہے۔ یہاں ایک سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا تم نہیں جانتے خدا توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات کو وصول کرکے اس کو بڑھاتا ہے؟ صدقات لینے والا اللہ تعالیٰ ہے تو پھر اس وسیلے سے لوگوں کو شوق دلایا گیا ہے کہ تمہارا معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے، اللہ توبہ قبول کرتا ہے وہ مہربان ہے اور اللہ نے خبر دی ہے تو اسی کی طرف تم نے پلٹ کر جانا ہے جس کی طرف پلٹ کر جانا ہے وہی ہے جو تمہارے صدقہ کو وصول کرتا ہے، جو تم نے حلال راستے سے حاصل کیا ہے۔ خداوند تبارک تعالیٰ اس کو قبول کرتا ہے اور اس میں بڑھوتری اور اضافہ بھی وہی دیتا ہے۔

وَ قُلِ اعۡمَلُوۡا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمۡ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ وَ سَتُرَدُّوۡنَ اِلٰی عٰلِمِ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾ۚ

"اور کہہ دے کہ کام کیے جاؤ اور یہ جان لو کہ اللہ، اس کا رسول اور مومنین تمہارے عمل کو دیکھتے ہیں اور عنقریب تم لوٹائے جاؤ گے، غائب اور حاضر کے جاننے والے کی طرف، تو وہ تمہیں بتادے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے"۔

مومن، کافر اور منافق کے لئے عمومی خطاب

اس آیت میں یہ بات کہی جارہی ہے کہ تم جو بھی عمل کرو تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ تمہارے عمل کو اللہ اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین سب دیکھ رہے ہیں۔ اعمال کے حقائق

اور نیک اور برے اعمال کی تاثیر، ان کا نفع یا نقصان کسی ایک زمانے یا کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس نے ہمیشہ کے لیے باقی رہنا ہے اور ایک قوم سے دوسری قوم پر اس کا اثر بھی ہونا ہے، پس مومنین کے اعمال کے جو حقائق ہیں اور ان پر جو آثار و فوائد مرتب ہوتے ہیں ان سب کو اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ جانتا ہے اور یہ امر مومنین کے درمیان واضح اور روشن ہے اور قیامت کے دن تمہارے ان اعمال کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

مومنین کے اعمال کے حقائق

جیسے معاشرے میں تقویٰ کا ہونا اور اسلامی معاشرے میں اصلاح کا عام ہونا، فقراء اور مساکین کی مدد اور اموال کی زکوٰۃ سے معاشرے میں طبقاتی فرق کا خاتمہ، یہ سارے اس عمل کے آثار ہیں لیکن عام طور پر تو ظاہری عمل دیکھا جاتا ہے لیکن اللہ فرمارہا ہے کہ ہر عمل چاہے خیر کا ہو یا شر کا جو تم انجام دیتے ہو۔ اللہ، رسولؐ اور مومنین ان اعمال پر گواہ ہیں اور ایسا ہے کہ جیسے خود براہ راست انہوں نے یہ سب دیکھے ہوں۔ جب تم خدا کی طرف پلٹوگے تو خدا تمہارے سارے اعمال کے متعلق تمہیں بتادے گا اور سب اعمال تمہارے سامنے ہوں گے۔ یہ آیت لوگوں کو خبردار کر رہی ہے کہ جو بھی تم عمل کر رہے ہو بھولو نہیں! خدا اور اللہ کا رسولؐ اور مومنین سب تمہارے اعمال پر ناظر ہیں اور دیکھ بھی رہے ہیں کہ تم نے کس نیت سے عمل کیا ہے، رضائے الٰہی کے لیے تھا یا رضائے الٰہی کے لیے نہیں تھا۔ عمل کا ظاہر اور باطن ایک جیسا تھا؟ تو اسی کے مطابق تمہیں اس کا اجر ملے گا۔[1]

---

[1] - صحیح روایات کی روشنی میں یہاں مومنین سے مراد بارہ امام معصوم ہیں، حضور پاکؐ کے بارہ جانشین، حضرت امام علی علیہ السلام سے امام المہدی (عج) تک جو لوگوں کے اعمال پر ناظر ہیں۔ آج کے دور میں امام زمانہ (عج) مومنین کے اعمال پر ناظر ہیں اور خود یہی ایک دلیل ہے کہ ہر دور میں امام موجود ہوتا ہے؛ یہ آیت کا باطنی معنی ہے۔ (مترجم)

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۱۰۶﴾

''اور کچھ مزید لوگ ہیں جن کا کام اللہ کے حکم پر موقوف ہے خواہ انہیں عذاب دے یا انہیں معاف کر دے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے''۔

اللہ کے فیصلے کے منتظر لوگ

''ارجاء'' مؤخر کرنے کے معنی میں ہے۔ ''مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ'' کا مطلب یہ ہے کہ امر خدا کو دیکھا جائے گا کہ ان کے بارے میں کیا ہے، اُن کی وضعیت واضح نہیں ہے کہ خدا اُن کے بارے میں کیا حکم اور فیصلہ صادر کرے گا۔ کیونکہ اُن کے نامہ اعمال میں اعمال صالح بھی ہیں اور برے اعمال بھی ہیں اور نیک اور برے اعمال کے پلڑوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر ترجیح نہیں رکھتا، نہ عذاب والا پہلو بھاری ہے نہ مغفرت والا پہلو بھاری ہے۔ یہ لوگ مستضعفین کی طرح ہیں جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، خدا چاہے تو ان کو عذاب کرے یا انہیں معاف کر دے۔ اللہ ہی دانا، حکیم اور علیم ہے اس کے علم و حکمت کا جو تقاضا ہے اسی کے مطابق وہ فیصلہ کرے گا کہ یہ مستحق عذاب ہیں یا عفو و درگزر و رحمت ان کے لئے ہے۔ تو اس میں یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ کچھ ایسے افراد ہوں گے کہ جن کے نیک عمل اور برے عمل برابر ہوں گے اور نیکیاں اس قدر نہیں ہوں گی کہ نیکیوں کی وجہ سے ان کو جنت میں بھیج دیا جائے،. برائیاں بھی ایسی ہوں گی. برائیاں اتنی نہیں ہوں گی کہ جہنم بھیج دیا جائے ان کی نیکیاں اور برائیاں. برابر ہوں گی تو اس میں خدا نے ہی فیصلہ دینا ہے کہ ان کے متعلق کیا کرنا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

"اور جنہوں نے مسجد بنائی ہے نقصان پہنچانے اور کفر کرنے اور مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کے لیے، اور ان لوگوں کے گھات لگانے کے لیے جو اللہ اور اس کے رسول سے پہلے لڑ چکے ہیں، اور البتہ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا مقصد تو صرف بھلائی تھی، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ جھوٹے ہیں"۔

مسجد ضرار

"اِرْصَادًا" کمین گاہ اور حملے کے لئے چھپ کر انتظار میں رہنے کے معنی میں ہے۔
اس آیت میں منافقوں کے ایک اور گروہ کا وصف بیان کیا جارہا ہے جنہوں نے مسجد بنائی تھی لیکن مسجد بنانے میں ان کا ہدف یہ تھا کہ اسلام کو نقصان پہنچائیں، مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈال دیں، مومنوں کے درمیان وحدت کلمہ کو توڑیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو چھپ کر وار کرتے ہیں اور چھپ کر کفر کی ترویج کرتے ہیں، ایک ایسی جگہ بنا رہے تھے جسے مسلمانوں کے خلاف استعمال کر سکیں، اسلام کے خلاف استعمال کر سکیں۔

نقل ہوا ہے کہ بنی عمرو بن عوف کی ایک جماعت نے مسجد قبا بنائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ تشریف لے آئیں اور وہاں نماز پڑھیں۔ اس پر بنی غنم بن عوف کے کچھ افراد حسد کرنے لگے جو منافق تھے۔ انہوں نے مسجد قبا کے پہلو میں ایک اور مسجد بنا ڈالی تاکہ اس مسجد میں بیٹھ کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر سکیں اور مسلمانوں میں تفرقہ ایجاد کریں۔ وہ ابی عامر راہب کا انتظار کر رہے تھے جس نے ان کو وعدہ دیا تھا کہ

روم سے ایک لشکر لے کر ان کی طرف آئے گا تاکہ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ سے باہر نکال دیں۔ یہ ان کی پلاننگ اور منصوبہ بندی تھی۔ انہوں نے آکر رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپ وہاں آکر نماز پڑھیں کہ ہم جماعت سے محروم رہ جاتے ہیں، بارش ہوتی ہے آندھی چلتی ہے راستہ خراب ہو جاتا ہے تو وہاں ہمارے لئے ایک مسجد ہو گی تو جو یہاں نہیں آسکتے تو وہ وہاں پر نماز پڑھ لیا کریں گے آپ تشریف لے آئیں اور اس مسجد کا افتتاح کریں اور آپ کے مبارک قدم سے یہ مسجد متبرک ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں وعدہ دیا کہ جب جنگ تبوک سے واپس مدینہ آئیں گے تو وہاں پر بھی نماز پڑھ لیں گے تو جیسے ہی آپ واپس آئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نیتوں کی خبر رسول اللہ ﷺ کو دے دی اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ کہیں گے کہ ہمارا تو ارادہ فقط خیر ہی کا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور یہ مسجد مسلمانوں کی سہولت کے لئے بنائی گئی ہے لیکن خدا ان کی نیتوں سے واقف ہے اور ان کے جھوٹ کو جانتا ہے ان کی منافقت کو جانتا ہے۔ اسی لئے پہلے ہی خبر دے دی کہ ان کی نیت خیر کی نہیں ہے۔

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

"تو اس میں کبھی کھڑا نہ ہو، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ اس کے قابل ہے تم تو اس میں قیام کرو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں پاک رہنے کو، اور اللہ پسند کرتا ہے پاک رہنے والوں کو"۔

تقویٰ کی بنیاد پر بنی مسجد

اس آیت کے شروع میں رسول اللہ ﷺ کو مسجد ضرار میں جانے سے منع کیا گیا

ہے کیونکہ اس مسجد کے نام سے ہی معلوم ہے کہ یہ مسجد نقصان دینے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ پھر مسجد قباء کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ یہ مسجد پہلے دن سے ہی تقویٰ کی بنیاد پر بنائی گئی تھی؛ یہ کسی اور مقصد اور نیت سے نہیں بنائی گئی۔ اسی لیے یہ زیادہ لائق ہے کہ آپ اس مسجد میں نماز پڑھیں۔ اس مسجد میں ایسے مومنین ہیں جو چاہتے ہیں کہ گناہوں کی پلیدی سے پاک ہوں، ظاہر و باطن ان کا پاک ہو، اللہ ایسے افراد سے محبت کرتا ہے جو پاکیزگی کو دوست رکھتے ہیں اور پاکیزہ بن کر رہتے ہیں۔ آپ کو چاہیے ان ہی کے درمیان جا کر نماز پڑھیں، منافقین کے درمیان جا کر نماز نہ پڑھیں۔

اَفَمَنۡ اَسَّسَ بُنۡيَانَهٗ عَلٰى تَقۡوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضۡوَانٍ خَيۡرٌ اَمۡ مَّنۡ اَسَّسَ بُنۡيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانۡهَارَ بِهٖ فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۰۹﴾

''بھلا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ سے ڈرنے اوراس کی رضامندی پر رکھی ہو وہ بہتر ہے یا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھائی کے کنارے پر رکھی جو گرنے والی ہے پھر وہ اسے دوزخ کی آگ میں لے گرے گی اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا''۔

دو مسجدوں کا موازنہ

''شَفَا'' کسی بھی چیز کے کنارے کو کہتے ہیں۔ ''جُرُفٍ'' ایسی جگہ کو کہا جاتا ہے جس کے اوپر پانی چڑھ گیا ہو یا ایسی جگہ جس میں سیلاب آنے کا خطرہ ہو اور ہمیشہ گرنے کے قریب ہو۔ اس آیت میں مومنین اور منافقین کا آپس میں تقابل کیا گیا ہے۔ مومنین کی زندگی اور ان کے رفتار کی بنیاد دین حق پر ہے، ان کا اللہ پر یقین ہے، ان کے سارے اعمال تقویٰ کی بنیاد پر

ہوتے ہیں، رضائے الٰہی کے علاوہ ان کا کوئی ہدف نہیں ہوتا اور ان میں اللہ کا تقویٰ ہے۔ جبکہ منافقین کا دین کمزور ہے، وہ ہمیشہ شک و اضطرب کی حالت میں ہیں۔ گویا وہ ایک ایسی سیلاب زدہ جگہ کے کنارے کھڑے ہیں جو گرنے کے قریب ہے اور جلد ہی اس کے گر جانے کا خوف ہے۔ ان کی بنیاد مستحکم نہیں۔ ان کا شک و اضطراب کی حالت میں ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ایسی بلندی پر کھڑا ہو جس کی بنیادیں سیلاب نے کمزور کر دی ہوں اور وہ گرنے کے قریب ہو۔ شک کی بنیاد کفر اور نفاق ہے اور کفر و نفاق انسان کے آتش جہنم میں جا گرنے کا سبب ہیں۔ کیا یہ دو گروہ برابر ہیں؟ ظاہر ہے۔ برابر نہیں ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا اور انہیں آتش جہنم سے نجات نہیں دے گا جسے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١١٠﴾

"جو عمارت انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں کھٹکتی رہے گی مگر یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے"۔

منافقین کی حالت

اس آیت میں منافقین کی حالت بیان کی جا رہی ہے کہ منافق ہمیشہ شک و تردید کی حالت میں ہوتے ہیں، یقین کے مرحلے تک نہیں پہنچتے۔ ان کا یہ شک اس وقت تک زائل نہیں ہوتا جب تک ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں، ان کے دل سے نفاق اسی وقت ختم ہو گا جب وہ ہلاک ہو جائیں۔ خدا علیم و حکیم ہے اس لیے وہ مومنین کو رفعت و بلندی دیتا ہے اور منافقین کو پستی اور ذلت دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَ اَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىةِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ وَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِکَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۱۱﴾

''بے شک اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر قتل کرتے ہیں اور قتل بھی کیے جاتے ہیں، یہ سچا وعدہ ہے توراۃ اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ خوش رہو اس سودے سے جو تم نے اللہ سے کیا ہے، اور یہ بڑی کامیابی ہے''۔

مومنین کیلئے اچھی خبر

''اشۡتَرٰی'' خرید و فروخت کے معنی میں ہے، یعنی ایک چیز دے کر اس کے بدلے دوسری چیز لینا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان مومنوں کو بہشت کا یقینی وعدہ دیا ہے جو اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ اور فرمایا ہے کہ مومنین کو دیے گئے بہشت کے اس وعدے کا تذکرہ تین کتبِ الٰہی تورایت، انجیل اور قرآن میں بھی ہوا ہے۔ یہ اس معاملے کی باقاعدہ سند ہے۔ آخر میں مومنین کو اس بڑے فائدے والے سودا کی بشارت دی گئی ہے جو انہوں نے اللہ سے کیا ہے اور وہ اسی پر خوش ہیں، اسی میں بڑی کامیابی ہے ۔ کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرے؟

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

"توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، شکر کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، اچھے کاموں کا حکم دینے والے، بری باتوں سے روکنے والے، اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے، اور ایسے مومنوں کو خوشخبری سنادے"۔

مومنوں کے اوصاف

اس آیت میں مومنین و صالحین کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ مومنین وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں اللہ کی طرف ان کا ہر وقت رجوع ہوتا ہے اور عبادت کرتے ہیں اور شکر بجالاتے ہیں، حمد کرنے والے ہوتے ہیں، اللہ کی حمد بجالاتے ہیں، اللہ کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں، ان کی زبان ہر وقت حمد الٰہی سے چلتی ہے اور اللہ کا بہت شکر بجالاتے ہیں۔ اپنے قدموں سے چل کر مساجد میں جاتے ہیں، دینی محافل میں جاتے ہیں، مومنین کی مشکلات حل کرنے کے لئے چلتے ہیں اللہ کی نعمات کا مشاہدہ کرنے کے لئے، اللہ کی آیات کو دیکھنے کے لئے، رکوع کرتے ہیں سجدہ کرتے ہیں، اپنے اعضاء و جوارح سے اللہ کے حضور خضوع و خشوع میں رہتے ہیں، یہ ان کی انفرادی حالت کے اوصاف ہیں۔ وہ اجتماعی حالت کے لحاظ سے ہمیشہ اپنے اجتماع، اپنی سوسائٹی پر نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کو اچھائی کا کہتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں تاکہ معاشرے میں انحراف نہ ہو اور اللہ کے بنائے ہوئے اصول و قواعد اور قوانین اور احکام اور جو شرعی حدود متعین ہوئی ہیں ان کی نگہبانی کرتے ہیں، اس کے لئے کوشاں رہتے ہیں، ظاہر میں

بھی اور چھپ کر بھی، فردی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی۔ کسی بھی حوالے سے اللہ کی حدود سے تجاوز نہیں کرتے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ پچھلی آیت کی طرح اس آیت میں بھی مومنین کو بشارت دے رہا ہے اور مومنوں کے لئے یہ بہت بڑی کامیابی اور اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾

”پیغمبر اور مسلمانوں کو یہ بات مناسب نہیں کہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں جب کہ ان پر ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ دوزخی ہیں“۔

مشرکین کے لئے دُعا کرنا

اس آیت میں ایک واضح بات بتادی گئی ہے کہ جن کا دوزخی ہونا حتمی ہو چکا ہے ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنا بے ثمر اور بے فائدہ ہے اور ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ مومن متواضع ہوتا ہے اور اللہ کے سامنے عاجزی کرتا ہے لہٰذا وہ بے ہودہ عمل انجام نہیں دیتا۔ لہٰذا وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں، مشرک ہیں، جنہوں نے عبودیت کا لباس اپنے تن سے اُتار دیا ہے اگرچہ ان کے ساتھ خونی رشتہ ہی کیوں نہ ہو ان کے لیے مغفرت کی دعا کیسے کی جا سکتی ہے؟ جب اللہ تعالیٰ کی بات آتی ہے تو عقیدتی اور ایمانی رابطہ معتبر ہوتا ہے، نسبی اور خونی رابطہ معتبر نہیں ہوتا۔ اس بنا پر مشرکین کے لئے استغفار کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ نہ نبی پاک ﷺ نے ان کے لئے دعا مانگی ہے اور نہ ہی مومنین نے دعا مانگی ہے کیونکہ یہ دعا بے اثر اور بے فائدہ ہے۔

وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝۱۱۴

''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا ایک وعدہ کے سبب سے تھا جو وہ اس سے کر چکے تھے، پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے، بے شک ابراہیم بڑے نرم دل تحمل والے تھے''۔

چچا کے لیے ابراہیمؑ کی دُعا

ظاہر ہے ابراہیم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں اور امام الانبیاء ہیں، انبیاء میں پہلی دفعہ امامت کا عہدہ انہیں ملا ہے۔ انبیاء کے ماں باپ نہ تو مشرک ہوتے ہیں اور نہ ہی بت پرست۔ ابراہیم علیہ السلام کے والد پہلے ہی وفات پا چکے تھے اور ان کے چچا نے ان کو سنبھالا ہوا تھا اس لئے انہوں نے اللہ سے دُعا مانگی کہ انہیں معاف کر دے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شروع میں خیال یہ تھا کہ وہ اللہ کا دشمن نہیں ہے، سرکش نہیں ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان کے پاس رہنے کی وجہ سے ان کے ساتھ ایک تعلق تھا تو اُس رابطے اور تعلق کی وجہ سے ایسا کیا۔

لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے یہ بات مسلم اور یقینی ہو گئی کہ وہ دشمن خدا اور مشرک ہے اور گمراہی پر اصرار کر رہا ہے اور اللہ پر ایمان لانے میں تکبر کر رہا ہے اور شرک کی پلیدی اور نجاست سے نکلنے کے لئے تیار نہیں ہے تو فوراً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے بیزاری کا اعلان کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت خدا ترس تھے اور خدا کی درگاہ میں گریہ و زاری کرتے تھے اور کیونکہ اپنے چچا کو وعدہ دیا تھا کہ ان کے حق میں بھلائی کریں گے تو اس وعدے کے تحت ان کے لئے دُعا مانگی تھی لیکن جب بعد میں پتہ چلا کہ وہ شرک پر برقرار ہے

تو پھر ان سے بیزاری کا اعلان کر دیا۔[1]

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

"اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کسی قوم کو صحیح راستہ بتلانے کے بعد گمراہ کر دے جب تک ان پر واضح نہ کر دے وہ چیز جس سے انہیں بچنا چاہیے، بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے"۔

خدا کسی قوم کو بغیر بتائے گمراہ نہیں کرتا

اس آیت میں مومنین کو خبردار کیا گیا ہے کہ اگر تقویٰ نہیں ہو گا اور اللہ تعالیٰ نے جن اعمال کو بجا لانے کا حکم دیا ہے انہیں انجام نہ دیں یا جن اعمال سے منع کیا ہے ان سے پرہیز نہ کریں تو پھر خدا انہیں ہدایت کے دوبارہ گمراہ کرے گا۔ جب خدا کی طرف سے ہدایت نہ ملے تو پھر گمراہ ہو جائیں گے۔ سابقہ آیات کے سیاق میں اس آیت کا معنی یہ ہو گا کہ اے مومنو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں کافروں سے دوستی سے منع کیا ہے، مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے منع کیا ہے اور دشمنان خدا کے ساتھ تعلق اور برادری رکھنے اور اُن کو اپنا سرپرست بنانے سے منع کیا ہے، اب اگر تم ان چیزوں سے دوری نہ کرو گے تو خدا تمہیں ہدایت سے

---

[1] ۔ عربی زبان میں لفظ "اب" چچا اور والد دونوں کے لئے بولا جاتا ہے اور مسلمہ روایات سے ثابت ہے کہ انبیاء کے والدین موحد اور توحید پرست ہوتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جو خلیل اللہ ہیں، کس طرح ان کے والد مشرک ہو سکتے ہیں؟ یہاں "اب" بولا گیا ہے والد نہیں بولا گیا، والد اس پر بولا جاتا ہے، انسان جس کی اولاد ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ شخص حضرت ابراہیم کے چچا تھے والد نہیں تھے۔ (مترجم)

محروم کر دے گا۔ ان ساری چیزوں کے بارے میں اللہ عالم ہے، دانا ہے، حکیم ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کسی قوم کو دی ہوئی نعمت کو اس وقت تک اس سے نہیں چھین لیتا جب تک وہ خود اس نعمت کے زوال کے اسباب فراہم نہیں کرتے جیسا کہ (سورہ انفال، آیت ۵۳) میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۵۳﴾

ترجمہ: ''ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عنایت فرماتا ہے اس وقت تک اسے نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے نہیں بدلتے اور یہ کہ اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے''۔

یہاں بھی ایسا ہے کہ جن مومنوں کو ہدایت ملی ہے اگر وہ ان کاموں سے نہ رکیں جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے اور ان کاموں کو انجام نہ دیں جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے تو پھر انہیں جو نعمت ایمان ملی ہے وہ واپس ہو سکتی ہے۔ لہٰذا مومن خبردار رہیں اور ایسا نہ ہو کہ وہ ایمان کے بعد گمراہی میں چلے جائیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

''آسمانوں اور زمین میں اللہ ہی کی سلطنت ہے، وہی زندگی دیتا ہے اور مارتا ہے، اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں''۔

اللہ کی مالکیت

پچھلی آیت میں مومنین کو مشرکین کے لئے استغفار کرنے اور اُن سے دوستی کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ اس آیت میں اس کی وجہ بتائی جا رہی ہے کہ تمہیں اس لیے روکا گیا ہے کہ

ساری ہستی کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، ہر چیز اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہی پروردگار یگانہ ہے اور اپنی الوہیت کے تحت مارتا بھی ہے اور زندہ بھی کرتا ہے۔ حیات دینا و موت دینا یہ دو الوہیت کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ہستی کے تمام امور کی تدبیر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں اللہ کے دشمنوں سے بیزاری اختیار کرنے کا اس لئے کہا گیا کیونکہ اللہ کے سواء کوئی تمہارا حقیقی ولی اور یاور نہیں ہے، غیر خدا کو اپنا یاور اور ولی مت بناؤ اور نہ ہی ان سے مدد لو اور نہ ہی وہ تمہاری مدد کرنے کے قابل ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ غیر اللہ کافر ہوں یا مشرک یا منافق یا اہل بدعت یا گمراہ اور آیات الٰہی کا انکار کرنے والے ہوں یا بعض گناہ کبیرہ پر اصرار کرنے والے ہوں جیسے رشوت خواری، اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے جنگ، مومنین سے جنگ اور اس کے علاوہ جو بڑے گناہ ہیں۔ لہٰذا ولایت اور سرپرستی سب اللہ کیلئے ہے کسی اور کیلئے نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ مال، جان اور نسبی تعلق داریوں اور رشتہ داریوں سے نکلو اور فقط اپنے رب تعالیٰ کے حضور میں تسلیم رہو کیونکہ سارے امور کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہی سب کا مددگار ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

”اللہ نے نبی کے حال پر رحمت سے توجہ فرمائی اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا بعد اس کے کہ ان میں سے بعض کے دل پھر جانے کے قریب تھے پھر اپنی رحمت سے ان پر توجہ فرمائی، بے شک وہ ان پر شفقت کرنے والا مہربان ہے“۔

پیغمبرؐ اور مومنین پر اللہ کی رحمت

اللہ تعالیٰ کا پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی رحمت واسعہ کے ساتھ اپنے نبیؐ کی جانب رجوع کیا، بغیر اس کے کہ پیغمبرؐ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہو، کیونکہ پیغمبرؐ تو معصوم ہیں لیکن مہاجرین اور انصار کا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے انہیں توبہ کی توفیق دی اور انہوں نے توبہ کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف رجوع کیا تو رب تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت واسعہ کے سائے میں لے لیا اور ان کی توبہ قبول کرلی۔ مہاجرین اور انصار سے وہ لوگ مراد ہیں جو سخت دنوں اور انتہائی مشکلات کے زمانے میں جیسے جنگ تبوک کا دور تھا، بھوک تھی، پیاس تھی سخت گرمی تھی، جس نے سب کو بے تاب کر دیا تھا لیکن انہوں نے پھر بھی پیغمبرؐ کی پیروی کی۔ یہ ایسا دور تھا جس میں قریب تھا کہ کچھ لوگ جنگ تبوک کو ہی چھوڑ دیں یا جنگ کے لئے مدینے سے ہی نہ نکلیں، حق سے منحرف ہو جائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت واسعہ کے ساتھ ان کی طرف رخ کیا لہٰذا وہ لوگ پیغمبرؐ کی پیروی کی جانب واپس لوٹے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے قلبی انحراف سے در گزر کیا اور ان کی طرف اللہ اپنی رحمت کے ساتھ آیا اور انہیں معاف کر دیا کیونکہ اللہ بہت مہربان ہے اور بندوں کی کمزوری سے آگاہ ہے۔ اسی لیے وہ اپنی رحمت واسعہ کے صدقے ان سب سے در گزر کرتا ہے اور ان کی توبہ قبول کرتا ہے۔

اگرچہ پیغمبر اکرم ﷺ کسی قسم کے انحراف کے مرتکب نہیں ہوئے تھے اس کے باوجود آپؐ کا ذکر مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس لیے کیا گیا تاکہ ان کو حوصلہ ملے اور وہ اپنی غلطی پر شرمندہ نہ ہوں اور معلوم رہے کہ سارے مومنین ایک دوسرے کی مانند ہیں اور خدا ہے جو اپنی رحمت واسعہ ان پر نازل کرتا ہے اور انہیں انحراف سے بچاتا ہے۔ درحقیقت رسول خداؐ پر اللہ کی توبہ؛ اُمت پر توبہ ہے اُمت کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے اور پیغمبرؐ اللہ کی رحمت

کے نزول کا واسطہ ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولؐ کی اُمت پر جو خیرات اور برکات آتی ہیں وہ اُن میں واسطہ ہیں۔

وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

''اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا، یہاں تک کہ جب ان پر زمین باوجود کشادہ ہونے کے تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر تنگ ہو گئیں اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ سے کوئی پناہ نہیں سوائے اسی کی طرف آنے کے، پھر بھی اپنی رحمت سے ان پر متوجہ ہوا تاکہ وہ توبہ کریں، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے''۔

تین معصیت کاروں کا تذکرہ

اس آیت میں چند معصیت کاروں کا واقعہ ذکر ہوا ہے۔ اوپر والی آیت کے برعکس کہ وہاں پر معصیت کے ارتکاب کے بغیر اللہ تعالیٰ نے پیغمبرؐ اور مومنین پر رحمت کی اور ان سے درگزر کیا تھا۔ اس آیت میں تین آدمیوں کا ماجرا ذکر ہوا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جنگ کے لیے نہیں نکلے۔ رسول پاک ﷺ اور مجاہدین کے چلے جانے کے بعد وہ پشیمان ہوئے کیونکہ لوگوں نے اُن سے سوشل بائیکاٹ کیا اور ان سے بات کرنا بھی بند کر دیا حتیٰ کہ ان کے گھر والوں نے ان سے بولنا بند کر دیا اور ان کے ساتھ بے توجہی کی۔ یہ بات سبب بنی کہ وہ اپنے آپ سے بھی تنگ آگئے اور زمین اپنی تمام وسعت کے ساتھ ان پر تنگ پڑ گئی اور سخت غم کی حالت میں انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ اللہ کے سوا کہیں پناہ نہیں ہے اور اُنہوں نے

طے کر لیا کہ وہ توبہ کرکے اور اللہ کی طرف رجوع کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی رحمت کے ساتھ ان کی طرف رجوع کیا اور ان کو توبہ کی توفیق دی اور ان کی توبہ قبول کی گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے بہت مہربان ہے۔

"تَوَّابُ" بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے اور رحمت اور ہدایت اسی کی جانب سے ہوتی ہے، وہی توبہ کی توفیق دیتا ہے اور بندے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہی انہیں اپنی طرف واپسی کی توفیق دیتا ہے اور جب وہ توبہ کرتے ہیں تو ان کی توبہ قبول کرتا ہے اور یہ اس کی رحمت واسعہ کی وجہ سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان اور رؤوف ہے۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ ﴿١١٩﴾

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور صادقین سے ہو جاؤ"۔

تقویٰ اور صادقین کی ہمراہی

اس آیت میں مومنین کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں یعنی جن کاموں کو انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے ان کو انجام دیں اور جن کو چھوڑنے کا کہا گیا ہے ان کو چھوڑیں۔ "صدق" کسی خبر کا واقعیت کے مطابق ہونے کو کہتے ہیں۔ اور انسان کو صادق اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کی خبر حقیقت اور واقعیت کے مطابق ہو۔ جس انسان کا عمل اس کے عقیدے کے مطابق ہو یا جس کے سارے کام ارادہ، عزم اور فیصلے کے تحت ہوں تو اسے بھی استعارۃ کے طور پر صادق کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تقویٰ اختیار کریں، حرام کی ہوئی چیزیں چھوڑیں اور واجبات کو انجام دیں، گناہ سے بچیں اور اللہ کے غضب سے خود کو بچائیں۔ پھر ساتھ حکم دیا ہے کہ سچوں کے ساتھ ہو جاؤ جو کردار میں، گفتار میں، رفتار میں

سچے ہیں ان کے ساتھ ہو جاؤ۔[1]

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَّتَخَلَّفُوا عَنْ رَّسُولِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَّغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۭ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۲۰﴾

''مدینہ والوں اور ان کے آس پاس دیہات کے رہنے والوں کو یہ مناسب نہیں تھا کہ اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ کہ اپنی جانوں کو اس کی جان سے زیادہ عزیز سمجھیں، یہ اس لیے ہے کہ انہیں اللہ کی راہ میں جو تکلیف پہنچتی ہے پیاس کی یا ماندگی کی یا بھوک کی یا وہ ایسی جگہ چلتے ہیں جو کافروں کے غصہ کو بھڑکائے اور یا کافروں سے کوئی چیز چھین لیتے ہیں ہر بات پر ان کے لیے عمل صالح لکھا جاتا ہے، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا''۔

---

[1] ۔ روایات آئمہ اہل البیتؑ میں سے معلوم ہوتا ہے کہ صادقین سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی خلفاء مراد ہیں اور وہ بارہ امام علیہم السلام ہیں اور صادقین کا صحیح مصداق وہی ہیں یعنی تم سب آئمہ اطہار علیہم السلام کے ساتھ ہو جاؤ۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو حقیقی خلفاء ہیں اُن کی اتباع کرو۔ (مترجم)

رسول اللہؐ کی مخالفت سے منع

اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ اہل مدینہ اور مدینہ کے اطراف میں رہنے والے اعراب کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ جہاد کے امر میں یا اس کے علاوہ دوسرے امور میں رسول اللہ ﷺ کے امر کی مخالفت کریں۔ ان کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ اپنے کاموں میں لگے رہنے کی وجہ سے بھی رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو اہمیت نہ دیں۔ یعنی جنگ کے خطرے اور سفر کی سختیوں اور زندگی کی لذات میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ رسول خدا ﷺ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔

اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جہاد کی راہ میں آنے والی ہر مصیبت جیسے بھوک، پیاس اور دوسری تکالیف اور جتنا بھی وہ سرزمین پر سفر کریں گے اور اسے کافروں کو ناراض کریں گے اور ان کو تکلیف پہنچائیں گے تو یہ عمل حسنہ اور نیکی ہے اور ان کے نامۂ اعمال میں عمل صالح لکھا جائے گا۔ کیونکہ یہ لوگ نیکوکار اور محسن ہیں، خدا بھی نیکوکاروں کے عمل کو تباہ نہیں کرتا بلکہ ان کا پورا پورا بدلہ دیتا ہے، اس میں سے کچھ کم نہیں کرتا اور انہیں پورا ثواب دیتا ہے۔ بلکہ اپنے فضل سے انہیں ان کا جتنا حق بنتا تھا اس سے زیادہ بھی دیتا ہے۔ اور ترجمہ میں اصل یوں ہے کہ جب وہ سفر کرتے ہیں تو اس میں جو پیاس برداشت کرتے ہیں، جو تکالیف دیکھتے ہیں، انہیں جو مصیبت آتی ہے اللہ کی راہ میں اور کسی بھی وہ جگہ قدم رکھتے تو جس کی وجہ سے کافروں کو وہ غضب میں لے آتے ہیں تو مومن پر واضح رہے کہ دشمن سے کوئی بھی تکلیف انہیں نہیں پہنچتی مگر یہ کہ اُن کے لئے عمل صالح لکھا جاتا ہے ان کے نامہ عمل میں نیکی لکھی جاتی ہے۔ یہ سب مجاہدین کی تعریف میں ہے۔

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

''اور جو وہ تھوڑا یا بہت خرچ کرتے ہیں یا وہ کسی وادی سے گزرتے ہیں تو یہ سب کچھ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ انہیں ان کے اعمال کا اچھا بدلہ دے''۔

عمل سے بہتر جزاء

راہ خدا میں جو بھی خرچ کیا جائے کم ہو یا زیادہ، راہ خدا میں جو سفر کیا جائے، جو راستہ طے کیا جائے سب لکھا جاتا ہے اور اس کا بہترین اجر دیا جاتا ہے اور یہ سب محفوظ ہوتا ہے ۔ صاحب عمل کو عمل سے بہتر جزاء ملتی ہے۔ اُن کی زیادہ تر توجہ ہوتی ہے کہ ان کا عمل اور اچھا ہو تو اس کا ثواب اور اس کا بدلہ بہترین ہوتا ہے اُن کے اعمال سے اجر زیادہ دیا جاتا ہے۔ یہاں پر بہترین اعمال سے مراد راہ خدا میں جہاد ہے کیونکہ جہاد دشوار ترین عمل ہے ، جس عمل میں سب سے زیادہ مشقت ہو گی وہی سب سے زیادہ فضیلت والا ہو گا۔ کیونکہ جہاد میں دین کی طرف دعوت ہوتی ہے اور اسی سے دین کی مضبوطی ہوتی ہے اس لیے جہاد بہترین عمل ہے۔ عمل کی جزاء حقیقت میں خود عمل ہی ہے جو اللہ کے پاس گیا ہے اور حقیقت میں بہترین جزاء وہی بہترین اعمال ہیں لہٰذا بہترین اعمال کے ذریعہ جزاء دیناہی بہترین جزاء ہے

اس آیت کا دوسرا معنی اس طرح کر سکتے ہیں کہ اللہ بزرگ و برتر ان کے ان گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ نیک اعمال انجام دینے کے دوران ہو جاتے ہیں اسی طرح ان اعمال میں کمزوری و نقص رہ جاتا ہے ، اللہ اس کو بھی دُور کر دیتا ہے، گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور نقائص کو دور کر دیتا ہے۔ اسی طرح ان کا نیک عمل، نیک تر میں تبدیل ہو جاتا ہے، عمل احسن ہو جاتا ہے اور اس طرح اُس عمل کی جزاء نیک تر اور بہتر ہو جاتی ہے۔

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''اور ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ سارے مومنین (گھر سے) نکل کھڑے ہوں، یوں کیوں نہ کیا کہ ان ''مومنوں'' کے ہر گروہ سے کچھ افراد ''گھر سے'' نکل جاتے تاکہ دین کا علم اور دین کی سمجھ حاصل کر لیتے اور جب وہ واپس پلٹتے تو اپنی قوم کے پاس تو ان کو ڈراتے کہ وہ ڈرتے اور (عذاب سے چوکنے ہو جاتے)''۔

دینی تعلیم سیکھنے کے لیے سفر کرنے کا حکم

اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ دینی تعلیمات حاصل کرنے اور دین سیکھنے کے لیے سب کو گھر سے نہیں نکلنا چاہیے، بلکہ ہر قوم سے ایک گروہ گھر سے نکل جائے اور باہر جا کر دینی تعلیمات حاصل کر کے واپس اپنی قوم کے پاس آئے، دین کا علم لے کر آئے اور واپسی پر اپنی قوم میں آکر قوم کو ڈرائیں ہو سکتا ہے ان کے ڈرانے سے عذاب الٰہی سے ڈر جائیں۔ اس جگہ مراد یہ ہے کہ ہر قوم میں سے ایک گروہ مدینہ چلا آئے اور آکر پیغمبر اکرم ﷺ سے دینی معلومات لے اور معلومات لے کر پھر اپنے شہر میں واپس چلا جائے۔ جب واپس پلٹیں تو وہ اپنی قوم کو ڈرائیں، انہیں دینی احکام کی مخالفت سے خبردار کریں، اصول و فروع دین ان کو سمجھائیں۔

اس آیت سے یہ مطلب بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ علم دین کے طلباء سے جہاد کا فریضہ ساقط ہے کیونکہ ان کا کام لوگوں کو اللہ کے احکام کی مخالفت سے ڈرانا ہے، اُنہیں خبردار کرنا اور چوکنا رکھنا ہے۔ ان کا مقصد گھٹیا اور پست مقاصد میں غرق ہونا نہیں جیسے عنوان، عہدہ،

صدارت، ظالموں جیسا بننا ان جیسا لباس پہننا، ان جیسی غذا کھانا اور زندگی کے دیگر معاملات میں اُن جیسا ہونا۔ کیونکہ جو دین کی معلومات حاصل کرنے جاتے ہیں وہ دین کا نمونہ بنتے ہیں۔اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر عالم فاسد ہو جائے تو پورا جہاں فاسد ہو جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں اگر اہل علم کی بات درست ہو تو علاج ہے، اگر اس کی بات درست نہ ہو تو درد اور بیماری ہے۔

اس آیت میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے، ایک بات تو یہ ہے کہ دین کی تعلیم لینے کے لئے کچھ افراد اپنے آپ کو وقف کریں اور دین کی معلومات لیں اور ان کی غرض یہ ہو کہ وہ اپنی قوم کے پاس واپس آکر قوم کو دینی معارف بتائیں گے اور انہیں دین کی مخالفت سے ڈرائیں گے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ جو گروہ علم دین حاصل کرنے کے لئے جاتا ہے تو پھر ان سے جہاد پر جانے کا امر ساقط ہو جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر سارے ایک ہی کام کے لئے نکل کھڑے ہوں تو معاشرے کی دوسری ضروریات کو پورا کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔اسی سے اشارہ ملتا ہے کہ معاشرے کے لئے ڈاکٹر کی بھی ضرورت ہے،انجینئر کی بھی ضرورت ہے، سائنسدان کی بھی ضرورت ہے، مختلف ماہرین کی بھی ضرورت ہے تو ہر شعبہ کے لئے ماہر تیار ہونے چاہئیں اور پھر ہر کوئی اپنا اپنا کام انجام دے اور ان میں سب سے بڑا شعبہ دین کی معرفت اور دین کی آگاہی اور دینی معارف سے آشنائی ہے تو اس کے لئے بھی باقاعدہ ایک گروہ ہونا چاہیے آج بھی اسی طرح ہے ہر علاقے، ہر ملک سے کچھ لوگ اپنے آپ کو اسی کام کے لئے وقف کر دیں اور جو علمی مراکز ہیں جہاں پر دین کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں پر جائیں اور واپس اپنے اپنے علاقے میں آکر دین کے مبلغ بنیں۔اس آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ جو لوگ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے علمی مرکز میں گئے ہیں وہ علم دین حاصل کرنے کے لئے بعد اسی جگہ نہ ٹھہر جائیں بلکہ ایک عرصہ تک وہاں پر رہیں اور پھر واپس اپنے گھر اپنی قوم کے پاس لوٹ آئیں اور اپنی قوم میں آکر دین کی تعلیم دیں، دینی احکام کی تبلیغ کریں،

مومنوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں انہیں تبلیغ کا فریضہ انجام دینا ہوگا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَ لْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اے ایمان والو! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تم میں سختی پائیں، اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے''۔

عمومی جہاد کا حکم

اس آیت میں مسلمانوں کو عمومی جہاد کا حکم دیا گیا ہے تاکہ دُنیا کے ہر کونے میں اسلام پھیلے اور وہ لوگ جو اسلام کے لیے رکاوٹ ہیں اُن کے خلاف جہاد کیا جائے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کوشش کرے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کرے اور ہدایت اور اسلام کی نعمت وسعت پائے اور پوری روئے زمین پر پھیل جائے اور غیر مسلم پرچم سرنگوں ہوں اور اسلام کا پرچم پورے عالم میں لہرائے اور تمام غیر الٰہی ادیان اور شرائع نابود ہوں۔ پھر فرمایا کہ کفار کو سمجھ آئے کہ تم اُن کے ساتھ سختی سے نپٹتے ہو، اُن کے بارے میں اچھے تصورات نہیں رکھتے ہو تاکہ وہ تمہارے فرمانبردار بن جائیں اور کلمۂ توحید کو قبول کریں، کفر کو چھوڑ دیں۔ یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے، اُن کی تائید فرماتا ہے، اللہ تعالی ان کی مدد کرے گا پس تمہیں کوشش کرنی چاہیے اور الٰہی حدود اور اوامر کی پابندی کرنی چاہیے تاکہ خداوند تبارک و تعالیٰ تمہاری مدد کرے۔

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

"اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان کو بڑھایا ہے، سو جو لوگ ایمان والے ہیں اس سورت نے ان کے ایمان کو بڑھایا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں"۔

آیات اُترنے سے ایمان میں اضافہ

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال ایسے شخص نے کیا جس کے دل میں شک و تردید تھا، اُس نے اپنے دل میں قرآن کے نزول کا کوئی اثر مشاہدہ نہیں کیا، وہ خیال کرتا ہے کہ باقی بھی اسی کی طرح ہیں تو اس لئے وہ ایسے شخص کی تلاش میں تھا جس کے دل پر قرآن کے نزول سے اثر ہوا ہو۔ کیونکہ اس نے سنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ قرآن ہر دل کی اصلاح کرتا ہے چاہے وہ دل خاشع ہو یا منحرف اور حق سے پھرا ہوا۔ قرآن کی آیات کے نزول سے حق سے منحرف دل کا شک اور نفاق بڑھتا ہے۔ لیکن مومنین جن کے دل نفاق سے خالی ہیں، نفاق کی بیماری اُن میں نہیں ہے تو پھر قرآن کا نزول اُن میں ایمان کو زیادہ کرتا ہے اور اُن کے دل میں نور ہدایت کا چراغ روشن ہو جاتا ہے، اس کے لئے حق کو قبول کرنے کی اور آمادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں ایمان کا اضافہ کمیت کے اعتبار سے بھی ہے اور کیفیت کے اعتبار سے بھی ہے۔ نور ہدایت سبب بنتا ہے کہ اُس میں شرح صدر ہو اور اس کا سینہ وسیع ہو۔ اس کی وجہ سے ان کے چہروں پر رونق نظر آتی ہے، ایمان کی روشنی کا اثر اُن کے وجود پر موجود ہوتا ہے اور اُن میں چستی آتی ہے اور ان کے اندر حق کی خاطر جوش و ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔

وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ فَزَادَتۡهُمۡ رِجۡسًا اِلٰی رِجۡسِهِمۡ وَ مَاتُوۡا وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾

"اور جن کے دلوں میں مرض ہے سو ان کے حق میں نجاست پر نجاست بڑھ گئی اور وہ مرتے دم تک کافر ہی رہے"۔

بیمار دلوں کی بات

اہل شک اور اہل نفاق کے دل قرآن کی آیات سن کر نہ فقط خاشع و خاضع نہیں ہوتے اور اُن کا ایمان نہیں بڑھتا بلکہ اُن کی گمراہی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اُن کا باطن پلید ہوتا جاتا ہے اور اس میں پلیدی اور بڑھ جاتی ہے۔ ان کی نجاست اور بڑھ جاتی ہے اور یہ حالت انہیں کفر کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے اور وہ اس طرح دُنیا سے جاتے ہیں کہ اُن کے دل شک، انکار اور کفر سے بھرے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ اسراء کی آیت ۸۲ میں ارشاد فرمایا ہے:

"اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے تو شفاء اور رحمت ہے لیکن ظالموں کے لیے تو صرف خسارے میں اضافہ ہی کرتی ہے"

اَوَ لَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

"کیا نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال میں ایک دفعہ یا دو دفعہ آزمائے جاتے ہیں پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں"۔

توبہ نہ کرنے والے

اس آیت میں بیان کیا جا رہا ہے کہ ہر سال ایک یا دو بار امتحان اور آزمائش میں واقع ہوتے ہیں اور اُس امتحان کے نتیجے میں بجائے اس کے کہ حالت گناہ سے نکل آئیں وہ اس امتحان میں ناکام ہوتے ہیں اور معصیت کرتے ہیں۔ توبہ نہیں کرتے اور غفلت سے بھی نہیں

نکلتے اور اس راستے میں تفکر اور سوچتے بھی نہیں ہیں، متوجہ بھی نہیں ہوتے اور اپنی ذمہ داری کی تشخیص بھی نہیں دیتے اور یقینی بات ہے کہ اس روش کا تسلسل اور اسے اسی طرح جاری رکھنا تو ہر سال ایک نجاست کے اوپر دوسری نجاست آجاتی ہے اور اس طرح اُن کا امر دائمی ہلاکت اور ہمیشہ کے گھاٹے اور نقصان پر ختم ہوتا ہے۔

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ یَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

”اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتا ہے کہ کیا کوئی مسلمان تو تمہیں نہیں دیکھ رہا پھر (وہ نظر بچا کر) چل نکلتے ہیں، اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں اس لیے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے“۔

منافقین کی کیفیت

اس آیت میں منافقین کی ایک اور خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ جب کوئی سورہ نازل ہوتی ہے تو وہ ایک عجیب نگاہ کرتے ہیں اور اُس نگاہ کے ساتھ ہی وہ یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ کوئی تمہیں دیکھ تو نہیں رہا ہے کیونکہ وہ ڈر رہے ہوتے ہیں کہ اُن کا اندرونی اضطراب اور باطنی نفاق ان کے چہروں پر ظاہر نہ ہو اور دوسرے ان کے اندرونی اور باطنی راز سے واقف نہ ہو جائیں۔ لہٰذا اپنے جیسوں سے پوچھتے ہیں اور اُن کی حالت اور اُن کی موقعیت کے بارے میں پوچھتے ہیں تاکہ جان لیں کہ کوئی تو ان کے اطراف میں ایسا نہیں جو ان کی وضع سے باخبر ہو گیا ہو۔

یہ بات اُن لوگوں کی ہے جن میں اللہ کی آیات سننے کی طاقت اور ہمت نہیں ہوتی اور پھر پیغمبر کے پاس واپس پلٹتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو آیات الٰہی وصول

کرنے اور ان کو یاد کرنے سے روک رکھا ہے وہ ان پر ایمان لے آئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ گونگے، بہرے ہیں، اندھے ہیں اور یہ حق کے بارے میں تعقل نہیں کرتے اور سوچتے نہیں۔ حقیقت میں یہ ایسا کلام ہے جو اللہ کی جانب سے ان منافقین پر نفرین ہے جن کے دل میں نفاق بھرا ہوا ہے اور وہ شک و تردید کی حالت میں ہیں۔ یہ اللہ کی آیات کو سُنا اَن سُنا کر دیتے ہیں اور اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں بناتے ہیں۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

"البتہ تحقیق تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آیا ہے، اسے تمہاری تکلیف گراں معلوم ہوتی ہے تمہاری بھلائی پر، وہ حریص (فکرمند) ہے مومنوں پر، نہایت شفقت کرنے والا مہربان ہے"۔

رسول اللہؐ کی خصوصیت

اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرمارہا ہے کہ جو پیغمبر تمہارے پاس آیا ہے وہ تمہاری نوع سے ہے۔ اس کے اوصاف یہ ہیں کہ وہ تمہارے نقصان کو نہیں دیکھ سکتا، تمہاری نابودی اور ہلاکت دیکھ کر اسے تکلیف ہوتی ہے اور وہ تم سب کا خیر خواہ ہے، وہ چاہتا ہے کہ تم سب ہدایت پا جاؤ۔ مومن اور کافر سب کے بارے میں اس کا ایک ہی خیال ہے، وہ سب کا ہمدرد ہے، مومنین کے لئے مہربان اور رووٴف ہے۔ جن کی ایسی اچھی صفات ہوں تم کیوں اس سے منہ موڑتے ہو اور اس کی بات نہیں مانتے ہو؟ تمہیں چاہیے کہ تم ایسے ہمدرد اور مہربان کی ہر بات کی پیروی کرو اس کے مطیع و فرمانبردار بنو کیونکہ وہ رسول ہے جو اللہ کے حکم رائج کرتا ہے اور تمہارا خیر خواہ ہے، اس کی اطاعت کرنا اللہ کی اطاعت کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خدا نے

اپنے رسول کے علاوہ کسی کے لئے دو نام قرار نہیں دیے۔ یہ فقط رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو رؤف کا نام بھی دیا ہے اور رحیم کا نام بھی دیا ہے اور یہ حضور پاک ﷺ کی بڑی شان ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿١٢٩﴾

''پھر اگر یہ لوگ پھر جائیں تو کہہ دو کہ مجھے اللہ ہی کافی ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں، اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے''۔

رسول پاکؐ کی حوصلہ افزائی

یہاں پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و پیروی کے واجب ہونے کی وجہ بتائی جارہی ہے اور رسول خدا ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ اگر معاند اور شرپسند، سرکش اور منافق تیری پیروی نہیں کرتے تو ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے تمام ظاہری اسباب کو رد کیا ہے اور خدا لاشریک پر اعتماد کیا ہے تو پیغمبر اکرم ﷺ کیلئے خدا ہی کافی ہے۔ اللہ فرما رہا ہے آپؐ پریشان نہ ہوں چاہے دوسرے لوگ آپؐ کا ساتھ دیں یا نہ دیں۔ ان کی پرواہ نہ کرو اگر لوگ آپ کا ساتھ دیں گے تو اس میں ان ہی کا فائدہ ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود ہے ہی نہیں۔ توکل اسی پر ہے لہٰذا بندی اپنے پروردگار کو اپنے کاموں کا وکیل بنائے اور اسے اپنے امور کا مدبر جانے، وہی مسبّب الاسباب ہے اسی پر تکیہ کرنا چاہیے، اسی پر بھروسہ ہو اور ظاہری اسباب پر کوئی اعتماد نہ رکھتا اور تمام اسباب کا اصل مسبّب اللہ ہی ہے۔ تمام اسباب کی جہاں بنیاد ہے وہاں اس نے ہاتھ ڈالا ہے اور وہ صاحبِ ملک ہے، اسی کی بادشاہت ہے، اسی کا اقتدار پوری ہستی پر چھایا ہوا ہے، تمام عوالم،

تمام کائنات اسی کے حکم کے تحت ہیں۔ لہٰذا اے میرے رسولؐ! اگر لوگ آپؐ کی پیروی نہیں کرتے تو اس سے فرق نہیں پڑتا، اگر وہ پیروی کریں گے تو یہ بات ان کے اپنے فائدے میں ہے اور اگر آپؐ کی پیروی نہ کریں گے تو آپ کو اس کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ ان سے کہہ دو میرے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے، مجھے اللہ کے سواء کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

سورہ یونس

(مکی۔ کل آیات 109)

سورت کے مطالب

اس سورہ کے اہم ترین مطالب میں لوگوں کو بشارت اور انذار کے ذریعے عقیدہ توحید سے متمسک رہنے کی تاکید، رسول خداﷺ اور ان کی امت کے درمیان عادلانہ فیصلہ کا بیان اور عقیدہ توحید کو جھٹلانے والوں کی رد شامل ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ۝۱

"ال ر، یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں"۔

کتاب حکیم قرآن کا تعارف

الف، لام، میم، حروف مقطعات اور قرآنی رموز سے ہیں؛ ان کا تعلق سورہ کے پورے مطالب سے ہوتا ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ بھی کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے رموز و اسرار سے آگاہ ہے۔ اس کے بعد قرآن حکیم کی آیات کی طرف "تِلۡکَ" کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے "تِلۡکَ" دور کے اشارے کے لیے آتا ہے۔ یہاں اس لئے لایا گیا ہے تاکہ ان آیات کی رفعت اور بلندی کی طرف اشارہ کیا جائے۔ یعنی آیات الٰہی کا مقام بہت بلند ہے اور یہ آیات اللہ تعالیٰ کا جو مقام ہے جو صاحب عرش ہے وہاں سے یہ نازل ہوئی ہیں۔ آیات، آیہ کی جمع ہے جو نشانی اور علامت کے معنی میں ہے۔ آیت کا لفظ خارجی چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر اللہ کی کتاب قرآن مجید کے اجزا مراد ہیں۔ قرآن حکیم کتاب ہے یعنی ایسی کتاب ہے جس میں کوئی نقص اور عیب موجود نہیں ہے۔ یا ایسی کتاب ہے جس

میں حکمت ، دانش اور علم ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کتاب حکیم سے لوح محفوظ مراد ہے۔ لیکن یہ بات گفتگو کے سیاق سے مناسبت نہیں رکھتی کہ کتاب حکیم سے لوح محفوظ مراد لی جائے۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲

”کیا اس بات سے لوگوں کو تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیج دی کہ سب آدمیوں کو ڈرائے اور جو ایمان لائیں انہیں یہ خوشخبری سنائے کہ انہیں اپنے رب کے ہاں پہنچ کر پورا مرتبہ ملے گا، کافر کہتے ہیں کہ یہ شخص صریح جادو گر ہے“۔

رسول اللہؐ پر وحی کا نزول

اس آیت میں استفہام انکاری کے ذریعے لوگوں سے پوچھا گیا ہے کہ کیا یہ لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ ہم نے قرآن کی شکل میں الٰہی معارف ان ہی میں سے ایک شخص کو دے دیے ہیں ؟ تاکہ وہ عام لوگوں کو ہماری مخالفت سے ڈرائے اور مومنوں کو بشارت دے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس حقیقی اور بڑی منزلت اور مقام ہے جیسا کہ سورۃ قمر کی آیت ۵۵ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۵۵

”سچی عزت کے مقام پر صاحب اقتدار بادشاہ کی بارگاہ میں“۔

یعنی ایک ایسی مجلس ہو گی جو ان کی پسندیدہ ہے اور وہ ایسے مالک کے پاس ہو گی جو

توانا اور مقتدر ہے۔ وحی الٰہی سرکش اور نافرمان لوگوں کے لیے انذار ہے اور مومنین کے لیے بشارت ہے۔ "مَقْعَدِ صِدْقٍ" کا دوسرا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ صدق سے سچائی کی طبیعت مراد ہے جس طرح جھوٹ کا ثابت قدم نہیں ہوتا اس کے قدم ہمیشہ لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں اسی طرح صدق اور سچائی کے بھی قدم ہوتے ہیں اور سچائی کے قدم استوار اور مستحکم ہوتے ہیں اور ان میں لغزش اور لڑکھڑاہٹ نہیں ہوتی۔

آخر میں فرمایا کہ کافروں نے پیغمبر اکرمؐ پر ساحر ہونے کی تہمت لگائی اور قرآن کو جادو قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک قرآن خارق العادہ امر تھا یعنی قرآن ایسا کلام ہے جو طبیعی اصولوں سے ہٹ کر ہے اس معنی میں کہ قرآن کریم اگرچہ ان ہی حروف تہجی سے مل کر بنا ہے جن سے لوگ اپنی کلام کو بناتے ہیں لیکن اس کی عبارت میں ایسی فصاحت اور بلاغت ہے جو عام آدمی کے بس میں نہیں ہے، بڑے سے بڑے فصیح و بلیغ افراد بھی ان حروف سے اس جیسا کلام نہیں تیار کر سکتے۔ لہٰذا جب وہ اس کلام کی ترکیب کو دیکھتے تھے تو وہ لوگ اس کتاب کے دلدادہ ہو جاتے۔ یہ کتاب لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن وہ اسے سحر و جادو کہتے تھے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

"بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر عرش پر براجمان ہوا، وہی ہر کام کا انتظام کرتا ہے، اس کی اجازت کے سوا کوئی سفارش کرنے والا نہیں ہے، یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے سو اسی کی عبادت کرو، کیا

تم پھر بھی نہیں سمجھتے"۔

کافروں کی تہمت کا جواب

اس آیت میں رسول خداﷺ پر لگائی گئی کفار کی اس تہمت کا جواب دیا گیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ پیغمبرؐ جادو گر ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن تمہیں صحیح معارف بتا رہا ہے اور حق کی جانب دعوت دے رہا ہے، یہ جادو نہیں ہے اور جن معارف کی طرف دعوت دی جارہی ہے ان میں سے ایک توحید ہے۔ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے عالم محسوس اور عالم مشہود کو چھ مرحلوں (چھ دن) میں بنایا ہے۔[1] چھ مرحلوں میں عالم محسوس بنائے جانے کا مطلب یہ ہے کہ زمین وآسمان کو بنایا اس کے بعد عالم غیر محسوس میں مصروف ہوگیا اور تدبیر کی کرسی پر بیٹھ گیا اپنی قدرت سے تمام امور کی تدبیر کی اور ہر شے کی تدبیر اللہ پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ پورے عالم کے امور کو اللہ تعالیٰ ہی چلارہا ہے۔ اللہ خالق ہے، مدبر ہے، خلق کا امر بھی اسی کے پاس ہے، عالم کی تدبیر بھی اسی کے پاس ہے، درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کا کوئی یاور و مددگار نہیں ہے یا کسی نے اس کی مدد نہیں کی۔ اگر عالم میں کسی کی مداخلت ہے یا اگر کوئی سفارشی بھی ہو تو اس کی اجازت سے شفیع ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پورے عالم اور کائنات کا اصلی سبب ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی سبب مستقل نہیں ہے۔ سارے ظاہری اسباب کو پروردگار نے ہی سبب بنایا ہے اور انہیں اپنے اور مخلوق کے درمیان واسطہ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسبّب الاسباب ہے، تمام اسباب کو سببیت دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

---

[1]۔ عالم کی خلقت اللہ کی قدرت سے چھ مرحلے میں مکمل ہوئی ہے۔ یا علم الٰہی کے چھ مرتبے تھے ان چھ مرحلوں کو بزرگان نے یوں بیان کیا ہے: خدا نے جانا، چاہا، ارادہ کیا، اندازہ لگایا، حکم چلایا اور فیصلہ دیا۔ اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ اسے اسی طرح جاری کردیا۔

آخر میں فرمایا کہ تمہارا رب ہی تمہارا خالق اور مدبر ہے، اسی کی عبادت کرو اسی کی بات مانو، اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ جو خالق ہے وہی مالک ہے، جو مالک ہے اسی کو قانون بنانے کا حق حاصل ہے، جو رب ہے اسی کی بات چلے گی۔ تم غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟ اس حقیقت کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتے؟ تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ تمہارا رب فقط اللہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور تمہارا معبود نہیں ہے۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۞

”تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، وہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے انہیں انصاف کے ساتھ بدلہ دے، اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے واسطے کھولتا ہوا پانی پینے کو ہوگا اور ان کے کفر کے سبب سے دردناک عذاب ہوگا“۔

معاد کا سچا وعدہ

پچھلی آیت میں مبداء اور خلقت کے آغاز کا تذکرہ ہوا ہے اور بتایا گیا کہ خلقت کا آغاز کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اب اس آیت میں معاد کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ معاد کا وعدہ حق پر مبنی ہے جیسا کہ سورۂ مرسلات آیت نمبر ۷ میں بھی ارشاد ہوا ہے:

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۞

ترجمہ: ”جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً واقع ہونے والی ہے“۔

”حق“ وہ چیز جو ثابت ہے، حقیقی اور واقعی ہے۔ معاد کے متعلق اللہ کا وعدہ حق

ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کی خلقت اس طرح کی ہے کہ جب تک تمام موجودات کی بازگشت اپنے خالق کی طرف نہ ہو یہ خلقت پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ جہاں سے خلقت کا آغاز ہوا تھا وہیں پر پھر واپس پہنچنا ہے۔

اس بارے سورۂ انشقاق آیت نمبر ۶ میں آیا ہے:

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝

ترجمہ: ''اے انسان! تو مشقت اٹھا کر اپنے رب کی طرف جانے والا ہے، پھر اس سے ملنے والا ہے''۔

جس طرح اگر ایک پتھر کو اوپر سے پھینکا جائے وہ اچھلتے اچھلتے زمین پر پہنچے گا، اسی طرح انسان اور عالَم کے تمام اجزاء کا جہاں سے آغاز ہوا تھا سب کی حرکت وہیں پر جا کر مکمل ہوگی۔

پھر معاد کی وجہ بتادی گئی ہے اور اس حوالے سے دو دلیلیں پیش کی گئی ہیں:۔

۱۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس عالم کی خلقت کا آغاز کیا ہے۔ اور وہی عالم اور اس میں موجود اشیاء کو ان کی اصلی منزل کی طرف پلٹائے گا۔ موجوداتِ عالم، خالق کے فیض سے وجود میں آئے ہیں اور ایک معین مدت تک اپنے کمال کو پہنچتے ہیں اور اپنی زندگی کو جاری رکھتے ہیں اور جب ان کی موت آجاتی ہے تو وہ فنا نہیں ہوتے اور ان کا وجود ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

۲۔ معاد کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نیک اور بد برابر نہیں ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن اور صالح کو قیامت کے دن ان کا عادلانہ اجر اور بدلہ دے اور کافر اور بے عمل کو برے اعمال کی سزا دے اور ان کو دردناک عذاب اور گرم اور کھولتا ہوا پانی پلایا جائے جو

ان کی انتڑیوں کو جلا کر رکھ دے گا کیونکہ وہ جو ایمان لے آیا اور عمل صالح کیا اور خضوع و خشوع کرتا رہا وہ اس کے برابر نہیں ہے جس نے کفر اختیار کیا، دشمنی کی، تکبر کیا۔ یہ دو گروہ دنیا میں طبیعی اسباب کے تحت برابر اور یکسان تھے اور دنیوی فائدوں اور نقصانات کے حوالے سے ان میں کوئی فرق نہیں تھا اس لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا دن ہو جس میں ان دو کو الگ الگ کیا جائے اور دونوں کو ان کے اعمال کا بدلہ اور ان کی جزا یا سزا دی جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر اللہ کی صفت عدل کی نفی ہو جائے گی جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات فعلیہ میں سے ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۵

”وہی ہے جس نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو منور فرمایا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب معلوم کر سکو، یہ سب کچھ اللہ نے تدبیر سے پیدا کیا ہے، وہ اپنی آیات سمجھداروں کے لیے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے“۔

سورج اور چاند کی خلقت کا مقصد

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نظام شمسی کا مقصد بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ نے سورج کو نورانی بنایا اور اسے روشنی دینے والے بنایا۔ چاند کو بھی منور فرمایا جو خورشید سے روشنی لیتا ہے۔ سورج کا نور اپنا ہے لیکن چاند کا نور اپنا نہیں ہے وہ سورج کی شعاعوں سے روشن ہوتا ہے اور سورج کی شعاعیں اسے چمکاتی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا ہے کہ ہم نے چاند کے لیے

منزلیں قرار دی ہیں یعنی آسمان میں اس کی جگہ اور شکل ہر رات بدلتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ تم اپنے دنوں اور مہینوں کا حساب کر سکو۔ پھر فرمایا کہ یہ ایک دقیق نظام ہے جو حق کی بنیاد پر خلق کیا گیا ہے اور اسے خلق کرنے کا ایک نتیجہ اور مقصد ہے جو حق پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس پر ایسے نتائج مرتب ہوتے ہیں جو حقیقی ہیں۔ اس پورے نظام ہستی کی خلقت نہ تو بے مقصد ہے اور نہ ہی بے ہدف، بے ہودہ اور بے غرض، بلکہ یہ سب ایک سوچ اور ایک ارادے اور ایک منصوبے کے ساتھ ایجاد ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس نظام کو خلق کیا گیا ہے تاکہ تمہاری زندگی کے امور کی تدبیر ہو، تمہاری معیشت کے معاملات مرتب ہوں، تمہارے معاد کی اصلاح ہو، کیونکہ تم نے اللہ کے پاس پلٹ کر جانا ہے۔ یہی دلیل ہے کہ اللہ پورے عالم کا مدبر ہے اور اس کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالی نے ان تکوینی اور خارجی یا لفظی آیات کو ان لوگوں کے لیے بیان کیا ہے جو اہل دقت ہیں، جو غور و فکر کرتے ہیں اور خلقت کی عظمت کو جانتے ہیں۔ تاکہ وہ اس کائنات کی عظمت اور اس دقیق نظام کو سمجھیں اور جانیں کہ یہ بغیر مدبر علیم اور خالق کے نہیں ہے اور پھر اس پر ایمان لے آئیں اور اس کو قبول کریں۔

اِنَّ فِی اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ ﴿۶﴾

”رات اور دن کے آنے جانے میں اور جو چیزیں اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کی ہیں ان میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں“۔

دن اور رات میں اللہ کی نشانیاں

زمین اپنے گرد گھومتی ہے اور زمین کا ایک حصہ سورج کی روشنی کے سامنے آتا ہے تو

اس سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ لیتا ہے اور رات کا طولانی اور دن کا چھوٹا ہونا بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ سال بھر میں مختلف فصلوں اور موسم کا وجود میں آنا یہ سب اللہ کا ایک دقیق نظام ہے جسے ہم نظام شمسی بھی کہتے ہیں۔ ان سب میں اللہ کا تقویٰ رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اہل تقویٰ کے لیے نشانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کے غضب سے بچنا چاہتا ہے اس کے لیے نشانی ہے۔

آسمانوں اور زمین کو اللہ تعالیٰ نے خلق کیا ہے۔ یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ یہ طے ہے اور پورے عالم کے موجودات میں سے ہر ایک موجود بتا رہا ہے کہ میرا خالق ہے جو حکیم بھی ہے اور مدبر بھی ہے۔ خود انسان ایک وسیع عالَم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ عالم ہستی کی تدبیر اور اس کے اجزا کے آپس میں ربط یہ سب بتا رہے ہیں کہ ان کا کوئی خالق ہے اور وہی ان کا مدبر ہے۔ اس نے نہایت احسن طریقے سے اس کی تدبیر کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ موجودات کی نشانیاں بتا رہی ہیں کہ رب تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ خلق و تدبیر سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ان سب کا مدبر ایک ہی ہے۔ اس لیے ان میں ٹکراؤ نہیں ہے اور ہر چیز اپنی جگہ پر مکمل ہے اور پورے سسٹم کے تحت ہے، ایک نظام کے تحت ہے، خود یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو اس کا بنانے والا ہے وہ علیم و حکیم ہے وہی مدبر ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور اس کو چلانے والا نہیں ہے اگر کوئی اور چلانے والا ہوتا تو ان میں ٹکراؤ ہوتا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ اطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۙ﴿۷﴾

"البتہ جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر خوش ہوئے اور اسی پر مطمئن ہو گئے اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں"۔

أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨﴾

"ان کا ٹھکانہ آگ ہے بسبب اس کے جو کرتے تھے"۔

روز جزا کے منکروں اور کافروں کا انجام

اس آیت میں کفار اور روز جزا اور معاد کا انکار کرنے والوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے مرنے کے بعد دوبارہ نہیں اٹھنا اور اللہ کے حضور پیش نہیں ہونا اور ان کا سارا ہم و غم اور ان کی سعی و تلاش اسی دنیا کی پست، گھٹیا اور مادی نعمات میں خلاصہ ہوئی ہے اور انہوں نے اسی پر اکتفا کر لیا ہے اور اسی سے ان کا دل مطمئن ہے اور آخرت کی سعادت حاصل کرنے سے وہ لوگ غافل ہیں اور آخرت کو بھول گئے ہیں اور دنیا میں غرق ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کی آیات سے غافل ہیں ان کی جزاء دوزخ کی آگ ہے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے جہنم جانے کی وجہ ان کے اپنے اعمال ہیں جو انہوں نے دنیا میں کیے ہیں۔ کیونکہ وہ معاد پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے جو دین کے بنیادی اصولوں میں سے ایک بنیادی اصل ہے۔ اصولی طور پر جب وہ معاد کے منکر ہوئے تو پھر جتنے بھی اللہ کے وعدے ہیں، اللہ نے جن چیزوں سے ڈرایا ہے، نبوت اور وحی سب کو پاؤں تلے روندتے ہیں اور دین کی بنیاد کو ہی باطل قرار دیتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص سرے سے معاد کو نہیں مانتا اور معاد کا منکر ہے، گفتار اور عمل دونوں میں معاد کا منکر ہے، دین کی کسی چیز کو قبول نہیں کرتا اور دنیا کا پابند ہے اور جو شخص گفتار میں تو معاد کو مانتا ہے لیکن عملی طور پر اس کا ہم و غم دنیا کی زندگی ہے اور اس نے آیات الٰہی کو بھلا دیا ہے اگرچہ لفظاً کہنے کی حد تک معاد پر عقیدہ رکھتا ہے کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے عمل کا نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ خدا کی یاد سے غافل ہونا ہے جس میں یہ دونوں شریک ہیں۔ اس بناء پر فقط معاد پر عقیدہ رکھنا اور معاد کا ذکر کر دینا کافی

نہیں ہے۔ لہٰذا جو اللہ کے ذکر سے غافل ہے اگرچہ معاد پر عقیدہ رکھتا ہو اور جو معاد کا کھل کر انکار کرتا ہے دونوں برابر ہیں اور ان دونوں کی سزا جہنم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ⑨

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے انہیں ان کا رب ان کے ایمان کے سبب ہدایت کرے گا، ان کے نیچے نعمت کے باغوں میں نہریں بہتی ہوں گی''۔

صالح مومنین کے لیے اللہ کی ہدایت

اس آیت میں مومنوں کی بات کی جارہی ہے جنہوں نے پیغمبر کی دعوت کو قبول کیا ہے، ایمان لے آئے اور نیک عمل کیا ہے تو خدا ان کو بدلہ دے گا اور ان کے ایمان کی وجہ سے ان کی ہدایت فرماتا ہے اور وہ اپنے رب کے پاس پہنچتے ہیں۔ جیساکہ سورہ رعد آیت نمبر ۲۷ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ'' ترجمہ: ''جو (اللہ کی طرف) رجوع کرتا ہے اپنی طرف اس کی راہنمائی فرماتا ہے ''۔ مومنین، ایمان کی وجہ سے قرب الٰہی کے مرتبے پر بلند ہو جاتے ہیں۔ عمل صالح، ایمان کو نتیجہ بخش بنا دیتا ہے۔ جس نے اللہ کی دعوت کو قبول کیا اور ایمان لے آیا اور نیک عمل انجام دیا تو اس کا عمل ایمان کو اوپر لے جاتا ہے۔

جیساکہ سورۂ فاطر کی آیت نمبر ۱۰ میں آیا ہے:

''اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ''

ترجمہ: ''پاکیزہ کلمات اسی کی طرف اوپر چلے جاتے ہیں اور نیک عمل اسے بلند کر دیتا ہے''۔

لہٰذا ایمان اور عقائد حقہ انسان کو مقام قرب میں لے جاتے ہیں۔ درحقیقت ہدایت کے وسائل اور مدارج ہیں جو آخر میں خدا تک جا کر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق فرمایا: وہ بہشت کی جاوادنی نعمات میں غرق ہیں جن کے نیچے نہریں چل رہی ہیں۔ حقیقی نعمت اللہ کی ولایت ہے جو تمام نعمتوں سے بلند اور اعلیٰ ہے جس کو اللہ کی ولایت مل جائے گویا اس کو سب کچھ مل گیا ہے۔

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۰

"اس جگہ ان کی دعا یہ ہوگی کہ اے اللہ! تیری ذات پاک ہے اور وہاں ان کا باہمی تحفہ سلام ہوگا، اور ان کی دعاء کا خاتمہ اس پر ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے"۔

اہل بہشت کی دعاء اور ان کا سلام

جب اولیاء اللہ جنت میں پہنچیں گے اور جنت کی نعمتوں میں غرق ہونگے تو اللہ اپنی کرامت کے صدقے میں ان کے دلوں کو ہر قسم کے شرک سے پاکیزہ بنا دے گا تو اللہ کی محبت کے سوا ان کے دل میں کسی کی محبت نہیں ہوگی۔ لہٰذا ان کی گفتار اور ان کا کلام اللہ کی تسبیح اور تقدیس کرنا ہوگا۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کی نفی کرتے ہیں جو اس کی کبریائی کے لائق نہیں ہے خدا کو ہر قسم کے شرک سے پاک و منزہ جانتے ہیں، اسم میں بھی اور معنی میں بھی ہر نقص اور ہر عدم سے اللہ کو منزہ جانتے ہیں۔ ان کی تسبیح زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی ہے اور دل سے بھی ہے کیونکہ اگر اس سے کم تر ہوگی تو اس میں شرک کا شائبہ ہوگا۔

اس لیے اللہ نے سورۃ یوسف کی آیت نمبر ۱۰۶ میں فرمایا:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ۝١٠٦

ترجمہ: ''ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان لائے بھی ہیں تو اس کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں''۔

ایمان کے ہوتے ہوئے مشرک ہوتے ہیں۔ اولیاء اللہ کا دل خیر و سلامتی سے مالا مال ہوتا ہے لہٰذا وہ ایک دوسرے کو سلام اور سلامتی کی دعا دیتے ہیں۔ دنیا میں سلام دینا ایک دوسرے کے لیے امن کی چاہت ہے۔ جب ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے آپ کے لیے خیر و سلامتی ہو، سلام کے جواب میں لیا جاتا ہے کہ آپ کے لیے بھی خیر و سلامتی ہو۔ لیکن آخرت میں امن مطلق سے مراد یہ ہے کہ وہاں کوئی بھی سلام اور خیر کے علاوہ کسی بات کا سامنا نہیں کرے گا۔ اگر کوئی سلام و خیر کو شر میں تبدیل کرے تو اولیاء اللہ بھی اس کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے خیر و سلامتی نہیں ہوگی۔ اولیاء اللہ اس لحاظ سے کہ ان کے دل نعمات الٰہی کی تعریف اور اس کی بزرگی بیان کرتے ہیں تو جب بھی انہیں کوئی نعمت ملتی ہے تو اس کے منعم اور جس نے نعمت دی ہے رب تعالیٰ کی یاد میں پڑ جاتے ہیں۔[1]

اولیاء اللہ کبھی بھی رب تعالیٰ سے غافل نہیں ہوتے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو دیکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کمال و جمال کی نشانی ہیں تو انہیں فوراً حق تعالیٰ کی جلالت و عظمت یاد آجاتی ہے جس کے نتیجہ میں ان کا ہر نعمت کی تعریف اور ستائش کرنا حقیقت میں رب تعالیٰ کے افعال و صفات جمیلہ کی ستائش اور تعریف کرنا اور اللہ کی حمد ہوتی ہے۔ ''حمد''

---

[1] - حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی بھی مخلوق کو نہیں دیکھا مگر یہ کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد خداوند متعال کا مشاہدہ کیا ہے؛ اولیاء اللہ دُنیا میں اس طرح ہوتے ہیں۔

اچھے اختیاری فعل کی تعریف کرنے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اولیاء اللہ بہشت میں کبھی بھی رب تعالیٰ کی تسبیح اور تحمید سے غفلت نہیں کرتے کیونکہ وہ رب کو حاضر دیکھ رہے ہوتے ہیں اور خود کو اس مقدس ذات کے سامنے موجود پا رہے ہوتے ہیں اس لیے وہ ہمیشہ زبان اور عمل دونوں سے تسبیح اور تمجید پروردگار میں مصروف ہوتے ہیں۔ جنت میں جانے والے سب ہی اولیاء اللہ بن چکے ہوتے ہیں لہٰذا ان کا وہاں پر کلام اور گفتار، سلام، امن اور خیر کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

وَ لَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾

"اور اگر اللہ لوگوں کو برائی جلد پہنچا دے جس طرح وہ بھلائی جلدی مانگتے ہیں تو ان کی عمر ختم کر دی جائے، سو ہم چھوڑے رکھتے ہیں ان لوگوں کو جنہیں ہماری ملاقات کی امید نہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں"۔

سرکش افراد کی حیرت اور گمراہی

"اِسْتِعْجَال" کسی چیز کو طلب کرنے میں جلدی کرنا اور اس چیز کے جلدی حاصل ہونے کے معنی میں ہے۔ "عمہ" سخت حیرت، پریشانی اور حیرانگی کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر وہ لوگوں کو عذاب اور شر دینے میں اس طرح جلدی کرتا یعنی ان کے عذاب کے مستحق ہوتے ہی ان پر عذاب بھیجنے میں اللہ جلدی کرتا جس طرح لوگ خیر حاصل کرنے میں اور نعمات حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کر دیتا اور ان کی عمر تمام ہو جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ عذاب دینے میں

جلدی نہیں کرتا اور معاد کے منکرین اور بے دین لوگوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ اپنی حیرت اور سر گردانی میں باقی رہیں اور انہیں سمجھ ہی نہ آئے کہ کس طرح طبیعی اسباب امر الٰہی کے تحقق کیلئے واسطہ بنتے ہیں۔

انسان طبیعی طور پر عجول اور جلد باز ہے اور چاہتا ہے کہ سارے علل و اسباب یکدم اکٹھے ہو جائیں تاکہ جلدی اسے خیر اور فائدہ مل جائے۔ لیکن طبیعی اسباب کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون انسانوں کی نفسانی خواہشات کے مطابق نہیں ہے، بلکہ اللہ کا قانون حکمت کی بنیاد پر ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کو فائدہ پہنچانے یا عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے لیے تباہی کے اسباب بنالیں اور اسباب پورے ہونے پر ہی انہیں خیر یا سزا دی جاتی ہے۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُیِّنَ لِلْمُسْرِفِیْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

"اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹے اور بیٹھے اور کھڑے ہونے کی حالت میں ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اس سے اس تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو وہ اس طرح گزر جاتا ہے گویا کہ ہمیں کسی تکلیف پہنچنے پر پکارا ہی نہ تھا، اس طرح بیباکوں (زیادہ روی کرنے والوں) کو پسند آیا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں"۔

تکلیف پہنچنے پر انسان کا مزاج

"ضُرّ" ان حادثات اور واقعات کو کہتے ہیں جو انسان کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ جب انسا ن پر کوئی بڑی مصیبت آن پڑتی ہے تو اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے وہ اللہ کو پکارتا ہے، اٹھتے

بیٹھتے، لیٹتے، سوتے ہر وقت اللہ کو یاد کرتا ہے، یااللہ، یہ مصیبت ٹال دے، جیسے ہی مصیبت ٹل جاتی ہے تو وہ اللہ کو بھول جاتا ہے کہ کس طرح وہ اللہ کو پکار رہا تھا اور پھر وہ اس دنیا کی زندگی میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنی خواہشات میں غرق ہو جاتا اور ذرا برابر بھی متوجہ نہیں ہوتا کہ اس نے جو دعا کی تھی جس وجہ سے اس سے مصیبت ٹل گئی تھی وہ حالت اسے یاد ہی نہیں رہتی، وہ اللہ کو بھلا دیتا ہے۔

اسراف کرنے والوں (وہ لوگ جو نعمات دنیوی کے استعمال میں زیاد روی کرتے ہیں) کے اعمال اس طرح ان کی نگاہ میں جلوہ گر ہوتے ہیں کہ وہ مکمل طور پر اپنے رب کو بھلا دیتے ہیں۔ اگر یہ افراد مصیبت آنے پر وقتی طور پر اللہ تعالیٰ کو یاد بھی کر لیتے ہیں تو جب وہ مصیبت ٹل جاتی ہے تو وہ پھر مادی لذتوں میں ایسے غرق ہو جاتے ہیں کہ وہ خدا کو بھول جاتے ہیں۔ ان کے اس انکار کی وجہ یہ ہے کہ شیطان نے ان کے اعمال کو خوبصورت بنا کر ان کے سامنے پیش کیا ہے اور یہ برے اعمال ان کے لیے اچھے لگ رہے ہوتے ہیں۔ وہ ان اعمال میں ایسے غرق ہو جاتے ہیں کہ مکمل طور پر اللہ کو بھلا دیتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعے ان کو متوجہ فرماتا ہے اور انہیں تذکر دیتا ہے تو پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے۔ جس کے نتیجے میں اللہ انہیں ان کے ظلم اور حدود سے تجاوز کرنے کے جرم میں ہلاک کر دیتا ہے۔ ستمگاروں کے متعلق یہی سنت الٰہی اور اللہ کا قانون ہے جس کے متعلق بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے:

وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

"اور البتہ ہم تم سے پہلے کئی امتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جب انہوں نے ظلم اختیار کیا، حالانکہ پیغمبر ان کے پاس کھلی نشانیاں لائے تھے اور وہ ہرگز ایمان لانے والے نہ

تھے، ہم گناہگاروں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں"۔

کفار اور مکذبین کا انجام

یہ آیت پچھلی بحث کا تتمہ ہے اور اس میں انذار کو شدت بخشنے کے لیے لوگوں کو براہ راست مخاطب قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ دیکھو اللہ کا قانون ایسا ہے کہ اس نے تم سے پہلے بھی ظالم اقوام جن کے پاس پیغمبر ان کھلے معجزے لے آئے لیکن وہ ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر پیغمبر اکرم ﷺ کو مخاطب قرار دے کر فرمایا: ہم مجرموں اور گنہگاروں کو اس طرح سزا دیتے ہیں۔ یہ خطاب ایسے شخص سے ہے جو اہل درک و اہل فہم ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی جو اس بات کو سمجھتے بھی ہیں اور اس کی صداقت پر ان کا مکمل ایمان بھی ہے۔ اگر مجرمین اس بات کو ٹھیک سمجھتے تو کفر نہ کرتے اور رسول ﷺ پر ایمان لے آتے۔ جب ایمان نہیں لائے تو مجرمین کے متعلق سنت الٰہی اور قانون یہی ہے کہ اللہ ان کو سزا دے گا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

"پھر ہم نے تمہیں ان کے بعد زمین میں نائب بنایا تاکہ دیکھیں تم کیا کرتے ہو"۔

مجرموں کے بعد آنے والی اقوام کی آزمائش

اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ایک قوم کو اس کے جرائم کی وجہ سے ہلاک کر دیتا ہے تو پھر اس کی جگہ دوسری قوم لے آتا ہے۔ تاکہ دیکھے کہ یہ لوگ کیسے عمل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ اقوام کی طرح ان کو بھی واضح دلائل دیے اور ان کے پاس بھی رسول آئے اور انہیں ہدایت دیتے تھے اگر وہ بھی انکار کرتے تو ان کو بھی ان

کے عمل کا نتیجہ ملتا۔ لہٰذا سنت الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے امتحان اور آزمائش کے قانون پر غور کرنا چاہیے۔ دنیاوی فوائد تھوڑی دیر کے لیے ہیں۔ ان میں ہمیشہ غرق نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون اٹل ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

"اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں، وہ لوگ کہتے ہیں جنہیں ہم سے ملاقات کی امید نہیں کہ اس کے سوا کوئی قرآن لے کر آؤ یا اسے بدل دو، تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اپنی طرف سے اسے بدل دوں، میں اسی کی تابعداری کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جائے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں بھی بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔

معاد کے منکروں کی بے جا درخواست

اس آیت میں بت پرستوں کی بات ہو رہی ہے جو بتوں کو مقدس سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ظلم اور گناہوں میں اس طرح غرق تھے کہ جب ان کے سامنے آیات الٰہی پڑھی جاتیں جو ان کی نفسانی خواہشات کے مطابق نہیں تھی تو وہ رسول ﷺ سے کہتے کہ ہمارے لیے اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آؤ اور اس کو تبدیل کرو۔ وہ رسول خدا ﷺ سے ایسا قرآن مانگ رہے تھے جو ان کی نفسانی خواہشات کے مطابق ہو اور انہیں ظلم سے منع نہ کرے،

شرک اور فحاشی کے ارتکاب سے نہ روکے۔ وہ چاہتے تھے کہ رسول خدا ﷺ قرآنی آیات کو اس طرح تبدیل کردیں کہ ان کی خواہشات کے مطابق ہو جائیں۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ ان کو جواب دو: قرآن کو تبدیل کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے کیونکہ قرآن میرا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ کی وحی ہے۔ میرا کام تو اللہ کی طرف سے دی گئی ذمہ داری کو پورا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرنا ہے۔ اگر میں نافرمانی کروں تو قیامت کے دن بڑے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ تم ایسی خواہش کر رہے ہو کہ گویا لگتا ہے کہ تم رب تعالیٰ کی ملاقات کی امید نہیں رکھتے، تمہیں روز جزا کا یقین نہیں ہے اور معاد اور قیامت کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے ہو، تمہیں اس دن کے بارے شک ہے۔ میں تو اس دن کے عذاب سے خوف کھاتا ہوں کیونکہ اس دن کا عذاب بہت سخت اور دردناک ہے۔ آیت کا یہ حصہ بہت بڑی دھمکی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ جب قیامت کے عذاب سے ڈرتے ہوں تو کفار کو تو بطریق اولیٰ اس دن کے عذاب سے ڈرنا چاہیے کیونکہ ان کے کفریہ اعمال کی وجہ سے انہیں قیامت کے دن یقینی طور پر عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"کہہ دو اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تمہارے سامنے نہ پڑھتا اور نہ ہی تمہیں اس سے خبردار کرتا، کیونکہ اس سے پہلے تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے"۔

کافروں پر اعتراض

رسول اللہ ﷺ فرمارہے ہیں کہ اللہ کی مشیت اور ارادہ ہی یہی ہے کہ میں ان آیات کو

تمہارے اوپر تلاوت کروں، ان کے بلند مضامین اور بلند مطالب تمہیں سمجھاؤں۔ قرآن کا امر میرے ہاتھ میں نہیں ہے تاکہ میں اس کے علاوہ کوئی اور قرآن تمہارے لیے لے آوں یا اس میں تبدیلی کروں۔ اور یہ کہ نزول وحی سے پہلے کئی سال میں تمہارے درمیان رہا ہوں، تو کیا تم نے اس دوران مجھ سے قرآن کے بارے میں کوئی بات سنی تھی؟ اگر قرآن کا سارا معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو اس سے پہلے بھی میں اس قسم کی بات کرتا۔ جب اس سے پہلے اس قسم کی بات نہیں کی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ قرآن میرا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس کا معاملہ میرے پاس نہیں ہے۔ میرا کام صرف پیغام رسانی ہے۔ پس تم اس بات کو سوچتے کیوں نہیں ہو؟ سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ ناسمجھی کی بات کیوں کر رہے ہو؟ اور مجھ سے قرآن کو تبدیل کرنے کی درخواست کیوں کرتے ہو؟

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

''پھر اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے، بے شک گناہگاروں کا بھلا نہیں ہوتا''۔

اللہ پر بہتان باندھنے والوں کا انجام

اس آیت میں استفہام انکاری کے ذریعے سوال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے والے اور اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے سے بڑا ظالم کون ہے؟ جو خدا پر افتراء باندھتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے اوپر وحی ہوئی ہے جبکہ اس پر وحی نہیں ہوئی اور دوسرا وہ شخص جو اللہ کی آیات کو جھٹلاتا ہے اور اسے جھوٹ سمجھتا ہے۔ یہ دو سب سے بڑے ظالم ہیں۔ پہلے بھی ہم نے کہا ہے کہ مورد ظلم جتنا عظیم ہو اور جس شخص پر ستم واقع ہو اس کا مقام جتنا

بلند ہو حتمی طور اس ظلم کا ارتکاب کرنے والا اتنا بڑا ظالم ہو گا۔ یقینی بات ہے کہ تمام ظالموں میں سے، خدا پر افتراء باندھنے والا اور اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے کا ظلم آشکار تر ہے اور وہ سب افراد سے زیادہ بڑا ظالم ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ مشرکین پر اس طرح احتجاج پورا کرتے ہیں اور دلیل کے ساتھ بات کرتے ہیں کہ میں دوسرا قرآن نہیں لا سکتا۔ اگر میں دوسرا قرآن لے آؤں تو گویا کہ میں نے خدا پر افترا باندھا ہے۔ اگر میں قرآن کو تبدیل کروں اور اسے تمہاری خواہشات کے مطابق بناؤں تو گویا میں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا ہے۔ اور یہ دونوں کام بدترین ظلم ہیں جو بھی ان کاموں کا ارتکاب کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی سخت سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ اللہ تعالیٰ حق کو جھٹلانے والے مجرم اور جرائم پیشہ افراد کو کبھی کامیاب نہیں کرتا اور وہ سعادت تک نہیں پہنچتے اور انہیں ان کے مقصد تک نہیں پہنچنے دیتا۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور اللہ کے سوا اس چیز کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکے اور نہ انہیں نفع دے سکے اور کہتے ہیں اللہ کے ہاں یہ ہمارے سفارشی ہیں، کہہ دو کیا تم اللہ کو بتلاتے ہو جو اسے آسمانوں اور زمین میں معلوم نہیں، وہ پاک ہے اور ان لوگوں کے شرک سے بلند ہے''۔

مشرکین کو تنبیہ

اس آیت کے مخاطب مشرکین ہیں، شاید یہ آیت باطل عقائد کے حامل اہل کتاب کو بھی شامل ہو۔ عبادت کا مقصد منفعت اور فائدے کو حاصل کرنا اور ضرر یا نقصان کو اپنے

سے ہٹانا ہے۔ بت پرست ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو کوئی فائدہ دے سکتے ہیں اور نہ کسی نقصان کو ان سے ہٹا سکتے ہیں۔ ان میں یہ اختیار ہی نہیں ہے لہٰذا ان کا عمل باعث حیرت ہے۔ وہ اپنے عمل کی توجیہہ کے لیے کہتے ہیں کہ رب الارباب کے پاس یہ ہمارے لیے واسطہ ہیں اور خالق ہستی کے قرب کا ذریعہ بنیں گے۔ حالانکہ انہوں نے جن چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے ان میں تو شعور اور ارادہ ہی نہیں ہے۔ یہ کیسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی شفاعت کریں گے؟

اس کے بعد فرمایا، اللہ تعالیٰ کو اس قسم کے معبودوں اور شفاعت کرنے والوں کی کوئی خبر نہیں ہے جبکہ اس کے پاس علم مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں کبھی بھی اس قسم کے واسطوں کو خلق نہیں کیا ہے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ اللہ تعالیٰ ایسے شفاعت کرنے والوں کو جانتا نہیں ہے۔ تم اپنے ان اعمال اور اس گفتگو کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو ایسی خبر دے رہو جس کا اللہ کو علم ہی نہیں ہے۔ تم اللہ پر کتنا بڑا افتراء باندھ رہے ہو؟ کیونکہ کیسے ممکن ہے وہ ذات جو پورے عالم کی خالق ہے، پوری کائنات کی خالق ہے، وہ کائنات میں موجود کسی چیز کے بارے میں بے خبر ہو؟! بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہاری یہ بات اللہ تعالیٰ پر بدترین افترا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کی شرک کی باتوں اور اس قسم کے افتراءات سے منزہ اور برتر ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٩﴾

"اور وہ لوگ ایک ہی امت تھے پھر جدا جدا ہو گئے، اور اگر ایک بات تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں ان میں فیصلہ کر دیا جاتا"۔

لوگوں کا اختلاف

سب انسان شروع میں دین فطری کی بنیاد پر توحید پرست اور امت واحدہ تھے۔ لیکن کیونکہ دنیادار تزاحم یا ٹکراؤ کا گھر ہے، اس میں معیشت اور احکام کے حوالے سے انسانوں کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، کچھ اپنے لیے زیادہ مال بٹورنے لگے اور دوسروں پر ظلم کرنے لگے، کسی نے حد سے تجاوز کیا اور کچھ مظلوم واقع ہوئے تو یہ اختلاف وجود میں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اختلاف کو دور کرنے کے لیے دین تشریع کیا، انبیاء بھیجے، کتابیں بھیجی تاکہ انبیاء الٰہی کتابوں کی روشنی میں لوگوں کے درمیان فیصلے دیں اور ان کے اختلافات کو دور کریں۔ اللہ کی بات ماننے والوں کو بشارت دیں اور اس کی نافرمانی کرنے والوں کو ڈرائیں۔

دوسرا اختلاف خود دین میں پیدا ہوا اور یہ اختلاف کچھ علماء دین کے ظلم اور زیادہ خواہی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ مومنوں کو ان اختلافات کے دوران ہدایت فرماتا رہا۔ اگر حضرت آدم کے ھبوط (بہشت سے زمین پر آنے کے) موقع پر جیسا کہ سورۂ بقرۃ آیت نمبر 36 میں آیا ہے:

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾

ترجمہ: ”پھر شیطان نے ان کو وہاں سے ڈگمگایا پھر انہیں اس عزت و راحت سے نکالا کہ جس میں تھے، اور ہم نے کہا تم سب اترو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور سامان ایک وقت معین تک“۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ نہ ہوتا کہ انسان ایک معین مدت تک زمیں پر رہیں، تو یقینی طور پر اللہ تعالیٰ ان کے متعلق اپنا فیصلہ سناتا اور اہل حق کو اہل باطل پر برتری عطا کرتا اور اہل باطل کو ختم کر دیتا اور فقط اہل حق باقی رہتے لیکن اللہ تعالی نے ان کو مہلت دے رکھی اور ہر ایک پر

حجت تمام کرنے کی خاطر کتاب بھی بھیجی، انبیاء بھی بھیجے جو ان کو آکر سیدھے راستے کی ہدایت کرتے رہے، اس کے باوجود جنہوں نے اپنے اوپر خود ظلم کیا اور انحراف کا راستہ اختیار کیا، انہیں دنیا میں بھی سزا دی گئی اور آخرت میں بھی انہیں دردناک عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

وَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾

"اور کہتے ہیں اس پر اس کے رب سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری، سو آپ ان سے کہہ دو کہ غیب کی بات تو اللہ ہی جانتا ہے سو تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

قرآن کے علاوہ دوسرے معجزے کا مطالبہ

مشرکین قرآن کو حقیر اور معمولی قرار دینے کے لیے اپنے گفتاری اور عملی مظالم کو جاری رکھتے ہوئے کہتے تھے: پیغمبر اکرم ﷺ اپنے رب کی طرف سے قرآن کے علاوہ کوئی اور معجزہ کیوں نہیں لاتے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ انہیں بتا دو کہ غیب کا علم صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور آیات اتارنا بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ معجزات لانا اور آیات اتارنا میرے ہاتھ میں نہیں ہے کہ میں اپنی مرضی سے معجزہ لے آؤں یا آیات اتاروں۔ اسی لیے تم بھی اس بات کا انتظار کرو اور میں بھی انتظار کروں گا تاکہ اللہ کی طرف سے حق کو باطل سے جدا کرنے والی آیات اتاری جائیں۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس انتظار میں تھے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے علاوہ کوئی اور معجزہ بھیج دے جو حق کو باطل سے جدا کرے اور ان کے درمیان اور امت کے درمیان فیصلہ دے دے۔ جس کا سورۂ یونس کی

آیت نمبر ۴۶ میں وعدہ دیا گیا ہے:

وَ اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیۡنَا مَرۡجِعُہُمۡ ثُمَّ اللّٰہُ شَہِیۡدٌ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾

"اور جس (عذاب) کا ہم ان کافروں سے وعدہ کر رہے ہیں اس کا کچھ حصہ ہم آپ کو زندگی میں دکھا دیں یا آپ کو پہلے (ہی دنیا) سے اٹھا لیں انہیں بہر حال پلٹ کر ہماری بارگاہ میں آنا ہے"۔

اس بناء پر ہر امت کی انفرادی زندگی کے علاوہ ایک اجتماعی زندگی ہوتی ہے۔ امتیں جب بندگی کی روش سے عدول کرتی ہیں تو خدا مقتدر اور غالب ان کا مؤاخذہ اور ان کی گرفت کرتا ہے اور انہیں ہلاک کر دیتا ہے اور ان کی جگہ دوسری قوم لے آتا ہے۔ اصولی طور پر ہر امت کا مقررہ وقت ہوتا ہے، جب ان کا مقررہ وقت آ جاتا ہے تو نہ ایک گھڑی تاخیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی۔

جیسا کہ سورۂ اعراف آیت نمبر ۳۴ میں آیا ہے:

وَ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُہُمۡ لَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَۃً وَّ لَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: "اور ہر قوم کے لیے ایک وقت مقرر ہے پس جب ان کا مقررہ وقت آ جاتا ہے تو نہ ایک گھڑی تاخیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی"۔

وَ اِذَاۤ اَذَقۡنَا النَّاسَ رَحۡمَۃً مِّنۡۢ بَعۡدِ ضَرَّآءَ مَسَّتۡہُمۡ اِذَا لَہُمۡ مَّکۡرٌ فِیۡۤ اٰیَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰہُ اَسۡرَعُ مَکۡرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا یَکۡتُبُوۡنَ مَا تَمۡکُرُوۡنَ ﴿۲۱﴾

"اور جب ہم لوگوں کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں اس تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچی تھی تو وہ ہماری آیتوں کے متعلق حیلے بہانے کرنے لگتے ہیں، کہہ دو کہ اللہ بہت جلد حیلہ کرنے والا ہے، بے شک ہمارے فرشتے تمہارے سب حیلوں کو لکھ رہے

ہیں"۔

سختیوں کے بعد رحمت کی بے قدری

اگرچہ اس آیت کا انداز بیان عمومی ہے اور آیت کے مخاطب سب لوگ ہیں۔ لیکن قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے ایک گروہ کے متعلق ہے جو زمانہ جاہلیت میں روزگار کی تنگی میں مبتلا تھے، ان کے درمیان تفرقہ تھا، بغض اور کینہ تھا تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی جانب سے رحمت عطا کی اور انہیں ہدایت کا تحفہ دیا حالانکہ وہ اس کی لیاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اس کے مستحق تھے۔ کیونکہ اگر وہ اس کے لائق ہوتے تو اس نعمت کا شکر بجا لاتے اور توحید کے راستے پر آجاتے اور حق تعالیٰ کی بندگی کرتے اور بندگی کرنے میں ایک دوسرے میں سبقت لے جاتے۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کی بے قدری کی اور پیغمبر اکرم ﷺ سے کہا کہ ہمارے لیے کوئی اور قرآن لے آؤ یا اس قرآن کو تبدیل کرو یا اس کی جگہ کوئی اور معجزہ لے آؤ۔ یہ سب ان کی سازشیں اور منصوبہ بندیاں تھیں جو انہوں نے اللہ کی آیات کے بارے میں کی۔ لیکن ان کی ان چالاکیوں اور سازشوں نے انہیں کوئی فائدہ نہیں دیا۔ کیونکہ اللہ کی تدبیر ان کی سازشوں سے محکم تر ہے اور سریع تر ہے لہٰذا وہ مشرکین کو ان کی ان سازشوں کے جرم میں مبتلا کرے گا اور انہیں مہلت نہیں دی جائے گی اور نہ ہی ان کی سازشیں ثمر آور ہونگی۔

انہوں نے اللہ کی آیات کو قبول نہیں کیا اللہ کی آیات کو ختم کرنے کے لیے سازشیں کرتے رہے تو اللہ کی طرف سے جو تدبیر کی گئی ہے اس کے نتیجے میں ان سے ہدایت پانے کی توفیق چھین لی جائے گی۔ آخر میں فرمایا کہ ہم نے تمہارے اعمال پر گواہ اور شاہد قرار دیے ہیں جو تمہارے سارے اعمال کو لکھ رہے ہیں اور ان اعمال کی حفاظت کر رہے ہیں اور قیامت کے دن تم خود ان اعمال کو دیکھو گے اور اس پر تمہیں سزا و جزا دی جائے گی۔ فرشتوں کے ہاتھ سے

بندوں کے اعمال کی کتابت کا مطلب یہ ہے کہ پس پردہ ان میں جو صلاحیتیں موجود ہیں اس کو فعلیت کے مرحلے میں لے آتے ہیں۔ لہٰذا خود یہ اعمال صحیفہ عالم کون (کائنات کی کتاب) میں اپنا نقش چھوڑتے ہیں۔

لہٰذا فرشتوں کے ذریعے بندوں کے اعمال ان کی ذات سے باہر آتے ہیں اور عالم میں خارج اور واقع میں موجود رہتے ہیں۔ اس بناء پر کس طرح وہ اپنی سازشوں میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور یہ اعمال اللہ سے پوشیدہ ہو سکتے ہیں؟ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام اور سسٹم بنایا ہے جس میں انسان جو بھی عمل کرتا ہے وہ سب فرشتوں کے ذریعے ہی انجام پا رہا ہوتا ہے ۔ لہٰذا جو اعمال انسان سے سرزد ہو جاتے ہیں وہ واقعیت خارجی میں موجود رہتے ہیں اور ختم نہیں ہوتے، ان کی اصلی شکل موجود رہتی ہے۔ سازشیں کرنے والے کفار سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ جو عمل کیا ہے وہ ختم ہو گیا لیکن انجام دیا ہوا عمل کبھی بھی ختم نہیں ہوتا بلکہ یہی عمل ان کو قیامت کے دن دکھایا جائے گا۔ اس بات کو سمجھنا بڑا آسان ہے کیونکہ انسان جو کام کر رہا ہوتا ہے اس سے ایک چھوٹا سے نقطے پر کس طرح ریکارڈ کر لیا جاتا ہے پھر اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ کائنات کی کتاب میں انسان کے انجام دیے گئے سب اعمال محفوظ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کام کو اللہ تعالیٰ کے فرشتے انجام دے رہے ہوتے ہیں۔

پیغام: انسان جو بھی کام کرتا ہے وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کا یہ کام ختم ہو گیا ہے، اس کا ہر کام اور ہر عمل بعینہٖ محفوظ ہو جاتا ہے اور اللہ کے وسیع نظامِ کائنات کے اندر موجود ہے اور یہی چیز قیامت کے دن سامنے آئی گی۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۲۲﴾

''وہ وہی ہے جو تمہیں جنگل اور دریا میں سیر کرنے کی توفیق دیتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں بیٹھتے ہو، اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعہ لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ ان سے خوش ہوتے ہیں تو ناگہاں تیز ہوا چلتی ہے اور ہر طرف سے ان پر لہریں چھانے لگتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ بے شک وہ لہروں میں گھر گئے ہیں، تو سب خالص اعتقاد سے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں کہ اگر تو ہمیں اس مصیبت سے بچادے تو ہم ضرور شکر گزار رہیں گے''۔

جنگل اور دریا اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

اس آیت میں اللہ نے اپنی ایک اور نعمت کا تذکرہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خشکی کو بھی انسان کے کنٹرل میں دیا ہے اور دریاؤں کو بھی انسان کے کنٹرول میں دیا ہے تاکہ وہ اپنی معیشت کو چلاسکے۔ پھر ایک مثال دی ہے کہ جب انسان دریا اور سمندر میں کشتی میں بیٹھا ہوتا ہے اور کشتی چل رہی ہوتی ہے، ملائم ہوا چل رہی ہوتی ہے تو وہ اس سے خوشحال ہوتے ہیں کہ ہم اپنے مقصد کو پہنچ گئے۔ لیکن جب اچانک تند و تیز ہوا چلنا شروع ہوجائے اور ہوا مناسب نہ ہو اور دریا کی موجیں اچھل اچھل کے آرہی ہوں اور سمندر کی لہریں ہر

طرف سے کشتی کو اپنے گھیرے میں لے لیں تو اس میں بیٹھے لوگ اس حالت کو دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری ہلاکت قریب ہے۔ جب سمندر کی لہریں ان کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں تو اس وقت وہ اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور تمام دنیاوی وسائل کو بھول جاتے ہیں، بڑے اخلاص کے ساتھ اور بغیر کسی شرک کے شائبہ کے اللہ کو پکارتے ہیں، اس وقت وہ نہ تو بتوں کو بلاتے ہیں اور نہ ہی کسی اور کو اور نہ کسی ظاہری سبب کو بلکہ ایک ذات کی طرف ان کی توجہ ہوتی ہے اور وہ ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے اور کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس سے نجات دے۔ بڑے خلوص سے پکار رہے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر ہمیں نجات دے گا تو ہم شکر گذار ہونگے اور تیری نعمت کی قدر جانیں گے۔

اس آیت میں سخن کو مخاطب سے غائب کی جانب تبدیل کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات سمجھانا مقصود ہے کہ عام لوگ اس لائق نہیں ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے براہ راست مخاطب واقع ہوں۔ اس لیے کلام کو رسول خدا ﷺ کی جانب موڑا گیا ہے۔

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۳

"پھر جب اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں، اے لوگو! تمہاری شرارت کا وبال تمہاری جانوں پر ہی پڑے گا، دنیا کی زندگی کا نفع اٹھالو، پھر ہمارے ہاں ہی تمہیں لوٹ کر آنا ہے پھر ہم تمہیں بتلادیں گے جو کچھ تم کیا کرتے تھے"۔

انسان کی ناشکری

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مخاطب قرار دے کر فرمایا ہے کہ اے ہمارے حبیب! جب ہم ان کو ہلاکت سے نجات دے دیتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ ہماری اس نعمت کا شکر بجالائیں، وہ دوبارہ ناحق طور پر ظلم اور زیادتی شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں پر گفتگو کا رخ غایب سے مخاطب کی جانب موڑا گیا ہے تاکہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف جذب کی جائے اور یہ جان لیں کہ اللہ ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اے لوگو! میں تمہاری رگ حیات سے زیادہ تمہارے قریب ہوں۔ تم جو بھی عمل کر رہے ہو چاہے سرکشی اور سازشیں ہوں یا نیک عمل سب ہماری مشیت اور ہماری منصوبہ بندی کے تحت کرتے ہو۔ اس صورت میں تم کس طرح ہمارے اوپر چڑھائی کر سکتے ہو یا زیادتی کر سکتے ہو؟ یہ جو ظلم یا ستم کر رہے ہو، حقیقت میں تم اپنے اوپر ظلم کر رہے ہو کیونکہ یہ چیز تمہیں ہم سے دور کر دے گی اور تمہارے اعمال نامہ ہیں برے آثار تمہارے کھاتے میں لکھے جائیں گے۔ اس لیے اس ظلم و ستم اور زیادتی کا نتیجہ خود تمہیں جھیلنا پڑے گا۔ تم اس لیے ان مظالم کے مرتکب ہوئے کیونکہ تم چاہ رہے تھے کہ دنیا کی معمولی اور جلدی ختم ہونے والی لذتیں حاصل کر سکو۔ یہ جان لو کہ دنیا چند روز کی ہے۔ آخر میں تم ہماری طرف پلٹ آؤ گے اور تمہار ے اعمال کے حقائق تم پر آشکار کر دیے جائیں گے۔

پیغام: انسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا عمل محفوظ ہے اور اللہ اس کے عمل کے تحت ہی اس کو بدلہ دے گا۔ اگر انسان دنیا کے مادی فوائد اور چند روزہ آسائش حاصل کرنے کے لیے ظلم و ستم کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ دار بقا آگے ہے اور چند روز کے لیے جو وہ کر رہا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا ہے۔ اس نے اللہ کے پاس ہی پلٹ کر جانا ہے اور وہاں پر اس کے سارے اعمال اس کے سامنے ہوں گے اور ان ہی کی روشنی میں اس کے ساتھ برتاؤ کیا جائے گا۔

اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا کَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ مِمَّا یَاۡکُلُ النَّاسُ وَ الۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتۡ وَ ظَنَّ اَهۡلُهَاۤ اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَیۡهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمۡرُنَا لَیۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِیۡدًا کَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

''دنیا کی زندگی کی مثال مینہ کی سی ہے کہ اسے ہم نے آسمان سے اتارا پھر اس کے ساتھ سبزہ مل کر نکلا جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین سبزے سے خوبصورت اور آراستہ ہو گئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر بالکل قابض ہو چکے ہیں، تو اس پر ہماری طرف سے دن یا رات میں کوئی حادثہ آپڑا سو ہم نے اسے ایسا صاف کر دیا کہ گویا کل وہاں کچھ بھی نہ تھا، اس طرح ہم نشانیوں کو کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے سامنے جو غور کرتے ہیں''۔

دنیاوی زندگی کی مثال

اس سے پہلے والی آیت میں اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا کہ دنیاوی زندگی متاع قلیل ہے۔ اس آیت میں اہل فکر کے لیے دنیاوی زندگی کی حقیقت کو ایک مثال دے کر سمجھا یا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ یہ چھوٹی نعمتیں جن سے کمزور نفوس والے راضی ہوتے ہیں اور ان سے ان کا دل خوش ہو جاتا ہے، یہ ایسا ہے کہ جب بارش کا پانی اترتا ہے اور زمین میں جذب ہوتا ہے زمین سے سبزہ اُگتا ہے، نباتات اُگتے ہیں انسان اور حیوانات ان نباتات سے اپنی خوراک بناتے ہیں اور زمین جب انتہا درجے پر سرسبز ہو جاتی ہے، کھیت پر رونق ہوتے

ہیں تو اس کو دیکھ کر لوگ خیال کرتے ہیں کہ خود انہوں نے زمین آباد کی ہے اور وہی اسی پر قادر ہیں اور ان کا اس پر تسلط ہے لیکن اچانک اللہ کی طرف سے عذاب آتا ہے اور زمین خشک ہو جاتی ہے اور سارے کھیت برباد ہو جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اس میں کچھ تھا ہی نہیں۔ انسان کی دنیاوی زندگی کی ساری نعمتوں کی مثال ایسی ہی ہے۔ یہ ساری نعمتیں اللہ کے لطف سے ہیں، یہ ساری نعمتیں چند دنوں کے لیے انسان کے اختیار میں دی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب ارادہ کرے ان سب کو نابود کر سکتا ہے تب انسان ذرہ برابر بھی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ دنیاوی زندگی میں انسان کے لیے استقلال نہیں ہے۔ ان سب پر اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے۔ یہ غرور کا سامان اور سر گرم رہنے کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا انسان کو آخرت کی ہمیشہ رہنے والی زندگی، دنیاوی مختصر زندگی اور متاع قلیل کے عوض فروخت نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ان سارے مطالب کو اہل فکر اور اہل دقت ہی سمجھ سکتے ہیں۔

وَ اللّٰهُ يَدۡعُوۡۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۲۵﴾

”اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے، اور جسے چاہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے“۔

ہدایت اللہ کی طرف سے

”دُعا“ کسی کو کسی خاص امر کی طرف متوجہ کرنا اور اسے اس کی طرف بلانے کے معنی میں ہے۔ اللہ کا دعوت دینا یا تو تکوینی ہے یا تشریعی۔ اللہ تعالیٰ کی تکوینی دعوت کا مطلب جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ایجاد کرنے کا ارادہ کیا ہے اور جس چیز کو ایجاد کیا ہے اور خلق کیا ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو اس انداز سے بنایا ہے کہ وہ اللہ کے فرمان کے تحت رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی تشریعی دعوت کا مطلب یہ ہے کہ اس نے جو شریعت بنائی ہے، جو قانون بنایا ہے

اپنی آیات اور اپنے پیغمبر کے ذریعے اس قانون اور شریعت کی پابندی کی طرف بلا رہا ہے۔ وہ جو کچھ لوگوں سے چاہتا ہے، پیغمبر کے ذریعے لوگوں کو بتاتا ہے۔

لیکن بندہ جب اپنے رب سے دعا کر رہا ہوتا ہے، اپنے رب کو بلا رہا ہوتا ہے تو اس کے دعا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے رحمت چاہتا ہے، توجہ چاہتا ہے اور اپنے آپ کو عبودیت محض کے مقام پر قرار دیتا ہے۔ دعا کی حقیقت ہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بندگی اور ذلت کا اقرار ہو، حق تعالیٰ کے مولا ہونے کو تسلیم کر رہا ہو۔ ''سلام'' ظاہری اور باطنی آفات سے محفوظ رہنے کی درخواست کرنے کو کہتے ہیں۔ ''سلام'' اللہ کا نام بھی ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ عین خیر ہے، خیر محض ہے، اس کی طرف شر کی نسبت نہیں دی جا سکتی۔ بہشت دار سلام اور سلامتی کا گھر ہے، امن کی جگہ ہے، وہاں کوئی نقصان اور کوئی شر نہیں کوئی ایسی چیز نہیں جو مزاج کے مخالف ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر انسان کی فطرت کو ابدی سعادت کی طرف مائل کیا ہے اور بہشت کی آرزو اس میں رکھ دی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اسے صراط مستقیم کی ہدایت بھی دے دیتا ہے۔ صراط مستقیم کے بارے میں پہلے بتایا گیا کہ یہ وہ فطری راستہ ہے جس کی بنیاد پر انسان کو خلق کیا گیا ہے اور یہ ان کا راستہ ہے جن کو اللہ نے انعام دیا ہے، یعنی انبیاء، شہدا اور صدیقین کا راستہ ہے، جس کی تفصیل سورہ حمد میں بیان کی جا چکی ہے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٦﴾

''جنہوں نے بھلائی کی ان کے لیے بھلائی ہے اور زیادہ بھی، اور ان کے منہ پر سیاہی اور رسوائی نہیں چڑھے گی، وہ بہشتی ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے''۔

نیکی کرنے والوں کے لیے اچھا بدلہ

"حُسۡنٰی" کا لفظ احسن کی مونث ہے اور اس کا مطلب ہے نیک بدلہ۔ "زِیَادَۃٌ" ایسے اضافہ کو کہتے ہیں جس کا کوئی استحقاق رکھتا ہو۔ پس جو نیک عمل کرتے ہیں ان کے نیک عمل کے برابر انہیں بدلہ ملے گا لیکن خدا اپنے فضل سے اس کے اوپر اضافہ بھی دے گا، سورۂ انعام آیت نمبر 160 کے مطابق اللہ تعالیٰ ان کے نیک عمل کا بدلہ دس برابر دے گا:

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ۚ

ترجمہ: "جو (اللہ کے پاس) ایک نیکی لے کر آئے گا اسے دس گنا (اجر) ملے گی"۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بھی انہیں ان کی نیکی کا بدلہ ملے گا اور اخرت میں بھی ایسا بدلہ ملے گا جس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پھر فرمایا کہ ان کے چہروں پر فقر و فاقہ اور بے چارہ گی کے ظاہری آثار یا ذلت و رسوائی کے احساس کے باطنی آثار نہ ہوں گے۔ یہ بہشتی ہیں اور انہوں نے بہشت میں ہمیشہ رہنا ہے جہاں وہ جو چاہیں گے انہیں ملے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ انہیں عطا کیا جائے گا، جیسا کہ سورۃ قٓ آیت نمبر ۳۵ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَهُمۡ مَّا يَشَآءُوۡنَ فِيۡهَا وَلَدَيۡنَا مَزِيۡدٌ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: "وہاں ان کے لیے وہ جو چاہیں گے حاضر و موجود ہو گا اور ہمارے پاس مزید بھی ہے"۔

تو یہ نیک عمل کرنے والوں کے لیے ایک قسم کی خوشخبری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو نیکی کا بدلہ نیکی تو دے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ دے گا۔

پیغام: ہمیں نیک اعمال بجالانے چاہیے کیونکہ نیک اعمال ہی ہماری کامیابی کا وسیلہ ہیں۔ نیک عمل کا فائدہ دُنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی۔ جو نیک کام کیا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل

سے اس سے زیادہ بدلہ عطاء کرے گا۔

وَ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

''اور جنہوں نے برے کام کیے تو برائی کا بدلہ ویسا ہی ہوگا کہ ان پر ذلت چھائے گی، اور انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا، گویا کہ ان کے چہروں پر اندھیری رات کے ٹکڑے اوڑھا دیے گئے ہیں، یہی دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

برے اعمال کا انجام برائی

اس جگہ اللہ تعالی فرمارہا ہے جو برا کام کرتا ہے تو ظاہر ہے برائی اور گناہ کی سزا ملنی ہے لیکن جتنی برائی کی ہے اتنی سزا ملے گی۔ جتنا گناہ ہے اتنی مقدار میں اس کی سزا ملے گی اس سے زیادہ اسے سزا نہیں دی جائے گی لہٰذا اگر ایک گناہ کیا ہے تو اس کی سزا بھی ایک ہی ہو گی۔ جبکہ نیکی کرنے والوں کو ایک نیکی کے بدلے دس برابر اجر ملے گا اور اس سے بھی زیادہ ملے گا جسے انسان کی عقل درک نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد فرمایا گناہ کرنے والوں کا باطن خبیث ہے جس نے ان کے چہرے کو ایسا سیاہ کیا ہے کہ گویا اندھیری رات کا ٹکڑا ان کے اوپر پڑا ہو۔ ان کے چہرے سے ذلت اور رسوائی عیاں ہو گی۔ ان کے لیے نہ کوئی پناہ ہے اور نہ کوئی پناہ دینے والا، جو ان کو اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔ ان کا کوئی سفارشی بھی نہیں ہے جو ان کو عذاب سے بچا سکے اور کوئی بچانے والا بھی نہیں ہے۔ یہ جہنمی ہیں جہاں ہمیشہ انہوں نے رہنا ہے؛ یہ گناہگاروں کا انجام ہے۔

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٢٨﴾

''اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے پھر مشرکوں سے کہیں گے تم اور تمہارے شریک اپنی جگہ کھڑے رہو، تو ہم ان میں پھوٹ ڈال دیں گے، اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم تو ہماری عبادت نہیں کرتے تھے''۔

مشرکین کی بات

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب مومن، کافر اور مشرک سب اللہ کے حضور آئیں گے اور ہم مشرکوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اسی جگہ ٹھہرو اور مشرکین اور ان کے شرکا کے درمیان جدائی ڈالیں گے اور ان کے آپس کے خیالی تعلقات اور روابط کو ختم کردیں گے۔ وہاں پر ان کو ان کے باطل خیالات کی سمجھ آجائے گی۔ انہوں نے جن چیزوں کو اللہ کا شریک بنا رکھا تھا حقیقت میں وہ اللہ کے شریک ہی نہیں تھے۔ ان کے باطل خیالات کی وجہ سے حقیقت امر ان پر مخفی تھی اور یہ شرکاء حقیقت میں معبود تھے ہی نہیں۔ اور ان کی عبادت متحقق نہیں ہوئی تھی کیونکہ مشرکین حقیقت میں اپنی نفسانی خواہشات کی عبادت کرتے تھے نہ کہ ان بتوں کی یا ان شرکاء کی۔ لہٰذا قیامت کے دن شرکاء مشرکین سے کہیں گے تم ہماری پرستش نہیں کرتے تھے کیونکہ ہم تو اللہ کے شریک تھے ہی نہیں۔ خدا خود اس امر کا گواہ ہے۔ ہم تو تمہاری عبادت سے غافل اور بے خبر تھے۔ شرکاء یہ بات اس لیے کہیں گے تاکہ ان کا عذاب ہلکا ہو جائے اور ان کی پوری کوشش ہو گی کہ وہ ان کو شریک بنانے کا دعویٰ کرنے والوں سے لاتعلّقی کا اظہار کریں اور کہیں گے کہ ہمیں نہ اس کی

خبر تھی نہ ہم نے کہا تھا اور نہ تم لوگ ہماری پرستش کرتے تھے، تم تو اپنی نفسانی خواہشات کے پجاری تھے۔

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

''سو اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہ کافی ہے کہ ہمیں تمہاری عبادت کی خبر ہی نہ تھی''۔

مشرکین کے معبودوں کا ان سے اظہار لاتعلّق

یہ شرکاء کہیں گے کہ جنہوں نے ہمیں اللہ کا شریک بنا رکھا تھا اور ہماری عبادت کرتے تھے ہمیں تو اس بات کی خبر ہی نہ تھی۔ اس بات کی گواہی کے لیے اللہ ہی کافی ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ ہی فیصلہ دے سکتا ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے غافل تھے۔ ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا کہ تم ہمیں اللہ کے شریک بنا رہے تھے۔ ہم تو نہ اللہ کے شریک تھے اور نہ ہی ہمیں اس بات کی خبر تھی کہ تم ہمیں اللہ کا شریک بنا رہے ہو۔ اس طرح بے جان بت مشرکین سے بیزاری کا اعلان کریں گے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع

''اس جگہ ہر شخص اپنے پہلے کیے ہوئے کاموں کو جانچ لے گا، اور یہ لوگ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو ان کا حقیقی مالک ہے، اور جو جھوٹ وہ باندھا کرتے تھے ان سے جاتا رہے گا''۔

قیامت میں انسان کے اعمال کا ظاہر ہو جانا

قیامت میں انسان کے دنیا میں انجام دیئے گئے سارے اعمال اس کے سامنے ظاہر ہو جائیں گے۔ آخرت، پوشیدہ اور پنہان امور کے آشکار ہونے کا گھر ہے۔ وہاں پر انسانوں کی حقیقت سب پر آشکار ہو جائے گی اور ان کے اعمال سب کے سامنے روشن و آشکار ہو جائیں گے اور ہر کوئی ان کا مشاہدہ کرے گا اور حق کو ظاہر بظاہر دیکھے گا اور انہیں سمجھ آجائے گی کہ حقیقی مولا اللہ کی ذات ہے جو سبحان ہے اور ان کے خیالی خدا جن کی طرف معبود ہونے کی غلط نسبت دیتے تھے وہ سب منہدم ہو جائیں گے اور ان کا کوئی اثر نہیں رہے گا۔ ان کے دعوے اور ان کے وہم و خیالات سب بے کار ہونگے اور وہاں ان کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔

دنیا میں باندھی جانے والی سب افتراء بازیوں کا منشاء وہ روابط ہیں جنہیں ہم اسباب و مسببات کے درمیان برقرار کرتے ہیں اور وہ ان اسباب کو مستقل سمجھتے ہیں اور ان کو اصل حقیقت جان رہے ہوتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ نہ کوئی معبود ہے اور نہ کوئی مولا اور نہ ہی کوئی حقیقی موثر ہے۔ یہ بات قیامت کے دن آشکار اور واضح ہو جائے گی کہ اسباب کی استقلالی حیثیت نہیں تھی۔ اگر ان کو تاثیر ملی تھی تو وہ اللہ کی طرف سے ملی تھی۔ اس دن سارے پردے ہٹ جائیں گے اور تمام اسباب اور مسببات کے رابطے ختم ہو جائیں گے۔ اس دن امر اور حکم فقط اللہ تعالیٰ ہی کا ہو گا، فقط اللہ کا حکم چلے گا، کسی اور کی بات نہیں چلے گی۔ اس دن پوشیدہ راز آشکار ہو جائیں گے اور ہر بات کھل کے سامنے آجائے گی کسی کے اوپر کوئی پردہ نہیں ہو گا۔ جیسا کہ سورۃ انفطار آیت نمبر ۱۹ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿١٩﴾

ترجمہ: ”اور اس دن صرف اللہ کا حکم چلے گا“۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

''کہو تمہیں آسمان اور زمین سے کون روزی دیتا ہے یا کانوں اور آنکھوں کا کون مالک ہے اور زندہ کو مردہ سے کو نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے کون نکالتا ہے اور سب کاموں کا کون انتظام کرتا ہے، سو کہیں گے کہ اللہ، تو کہہ دو کہ پھر کیوں نہیں ڈرتے''۔

اللہ کی حاکمیت

اس آیت میں چند مثالیں دے کر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت بتائی گئی ہے۔ ''رزق'' مسلسل عطا ہونے والی چیز کو کہتے ہیں۔ آسمان سے نازل ہونے والے اللہ کے رزق میں بارش، برف اور ان جیسی چیزیں شامل ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے زمینی رزق میں وہ چیزیں شامل ہیں جو زمین سے اگتی ہیں یا زمین پر موجود ہیں جیسے نباتات، حیوانات اور ان جیسی دوسری برکات جن سے نوع انسان کی بقاء ہے۔ کان اور آنکھ پر اللہ تعالیٰ کی مالکیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسان کے حواس میں تصرف کرتا ہے جن کے ذریعے وہ تشخیص دیتا ہے کہ کونسی چیز مفید ہے اور کونسی چیز مفید نہیں ہے۔ انسان ان حواس کے ذریعے الٰہی نعمات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کی روزی مکمل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ ان حواس کے ذریعے اللہ کے ملک میں موجود اشیاء سے فائدہ اٹھائے۔

اس جگہ انسان کے حواس میں سے صرف کان اور آنکھ کا نام اس لیے لیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں باقی حواس کی نسبت زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور انسان کے کاموں میں ان کی دخالت

زیادہ ہوتی ہے۔ اللہ زندہ کو مردے سے نکلتا ہے یعنی ایک زندہ موجود کو مردہ مٹی سے پیدا کرتا ہے یا مومن، عاقل اور صالح انسان کو ایک کافر، نادان اور ناصالح باپ سے پیدا کرتا ہے۔ زندہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سننے والے پر مطلوبہ اثر ڈالے۔ انسان کی حیات اور اس کے زندہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس روش اور طریقے کے مطابق زندگی گزارے جو اس کی فطرت کے مطابق ہے۔

خدا مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے جیسے خشک زمین کو سرسبز کرتا ہے، زندہ موجود کو نطفہ سے نکالتا ہے یا چوزے کو جامد انڈے سے نکالتا ہے یا کافر، جاہل اور ناصالح انسان سے ایک مومن، صالح اور عقل مند انسان پیدا کرتا ہے۔ اس بناء پر یہاں پر موت وحیات کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے۔ بہر حال خدا علیم اور آگاہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ان امور کی تدبیر ہے ؟ کون ہے جس نے پورے عالم ہستی کے نظام کو کنٹرول کیا ہوا ہے؟ تو یہ سارے بول اٹھیں گے کہ اللہ ہے۔ وہ سب اس بات کا اعتراف کریں گے کہ بارش اللہ دیتا ہے، روزی اللہ دیتا ہے، مارتا اللہ ہے، زندہ کو مردے سے اور مردے کو زندہ سے اللہ نکالتا ہے، آنکھ اور کان کی صلاحیت اللہ نے عطا کی ہے۔ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے، انسان کے سارے امور کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے، غیر انسان تمام موجودات کے امور بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اللہ لاشریک ہے۔ ان سب واضح دلائل کے باوجود بت پرستوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ رب الارباب ہے تو اے پیغمبر اکرم ﷺ ان سے کہہ دو تم اللہ کی ربوبیت کے کیوں قائل نہیں ہوتے؟ اللہ کا تقویٰ کیوں نہیں اختیار کرتے؟ اور اللہ کے علاوہ کسی اور کو معبود کیوں بناتے ہو؟

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝٣٢

"یہی اللہ تمہارا سچا رب ہے، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور ہے کیا، سو تم کدھر پھرے جاتے ہو"۔

کافروں کو تنبیہ

یہ جملہ پچھلی آیت کے ساتھ مربوط ہے۔ جب سارے امور کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے تو پھر تمہارا حقیقی رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، ربوبیت اسی کی ہے لہٰذا پیروی بھی اسی کی ہونی چاہیے، اسی کی عبادت ہونی چاہیے۔ ہدایت ہمیشہ حق کے ہمراہ ہوتی ہے، غیر حق باطل ہے لہٰذا حق کو چھوڑو گے تو سوائے گمراہی اور ضلالت کے کچھ نہیں ملے گا۔ حق سے منہ موڑ کر کہا گھومے جا رہے ہو؟ کیوں منحرف ہو رہے ہو؟ ہر طرح کی ہدایت اللہ کی طرف سے ہے اور ضلالت میں باطل کے سواء کچھ نہیں ہے۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٣٣

"اسی طرح ان نافرمانوں کے حق میں تیرے رب کا فیصلہ ثابت ہو کر رہا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے"۔

فاسقوں کے بارے میں فیصلہ

فاسقوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حتمی فیصلہ ہے کہ جب تک وہ فسق پر باقی ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے اور انہیں ہدایت نہیں دی جائے گی۔ یہ الٰہی فیصلہ نہ تو ظلم ہے اور نہ بے ہودہ اور بے مقصد بلکہ یہ حکم اس لیے جاری ہوا ہے کہ انہوں نے خود راہ حق کو چھوڑا ہے اور اپنی مرضی سے برائی اور فسق کا راستہ اختیار کیا ہے، حق سے منحرف ہوئے ہیں اور گمراہی کے راستے پر آئے ہیں۔ اسی بارے اللہ تعالیٰ سورۃ مائدہ کی آیت نمبر ۱۰۸ میں ارشاد فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝١٠٨

ترجمہ: ''اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا''۔

اس بناء پر فاسقوں کے متعلق اللہ کا یہ فیصلہ کہ اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا ہے، اس کی وجہ خود ان کا اپنا گناہ کی طرف میلان رکھنا اور خود ان کا حق سے انحراف کرنا ہے، یہی چیز سبب بنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں یہ حتمی فیصلہ دے دے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۳۴

''کہہ دو کیا تمہارے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو مخلوقات کو پیدا کرے پھر اسے دوبارہ زندہ کرے، کہہ دو اللہ پہلے پیدا کرتا ہے پھر اسے لوٹائے گا، سو تم کہاں پھرے جاتے ہو''۔

مشرکین کو تنبیہ

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو ایک اور دلیل کی تعلیم دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو جو ہر موجود کا مبداء ہے اسی کی طرف سارے موجودات کی بازگشت بھی ہے۔ جس نے خلق کیا ہے واپسی بھی اسی کی طرف ہوگی۔ لہٰذا اسی کی پرستش ہونی چاہیے تاکہ واپسی اور ملاقات کے دن اللہ کے عذاب سے بچ سکو اور اچھا ثواب اپنے لیے حاصل کرسکو۔ مشرکین معاد کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے رسول خدا ﷺ سے کہا کہ ان سے پوچھو کہ کس نے خلق کیا ہے؟ کون ہے جس نے آغاز کیا؟ جس کا وہ جواب دیں گے کہ اللہ ہے، مشرکین مکہ اللہ کو خالق مانتے تھے تو انہیں بتاؤ کہ جس نے خلق کیا ہے تمام مخلوقات نے دوبارہ اسی کی جانب پلٹنا بھی ہے۔ ایجاد اور پھر ایجاد کے بعد پہلے نقطے پر واپسی اس دلیل سے خدا نے مشرکین کو لاجواب کیا۔ ہر عمل کی ایک غرض ہونی چاہیے وگرنہ وہ عمل بے ہودہ

اور بے فائدہ ہوگا۔ اگر معاد نہ ہو سب کی واپسی اس جگہ نہ ہو جہاں سے وہ خلق ہوئے ہیں تو پھر پورے عالم کی خلقت لغو اور بے ہودہ ہو جائے گی۔ خدا عادل ہے، حکیم ہے، اس سے کوئی کام بے فائدہ اور بے ہودہ صادر نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ کسی پر ظلم کرتا ہے۔ پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ معاد کا ہونا مسلم اور یقینی امر ہے۔

آخر میں فرمایا کہ کیوں تم حق سے رو گردانی کرتے ہو؟ حق سے رو گردانی کرنے کے لیے تمہارے پاس کوئی منطقی دلیل نہیں ہے۔ جب ایسا ہے اور جن کو تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے نہ تو انہوں نے خلقت کا آغاز کیا ہے اور نہ ہی خلقت کی بازگشت ان کی طرف ہے اور اللہ ہی ہے جس نے خلقت کا آغاز کیا ہے اور سب نے اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے تو پھر تم حق سے منحرف کیوں ہو؟

پیغام: جو خالق ہے وہی مالک ہے اور جو مالک ہے اسی کا قانون ہے جس کا قانون ہے وہی رب ہے اور جو رب ہے اسی کی اطاعت ہونی چاہیے کسی اور کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

''کہہ دو کیا تمہارے شریکوں میں کوئی ہے جو صحیح راہ بتلائے، کہہ دو اللہ ہی صحیح راہ بتلاتا ہے، تو اب جو صحیح راستہ بتلائے اس کی بات ماننی چاہیے یا اس کی جو خود راہ نہ پائے کوئی اور اسے راہ بتلائے، سو تمہیں کیا ہو گیا کیسا انصاف کرتے ہو''۔

صحیح راستہ بتلانے والے کی پیروی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک اور دلیل کی تعلیم دی ہے تاکہ

اسے مشرکین کے سامنے پیش کر سکیں۔ کہا گیا ہے کہ عقل یہ فیصلہ دیتا ہے کہ حق کی پیروی کی جائے اور انسان کو چاہیے کہ وہ عقل کی بات مانے اور یہی دلیل انسان کے حق کی طرف ہدایت پانے کا موجب ہے۔ حق کی ہدایت دینے والے کی پیروی کرنا عین حق کی پیروی ہے۔ مشرکین سے پوچھا جائے کہ جنہیں تم نے اللہ کا شریک بنایا ہوا ہے کیا ان میں سے کوئی ہے جو تمہیں حق کی راہنمائی کرے، حق کی نشاندہی کرے؟ مشرکین کا جواب منفی ہوگا۔ خواہ ان کے معبود بت ہوں یا فرشتے یا جن یا نوع کے ارباب ہوں یا ظالم حکمران جیسے نمرود، فرعون یا ان جیسا کوئی دوسرا، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو حق پر ہو تو وہ دوسروں کو کیسے حق کی طرف راہنمائی کر سکتے ہیں؟ ان میں سے کوئی بھی اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے، اپنی موت و حیات کا مالک نہیں ہے تو وہ کسی اور کی کیسے ہدایت کر سکتا ہے؟ لہٰذا پیغمبر اکرم ﷺ سے فرمایا ہے کہ ان سے کہو فقط اللہ ہی ہے جو ہر مخلوق کو اس کے وجودی مقاصد کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ اللہ ہی نے موجودات کو خلق کیا ہے، کامل بنایا ہے اور ان کے لیے منصوبہ بندی کی ہے اور وہی ہدایت دیتا ہے، جیسا کہ سورۂ اعلیٰ آیت نمبر ۲، ۳ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝۲ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝۳

ترجمہ: ”جس نے پیدا کیا اور توازن قائم کیا، اور جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی“۔

لہٰذا اللہ ہی ہے جو رسولؐ بھیج کر، کتابیں اتار کر، شریعتیں بھیج کر انسان کو سعادت ابدی کی ہدایت دیتا ہے۔ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ عقیدہ، عمل اور سخن حق وہ ہے جو عالم وجود میں اللہ کی جاری سنت کے مطابق ہو جو کہ فعل خدا ہے۔ اس بناء پر اللہ کا ارادہ اور اللہ کی مشیت حق ہے۔ پھر سوال ہوا کہ جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے وہ زیادہ لائق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود ہدایت یافتہ نہیں ہے؟ جس کے پاس خود کچھ نہیں ہے وہ دوسرے کو کیا دے گا؟ خود فیصلہ کرو۔ خداوند متعال جو تمہیں حق کی طرف راہنمائی دیتا ہے وہ

زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جس کو تم نے خیالی خدا بنا رکھا ہے؟ جن میں نہ تو ہدایت دینے کی قدرت ہے اور نہ ہی ان میں شعور ہے۔ مشرکین خود فیصلہ کریں۔ پھر ان کی ملامت کی گئی ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟!

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

"اور وہ اکثر اٹکل پر چلتے ہیں، بے شک حق بات کے سمجھنے میں اٹکل (گمان) ذرا بھی کام نہیں دیتی، بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں"۔

کافروں کی اکثریت کا رویہ

اس آیت میں کافروں کی عملی صورتحال بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار کی اکثریت کے پاس اپنے باطل عقائد پر کوئی ثبوت نہیں ہے، وہ فقط گمان اور خیال پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن کفر کے پیشواؤں کو نہ فقط اپنے عقائد کے صحیح نہ ہونے کے بارے میں گمان نہیں ہے بلکہ وہ اپنے عقائد کے درست نہ ہونے اور دین حق کی حقانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن نفسانی خواہشات، مسند حکومت کی محبت اور آپس کے بغض و دشمنیوں کے سبب انہوں نے حق سے ہاتھ اٹھایا ہوا ہے اور لوگوں کو باطل کی دعوت دیتے ہیں۔

لہٰذا لوگوں کی اکثریت اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید کرتے ہوئے ظن، گمان اور خیال کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن یہ گمان، ظن اور خیال کبھی بھی حق کو واضح نہیں کر سکتا اور یقین تک نہیں پہنچا سکتا۔ جو کچھ لوگ انجام دیتے ہیں اللہ اس سے آگاہ ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ان کے پاس سوائے گمان اور خیال کے اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی باطل کی پیروی کرنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پہلا گروہ باطل عقائد رکھنے والوں کے سربراہوں کا ہے،

یہ لوگ بہت ذہین ہیں، انہیں اپنے عقائد کے باطل ہونے کا یقین ہے لیکن انہوں نے اپنی دکانیں چمکانے کے لیے سادہ لوگوں کی سادگی سے فائدہ اٹھایا ہوا ہے اور سادہ لوگوں کو ان باطل عقائد کی پیروی کرنے پر آمادہ کیا ہے اور یہ سادہ لوگ بھی گمان اور خیال کی بنیاد پر ان کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں۔ جبکہ دوسرا گروہ عوام کا ہے جو اکثریت میں ہیں، یہ ظن و گمان کی بنیاد پر باطل عقائد والے پیشواؤں کی پیروی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کی اس صورتحال کو یہاں پر بیان کیا ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾

"اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا اسے کوئی اپنی طرف سے بنا لائے اور لیکن اپنے سے پہلے کلام کی تصدیق کرتا ہے اور ان چیزوں کو بیان کرتا ہے جو تم پر لکھی گئیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے"۔[1]

قرآن کی حقانیت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے افتراء ہونے کی نفی کی ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہو یا اللہ کے علاوہ کسی اور کا تیار کردہ اور افتراء ہو۔ یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ بجائے اس کے کہ کہے قرآن غیر اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوا، اس تعبیر

---

[1]۔ یہ سورہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی 51 ویں سورہ ہے اور پہلی دفعہ اس میں "لاریب فیہ" آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ سورہ نازل ہوئی تو قرآن کا اعتبار حتی کہ دشمنان دین کے ہاں اس قدر ہو چکا تھا کہ اس کے متعلق "لاریب فیہ" اس میں کوئی شک نہیں، کہا گیا ہے۔ اس وقت قرآن کی حقانیت بہت روشن ہو چکی تھی۔

سے استفادہ کیا ہے کہ قرآن کی شان اس سے بلند تر ہے کہ یہ غیر خدا کی طرف سے نازل ہوا ہو یا غیر خدا کا گڑھا ہوا ہو۔ اس کے بعد فرمایا ہے قرآن پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ یقینی بات ہے کہ قرآن، حضرت نوحؑ اور ابراہیمؑ پر اتاری گئی کتابوں کی نسبت تورات اور انجیل کے زیادہ نزدیک ہے۔ لہٰذا قرآن ان دو کتابوں میں موجود حق مطالب کی تائید کرتا ہے۔ قرآن نے ان کتابوں کے اجزاء کو جدا جدا کیا جو آپس میں ملے ہوئے تھے اور دین حق اور الٰہی دین کے معارف کی شرح اور تفصیل اور توضیح دی۔ اللہ کے ہاں دین ایک ہے اور الٰہی ادیان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگر ان میں کوئی فرق ہے تو صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے۔ "لَا رَیۡبَ فِیۡہِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۷﴾ " پہلے والے جملے (یعنی قرآن غیر خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوا ہے) کی علت کے طور پر بیان ہوا ہے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن، رب العالمین کی طرف سے ہے، غیر خدا کی طرف سے نہیں ہے تو اس میں کسی قسم کے شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ کہا جائے کہ یہ غیر خدا کی طرف سے ہے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّثۡلِہٖ وَ ادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۸﴾

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں اس نے اسے خود بنایا ہے، کہہ دو تم ایک ہی ایسی سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو"۔

قرآن کی حقانیت کے بارے میں چیلنج

"اَمۡ" اس جگہ "بلکہ" کے معنی میں ہے۔ مشرکین کہتے ہیں کہ قرآن کو رسول خدا ﷺ نے خود گھڑا ہے اور اللہ کی طرف اس کی نسبت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسول

پاک ﷺ سے کہہ رہا ہے کہ ان کو چیلنج دے دو کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو اس کی مانند ایک سورہ بنا کر لے آؤ اور اس بارے اپنے شرکاء سے بھی مدد لے لو۔ مشرکین نے پورے قرآن کے بارے میں تہمت لگائی تھی کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے، اسے رسول خداؐ نے خود بنایا ہے۔ قرآن کا لفظ اس کے ہر جزء پر بھی صادق آتا ہے اور پورے قرآن پر بھی صادق آتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم ساری مخلوقات کو اس حوالے سے مدد کے لیے لا سکتے ہو تو لے آؤ اور سب سے تعاون لے لو۔

اس چیلنج میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں کسی ایک صورت کو معین نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ قرآن کی تمام صورتوں کو شامل ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ چیلنج فقط قرآن کی فصاحت و بلاغت کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ اس میں قرآن کی ساری خصوصیات اور جتنے بھی صفات کمالیہ ہیں ان سب کو سامنے رکھا گیا ہے جیسے احکام، عبادات، اجتماعی قوانین، سیاسی، عدالتی اور اخلاقی قوانین، غیبی خبریں، قرآن ان سب کے حوالے سے معجزہ اور چیلنج ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ چیلنج کسی خاص فرد کو نہیں اور نہ ہی کسی خاص زمانے کو بلکہ تمام افراد اور تمام زمانوں کو ہے۔ تمام ادوار کے لوگوں کو کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شک کرتا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے تو اس جیسی ایک سورہ بنا کر لے آئے۔ دوسری جگہ فرمایا کہ سارے جن و انس اکھٹے ہو جائیں تو اس جیسا قرآن نہیں لا سکتے، چاہے یہ سب ایک ہو جائیں۔

سورۂ اسراء آیت نمبر ۸۸:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

ترجمہ: ”کہہ دیجئے: اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل لا نہیں سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں“

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

''بلکہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جسے وہ سمجھ نہ سکے اور ابھی اس کی حقیقت ان پر کھلی نہیں، اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے بھی جھٹلایا تھا، سو دیکھ لو کہ ظالموں کا انجام کیسا ہوا''۔

ستمگاروں کا انجام

ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے نزدیک قرآن غیر خدا کی طرف سے ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن میں حقیقی معارف ہیں، حقیقی علوم ہیں جو ان کے فہم اور سمجھ سے بالاتر ہیں، ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اس کے عظیم معارف کو سمجھ سکیں۔ ان کی شرح اور تاویل ان کے کانوں نے سنی بھی نہیں ہے۔ یہ مطلب قیامت کے دن کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس دن سارے کفار کے سامنے تمام حقائق کی تاویل بھی آجائے گی اور قران کی واقعیت اور قرآن کے معارف کو بھی سمجھ لیں گے۔ تاویل اس حقیقت کو کہتے ہیں جس پر معنی اور احکام کی وضاحت کے حوالے سے اعتماد کیا جاتا ہے۔ سورۃ اعراف کی آیت نمبر ۵۳ اسی حوالے سے اشارہ ہوا ہے:

''يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ''

ترجمہ: ''جس روز وہ انجام کار سامنے آئے گا جو لوگ اس سے پہلے اسے بھولے ہوئے تھے وہ کہیں گے''

پھر فرماتا ہے کہ سابق امتیں بھی اپنے جہل کی وجہ اسی طرح اپنے پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کو جھٹلاتی تھیں۔ قیامت کے دن سارے امور کی تاویل ان کے سامنے ظاہر

ہو جائے گی تو اس وقت ان کی تصدیق کرنے اور ان پر ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن اس وقت ان کا ایمان لانا اور تصدیق کرنا انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔ دنیا میں ان کے جھٹلانے کا نتیجہ ان کی گمراہی اور ہلاکت تھا پس غور کرو کہ ظالم لوگوں کا انجام کیسا ہوگا۔ ظاہر ہے ظالموں کا انجام برا ہوگا کیونکہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۴۰

”اور ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ایمان نہیں لاتے، اور تمہارا رب مفسدوں سے خوب واقف ہے“۔

بعثت رسول خداؐ کے وقت لوگوں کے دو گروہ

اس آیت میں زمان بعثت رسول خدا ﷺ کے لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ اور دوسرا گرہ وہ ہے جو قرآن پر ایمان نہیں لاتے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے گروہ کو جو قرآن پر ایمان نہیں لاتے مفسد کہا ہے۔ پس قرآن کو جھٹلانے والے مفسد ہیں اور وہ فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔ پچھلی آیات میں قرآن کی حقانیت اور اس کے اللہ کی طرف سے ہونے کو بیان کیا گیا اور کہا گیا کہ قرآن کے حق ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور اس میں کسی قسم کی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اس حوالے سے چیلنج بھی کیا گیا ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں ہے تو اس کے مقابلے میں ایک سورہ بنا کر لے آئیں تو وہ ایسا کرنے سے عاجز ہیں۔ جب ایسا تو پھر اس صورتحال میں اللہ تعالیٰ ایک حقیقت بتا رہا ہے کہ رسول پاک ﷺ جن پر مبعوث ہوئے ان کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ وہ جو ان پر ایمان لے آئے اور دوسرا گروہ

وہ جو ان پر ایمان نہیں لے آئے۔ جو ایمان نہیں لے آئے وہ فسادی ہیں اور ان کو سخت سزا ملے گی اور ان کا انجام بہت برا ہوگا۔

وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

"اور اگر تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے میرے لیے میرا کام اور تمہارے لیے تمہارا کام، تم میرے کام کے جواب دہ نہیں اور میں تمہارے کام کا جواب دہ نہیں ہوں"۔

فیصلہ کن مرحلہ

یہ آیت رسول ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید کے حوالے سے ہے۔ رسول پاک ﷺ کو کہہ دیا گیا ہے کہ جو ہٹ دھرمی کرتے ہوئے آپ کو جھٹلاتے ہیں ان سے بیزاری کا اعلان کرو اور ان سے کہہ دو کہ میرا راستہ تم سے جدا ہے اور تمہارا راستہ مجھ سے جدا ہے۔ تم میرے امر صالح کو پسند نہیں کرتے تو میرا بھی تمہارے باطل اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس بنا پر حق طریقہ یہ ہے کہ حق کی دعوت دینے والے رسول لوگوں کو حق کی طرف بلائیں۔ اگر وہ قبول کر لیں تو ٹھیک ہے۔ اگر قبول نہیں کرتے تو پھر رسول ان سے بیزاری کا اعلان کرے اور کہے کہ میرا راستہ تم سے جدا ہے کیونکہ تم باطل پر ہو اور باطل اس قابل نہیں ہے کہ اسے قبول کیا جائے۔ تمہارا کام تمہارے ذمے اور میرا عمل میرے ذمے۔ میرا کام یہ تھا کہ تم کو حق کی دعوت دوں جسے میں نے انجام دیا اور تمہیں حق کی دعوت دے دی، اب اسے قبول کرنا یا نہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا

لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۲﴾

"اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں، کیا تم بہروں کو سنا سکتے ہو اگرچہ وہ نہ سمجھیں"۔

حق کو قبول نہ کرنے والے ہٹ دھرم افراد

اس آیت میں استفہام انکاری کی صورت میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا جارہا ہے کہ جو آپ کی بات کو سن نہیں سکتے، جن کے کان بہرے ہیں، کیا آپ انہیں کچھ سنا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے اس سوال کا جواب منفی ہے۔ یعنی جب ان میں عقل اور سمجھ کی صلاحیت ہی نہیں ہے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو کیسے سنا سکتے ہیں۔ سنا نہ سکنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ظاہر میں وہ نہیں سن سکتے اور حقیقت میں وہ بہرے ہیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دل سے بہرے ہیں، ان کے دل میں بات نہیں بیٹھتی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو سُنی اَن سُنی کر دیتے ہیں۔ گویا کہ انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو سنا ہی نہیں۔ ان کے دل کے کان بند ہیں۔ حالانکہ بات ان کے کانوں تک پہنچ رہی ہوتی ہے۔ لہٰذا نہیں سننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتے نہیں اور حق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ گویا کہ وہ حق کو سن ہی نہیں سکتے ہیں اور بہرے ہیں۔ جس طرح بہرا شخص کسی کی بات نہیں سن رہا ہوتا، یہ سن تو رہے ہیں لیکن سننے کے بعد اس کو قبول نہیں کر رہے ہوتے تو گویا انہوں نے سنا ہی نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ میرے حبیب! تو ان کو نہیں سنا سکتا، جب یہ بے عقل ہیں، ان کی سمجھ میں بات آتی نہیں ہے تو پھر ان عقل کے اندھوں اور عقل کے بہروں پر آپؐ کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّنۡظُرُ اِلَیۡکَ ؕ اَفَاَنۡتَ تَہۡدِی الۡعُمۡیَ وَ لَوۡ کَانُوۡا لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۴۳﴾

''اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں، کیا تم اندھوں کو راہ دکھا دو گے اگرچہ کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں''۔

بے بصیرت افراد

اس آیت میں بھی پچھلی آیت کی طرح استفہام انکاری ہے۔ کہا گیا ہے کہ جن کے دل حقیقت کو وصول کرنے سے عاری ہیں اور نگاہیں بصیرت والی نہیں، آنکھوں سے دیکھ تو رہے ہیں لیکن ایسا ہے کہ گویا کہ وہ دیکھ ہی نہیں رہے۔ ایسے اعمال اور ایسے مظالم کا ارتکاب کر چکے ہیں جس نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔ وہ عقل کے اندھے ہیں اور غور و فکر کرنے کی قدرت ان میں نہیں ہے۔ اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ان عقل کے اندھوں کو ہدایت دینا تیرے بس کی بات نہیں۔ جب آپ کی بات ان تک پہنچتی ہی نہیں تو ان پر اثر کیسے کرے گی۔ تاکہ آپ کی باتوں سے ہدایت پا سکیں۔ اگرچہ ان کی ظاہری آنکھ تجھے دیکھ رہی ہے لیکن ان کی باطنی آنکھ بند ہے، ان کا دل نابینا ہے لہٰذا وہ ہدایت نہیں پا سکتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

''بے شک اللہ لوگوں پر ذرہ ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں''۔

اللہ لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا

یہ آیت بھی پچھلی آیات میں ہونے والی بحث کا تتمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ وہ افراد جو سن نہیں سکتے یا دیکھ نہیں سکتے اور حق کو قبول کرنے کے حوالے سے اندھے اور بہرے ہیں، انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ اللہ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اللہ نے تو ان کو سماعت کی نعمت عطا کی لیکن انہوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اللہ نے ان سے سماعت اور بینائی کی

قدرت سلب نہیں کی بلکہ انہوں نے خود اپنے گناہوں کے سبب اپنے آپ کو سماعت اور بینائی کی صلاحیت سے محروم کیا ہے۔ لہٰذا ان کا بے بصیرت، عقل کا اندھا اور سمجھنے سے عاری ہونا خود ان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا ہے۔ اللہ نے سب کی ہدایت کے اسباب مہیا کیے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت اور نعمتوں کا شکر بجالاتے ہیں تو ان سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور جو لوگ ان نعمتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو وہ خود قصور وار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ وہ کسی پر ذرہ برابر بھی زیادتی نہیں کرتا۔ یہ لوگ خود اپنے اوپر زیادتی کرتے ہیں اور اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور اس ظلم کا نتیجہ بھی خود انہیں بھگتنا پڑے گا۔

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۴۵

”اور جس دن انہیں جمع کرے گا گویا وہ نہیں رہے تھے مگر ایک گھڑی دن کی ایک دوسرے کو پہچانیں گے، بے شک خسارے میں رہے جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور راہ پانے والے نہ ہوئے“۔

معاد کو جھٹلانے والے خسارے میں ہیں

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جب ہم قیامت کے دن سب کو مشہور کریں گے تو اس وقت معاد کا انکار کرنے والوں کو دنیا کی زندگی انتہائی حقیر نظر آئے گی۔ وہ کہیں گے دنیا میں ہماری پوری زندگی ایک دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہ تھی۔ یا ان کی موت سے لے کر حشر تک کی مدت ایک دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہ تھی۔ اس دن وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے کہ کیا کرتے تھے، ان کا سارا عمل سامنے آجائے گا، کچھ بھی نہیں بھولا ہوگا۔ اس دن دین کی حقیقت،

قرآن کی حقیقت سب آشکار ہو جائے گی اور سب چیز کھل کر سامنے آجائے گی۔ اس دن جب نورتوحید جلوہ گر ہوگا تو انہیں معلوم ہو گا کہ انہوں نے نقصان اٹھایا ہے اور وہ خسارے میں ہیں۔اس وقت انہیں سمجھ آئے گی کہ ملک اور مملکت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

اب وہاں کچھ بھی نہیں کر سکیں گے کیونکہ وہ دنیا میں دنیاوی مظاہر اور مادی زندگی میں غرق تھے اور قیامت کو جھٹلاتے تھے، اللہ کی دعوت کو جھٹلاتے تھے، حق کے راستے پر نہیں چلتے تھے۔اب جب ان کو موت آئی ہے تو وہ پچھلی ہر شے کو بھلانا چاہتے ہیں لیکن بھول نہیں سکتے۔ ہر شئے ان کے سامنے ہے۔جب موت آجائے گی یا جب محشور ہوں گے تو ان کے لیے ساری مدت جتنا عرصہ گزرا ہے وہ بہت معمولی جلوہ کرے گا۔ کیونکہ اس دن اصل حقیقت سامنے آجائے گی۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی دعوت کو جھٹلانے والے کفار کی یہ کیفیت ہوگی۔

وَ اِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا یَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

”اور اگر ہم تمہیں ان وعدوں میں سے کوئی چیز دکھا دیں جو ہم نے ان سے کیے ہیں یا تمہیں وفات دیں پھر انہیں ہماری طرف لوٹنا ہے پھر اللہ شاہد ہے ان کاموں پر جو کرتے ہیں“۔

اُمت کی بازگشت اللہ کی جانب

اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ ایک دن امت نے اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ چاہے تیری زندگی میں ان پر عذاب نازل کردیں یا آپ کی زندگی کے بعد ان پر عذاب نازل کریں۔ ”ثُمَّ“ گفتگو کی ترتیب کے لحاظ سے ہے نہ زمانے کے لحاظ سے کیونکہ اللہ ہر وقت ان پر

گواہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ فقط قیامت کے دن ان کے اعمال پر گواہ ہوگا۔ قیامت سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر گواہ ہے۔ یہ آیت رسول ﷺ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ہے۔ فرمارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس نے جو وعدہ دیا ہے اسے پورا کرے۔ جب اس نے وعدہ دیا ہے کہ ان کو عذاب دیا جائے گا تو ان کو عذاب دے گا، ان کو یہ عذاب دنیا میں بھی دے سکتا ہے اور آخرت میں تو ان کے لیے عذاب ہے ہی۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ان کے اعمال ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں لہٰذا اے حبیب! آپؐ غمناک نہ ہوں، پریشان نہ ہوں۔ یہ آیت بعد والی آیت کا مقدمہ ہے جس میں قضا الٰہی اور اللہ کے عذاب کو بیان کیا جانا ہے۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

”اور ہر امت کا ایک رسول ہے، پھر جب ان کے پاس ان کا رسول آیا تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کیا گیا اور ان 5 پر ظلم نہیں کیا جاتا“۔

قضائے الٰہی

اس آیت میں اللہ کی قضا اور اللہ کے فیصلے کا تذکرہ ہوا ہے۔ بتایا جارہا ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ ہر امت کے لیے ایک رسول ہے جو ان کے پاس اللہ کا پیغام لاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی امت ہو جس کے پاس اللہ کا رسول پیغام لے کر نہ آیا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیغمبر کا پیغام پہنچانا اس بات کا سبب بنتا تھا کہ اس امت میں اختلاف پیدا ہوں۔ کچھ اس رسول کے پیرو ہو جاتے تھے اور کچھ اسے جھٹلاتے تھے۔ اس وقت اللہ کا ایک اور فیصلہ آتا تھا اور اللہ کا فیصلہ عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اس فیصلے میں کسی پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں کی گئی کہ عذاب ان پر نازل کیا جائے۔ ان پر عذاب کا نزول، عدالت الٰہی کا تقاضا تھا۔ کیونکہ ایک

گروہ نے اللہ کے رسول اور اس کے حکم کو تسلیم کیا جبکہ دوسرے گروہ نے تسلیم نہیں کیا، اسے جھوٹا قرار دیا۔ جنہوں نے اللہ کے رسول اور اللہ کے حکم کو جھوٹا قرار دیا انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ ان پر عذاب نازل کرنے کا اللہ کا فیصلہ عدل پر مبنی فیصلہ تھا۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٨﴾

''اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب ''پورا ہونا'' ہے اگر تم سچے ہو''۔

پیغمبرؐ سے مشرکین کا سوال

مشرکین رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرتے تھے کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں عذاب دے گا، تو اللہ کا یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ یعنی اللہ کا عذاب کب آئے گا؟ اس سوال کا جواب اگلی آیت میں آیا ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٤٩﴾

''کہہ دو میں اپنی ذات کے برے اور بھلے کا بھی مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے، ہر امت کا ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت آتا ہے تو ایک گھڑی بھی دیر نہیں کر سکتے اور نہ جلدی کر سکتے ہیں''۔

ہر اُمت کیلئے معین وقت

جیسا کہ پہلی آیت میں بیان کیا گیا کہ مشرکین پیغمبرؐ کا مذاق اڑاتے اور انہیں عاجز قرار دینے کے لیے ان سے سوال کرتے اگر تم سچ بولتے ہو تو بتا دو کہ اللہ کا فیصلہ کب متحقق ہو

گا؟ اور کس وقت عذاب الٰہی آئے گا؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بتایا کہ ان سے کہو کہ یہ امر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں اپنی ذات کے حوالے سے کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ اور نہ ہی میں دوسروں کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہوں۔ میں تو فقط پیغام رساں ہوں۔ میرا کام اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دینا ہے۔ عذاب بھیجنا اللہ کے ہاتھ میں ہے میرے ہاتھ میں نہیں ہے اور نہ ہی اس کے وقت کا مجھے پتہ ہے۔ لہٰذا ان کا یہ سوال جہالت کی بنا پر ہے۔

اس کے بعد اجمالی طور یہ خبر دی گئی ہے کہ عذاب کا آنا حتمی اور یقینی ہے۔ کیونکہ عذاب الٰہی کا آنا غیبی امور میں سے ہے اور غیبی امور صرف اللہ کے پاس ہیں اور اس کا حتمی ہونا اور حقیقت کا مصداق ہونا یہ کائنات کے پورے نظام اور سسٹم میں جاری اس کلی ضابطے کا حصہ ہے جس کی طرف اشارہ کرکے مشرکین کے سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے۔ پورے عالم کے متعلق کلی قانون یہ ہے کہ ہر امت کا ایک وقت مقرر ہے اس وقت تک انہیں مہلت ملی ہوئی ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو ایک لمحہ نہ اس سے پیچھے ہوگا نہ آگے ہوگا اور اس میں خطا بھی نہیں ہوگی اسی وقت واقع ہوگا۔

انفرادی زندگی کے علاوہ ہر امت کی ایک اجتماعی حیات ہے۔ نیز ان کے لیے سعادت ملنا یا شقاوت ملنا، ان کی ترقی اور ثواب یہ سب اللہ کی طرف سے ان کے لیے مقرر ہے۔ گذشتہ امتیں بھی اس مطلب کے صحیح ہونے کی گواہی دیتی ہیں چاہے وہ مومن ہوں یا کافر۔ پس بہت جلد اللہ ان کے درمیان فیصلہ دے گا۔ کیونکہ اللہ ان ظالموں کی تاک میں ہے۔ لہٰذا کفار یہ نہ سمجھیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور اپنے پیارے پیغمبر کے وجود کی کرامت کی وجہ سے ان سے وقتی طور پر درگزر کیا ہوا ہے اور ان پر عذاب نہیں اتارا ہے تو یہ اللہ کے ہاں اپنے رسول کی کرامت کی وجہ سے ہے اور ان کی عظمت عزیز ہے ان کے احترام میں ہے ۔ کیونکہ اس عقیدہ کے تحت کسی بھی ملت اور شریعت کے لیے کوئی بھی قانون باقی نہیں رہتا سوائے بے ہودہ قانون کے۔ (نعوذ باللہ) گویا اللہ تعالیٰ نے ان امتوں کو کھیل تماشہ اور اپنی سر

گرمی قرار دیا ہو اور اس کے نزدیک مومن اور کافر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان باطل اور بے ہودہ باتوں اور نظریات سے بہت برتر و بلند تر ہے۔ ان کے باطل نظریات کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ذکر خدا کو چھوڑا اور اللہ کی کتاب سے دوری اختیار کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے اے میرے رب! میری امت نے قرآن کو چھوڑ دیا، قرآن کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔

سورۂ فرقان آیت نمبر ۳۰:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾

ترجمہ: "اور رسول کہیں گے: اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو واقعی ترک کر دیا تھا"۔

پیغام: عمل کرنے والے اور عمل نہ کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔ لوگوں کے دو گروہ ہیں کچھ وہ جو ایمان لائے اور کچھ وہ جنہوں نے جھٹلایا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

"کہہ دو بھلا دیکھو تو اگر تم پر اس کا عذاب رات یا دن کو آجائے، تو عذاب میں سے کون سی ایسی چیز ہے کہ مجرم اس کو جلدی مانگتے ہیں۔"

عذاب الٰہی کو جلد مانگنے والے مجرمین

اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو عذاب دے گا تو اچانک ہی دے گا، رات کے وقت یا دن کے وقت۔ جب عذاب آجائے گا تو پھر کیا کرو گے؟ تو پھر کیا وجہ ہے کہ مجرمین جلد عذاب الٰہی کے آنے کی درخواست کر رہے ہیں۔ اللہ کا عذاب جب نازل ہو گا تو صرف گناہگار ہی اس عذاب کی

پکڑ میں آئیں گے، یہ عذاب غیر گناہگاروں کو نہیں گھیر لے گا۔ کیونکہ عذاب آنے کا سبب مجرمین اور گنہگار ہی بنے تھے۔ اب جب تمہارے اوپر عذاب کا آنا حتمی ہے تو پھر اس کے وقوع میں جلد بازی مت کرو۔ بہر حال جب عذاب آئے گا تو اس وقت گناہ گار اس عذاب سے فرار نہیں کر سکیں گے۔

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

"کیا (عذاب) جب آ چکے گا تب اس پر ایمان لاؤ گے، اب مان گئے ہو جبکہ تم تو اس کی جلدی طلب کیا کرتے تھے"۔

وقت گزرنے کے بعد ایمان لانا

اللہ تعالیٰ فرمارہا کہ جب عذاب آجائے گا اور عذاب کو دیکھ کر اگر کوئی اللہ، قرآن اور دین حق پر ایمان لے آئے گا تو اس ایمان کا اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ عذاب کے اترنے کے وقت تک تم نے ایمان لانے کو مؤخر کئے رکھا اور اللہ کے رسول کو جھٹلاتے رہے، اور یہ کہتے رہے کہ قرآن جادو ہے، پیغمبر کی دعوت جھوٹ پر مبنی ہے۔ اب جبکہ اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھ لیا ہے اور ہلاک ہو رہے ہو تو اب تمہارا ایمان لانا تمہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔ تم نے پوری عمر عذاب کے اترنے کے بارے میں ہمارے رسول کا تمسخر کیا اور ان کا مذاق اڑاتے رہے اور کہتے رہے کہ یہ عذاب کب آئے گا؟ اور تمہیں اس عذاب کی جلدی بھی تھی۔ تم عذاب الٰہی کے وعدے کو حقیر اور حقیقت سے خالی امر سمجھتے رہے۔ اور اب دنیا میں بھی اس عذاب کا مزہ چکھو اور آخرت میں بھی دردناک عذاب تمہاری انتظار میں ہے۔

پیغام: اللہ کے فیصلوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ ہر وقت اللہ کو یاد کرنا چاہیے اور اللہ کا ذکر کرنا چاہیے۔

ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٥٢﴾

"پھر ظالموں سے کہا جائے گا ہیشگی کا عذاب چکھتے رہو، تمہیں نہیں بدلا دیا جاتا مگر اس چیز کا جو تم کرتے تھے"

ظالموں کے لیے دائمی عذاب

جب منکرین اور مجرمین دنیاوی عذاب سے نابود ہو جائیں گے تو قیامت کے دن بھی ان سے کہا جائے گا کہ اب عذاب جاودانی کا مزہ چکھو۔ آج کے دن تم فقط اپنے عمل کا بدلہ پاؤ گے اس کے سواء تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ جو کچھ تم نے دنیا میں انجام دیا وہی آج تمہیں عذاب کی شکل میں مل رہا ہے، اسے خود تم نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے۔ "ذُوقُوا" سے تکوینی خطاب مراد ہے یعنی ہر عمل کا عکس العمل ہے، ایسا ممکن نہیں ہے کہ کافروں کو ان کے کفر کا عذاب اور سزا نہ ملے۔

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿٥٣﴾

"اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات سچ ہے، کہہ دو ہاں میرے رب کی قسم بے شک یہ سچ ہے، اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو"۔

حتمی عذاب

رسول اللہ ﷺ سے آکر پوچھتے تھے کہ جس عذاب کی بات ہو رہی ہے کیا یہ حتمی ہے؟ اے ہمارے پیغمبر ﷺ قسم اٹھا کر کہہ دو کہ عذاب کا واقع ہونا حتمی اور قطعی ہے

کیونکہ اس کے واقع ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں، کوئی اس عذاب کو روک نہیں سکتا اور خدا کو کوئی عاجز بھی نہیں کر سکتا اور خدا کو گناہگاروں کو عذاب دینے سے کوئی منع بھی نہیں کر سکتا لہٰذا اس عذاب کا وقوع پذیر ہونا یقینی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

وَ لَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

"اور اگر ہر ایک نافرمان کے پاس روئے زمین کی تمام چیزیں ہوں اور وہ ان سب کو اپنے بدلے میں دے ڈالے (اسے عذاب سے چھٹکارا نہ ملے گا) اور جب وہ عذاب دیکھیں گے تو دل میں نادم ہوں گے (ندامت کو چھپائیں گے) اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ ہوگا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا"۔

عذاب جہنم کی شدت

یہ آیت آخرت کے عذاب کی سختی کو بیان کر رہی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ یہ عذاب اتنا عظیم ہے کہ اس سے نجات پانے کے لیے زمین میں موجود سب کچھ بھی فدیہ دیا جائے تو اس عذاب سے نجات نہیں مل سکتی۔ اہل عذاب جب عذاب آخرت کو دیکھیں گے تو ملامت اور سرزنش کے ڈر سے اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔ اس دن ان کے درمیان عادلانہ فیصلہ ہوگا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

بظاہر اس آیت میں عذاب سے دنیاوی عذاب مراد ہے۔ وہ اس عذاب کے مستحق تھے کیونکہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس عذاب کے نزول کے اسباب فراہم کئے اور اس کے نزول کی جلدی چاہی اس جگہ پر بتایا گیا ہے کہ اگر فرض کرلیں جو کچھ زمین پر ہے وہ ان کا ملک

ہو جنہوں نے ظلم کیا ہے اور وہ ظلم کے نتیجے میں اس عذاب میں مبتلا ہو جائیں، جب عذاب آئے تو وہ عذاب کو دیکھ کر اس عذاب سے بچنے کے لیے کہیں گے کہ ساری زمین جو ان کا ملک ہے اسے ہم سے لے لیا جائے اور اس کے بدلے انہیں اس عذاب سے نجات دے دی جائے تو ان کو نجات نہیں ملے گی۔ جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو شرمندگی کی وجہ سے کہ خود ہی انہوں نے عذاب کے جلد آنے کی درخواست کی تھی اور اب جب عذاب آگیا ہے تو پریشان ہوں گے اور اپنی شرمندگی کو چھپائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں جو فیصلہ دے گا وہ حق اور عدل پر مبنی ہوگا کسی پر ظلم پر اور زیادتی نہیں ہوگی اور ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ اور اجر ملے گا۔ کافروں کی بے بسی کو بیان کیا جا رہا ہے، کوئی بھی خود کو عذاب سے نہ بچا سکے گا اور اس پر ظلم نہ ہوگا۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۵۵

”خبردار! بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، خبردار! بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے“۔

برحق الٰہی وعدہ

اس آیت اور بعد والی آیت میں عذاب کے واقع ہونے اور اس کے برحق ہونے کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ اس وعدے کے تحقق کی دلیل یہ ہے کہ جو کچھ آسمان اور زمین پر ہے وہ سب اللہ کے مملوک ہیں، اللہ ان کا خالق اور مالک ہے اور ہر قسم کا تصرف کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ان میں کسی اور کا ارادہ نہیں چلتا اور نہ ہی کسی کو ان میں تصرف کرنے کا حق ہے۔ کوئی اللہ کے کام میں رکاوٹ بھی نہیں بن سکتا۔ کائنات کے سارے ظاہری اسباب

اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تحت ہیں۔ وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور اگر کسی چیز کو نہیں چاہتا تو نہیں ہوتا:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ (سورہ یٰسٓ، آیت نمبر ۸۲)

ترجمہ: ''جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے کہ اسے یہ کہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے''

اس بنا پر اللہ تعالیٰ کا قول وہ فرمان در حقیقت عالم خارج میں اس شئی کا وجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول عین واقعیت ہے، اس میں جھوٹ اور خطا نہیں (کیونکہ جھوٹ اور خطاء ذہنی مفاہیم ہیں جن کا خارجی وجود نہیں ہوتا)۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق و سچ ہے، اس کے واقع ہونے میں کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں ہے۔ غیر اللہ اگر کسی چیز میں تصرف کرنا چاہے تو اللہ کے اذن سے ہی کر سکتا ہے، اللہ کے اذن کے بغیر کچھ نہیں سکتا۔ اللہ کے وعدے میں کوئی بھی بے ہودگی یا باطل امر نہیں ہے، لیکن اکثر لوگ اس چیز کو نہیں جانتے۔ کیونکہ لوگ اللہ تعالیٰ کی سلطنت اور ملک کو بادشاہوں کی سلطنت اور بادشاہت جیسی سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ بڑی طاقت والے ہیں، جو فیصلہ کریں اس کو نافذ کر سکتے ہیں، لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ بادشاہ اور بڑے لوگ وعدے دیتے ہیں لیکن اپنا وعدہ پورا نہیں کرتے یا اس وعدے کو پورے کرنے کا ارداہ نہیں کرتے، یا ان پر دنیاوی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اور ان کی سلطنت ختم ہو جاتی ہے، یا ان کی سلطنت کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ کمزور پڑ جاتا ہے اور وہ ان سے سلطنت چھین لیتے ہیں۔ یعنی دنیاوی حکومت ایسی ہوتی ہے کہ بعض اوقات حکومت کوئی وعدہ دیتی ہے پھر حکومت کا تختہ الٹ جاتا ہے تو اس وعدے کو پورا کرنے کی راہ میں رکاوٹ کھڑی ہو جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی سلطنت اور مملکت ایسی نہیں ہے، اس کا دنیاوی سلطنت کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، اللہ خالق ہے، مالک ہے، مدبر ہے، ہر چیز کا وجود اسی ذات سے ہے، تو کس

طرح اس کے وعدے میں جھوٹ ہو؟ کس طرح اس کی مشیت کے مطابق عمل نہ ہو؟ اللہ تعالیٰ کی ذات اس طرح کے باطل خیالات سے منزہ اور برتر ہے۔ اللہ کا وعدہ برحق ہے، اس نے وقوع پذیر ہونا ہے اس کے خلاف تو کچھ ہو نہیں سکتا، اس کے وعدے کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

''وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف پھر کر جاؤ گے''۔

حیات وممات اللہ کے اختیار میں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی مالکیت پر دوسری دلیل قائم کی گئی ہے۔ انسانوں کے تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں، ان کی حیات اور موت بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمہارے تمام امور کا خالق، رازق اور مدبر اللہ ہے، اور اخر میں تمہاری بازگشت اللہ کی طرف ہے۔ لہٰذا کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ تم اللہ کی مالکیت میں نہ ہو؟

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

''اے لوگو! تمہارے رب سے نصیحت اور دلوں کے روگ کی شفا تمہارے پاس آئی ہے، اور ایمان داروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے''۔

موعظہ الٰہی اور دلوں کی شفاء

اس آیت میں انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم بیان کیا گیا ہے۔ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ایک تو یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے موعظہ آیا ہے۔ ''مَّوْعِظَةٌ'' ڈرا کر

کسی کام سے روکنے کو کہا جاتا ہے، اسی طرح یہ لفظ عمل خیر کو یاد دلانے اور تذکر دینے، یا ایسا بیان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس سے وعظ و نصیحت سننے والے کا دل نرم ہو جائے۔"
هُدًی" لطف و مہربانی کے ساتھ مطلوب کی طرف راہنمائی کرنے کو کہتے ہیں ۔"
رَحْمَةٌ" دوسروں کو نقصان وضرر میں دیکھ کر متاثر ہونا اور اس نقصان اور ضرر کی تلافی کے لیے اقدام کرنے کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے رحمت، خود تاثر کے معنی میں نہیں ہے بلکہ تاثر کا نتیجہ مراد ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی چار صفات بیان کی ہیں:۔

۱۔ قرآن موعظہ ہے۔

۲۔ شفاء قلب ہے۔ دلوں کی بیماریوں کی شفا ہے، شرک، جھوٹ، حسد اور بخل کی بیماری سے شفا ہے۔

۳۔ ہدایت اور راہنمائی ہے۔

ق ۴۔ رحمت ہے۔

۱۔ پہلے مرحلے میں قرآن مومنوں کے پاس ایسی حالت میں آیا جب غفلت نے ان کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا تاکہ ان کو باطن کے شک و شبہ اور تاریکی سے نکالے اور انہیں اچھی نصیحتیں کرے، یاد دہانی کرائے اور برے انجام سے ڈرائے، انہیں خیر اور سعادت کے لیے اُبھارے۔

۲۔ دوسرے مرحلے میں ان کے باطن کو پاک کرتا ہے اور ان کو ہر پست، گھٹیا اور پلید صفت سے باہر نکالتا ہے۔ ہر وہ صفت جو انسان کو بد بختی کی طرف لے جائے اور دنیا و آخرت کے خیر سے محروم کرے، ایسی صفات سے پاک کرتا ہے۔ ان کے دلوں کو باطنی بیماریوں سے شفا دیتا ہے۔

۳۔ تیسرے مرحلے میں انہیں معارف حق اور نیک اعمال کی جانب ہدایت

دیتا ہے۔ لطف و مہربانی کے ساتھ عقل کا ہاتھ پکڑ کر اسے معنوی مدارج کی طرف اوپر لے جاتا ہے تاکہ اسے اخری منزل تک پہنچا دے، کیونکہ قرآن ہدایت مطلق ہے۔

۴۔ چوتھے مرحلے میں قرآن ان کو رحمت کا لباس پہناتا ہے اور ان کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے اور انہیں دار کرامت میں پہنچاتا ہے اور مقربان الٰہی سے قرار دیتا ہے اور بہشت کے بلند ترین مقام میں انہیں رہائش دلواتا ہے۔

لہٰذا قرآن ایسا بے نظیر معجزہ ہے جو نفوس کے لیے وعظ بھی ہے، باطنی بیماریوں کے لیے شفاء بھی ہے، صراط مستقیم کی جانب دل سوز راہنما بھی ہے اور اہل ایمان کے لیے رحمت بھی ہے۔

قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَ بِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾

”کہہ دو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے سو اسی پر انہیں خوش ہونا چاہیے، یہ ان چیزوں سے بہتر ہے جو کچھ وہ جمع کرتے ہیں“۔

رحمت اور فضل الٰہی

”فَضۡلِ“ اضافہ کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی چیزوں کو اس لیے فضل کہا گیا ہے کیونکہ اللہ بے نیاز ہے، اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ساری مخلوق اللہ کی محتاج ہے، اللہ انہیں کچھ دے، کسی مخلوق کو خلق کرے تو یہ سب اس کا فضل ہے۔ بعید نہیں ہے کہ فضل سے اللہ کی عام رحمت اور عطیہ مراد ہو۔ اور رحمت سے اللہ کے خصوصی افاضات مراد ہوں جنہیں وہ مومنین کو عطا کرتا ہے اور انہیں دنیا اور آخرت کی سعادت تک پہنچاتا ہے۔ یقینی طور پر دنیا و آخرت کی خیر اور ابدی سعادت ایک ایسا امر ہے کہ اس کے ہوتے

ہوئے مومنین کو خوشحال ہونا چاہیے۔ کیونکہ دنیاوی اموال معمولی ہیں اور ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ سوائے فتنہ اور آزمائش کے وسیلے کے کچھ نہیں ہیں۔ اکثر اوقات یہ چیزیں انسانوں کو شقاوت اور بدبختی کی طرف لے جاتی ہیں۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ لَکُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْہُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰہُ اَذِنَ لَکُمْ اَمْ عَلَی اللّٰہِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾

''کہہ دو بھلا دیکھو تو اللہ نے تمہارے لیے جو رزق نازل فرمایا ہے تم نے اس میں سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال کر دیا، کہہ دو اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے، یا تم اللہ پر افتراء باندھتے ہو''۔

اللہ کی طرف سے رزق کی فراہمی

آدمی کا رزق اگرچہ زمین سے نکلتا ہے لیکن اس آیت میں اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کا رزق اتارا ہے، شاید یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمام محدود اشیاء جو انسان کے اختیار میں دی گئی ہیں وہ سب اللہ کے لامحدود خزانوں سے عطا کی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے ان لا محدود خزانوں میں سے طے شدہ مقدار میں رزق عالم طبعیت میں اتارتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾ (سورۃ حجر ،آیت ۲۱)

ترجمہ: ''اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں پھر ہم اسے مناسب مقدار کے ساتھ نازل کرتے ہیں''

لہٰذا نوع بشر کی بقاء کے جتنے بھی اسباب ہیں، اس کے کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں سب اللہ کے خزانوں سے اُتارے جاتے ہیں۔ انسانوں نے ان میں سے بعض کو حرام قرار دیا

ہے اور بعض کو حلال۔ تو اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ تمہیں کس نے اجازت دی ہے کہ اللہ کے رزق کو حلال و حرام میں تقسیم کرو۔ تم نے ایسے ہی احکام گھڑ لیے ہیں اور خدا کی طرف جھوٹ کی نسبت دیتے ہو۔ واضح ہے کہ مشرکین نے اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھا ہے، جس کی اللہ تعالیٰ بڑے لطیف انداز میں اور کنایہ سے مذمت کر رہا ہے، اس مطلب کو صریحاً بیان نہیں فرمایا، یہ اس کا لطف و کرم ہے۔

مشرکین نے اپنی طرف سے کچھ قومی آداب اور سنتیں ایجاد کر رکھی تھیں جن کی مشروعیت (جواز) پر اللہ کی طرف سے کوئی دلیل نہیں اتاری گئی۔ بلکہ انہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کے تحت یہ احکام بنائے ہیں اور پھر ان کو اللہ کی طرف نسبت دے دی۔

اللہ تعالیٰ، مخلوق کا خالق ہے اور خلقت کا کمال اس میں ہے کہ مخلوقات کو وہ تمام صلاحتیں اور وسائل دئے جائیں جو انہیں اُن کی خلقت کے ہدف اور غرض تک پہنچا سکیں۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾ (سورہ طٰہٰ، آیت: ۵۰)

ترجمہ: ''موسیٰ نے کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی اور پھر ہدایت دی''۔

کوئی بھی مخلوق صرف اپنے انجام دیے گئے اعمال اور صفات کے ذریعے ہی اپنے کمال مطلوب تک پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ دین مکمل طور پر نظام خلقت اور نظام فطرت کے ساتھ منطبق اور ہم آہنگ ہو کیونکہ فطری طور پر انسان کے اندر غذا اور مرد و عورت کے ملاپ کا غریزہ رکھا گیا ہے اس لیے فطرت اس بات کا حکم دیتی ہے کہ وہ کھانا کھائے اور ازدواج کرے۔ اسی بناء پر اسلام میں رہبانیت نہیں ہے کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ احکام اور قوانین بنانا اللہ کے اختیار میں ہے، وہی ہے جو بتاتا ہے کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ چیز حرام ہے، کسی اور کو کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا حق نہیں ہے، رسول خدا ﷺ جو کچھ بیان کرتے ہے در حقیقت اللہ کا ہی پیغام ہوتا ہے جو لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

وَ مَا ظَنُّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿٦٠﴾

''اور جو لوگ اللہ پر افتراء کرتے ہیں قیامت کے دن کی نسبت ان کا کیا خیال ہے، بے شک اللہ لوگوں پر مہربان ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے''۔

اللہ پر افتراء باندھنا بڑا گناہ

اس آیت میں تذکر دیا گیا ہے کہ اللہ پر افترا باندھنا اور اس کی روزی کو حلال و حرام میں تقسیم کرنا عقل کے تحت بہت بڑے گناہوں میں سے ایک گناہ ہے؛ لہٰذا فرماتے ہیں کہ جو لوگ اللہ پر افتراء باندھتے ہیں کیا انہیں قیامت کے دن کی فکر نہیں کہ اس دن کی کیفیت کیسی ہو گی؟ اس دن تہمت لگانے والے اپنی جزاء کو پہنچیں گے اور انہیں سزا ملے گی۔ بعد والے جملے میں ان کی ناشکری کی بری عادت کی سرزنش اور ملامت کی گئی ہے۔ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی نعمتوں میں غرق ہیں لیکن وہ اللہ کے شکر گزار نہیں ہیں۔ خدا ان کی تمام نعمات کا ولی ہے اور اللہ کے بے حساب عطیات ان کو ملے ہوئے ہیں لیکن انہوں نے خود ہی اللہ کے کچھ عطیات کو اپنے اوپر حلال کیا ہے اور کچھ کو حرام کیا ہے۔ ان کا یہ عمل کفران نعمت ہے، کیونکہ کسی کو حق نہیں ہے کہ اللہ کی روزی کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کرے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، قانون بنانا اللہ کا اختیار ہے، کسی اور کا اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ ہی خالق ہے اللہ ہی مالک ہے اور جو مالک ہے وہی قانون بناتا ہے، کسی دوسرے کو اس کا حق نہیں ہے۔

وَ مَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّ مَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ
عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ وَ مَا یَعْزُبُ عَنْ
رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ وَ لَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ
وَ لَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۶۱﴾

"اور تم جس حال میں ہوتے ہو یا قرآن میں سے جو کچھ پڑھتے ہو یا تم لوگ کوئی کام کرتے ہو تو ہم وہاں موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو، اور تمہارے رب سے ذرہ بھر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں، اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہو اور نہ بڑی مگر یہ کہ وہ روشن کتاب میں موجود ہے"۔

علم الٰہی

"شَاْنٍ" ایسی حالت یا ایسے امر کو کہتے ہیں جو مصلحت کے مطابق ہو۔ "اِفاضه" کا معنی ہوتا ہے چند افراد مل کر کسی کام میں مصروف ہوں اور غیر سے غافل ہوں۔ آیت کا معنی بڑا واضح ہے۔ یہ آیت علم الٰہی کے سارے امور کو شامل ہونے کے متعلق ہے، ارشاد ہو رہا ہے کہ تم جو بھی کام کرتے ہو ہم اس کی نگرانی کر رہے ہیں تاکہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ خدا بعض کاموں سے آگاہ ہے اور بعض سے آگاہ نہیں ہے لہٰذا جن کاموں سے آگاہ نہیں ہے قیامت کے دن ان پر ہماری پکڑ نہیں ہوگی۔ تیرے پروردگار سے پورے عالم کا کوئی ذرہ بھی مخفی نہیں ہے، وہ تمام باتوں سے آگاہ ہے خواہ وہ چھوٹی ہوں یا بڑی۔ کتاب مبین میں ہر شے ضبط شدہ ہے اور وہاں سے مٹ بھی نہیں ہو سکتی۔ سورہ انعام کی آیت نمبر ۵۹ میں بیان کیا گیا

کہ کتاب مبین سے مراد کتابِ تکوین ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

"آگاہ رہو! کہ بلاشک جو اللہ کے دوست ہیں نہ ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

اولیاء اللہ کی خصوصیات

"اَلَآ" کا لفظ، خبر دار کرنے اور آگاہ کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اور بعد والی آیت میں اپنے اولیاء کا تعارف کرایا ہے اور ان کی ولایت کے اثرات کو بیان کیا ہے اور ان کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ "ولایت" دو چیزوں کے درمیان سے واسطہ کے ہٹ جانے کو کہتے ہیں۔ لیکن بطور کنایہ ایک چیز کا دوسری چیز کے نزدیک ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ یہ نزدیکی مکانی ہو، نسبی ہو یا مکان و منزلت کے اعتبار سے ہو یا دوستی کے حوالے سے ہو۔ اللہ تعالیٰ اور مومنین کے درمیان ولایت اس معنی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کے ساتھ اس طرح کا رابطہ ہے اور وہ اس کے امور کا نگہبان ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کا ایسا تعلق اس کے ساتھ نہیں ہے۔

"اَوْلِيَآءَ اللّٰه" وہ لوگ ہیں جو خدا کو اپنا ولی بناتے ہیں اور خدا پر ایمان کی وجہ سے اللہ مومنین کا ولی ہے۔ یہاں پر ایمان سے اس کا بلند ترین مرتبہ مراد ہے۔ ایمان کا ادنیٰ اور ابتدائی مرتبہ اسلام لانا اور زبان سے شہادتین پڑھنا اور ظاہری تسلیم ہونا ہے۔ اس کا دوسرا مرتبہ جو پہلے مرتبے کے بعد آتا ہے جس چیز کا زبانی طور پر اقرار کیا گیا ہے۔ اس کا اجمالی طور پر دل سے اعتراف اور اقرار کرنا ہے یعنی جو کچھ زبان سے پڑھا ہے اس کو مانے۔ اس طرح ایمان کے درجات اوپر ہو جاتے ہیں۔ جس قدر اللہ کے سامنے آدمی کے تسلیم ہونے کا سلسلہ بیشتر ہوتا جائے گا، ایمان کا مرتبہ بلند تر ہوتا جائے گا یہاں تک کہ جب وہ اپنے تمام امور اللہ کے سپرد کر

دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ ایمان کے بلند ترین درجات پر پہنچ جاتا ہے۔ اور بندہ مومن حقیقی طور پر رب تعالیٰ کی الوہیت کے آگے تسلیم ہو جاتا ہے۔ اور اپنی حقیقی موقیعت اور حیثیت کو سمجھ لیتا ہے اور معبود کی مکمل معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے جس پر پہنچنے کے بعد نہ اسے کوئی غم رہتا ہے اور نہ کوئی تکلیف رہتی ہے اور کوئی اعتراض رہتا ہے۔ تسلیم کا یہ مرحلہ ایمان کا وہ مرحلہ ہے جس میں بندہ اللہ کے وجود کا اقرار اور پھر یقین کی منزل اور پھر حق الیقین کے مرحلے تک پہنچ جاتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ تمام چیزیں اللہ کی طرف پلٹتی ہیں۔ یہ حالت ایمان کامل کی ہے جس میں عبد کی عبودیت انتہائی حد کو چھو رہی ہوتی ہے اور اپنے کمال کو پہنچ چکی ہے جس میں کوئی عیب اور نقص نہیں رہتا۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے افراد کو نہ تو کوئی ڈر ہے اور نہ غم کیونکہ وہ لوگ خدا کو مالک مطلق جانتے ہیں۔ خوف وہاں ہوتا ہے جہاں ضرر اور نقصان کا احتمال ہو۔ اور حزن اور غم وہاں ہوتا ہے جب انسان کسی چیز کو پسند کرتا ہو وہ اس کے ہاتھ سے چلی جائے یا ایسا امر اس کو درپیش ہو جو اس کی پسند کے خلاف ہو۔ یہ دونوں مورد اس وقت پیش آتے ہیں جب انسان اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک اور حقدار سمجھے۔ اولیاء اللہ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک ہی نہیں سمجھتے، وہ خدا ہی کو ہر چیز کا مالک سمجھتے ہیں، لہٰذا انہیں نہ کسی چیز کا ڈر ہوتا ہے اور نہ ہی غم واندوہ ہوتا ہے۔ وہ نہ دنیا میں خوف میں ہوتے ہیں اور نہ آخرت میں انہیں خوف یا حزن ہوگا۔ انہیں صرف ان امور کا ڈر رہتا ہے جن سے خدا نے ڈرنے کا حکم دیا ہے جیسے اللہ سے ڈرنا یا کسی کرامت یا فضیلت کے ہاتھ سے چلے جانے کا ڈر اور خوف۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝٦٣

”جو لوگ ایمان لائے اور ڈرتے رہے“۔

اولیاء اللہ کی دوسری صفت

اس آیت میں اولیاء اللہ کی ایک اور صفت بیان ہوئی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اولیاء اللہ وہ ہیں جو مومن اور متقی ہیں۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اور ہر وقت خود کو تقویٰ کے لباس سے آراستہ رکھتے ہیں۔ اللہ کے اوامر کی پابندی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ اللہ کے احکام کے پابند ہوتے ہیں۔ غیر خدا کے لیے کسی بھی قسم کے استقلال کے قائل نہیں اور نہ ہی ان کی تاثیر کو مستقل سمجھتے ہیں۔ مالکیت اور حکم کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں منحصر سمجھتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ غیر خدا سے نہیں ڈرتے۔ ان کے دل میں فقط ایمان اور تقویٰ موجود ہوتا ہے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا، ان کا دل غیر اللہ سے خالی ہوتا ہے، ان کا دل حرم الٰہی ہوتا ہے۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ؕ ﴿۶۴﴾

”ان کے لیے دنیا کی زندگی اور آخرت میں خوشخبری ہے، اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہوتی، یہی بڑی کامیابی ہے“۔

اولیاء اللہ کے لیے بشارت

مومنین کو امید اور کرنے اور ان کے دل کو مطمئن کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انہیں اجمالی بشارت دی ہے لیکن اس بشارت کی کیفیت کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ اس بشارت کے اجمال سے اس کی جذابیت میں اضافہ ہوا ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ یہ بشارت اللہ کا حتمی فیصلہ ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور یہ امر بڑی کامیابی ہے اور بڑی فلاح ہے۔ لہٰذا اولیاء اللہ کو اپنے پروردگار کے وعدے پر پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ نہ تو

انہیں کسی چیز کا ڈر ہو اور نہ وہ کسی چیز کے ہاتھ سے جانے کے متعلق غمگین ہوں۔ کیونکہ حقیقی طور پر عزت و اقتدار سب کا سب اللہ کا ہے، وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾

"اور ان کی بات سے غم نہ کر، بے شک عزت سب اللہ ہی کے لیے ہے، وہی سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

پیغمبرؐ کی حوصلہ افزائی

اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ مشرکین پیغمبر اکرم ﷺ کو اذیت و آزار دیتے تھے اور انہیں ان کے دین کے بارے میں طعنے دیتے تھے اور پیغمبرؐ کے سامنے آکر اپنے بتوں اور معبودوں پر فخر کرتے تھے، اس حد تک چڑھ چڑھ کر بولتے تھے کہ پیغمبرؐ کا دل افسردہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرم ﷺ کو حوصلہ دینے کے لیے فرماتا ہے: اے میرے پیارے! ان کی باتیں آپؐ کو اندوہناک نہ کریں، آپؐ ان کی باتوں سے غم زدہ نہ ہوں، کیونکہ مشرکین کی گفتگو اور ان کی الٹی سیدھی باتوں سے نہ تو اللہ تعالیٰ مغلوب ہوتا ہے اور نہ شکست کھاتا ہے۔ اقتدار، عزت، بالادستی سب کے سب اللہ کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مشرکین کی باتیں سنتا ہے اور پیغمبرؐ کے حالات سے اور مشرکین کے حالات سے بھی آگاہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی عزت لامتناہی سے اگر چاہے تو عذاب کے ذریعے ان کا مواخذہ کر سکتا ہے۔ اگر وہ انہیں عذاب نہیں دے رہا تو دینی دعوت کی مصلحت کے تحت نہیں دے رہا۔ "إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ" اور "هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾" ہر ایک مستقل سبب اور علت ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو غم زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ عزت و وقار سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اس کہ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے۔

اس لیے ان دو جملوں کو واو عاطفہ کے بغیر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب اسی وجہ سے ہے کہ رسول پاکؐ غم نہ کھائیں اور افسردہ نہ ہوں اندوہناک نہ ہوں، کیونکہ مشرکین ہی نے شکست کھائی ہے، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ شُرَکَآءَ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ هُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ ﴿۶۶﴾

"خبردار! جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے سب اللہ کا ہے، اور یہ جو اللہ کے سوا شریکوں کو پکارتے ہیں، وہ نہیں پیروی کرتے مگر گمان کی اور نہیں ہیں وہ مگر اٹکل کرتے"۔

پروردگار کی مالکیت

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ اپنی صاحب عقل و شعور مخلوق اور مملوک یعنی فرشتوں، جن و انس کا مالک ہے اور ان کے سارے امور کا مدبر و مالک بھی رب تعالیٰ ہے۔ اللہ کی مالکیت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ مشرکین نے جن کو اللہ کا شریک بنایا ہوا ہے اور ان کی عبادت کرتے ہیں یہ وہمی اور خیالی خدا ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ فرضی مفاہیم ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں خدائی یکتا کا مقایسہ خیالی خداؤں سے کیا گیا ہے لہٰذا وہمی اور خیالی خدا، خدای واحد سے وہی نسبت رکھتے ہیں جو نسبت گمان و خیال کی حقیقت سے۔ حقیقت کا وہم و گمان سے کوئی تقابل نہیں!

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

"وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ اس میں آرام کرو اور دن دکھلانے والا بنایا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں"۔

رات اور دن کا فلسفہ

یہاں پر اللہ کی عظمت کو بیان کیا جارہا ہے۔ اس کے لیے اللہ کی عمومی تدبیر کی ایک مثال دی جارہی ہے جس سے انسان کی معیشت اور روزگار کا قیام ہے اور جس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس طرح ربوبیت کے کامل معنی کو بیان کردیا گیا ہے کہ خدا موجود ہے جس نے آرام و سکون کو عبادت اور تازہ دم ہونے کے لیے رات کو قرار دیا ہے۔ اور سفر اور کمائی معیشت کا سامان مہیا کرنے کے لیے دن کو قرار دیا۔ یہ سب ان افراد کے لیے اللہ کی نشانیاں ہیں جو سنتے اور جانتے ہیں کہ مالکیت اور تدبیر اللہ تعالیٰ کیلئے ہے کسی اور کی نہیں ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

"کہتے ہیں اللہ نے بیٹا بنالیا، وہ پاک ہے، وہ بے نیاز ہے، جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے، تمہارے پاس اس کی کوئی سند نہیں ہے، تم اللہ کے بارے ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جو جانتے نہی"۔

مشرکین کے شبہ کا جواب

انسان اس لیے اولاد پیدا کرتا ہے تاکہ اس کی اولاد اس کی پریشانی اور اس کے فقر و فاقہ اور بڑھاپے میں اس کی مدد کر سکے۔ (بیٹا باپ کا حصہ ہوتا ہے، باپ کا نطفہ ہوتا ہے اور اسی سے وہ نطفہ ماں کے رحم میں جاتا ہے اور اس سے اس کا وجود بنتا ہے)۔ یہ ساری چیزیں اللہ کے بارے میں محال ہیں۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا کا کوئی جز نہیں ہے۔اللہ وحدت حقیقی کے ساتھ واحد ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں تدریج نہیں ہے جب کہ بیٹے ہونے میں تدریج ہے، ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ کوئی بھی چیز اللہ کی مثل اور مانند نہیں ہے۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ اللہ بے نیاز ہے، وہ مطلّقاً کسی کا محتاج نہیں ہے۔اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے، اسے کسی مددگار کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ وہ سب سے بے نیاز ہے۔

تمہارا دعویٰ ہے کہ اللہ نے اپنا بیٹا بنایا ہے لیکن اس کے بارے میں آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تمہاری یہ بات تمہاری جہالت کی پیداوار ہے۔جب تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تو تم ایسی بات کیوں کہتے ہو؟ بلکہ تمہارے خلاف دلیل موجود ہے۔ کیونکہ خدا غنی مطلق ہے، اسے اولاد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مناظرہ کی اصطلاح میں اس قسم کے استدلال کو ”منع باسند“ کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی ایسا استدلال جس میں سند و ثبوت کے ساتھ ایک بات کو رد کیا گیا ہو۔آخر میں مشرکین کی ملامت اور سرزنش کی گئی ہے کہ ایسی بات کیوں کرتے ہو جس کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے اور اس بات کا تمہارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ بغیر علم کے کی گئی بات عقلاً درست نہیں اور عقلی لحاظ بغیر ثبوت

کے بات کرنا مذموم ہے۔ خاص طور پر اگر ایسی گھٹیا بات کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی جائے تو اس کی قباحت اور بڑھ جاتی ہے۔

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾

''کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر افترا کرتے ہیں نجات نہیں پائیں گے''۔

اللہ پر افتراء باندھنے والے فلاح نہیں پاتے

اس آیت میں یہ بات واضح طور پر بتائی گئی ہے کہ جو اللہ کی طرف ناروا نسبت دیتے ہیں، اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہیں، ان کا انجام برا ہوگا اور وہ فلاح اور کامیابی نہیں پا سکیں گے۔ کلام کے سیاق کو تبدیل کرکے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو ان کے جہل سے بھی پاک و منزہ کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ان کو خبردار بھی کیا ہے کیونکہ ڈرانا رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری ہے۔

مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

''دنیا میں تھوڑا سا نفع اٹھالینا ہے پھر ہماری طرف انہیں لوٹنا ہے پھر ہم انہیں سخت عذاب چکھائیں گے بسبب اس کے کہ وہ کفر کرتے تھے''۔

کفر کا انجام، سخت عذاب

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے کہ ان کافروں سے کہہ دو جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے اور اس کے بدلے میں دنیا کا معمولی سامان اور چند روزہ عیش و عشرت خرید لیا ہے تو آخر کار انہوں نے پلٹ کر اللہ کے پاس آنا ہے۔ جب وہ ہمارے پاس پلٹ کر آئیں گے تو

ان کے کفر، حق کے انکار اور اللہ کی دعوت کو جھٹلانے کے سبب سخت عذاب دیا جائے گا۔ لہٰذا ان کی ناکامی کی وجہ ان کا کفر ہے۔

وَ اتۡلُ عَلَیۡہِمۡ نَبَاَ نُوۡحٍ ۘ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ اِنۡ کَانَ کَبُرَ عَلَیۡکُمۡ مَّقَامِیۡ وَ تَذۡکِیۡرِیۡ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَعَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَکُمۡ وَ شُرَکَآءَکُمۡ ثُمَّ لَا یَکُنۡ اَمۡرُکُمۡ عَلَیۡکُمۡ غُمَّۃً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَیَّ وَ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۷۱﴾

''اور انہیں نوح کا حال سنا، جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے قوم! اگر تمہیں میرا تم لوگوں میں رہنا اور اللہ کی آیات کے ذریعہ نصیحت کرنا ناگوار ہو تو میں اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں، اب تم سب مل کر اپنا کام مقرر کرو اور اپنے شریکوں کو جمع کرو پھر تمہیں اپنے کام میں شبہ نہ رہے تو پھر وہ کام میرے ساتھ کر گزرو اور مجھے مہلت بھی نہ دو''۔

نوح پیغمبرؑ کا واقعہ

''نَبَاء'' بڑی خبر کو کہتے ہیں۔ ''اجماع'' یعنی ارادہ اور فیصلہ کرنا۔ ''غُمَّۃ'' غم و اندوہ اور سختی اور مشکلات۔ ''مقام'' منزلت، مقام اور قیام کرنے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں حضرت نوح کے متعلق بڑی خبر کا حوالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے: اے پیغمبرؐ! ان کو نوح کی داستان پڑھ کر سناؤ، جب نوحؑ اپنی ظالم قوم کے مقابلے میں کھڑے ہوگئے اور ان کو چیلنج کردیا جبکہ وہ اکیلے تھے، کہا کہ اے میری قوم! اگر میری رسالت اور میرا مقام اور میرا اللہ کی آیات آپ کے لیے پڑھ کر سنانا تمہارے لیے ناگوار ہے تو میں تو خدا پر اعتماد اور بھروسہ

کرتا ہوں۔ پس تم بھی اپنے امور میں اپنے شرکاء کو اکٹھا کرو اور ایک دوسرے کو مدد کے لیے پکارو اور مجھے مہلت نہ دو اور میرے قتل کا اقدام کرو۔ حضرت نوحؑ کی اس بات کا مطلب ان کو عاجز قرار دینا تھا کہ تم ایسا نہیں کر سکتے، تم مجھے نقصان نہیں دے سکتے ہو کیونکہ میرے خلاف جو بھی منصوبہ بناؤ گے تو اللہ تعالیٰ ہر طرح کا نقصان اور ضرر مجھ سے دور کرنے پر قادر ہے، وہ اپنی قدرت سے میری مدد کرے گا لہٰذا تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾

"پھر اگر منہ پھیرو تو میں نے تم سے کچھ معاوضہ نہیں مانگا، میرا معاوضہ اللہ پر ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ فرمانبرداروں میں سے رہوں"۔

معاوضہ کے بغیر اللہ کا پیغام پہنچانا

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم میری دعوت کو قبول نہیں کرتے تو اس کا مجھے تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ میں اس دعوت کے بدلے تم سے کوئی اجرت نہیں مانگ رہا۔ لہٰذا تمہارا میری بات نہ ماننے سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہو رہا کیونکہ اس کا بدلہ تم نے نہیں دینا اس کا بدلہ تو میرے اللہ نے دینا ہے۔ میں تو اللہ کی طرف سے مامور ہوں اور مجھے تو اللہ کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ میں اپنے تمام امور میں اپنے رب تعالیٰ کے آگے تسلیم رہوں اور ان میں سے بنوں جو اللہ کے مقابلے میں تکبر نہیں کرتے اور ظاہری اسباب کے سامنے تسلیم نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تسلیم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں کسی سے کوئی نقصان کی توقع نہیں ہے۔ ان کے نزدیک سارے معاملات اللہ کے پاس ہیں۔ اس طرح حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو سمجھایا اور یہ بتایا کہ قادر مطلق فقط اللہ کی ذات ہے۔ میرا اسی پر

بھروسہ ہے، میں اسی کے آگے تسلیم ہوں اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں ان لوگوں سے بنوں جو اللہ کے آگے تسلیم ہیں۔

فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

"پھر انہوں نے اسے جھٹلایا پھر ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو کشتی میں بچالیا اور انہیں خلیفہ بنا دیا اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا انہیں غرق کر دیا، پھر دیکھ لو کہ جو لوگ ڈرائے گئے تھے ان کا انجام کیسا ہوا"۔

قوم نوحؑ کا ان کی دعوت کو ٹھکرانا

یہاں پر قوم نوحؑ کی داستان کا اجمالی طور پر ذکر ہوا ہے کہ نوحؑ تو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا رہا لیکن وہ ان کو جھٹلاتے رہے۔ جب انہوں نے تکبر کیا اور حضرت نوحؑ کی دعوت کو قبول نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم دیا۔ جب وہ خشکی پر کشتی بنا رہے تھے تو ان کی قوم نے ان کا مذاق اڑایا تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس کشتی میں انہیں بٹھاؤ جو تجھ پر ایمان لے آئے ہیں اور جانوروں کا بھی جوڑا جوڑا اس میں بٹھا دو۔ قوم نوح والے حضرت نوحؑ کے اس کام پر ہنستے تھے، ان کا مذاق اڑاتے اور سٹیاں بجاتے تھے تو اللہ نے آسمان سے پانی برسانے کیلئے دروازے کھول دیئے اور بھرپور بارش شروع ہوئی اور اسی طرح زمین سے چشمے بھی ابل پڑے اور ہر جگہ کو پانی نے گھیر لیا اور اللہ کے حکم سے نوحؑ کی کشتی پانی کے اوپر تیرنے لگی۔

اللہ کے حکم سے حضرت نوح اور ان پر ایمان لانے والے کشتی پر سوار افراد نے نجات

پائی اور کفار اور حضرت نوحؑ کو جھٹلانے والے سب کے سب غرق ہوئے۔ ان کے غرق ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے نہ فقط پیغمبر خدا کے خبر دار کرنے پر ان کی بات نہ مانی اور ان کے ڈرانے پر نہ ڈرے بلکہ ان کے سامنے تکبر کرتے رہے تو خدائے مقتدر، عزیز اور شکست ناپذیر نے ان کا خوب مؤاخذہ کیا اور انہیں سخت عذاب میں مبتلا کر دیا۔ ذرا بتاؤ کہ ان کا کیسا حال ہوا؟ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ مشرکین! تم بھی تکبر کر رہے ہو اور میری بات نہیں مان رہے ہو تو تمہارا حال بھی حضرت نوح کی قوم جیسا ہوگا۔ اے مشرکین! حضرت نوحؑ کی قوم کے حالات کو یاد کرو اور ان کا انجام جو ہوا اسے بھی یاد کرو، اگر تم نے ان جیسا رویہ اپنایا تو اللہ کی طرف سے تمہاری بھی سخت پکڑ ہوگی اور تم اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکو گے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

”پھر ہم نے نوح کے بعد اور پیغمبر ان کی قوم کی طرف بھیجے تو وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لائے پھر بھی ان سے یہ نہ ہوا کہ اس بات پر ایمان لے آئیں جسے پہلے وہ جھٹلا چکے تھے، اسی طرح ہم حد سے نکل جانے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں“۔

نوحؑ کے بعد آنے والے انبیاء الٰہی

اس آیت میں ”رُسُل“ سے مراد وہ پیغمبر ہیں جو حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت

موسیٰ کے زمانے تک آتے رہے۔ ''بیّنات'' سے وہ معجزے مراد ہیں جو مختلف امتوں کے تقاضا کرنے پر ان کے پیغمبر لاتے رہے۔ لیکن گناہ اور تکبر ان اُمتوں کے دلوں میں رسوخ کر چکے تھے اور ان کی عادت ثانویہ بن چکی تھی اس لیے وہ ایمان نہیں لاتے تھے اور پیغمبروں کو جھٹلاتے تھے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ کی طرح عالم ذر کی جانب اشارہ ہو:

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْؕ قَالُوْا بَلٰىۚۛ شَهِدْنَاۚۛ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَۙ﴿۱۷۲﴾

ترجمہ: ''اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور ان پر خود انہیں گواہ بنا کر (پوچھا تھا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا تھا: ہاں! (تو ہمارا رب ہے) ہم اس کی گواہی دیتے ہیں، (یہ اس لیے ہوا تھا کہ) قیامت کے دن تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے''۔

بہر حال وہ ایمان لانے والے نہیں تھے اور اس کی وجہ ان کی جھٹلانے کی سابقہ عادت تھی اور ان کے دلوں میں بغاوت اور غرور و تکبر رچ بس گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اس طرح نافرمانوں اور جھٹلانے والوں کے دلوں پر مہر لگاتے ہیں جس کے نتیجے میں ان سے دعوت حق کو قبول کرنے کی صلاحیت چھین لی جاتی ہے۔[1]

---

[1]۔ بہت ساری روایات میں آیا ہے جن میں سے ایک روایت حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے نقل ہوئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کی آفرینش کے وقت جس کو چاہا اسے بہشت کی مٹی سے خلق کیا اور دشمن کو دوزخ کی مٹی سے خلق کیا۔ پھر سب کو سایہ میں قرار دیا کیونکہ سارے موجودات ایک لحاظ سے رب کا سایہ ہیں۔ اور پھر ان سب سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا اور انبیاء کی دعوت ان کے سامنے پیش کی تو بعض نے اقرار کیا اور بعض نے انکار کیا۔ پھر انہیں ہماری ولایت پیش کی گئی اور اللہ کی قسم ہماری ولایت کو صرف انہوں نے قبول کیا جن کو اللہ دوست رکھتا تھا اور جنہوں نے جھٹلایا اور انکار کیا وہ وہی تھے جن کو اللہ دشمن رکھتا تھا۔ پس تکذیب اور جھٹلانے کا عمل پہلے سے تھا۔

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مُّوۡسٰی وَ هٰرُوۡنَ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِهٖ بِاٰیٰتِنَا فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَ كَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿۷۵﴾

''پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنی نشانیاں دے کر بھیجا پھر انہوں نے تکبر کیا اور وہ لوگ جرائم پیشہ اور گنہگار تھے''۔

موسیٰؑ اور ہارونؑ کا واقعہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت موسیٰ تک آنے والے پیغمبروں کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون کو فرعون کی طرف معبوث کیا۔ ''مَلَاۡئِہٖ فِرۡعَوۡنَ'' سے وہ لوگ مراد ہیں جن کا فرعون کے ساتھ تعلق تھا اور اپنے آپ کو وہ خود فرعون کے رشتہ دار سمجھتے تھے۔ ''اٰیَات'' سے موسیٰ اور ہارون کو دیے گئے معجزات مراد ہیں۔ پہلے بھی بتایا گیا کہ موسیٰ اور ہارون کو ۱۷ معجزات دیئے گئے تھے جن میں سے مشہور معجزات عصا کا اژدھا بن جانا اور ید بیضا تھے۔ بہر حال جب حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون اور اس کی قوم کے پاس آئے اور ان کو اللہ کا پیغام پہنچایا تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات ماننے کی بجائے تکبر کیا، بڑے بن بیٹھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مجرم اور ستمگار تھے لہٰذا انہوں نے اپنے پلید اور برے اعمال کو جاری رکھا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِنَا قَالُوۡۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۷۶﴾

''پھر جب انہیں ہمارے ہاں سے سچی بات پہنچی کہنے لگے یہ تو کھلا جادو ہے''۔

حق کا انکار

یہاں حق سے مراد وہ معجزہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسی علیہ السلام کے ہاتھ پر

جاری کیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ سامنے آگیا اور عصا، اژدھا بن گیا تو ان کے سارے جادو گر حضرت موسیٰ کے سامنے تسلیم ہوگئے تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول کرتے اور اس کے رسول کو مان لیتے، انہوں نے کہہ دیا کہ یہ کھلا جادو ہے، حالانکہ وہ معجزہ اللہ کی طرف سے تھا اور حقیقی امر تھا، جادو، سحر یا خیالی چیز نہیں تھی۔ جھٹلانے والے اور تکبر کرنے والوں کی یہ علامت ہے کہ وہ مومنوں اور اہل حق کو باطل اور انبیاء کے برحق معجزات کو سحر و جادو قرار دیتے ہیں۔

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾

''موسیٰ نے کہا کیا تم حق بات کے بارے یہ کہتے ہو جب وہ تمہارے پاس آئی کیا یہ جادو ہے جبکہ جادو کرنے والے تو نجات نہیں پاتے''۔

حضرت موسیٰؑ کا سوال

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے استفہام انکاری کے ذریعے ان سے پوچھا اب جبکہ حق تمہارے پاس آگیا ہے تو تم حق کو دیکھ کر کہتے ہو کہ یہ سحر و جادو ہے؟ کیا یہ معجزہ تمہاری نظر میں جادو ہے؟ جبکہ جادو باطل ہے اور معجزہ برحق ہے۔ آخر میں فرمایا کہ جادو گر کامیاب نہیں ہوتے۔ اس گفتگو سے آپ نے اپنے آپ کو سحر و جادو سے مبرا قرار دیا۔ کیونکہ آپ نے جادو گر کو کامیابی سے محروم اور اپنے آپ کو کامیاب قرار دیا۔ وہ اس وجہ سے آپ کی بات کا انکار کر رہے تھے کیونکہ وہ کامیابی سے محروم تھے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

"انہوں نے کہا کیا توں ہمارے ہاں آیا ہے کہ ہمیں اس راستہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا ہے اور (چاہتے ہو کہ) تم دونوں کو اس ملک کی سرداری مل جائے اور ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں ہیں"۔

فرعونیوں کا موسیٰؑ کو جواب

"لفت" کسی چیز کو چھوڑ دینے کے معنی میں ہے۔ حقیقت میں فرعون اور اس کے درباریوں نے موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا کہ تم ہمیں اپنے آباء واجداد کے دین سے ہٹانے کے لیے آئے ہو۔ تمہارا مقصد ہماری کئی سالہ حکومت کو چھین کر اسے بنی اسرائیل کے افراد کے حوالے کرنا ہے۔ تم ہمارے اوپر حکومت اور سرداری کرنا چاہتے ہو، اس لیے ہم تمہاری بات ہرگز نہیں مانیں گے اور تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس طرح انہوں نے حضرت موسیٰ اور ہارونؑ کا انکار کر دیا۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِیْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِیْمٍ ﴿۷۹﴾

"اور فرعون نے کہا میرے پاس ہر دانا جادوگر کو لے آؤ"۔

فرعون کا جادوگروں کو اکٹھا کرنا

فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھا تو اپنے درباریوں اور وزیروں سے کہنے لگا کہ پوری مملکت سے بڑے ماہر جادوگروں کو اکٹھا کرو تاکہ ہم موسیٰؑ کا مقابلہ کریں اور اسے شکست دیں اور اس کا جھوٹ واضح کر دیں۔ وہ یہی خیال کرتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ جادو ہے۔ لہٰذا اس جادو کا جواب جادو ہی سے دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم اس طرح موسیٰؑ اور ہارونؑ پر غالب آجائیں گے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾

”پھر جب جادو گر آئے تو انہیں موسیٰ نے کہا کہ پھینکو جو تم پھینکنا چاہتے ہو“۔

جادو گروں سے موسیٰؑ کی گفتگو

فرعون نے جادو گروں کو اکھٹا کیا اور ایک دن معین کیا گیا۔ جب سارے جادو گر آگئے تو حضرت موسیٰؑ نے جادو گروں سے کہا کہ پہلے تم اپنا کرتب دیکھاؤ اور تمہارے پاس جو لاٹھیاں اور رسیاں ہیں انہیں زمین پر پھینک دو تو انہوں نے وہ رسیاں پھینک دیں۔ مجمع لگا ہوا تھا اور ہر شخص اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لیے مکمل تیاری کر کے آئے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا پہلے تم اپنا کام دیکھاؤ۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

”پھر جب انہوں نے اپنا سب کچھ سامنے پھینک دیا تو موسیٰ نے کہا جو تم لائے ہو وہ جادو ہے، اللہ اسے ابھی درہم برہم کر دے گا، بے شک اللہ مفسدوں کے کام نہیں سنوارتا“۔

جادو گروں کی ناکامی

جیسے ہی جادو گروں نے اپنے جادو کا آغاز کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تمہارا یہ عمل جادو ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس کلام کا مقصد حقیقت کو بیان کرنا تھا۔ وہ فرمانا چاہتے تھے کہ سحر حقیقت نہیں رکھتا، اس کی کوئی واقعیت نہیں، یہ ایک غیر واقعی امر ہے جو لوگوں کے سامنے حق اور واقعیت کی شکل میں نظر آتا ہے، یہ عمل ذاتی طور پر باطل ہے۔ جہان ہستی کا یہ قانون ہے کہ حق برقرار رہتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔ لہٰذا بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے جادو کو باطل اور ختم کر دے گا اور ہمیں فتح دے گا کیونکہ ہمیشہ فتح حق کو ملتی ہے

اور حق کی حکومت قائم ہوگی۔ اگرچہ باطل کچھ مدت کے لیے حکومت کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے وسیلے سے جادوگروں کے جادو کو باطل کر دیا۔ (کیونکہ موسیٰ کے عصا نے جادوگروں کے چھوٹے بڑے سب سانپ نگل لیے) اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا، فسادی کے عمل کی اصلاح نہیں کرتا ہے۔ کیونکہ صلاح و فساد اور درستگی اور خرابی دو متضاد عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی سنت اور مشیت کے مطابق صحیح اور درست کی اصلاح کرتا ہے اور فاسد اور خراب کو درست نہیں کرتا کیونکہ اگر فاسد عمل کی اصلاح ہو جائے تو پورا عالم فاسد ہو جائے گا اور یہ عمل محال ہے۔ اس طرح جادوگروں کا جادو ناکام ہوا۔

وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

"اور اللہ اپنے حکم سے حق بات کو سچا کرتا ہے اگرچہ گنہگار اسے برا ہی مانیں"۔

حق کی سچائی

یہاں پر اللہ کے کلمات سے الٰہی فرامین اور احکام مراد ہیں جو پورے موجودات عالم میں جاری ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہاں پر ایک الٰہی سنت کو بیان کر رہے ہیں اور ایک حقیقت بتا رہے ہیں جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے، ان کو متوجہ کر رہے ہیں اور ان کے دلوں کو عنقریب رونما ہونے والے معجزہ کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کر رہے تھے۔ انہیں بتا رہے تھے کہ عنقریب جب حق ظاہر ہوگا تو وہ صحیح طریقے سے اسے درک کر سکیں۔ اس لیے فرمایا کہ خدا اپنے کلمات کے ذریعے ہمیشہ حق کو ثابت کرتا ہے اگرچہ مجرمین کو ناگوار گزرے۔ کیونکہ مجرمین حق کے راستے کے مخالف ہوتے ہیں اور حق کو ناپسند کرتے ہیں، وہ حق کے غلبہ کو نہیں چاہتے۔ لیکن ان کا ناپسند کرنا اللہ کی مشیت کو ناکام نہیں کر سکتا۔ مجرم ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں اور ہمیشہ ناکامی ان کا مقدر رہتی ہے، یہ ایک حقیقت تھی جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اشارہ کیا اور معجزہ کے برحق ہونے کو اس انداز میں بیان کیا۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

"پھر کوئی بھی موسیٰ پر ایمان نہ لایا مگر اس کی قوم کے چند لڑکے اور وہ بھی فرعون اور ان کے سرداروں سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں وہ انہیں مصیبت میں نہ ڈال دے، اور بے شک فرعون زمین میں سرکشی کرنے والا تھا اور بے شک وہ حد سے گزرنے والوں میں سے تھا"۔

قوم موسیٰؑ کے مومن افراد

گفتگو کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ "قَوْمِهٖ" کی ضمیر موسیٰ علیہ السلام کی طرف پلٹ رہی ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم (بنی اسرائیل) کے کمزور اور مساکین افراد میں سے تھوڑے سے لوگ موسیٰ پر ایمان لائے۔ کیونکہ وہاں پر جن کی حکمرانی تھی وہ بہت قوی تھے اور وہ اپنے مقام اور حیثیت کو محفوظ رکھنے کے لیے ہر طریقے کو استعمال میں لا رہے تھے۔ وہ اپنے خدمت گزاروں کو مال دے کر یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ان کے خیر خواہ ہیں، حکومت ان کی خیر خواہ ہے، تاکہ اس طرح ان کی حکومت سے ناراضگی کے سبب کو دور کر سکیں۔ اگرچہ بعض مفسرین نے "قَوْمِهٖ" کی ضمیر کو فرعون کی طرف پلٹایا ہے، لیکن بعد والی آیت، اس کی نفی کرتی ہے۔

بنی اسرائیل میں سے جو قلیل تعداد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر لائے تھے وہ بھی خوف اور ڈر کی حالت میں ایمان لائے تھے۔ انہیں فرعون کا بھی ڈر تھا اور خود بنی اسرائیل کے

بڑے اور مالدار لوگوں کا بھی خوف تھا۔ کیونکہ قوم کے اشراف انہیں ایمان لانے سے منع کرتے تھے۔ کیونکہ وہ فرعونیوں کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وہ ان کے دوست ہیں تاکہ انہیں اپنے آپ سے خوش رکھیں۔ لہٰذا بنی اسرائیل کے کمزور مومنین فرعون اور اس کے حواریوں سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ انہیں آزار و اذیت نہ دیں۔ ان کا ڈرنا بجا تھا کیونکہ اس زمانے میں اس سرزمین میں فرعون کی سلطنت تھی اور اسی کو برتری حاصل تھی اور وہ بالکل عدالت کی رعایت نہیں کرتا تھا بلکہ ظلم اور ستمگری میں حد سے بڑھا ہوا تھا اور اس کے ظلم و شکنجے اور زیادتی کی کوئی حد نہیں تھی۔

وَ قَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝٨٤

"اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم فرمانبردار ہو"۔

اللہ پر بھروسہ کرنے کی سفارش

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ اللہ پر ایمان لے آؤ اور اسی پر توکل اور بھروسہ کرو کیونکہ رب تعالیٰ کا سہارا سب سہاروں سے برتر ہے۔اس کہ وجہ یہ ہے کہ جب بندہ اللہ پر ایمان لاتا ہے تو اسے رب تعالیٰ کی اجمالی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ یہ جان لیتا ہے کہ سارے اسباب اللہ پر ختم ہوتے ہیں، سارے امور کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا مومن کا ایمان اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ اپنے سارے امور اللہ کے سپرد کر دے اور اسے اپنے تمام معاملات کا وکیل قرار دے۔ اس بناء پر ظاہری اسباب پر اعتماد کرنا خالص جہالت ہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے مومنوں کو خطاب کیا اور

کہا کہ اگر تمہار ایمان خدا پر ہے اور تمہارا ایمان کمال کی منزل پر پہنچا ہوا ہے تو اللہ کے حضور تسلیم ہو جاؤ اور خدا پر بھروسہ کرو، خدا پر اعتماد کرو۔ خدا تمہاری مدد کرے گا کوئی تمہیں نقصان نہیں دے سکتا۔

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾

''تب وہ بولے ہم اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، اے ہمارے رب! ہم پر اس ظالم قوم کا زور نہ آزما''۔

مومنین بنی اسرائیل کا جواب

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی میں ایمان لانے والوں نے کہا ہم اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور دعا مانگی اور یہ دعا اسی توکل کے نتیجے میں تھی کہ ہمارے تن سے کمزوری اور ذلت کے لباس کو اتار دے اور ہمیں ظالم قوم کے شر سے نجات دے۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کی پہلی دعا اور خواہش ذکر ہوئی ہے اور بعد والی آیت میں ان کی دوسری دعا ذکر ہوئی ہے۔ ان کی پہلی دعا جس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنا، اس کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ہماری کمزوری سے نکال دے۔ کیونکہ کمزوروں کی کمزری اس بات کا سبب بنتی ہے کہ وہ طاقت وروں کے دھوکے میں آجائیں اور ظالموں کے ماتحت ہو جائیں۔ لہٰذا ضعیف کا ضعف ظالم کے فتنہ اور آزمائش کا وسیلہ بنتا ہے۔ کیونکہ ضعیف کا ظلم سہنا ستمگار کو ظلم کرنے پر ابھارتا ہے۔ یہ بنی اسرائیل کی پہلی دعا تھی کہ ہمیں ظالموں کے لیے امتحان کا وسیلہ قرار نہ دے، یعنی ہم سے ضعف اور کمزوری اتار دے۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور اپنی مہربانی فرما کر ہمیں ان کافروں سے نجات دے دے''۔

توکل کے مرحلے کے بعد یہ دوسری بات ہے۔ بنی اسرائیل کی پہلی دعا یہ تھی کہ ہمیں ذلت و کمزوری سے باہر لے آ۔ ان کی دوسری دعا یہ ہے کہ اپنی رحمت کے صدقے ہماری مدد فرما اور ہمیں کافروں کے چنگل سے نجات دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعائیں قبول کر لی۔

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰی وَ اَخِیۡہِ اَنۡ تَبَوَّاٰ لِقَوۡمِکُمَا بِمِصۡرَ بُیُوۡتًا وَّ اجۡعَلُوۡا بُیُوۡتَکُمۡ قِبۡلَۃً وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۷﴾

''اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو حکم بھیجا کہ اپنی قوم کے واسطے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو مسجدیں سمجھو اور نماز قائم کرو، اور ایمان والوں کو خوشخبری دو''۔

موسیٰ اور ہارونؑ کیلئے فرمان الٰہی

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو مصر کی سرزمین میں ٹھکانہ دو۔ اور تبلیغ کی سہولت اور ایک دوسرے کے ساتھ جلد رابطہ کرنے اور نماز باجماعت قائم کرنے کے لیے انہیں حکم دیا کہ اپنے گھر آمنے سامنے بناؤ۔ اور نماز قائم کرو اور مومنوں کو بشارت دو۔ اس بشارت کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بتادو کہ جو تم نے دعا کی ہے کہ فرعون کے شر سے اللہ تمہیں نجات دے تو، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے صدقے میں تمہاری دعا قبول کی ہے اور تمہیں فرعون کے شر سے نجات دے گا۔ اس طرح بنی اسرائیل جن کی کوئی معین جگہ نہ تھی انہیں مصر میں ٹھہرایا گیا۔

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾

"اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں آرائش اور ہر طرح کا مال دیا ہے، اے ہمارے رب! یہاں تک کہ انہوں نے تیرے راستہ سے گمراہ کر دیا، اے ہمارے رب! ان کے اموال کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے پس یہ ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھیں"۔

اللہ سے موسیٰؑ کی درخواست

"زِيْنَةً" ان چیزوں کو کہتے ہیں جو زینت کا ذریعہ ہوں۔ منطقی اعتبار سے مال اور زینت کے درمیان عموم خصوص من وجہ کی نسبت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ مال ہوتا ہے لیکن زینت نہیں جیسے جانور اور زمین۔ اور بعض دفعہ زینت ہوتی ہے لیکن مال نہیں جیسے مناسب قد اور خوبصورتی۔ اور بعض دفعہ زینت بھی ہے اور مال بھی ہے جیسے زیورات اور زینت کی دوسری چیزیں۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے عرض کیا کہ اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو بڑی جزا اور دنیاوی زندگی میں تو نے انہیں مال دیا ہے، زینت دی ہے، اور وہ انہی وسائل کے ذریعے تیری یاد سے غافل ہیں اور ہدایت نہیں

پاتے۔ اے میرے رب! ان پر اپنے عذاب کو جاری رکھ، ان کے اموال ضائع کردے، ان کو سخت عذاب دے کہ کبھی بھی حق کو قبول نہ کریں اور ایمان قبول کرنے کی ان میں گنجائش نہ رہے تاکہ وہ ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں پر ایمان انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے اور وہ وقت ہے کہ جب عذاب الٰہی کو دیکھیں گے اور کہیں گے کہ ہم ایمان لائے تو اس وقت ان کا ایمان لانا کوئی فائدہ نہ دے گا۔ حضرت موسیٰ نے یہ دعا اس وقت کی جب کلی طور ان سے مایوس ہو گئے اور یقین ہو گیا کہ ان کا زندہ رہنا سوائے گمراہی کے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے کچھ اور نہیں ہوگا۔ یہ حضرت نوحؑ کی دعا کی طرح ہے کہ جب انہوں نے اپنے قوم کے خلاف دعا کی تھی اور کہا تھا کہ:

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾

ترجمہ: ”اور نوح نے کہا: میرے رب! روئے زمین پر بسنے والے کفار میں سے ایک کو بھی باقی نہ چھوڑ“۔

قَالَ قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَانِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٨٩﴾

”فرمایا تمہاری دعا قبول ہو چکی سو تم دونوں ثابت قدم رہو اور بے عقلوں کی راہ پر مت چلو“۔

موسیٰؑ کی دعا کی قبولیت

پہلی آیت میں دعا فقط موسیٰ علیہ السلام کی تھی لیکن یہاں پر خطاب موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کو ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی تو ہارون نے آمین کہا ہو گا۔ اور آمین کہنا بھی دعا ہے پس دونوں کی دعا تھی تو خدا نے ان

دونوں کی دعا کو قبول کیا اور حکم دیا کہ اپنے طریقے پر قائم رہیں، مستحکم رہیں، استقامت کریں، اس راہ میں تمہارے قدم نہ ڈگمگائیں، اور جاہل جماعت کی پیروی نہ کرنا۔ جاہل جماعت سے بنی اسرائیل کا ایک گروہ مراد ہے جو نفسانی خواہشات کے پیرو تھے اور موسیٰ اور ہارون سے بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کی نفسانی اور شہوانی خواہشات کی پیروی کریں۔آیت کے اس حصے میں گویا اشارہ ہے کہ موسیٰ اور ہارون سے ان کی امت کے جاہل لوگ اسی قسم کی خواہش کریں گے کہ وہ ان کی جاہلانہ اور قومی روایت کو برقرار اور زندہ رکھیں۔

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّ عَدْوًا ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾

”اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا پھر فرعون اور اس کے لشکر نے ظلم اور زیادتی سے ان کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا تو کہا میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں مگر جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں“۔

فرعون کے ایمان کا اعلان

فرعون نے بنی اسرائیل پر ظلم و زیادتی کی تمام حدیں پھلانگ دی۔ خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرئیل کو لے مصر سے نکلے۔ راستے میں جب سمندر آگیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے وہاں پر عصا مارا تو بارہ راستے بن گئے۔ بنی اسرائیل نے ان راستوں سے دریا عبور کر لیا۔ فرعون کے لشکری ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ بنی اسرائیل والے پریشان بھی تھے

کہ کہیں فرعونی انہیں گرفتار نہ کرلیں۔ جب بنی اسرائیل نے دریا عبور کر لیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اس راستے کو بند نہیں کیا، اگرچہ بنی اسرائیل نے جب فرعون کے لشکریوں کو اس راستے سے داخل ہوتا دیکھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم نے یہ کیا کیا کہ ان کا راستہ بند نہیں کیا، وہ تو ہمیں گرفتار کرلیں گے۔ لیکن اللہ کا اپنا نظام تھا، جیسے ہی فرعون اور اس کے لشکری دریا کے درمیان میں پہنچے تو پانی آپس میں مل گیا اور سب غرق اور ہلاک ہو گئے۔

فرعون نے جب اپنے آپ کو ہلاک ہوتے دیکھا تو کہا کہ میں بھی بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لے آیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید ایمان لانے سے ہلاکت سے بچ جائے گا اور اس طرح دریا عبور کرلے گا۔ اس لیے اپنے آپ کو مسلمان کا وصف دیا اور کہا کہ میں بھی مسلمان ہوا ہوں۔ اس کے اسلام اور ایمان دونوں کو اکھٹا کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے وہ اپنے اس گناہ کے اثر کو ختم کرنا چاہتا تھا جس پر وہ ایک لمبا عرصہ اصرار کرتا رہا تھا، وہ عرصہ دراز تک شرک کا ارتکاب کرتا رہا تھا اب ایمان اور اسلام کے اظہار سے اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے کہا کہ میں اسی خدا کو اپنا معبود سمجھتا ہو جسے بنی اسرائیل اپنا معبود سمجھتے ہیں اور میں مسلمان ہو گیا ہوں اور اللہ کے آگے تسلیم ہوں۔

آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾

”اب یوں کہتا ہے، اور تو اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا“۔

اللہ تعالیٰ کا فرعون کو جواب

اللہ تعالیٰ نے فرعون کو جواب دیا کہ جب عذاب آگیا تب ایمان لاتے ہو؟ جبکہ اس سے پہلے گناہ اور فساد میں غرق تھے، پوری عمر اللہ تعالیٰ کی معصیت کی اور جب توبہ کا وقت تھا تو

اس وقت توبہ نہیں کی، اللہ کے پیغمبر کو جھٹلایا، معجزات دیکھ کر ایمان نہیں لے آئے۔ اب جب موت کا لمحہ آیا، عذاب پہنچ گیا تو اب ایمان لاتے ہو؟ تمہارا ایمان اور تمہاری توبہ قبول نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر تیرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا، جب اختیار تھا تو اس وقت ایمان نہیں لایا اب جب بے اختیار ہو تو ایمان کا اعلان کر رہے ہو؟ بے اختیاری میں لایا گیا ایمان قبول نہیں ہے۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۟ؑ ﴿۹۲﴾

''پس آج ہم تیرے بدن کو نکال لیں گے تاکہ تو پچھلوں کے لیے عبرت ہو، اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں''۔

فرعون کے جسد کا محفوظ رہنا

اللہ تعالیٰ نے فرعون کے بدن سے روح لے لی اور وہ عذاب سے نہ بچ سکا لیکن اللہ تعالیٰ نے عبرت کے لیے کہہ دیا کہ تیرا بدن محفوظ رہے گا تاکہ یہ دنیا میں لوگوں کے لیے عبرت بنا رہے۔ انسان کی انسانیت اس کے نفس سے ہے، اس کے بدن سے نہیں ہے۔ اس لیے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے اس کے نفس کو موت دے دی لیکن اس کے بدن کو ہم نے نجات دی تاکہ آنے والوں کے لیے عبرت اور نشانی رہے۔ اگرچہ اکثر لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔[1]

---

[1]۔ قرآن اور جدید سائنس'' کتاب کے مصنف ڈاکٹر موریس بوکائل نامی فرانسیسی سرجن اور محقق نے رامسس دوئم فرعون کی مومی کے متعلق تحقیق کی۔ اس کی تحقیق کے مطابق فرعوں کا جسد تین ہزار سال پرانا ہے اور وہ پانی کے اندر رہنے کے باوجود خراب نہیں ہوا ہے۔ جب اس نے سعودی عرب کا سفر کیا اور '' سورہ یونس کی آیت نمبر 92 کو پڑھا'' تو عربی زبان سیکھی اور قرآ

وَ لَقَدۡ بَوَّاۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مُبَوَّاَ صِدۡقٍ وَّ رَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡا حَتّٰی جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۹۳﴾

''اور البتہ تحقیق ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کی عمدہ جگہ دی اور کھانے کو ستھری چیزیں دیں وہ باوجود علم ہونے کے خلاف کرتے رہے، بے شک تیرا رب قیامت کے دن ان میں فیصلہ کرے گا جس بات میں کہ وہ اختلاف کرتے تھے''۔

بنی اسرائیل کے حالات

'' مُبَوَّاَ صِدۡقٍ '' رہائش کی ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں زندگی گزارنے کی تمام ضروریات موجود ہوں، یہ جگہ بیت المقدس اور شام کے اطراف میں موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو وہاں پر رہائش دی اور اس کو مبارک اور برکتوں کی سرزمین قرار دیا جس میں ہر طرح کی نعمتیں تھیں، قسم قسم کے پھل، غذائی اجناس، کھیت اور ہر شئے وہاں پر موجود تھی۔ بنی اسرائیل ان ساری نعمات کا شکر بجالانے کی بجائے حقیقت کو جاننے کے باوجود اختلاف کا شکار ہوئے اور ظلم و زیادتی کرنے لگے اور حد سے گزر گئے، نعمات الٰہی کا کفران کیا۔ انہوں نے ان سب اعمال کو جان بوجھ کر انجام دیا۔ ان برے اعمال کی وجہ سے انہیں سخت

ن کا مطالعہ کرنے کے بعد فوق الذکر کتاب لکھی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم تیرے بدن کو نجات دیں گے تو اس کے جسم کو پانی نے نقصان نہیں دیا اور ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی اس کا جسد اب بھی محفوظ ہے اور لوگوں کے لیے عبرت اور نشانی ہے۔

قسم کے انجام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ قیامت کے دن خدا حتمی طور پر ان کے اختلاف کا فیصلہ دے گا۔

فَاِنۡ کُنۡتَ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ فَسۡـَٔلِ الَّذِیۡنَ یَقۡرَءُوۡنَ الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ لَقَدۡ جَآءَکَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۹۴﴾

"سو اگر تمہیں اس چیز میں شک ہے جو ہم نے تیری طرف اتاری تو ان سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں، بے شک تیرے پاس تیرے رب سے حق بات آئی ہے سو شک کرنے والوں میں ہر گز نہ ہو"

شک و تردید سے بچنے کی تاکید

پیغمبر اکرم ﷺ کو خطاب ہے کہ اگر مبداء و معاد کے معارف اور سابقہ امتوں کی سرنوشت کے بارے میں جاری اللہ کی سنت اور طریقہ اور جو کچھ ہم نے تیرے اوپر اتارا ہے اس کے متعلق تمہیں شک و تردید ہے تو اہل کتاب سے پوچھو جو آسمانی کتابوں کو اچھی طرح جانتے ہیں، یقینی طور پر جو کچھ تیرے اوپر تمہارے پروردگار کی جانب سے اترا ہے وہ حق ہے۔ یہ واضح دلائل سے عقلوں کو اسے تسلیم کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ لہٰذا ان افراد سے نہ بنو جو شک و تردید میں مبتلا ہیں۔ اس آیت کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ (نعوذ باللہ) پیغمبر اکرم ﷺ کو قرآن کریم کے حقائق کے بارے میں شک و تردید تھا۔ بلکہ عرف میں یہ روش عام ہے کہ کسی مطلب کو ثابت کرنے کے لیے مخاطب سے کہا جاتا ہے کہ اگر اس استدلال میں شک ہے تو دوسروں سے بھی سوال کر سکتے ہو۔ وگرنہ معلوم ہے کہ قرآن کی حقانیت کے متعلق پیغمبرؐ اکرم ﷺ کے دل میں کسی قسم کا شک نہیں تھا۔ خدا نے اہل کتاب پر اتمام حجت کے لیے پیغمبرؐ کو ایسا فرمان دیا۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾

''اور ان میں سے بھی نہ ہو جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تو اس طرح تم خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جاؤ گے''۔

آیات الٰہی کو جھٹلانے والے خسارے میں

پچھلی آیت میں شک و تردید نہ کرنے کی تاکید کی گئی تھی اس آیت میں اسی مطلب کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا ہے کہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں میں سے نہ بنو۔ کیونکہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔ معلوم رہے کہ کوئی بھی آیت اس وقت تک آیت نہیں ہوتی جب تک اس کی دلالت واضح اور روشن نہ ہو۔ لہٰذا ایسی صورت میں اس کو جھٹلانے کی وجہ سوائے دشمنی اور ضد بازی کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ خدا کی آیات کو جھٹلانے کا انجام یہ ہوگا کہ انسان نقصان میں جائے گا۔ نقصان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنا سرمایہ کھو بیٹھے۔ انسان کی دنیاوی اور آخروی زندگی کا سرمایہ اللہ تعالیٰ اور اس کی آیا ت پر ایمان لانا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں اس خطرناک عاقبت اور انجام کے بارے میں خبردار کیا گیا ہے کہ تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے نہ بنو۔ حقیقت میں یہ بھی منکرین کے لیے حجت تھی ورنہ پیغمبر اکرم ﷺ تو ایسے نہیں تھے اور نہ ہی پیغمبرؐ کو ایسے خطاب کی ضرورت ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾

''جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے وہ تو ایمان نہیں لائیں گے''۔

جھٹلانے والوں کی وضاحت

اس آیت میں جھٹلانے والوں کی وصف بیان کی گئی ہے تاکہ ان کے نقصان اٹھانے

والوں میں سے ہونے کی وجہ بیان کی جائے۔ ان کے نقصان اٹھانے والوں میں سے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کلمہ (وعدہ الٰہی) پورا ہو چکا۔ اللہ کے کلمے اور اللہ کی گفتار سے مراد وہی ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ (سورہ البقرۃ، آیت: ۳۹)

ترجمہ: ''اور جو لوگ کفر کریں اور ہماری آیات کو جھٹلائیں وہی دوزخ والے ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''

آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کے انجام کا فیصلہ اللہ نے دے دیا ہے لہٰذا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس آیت سے تین نقطے واضح ہوتے ہیں:۔

۱۔ حق کے ساتھ ضد بازی، حق کے مقابلے میں ہٹ دھرمی یا آیات الٰہی کو جھٹلانا ایسا جرم ہے جس کی سزا اور اس کا عذاب جاودانی اور حتمی ہے۔

۲۔ انسان کی سعادت کا سرمایہ فقط اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات پر ایمان لانا ہے۔

۳۔ اللہ کے ہاں ایمان اس صورت میں قبول ہے جب اختیاری حالت میں لایا جائے۔ موت کا نظارہ دیکھ کر یا نزول عذاب کو دیکھ کر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

''اگرچہ انہیں ساری نشانیاں پہنچ جائیں جب تک کہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں (ایمان نہیں لائیں گے)''۔

آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کا مزاج

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں، اللہ کے رسولوں کی دعوت کو قبول نہیں

کرتے تو الٰہی فیصلے کے مطابق وہ خسارے میں ہیں۔ اگر ان کے لیے ہر قسم کے معجزات اور آیات اتاری جائیں تو پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اگر یہ لوگ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرکے ایمان لائیں گے تو اس وقت ان کے ایمان لانے کا انہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ایمان اس وقت فائدہ دیتا ہے جب اختیاری حالت میں لایا جائے۔ یہ لوگ پوری زندگی ایمان سے دور رہے اور جب موت کے آثار دیکھے تو پھر کہا ہم اللہ پر ایمان لائے، تو یہ ایمان لانا ان کے فائدے میں نہیں ۔

فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾

”سو کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی جو ایمان لاتی تو اس کا ایمان اسے نفع دیتا سوائے یونس کی قوم کے، کہ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے ذلت کا عذاب دور کر دیا اور ہم نے انہیں ایک وقت تک فائدہ پہنچایا“۔

قوم یونسؑ کا تذکرہ

”لَوْلَا“ ایمان لانے کی تشویق اور ترغیب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ”اٰمَنَتْ“ سے اختیاری اور صحیح ایمان مراد ہے۔ لیکن یہ ترغیب فعل ماضی کے متعلق ہے جو ابھی محقق نہیں ہوا اس لیے قطعی طور اس سے یاس اور ناامیدی مراد ہے۔ اسی لیے قوم یونس کو اس سے استثناء کیا ہے۔ اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جن بستیوں میں ہم نے پیغمبر بھیجے ان بستیوں والوں نے ہمارے پیغمبروں کو جھٹلایا اور کوئی بھی آبادی والے عذاب کے نزول سے پہلے اختیاری ایمان نہیں لائے تاکہ ان کا ایمان لانا ان کے لیے فائدہ مند ہوتا اور ان سے عذاب ٹل جاتا،

سوائے قوم یونس کے جو عذاب اُترنے سے پہلے ایمان لے آئے اور ہم نے ان سے دنیاوی عذاب ان سے اٹھالیا اور پھر ہم نے ان کی طبیعی عمر تک ان کو زندگی عطا کی۔ لہٰذا اس آیت میں جو استثناء ہے یہ استثناء متصل ہے۔ اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ مخلوقات کے تصرف کرنے میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے اور وہ اپنے اعمال میں مختار ہیں۔ لیکن ان کے اعمال پر جو آثار مرتب ہوتے ہیں وہ جبری امر اور ایک طبیعی سنت اور قانون ہے۔ ہر عمل کا عکس العمل ہے ہر عمل کا ایک خاص نتیجہ ہے جس نے ہر صورت میں مرتب ہونا ہوتا ہے۔

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

”اور اگر تیرا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب ایمان لے آتے، پھر کیا توں لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں“۔

اللہ کے نزدیک جبری ایمان مطلوب نہیں

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اگر کچھ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس وجہ سے ہے کہ خدا نے نہیں چاہا کہ سارے لوگ ایمان لائیں، اگر خدا چاہتا کہ روئے زمین کے سارے خلائق ایمان لائیں تو پھر ایسا ہی ہو جاتا۔ اے پیغمبرؐ! آپ کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کے سب لوگ ایمان لے آئیں اور اس امر کے لیے اپنے آپ کو تھکاوٹ میں نہ ڈالو کیونکہ تم سب کو زبردستی مومن نہیں بناسکتے اور اللہ ایسے ایمان سے راضی بھی نہیں جو ایمان زبردستی اور مجبوری کی حالت میں اختیار کیا گیا ہو۔ وہ ایمان مطلوب ہے جو حسن اختیار سے ہو جس میں زبردستی کا عنصر شامل نہ ہو۔

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"اور کسی کے بھی بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا ایمان لے آئے، اور اللہ ان کے لیے کفر کا فیصلہ کرتا ہے جو نہیں سوچتے"۔

اللہ تعالیٰ کا اختیار مطلق

ملک اور حکومت فقط اللہ کی ذات سے مختص ہے۔ اللہ تعالیٰ پورے عالم میں ذاتی طور پر تصرف کا حق رکھتاہے۔ اس تصرف میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے ۔ اس کے سواء مخلوقات میں سے کسی کو ذاتی طور پر تصرف کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ہاں یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے بعض کو تصرف کا حق عطا کیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانا ایک خاص سبب کا محتاج ہے اور یہ سبب اسی صورت میں اثر کرتا ہے جب اللہ کی طرف سے اذن ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنا اذن ان نفوس کے لیے صادر کرتا ہے جن میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد موجود ہو۔ جو لوگ ہٹ دھرم اور ضدی ہیں اور حق کے سامنے تسلیم نہیں ہوتے، اللہ تعالی ان کے لیے گمراہی، پلیدی اور نجاست ہی نصیب کرتا ہے۔ کیونکہ ان میں ایمان قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ وہ لوگ جو ٹھیک سمجھتے نہیں اور ان میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کے متعلق عذاب کا حتمی فیصلہ ہو چکا ہے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

''کہہ دو دیکھو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ موجود ہے، اور بے ایمان قوم کو معجزے اور ڈرانے والے کچھ فائدہ نہیں دیتے''۔

زمین وآسمان میں اللہ کی نشانیاں

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ زمین اور آسمانوں میں جتنے بھی موجودات ہیں یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں جو انسانوں کو ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے ایمان نہ لانے کا اٹل فیصلہ کر لیا ہے ان کو یہ نشانیاں کوئی فائدہ نہیں دے سکتیں۔ جنہوں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے۔ بعض مفسرین نے ''مَا تُغْنِي'' میں ما کو نافیہ قرار دیا ہے، اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ان آیات، نشانیوں اور ڈرانے کا بے ایمان افراد پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

فَهَلۡ يَنۡتَظِرُوۡنَ اِلَّا مِثۡلَ اَيَّامِ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ؕ قُلۡ فَانْتَظِرُوۡۤا اِنِّىۡ مَعَكُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِيۡنَ ﴿۱۰۲﴾

''پھر کیا وہ انہیں لوگوں کے دنوں کا سا انتظار کرتے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں، کہہ دو چلو انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں''۔

آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کا عذاب

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جن لوگوں پر ان نشانیوں اور ڈرانے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ایمان نہیں لائے تو ان کا انجام اور سرنوشت ماضی کی پچھلی امتوں جیسی ہوگی۔ لہٰذا یہ بھی انتظار کریں کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو عذاب الٰہی کے لیے ذخیرہ کیا ہے اور یہ عذاب ان کے اور پیغمبر کے درمیان جدائی ڈالے گا اور یہ عذاب ان کے لیے حتمی ہے۔ پیغمبرؐ کو

خطاب ہے کہ ان کی اس قسم کی سر نوشت اور انجام کے تم بھی منتظر رہو۔ جو تمہارے اور ان کے درمیان جدائی ڈالے گا۔ لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

''پھر ہم بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں، اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ ایمان والوں کو بچالیں''۔

انبیاء اور مومنین کی نجات کا حتمی فیصلہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جب اللہ کا حتمی عذاب آجائے گا تو جس طرح ہم نے سابقہ زمانے میں اپنے پیغمبروں اور ان کے باایمان ساتھیوں کو نجات دی تھی اب بھی ایسا ہی ہوگا اور ہم مومنوں کو نجات دیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو نجات دینے کا حتمی فیصلہ کر رکھا ہے۔ اس آیت کے آخر میں رسولؐ خدا کا نام نہ لینے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپؐ اس زمانے میں نہیں ہوں گے جب مومنین کو دیا گیا نجات کا وعدہ محقق ہوگا۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد وہ وعدہ محقق ہوگا اور اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ کی امت کے مومنین کو نجات دے گا۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

''کہہ دو اے لوگو! اگر تمہیں میرے دین میں شک ہے تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو بلکہ میں تو اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں وفات دیتا ہے، اور مجھے حکم ہوا ہے کہ ایمانداروں میں رہوں''۔

دین الٰہی کی پیروی

''دِیْن'' اس سنت، طریقہ اور روش کو کہتے ہیں زندگی میں جس کی پیروی ہونی چاہیے۔ دین میں شک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان شک کرے کہ جس طریقے کو اس نے اختیار کیا ہے، اس پر استقامت کرے اور اسی پر برقرار رہے یا نہ رہے؟ شک کرے کہ اس کا دین دائمی اور پائیدار ہوگا یا نہیں ہوگا؟ اس شک کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین کا خیال تھا کہ اسلام جلد ختم ہو جائے گا اور انہیں امید تھی کہ وہ بہت جلد دعوت اسلام کو مٹا دیں گے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ پیغمبر کو دستور دے رہا کہ ان کو جواب میں کہو کہ اگر تم میرے دین کے زوال کی توقع رکھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ یہ باقی نہ رہے گا اور میری دعوت ختم ہو جائے گی تو جان لو! میں تو تمہارے بتوں کی پوجا نہیں کروں گا، میں تو فقط اللہ کی عبادت کرتا ہوں کیونکہ وہی ہے جو تمہیں موت دے گا۔ آیت کے اس حصے کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین بتوں کی عبادت اس وجہ سے کرتے تھے تاکہ ان سے عذاب ٹل جائے، اور اگر ان کی پرستش چھوڑ دیں گے تو یہ ناراض ہو جائیں گے۔ پیغمبرؐ نے اس عبارت سے ان کو بتا دیا کہ تمہارے بتوں کے پاس نہ تو عذاب لانے کا اختیار ہے اور نہ وہ تمہاری موت کو ٹال سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو تمہارا خالق ہے اور وہی تمہیں مارنے کی قدرت رکھتا ہے۔ لہٰذا امن حاصل کرنے اور عذاب سے بچنے کے لیے فقط اللہ کی پرستش کرو اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں مومن افراد سے بنوں کیونکہ خدا نے مومنوں کی نجات کا وعدہ دیا ہے۔

وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾

"اور یہ بھی کہ یکسو ہو کر دین کی طرف رخ کیے رہو، اور مشرکوں میں نہ ہو"۔

مشرکین سے برائت

یہ جملہ پچھلے جملے پر عطف ہے جہاں رسول خدا ﷺ کی زبانی کہا گیا تھا کہ مجھے حکم ہوا کہ میں مومنین میں سے ہو جاؤں۔ اس جملے میں کہا گیا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اپنا رخ دین حنیف کی جانب کروں، یعنی توحید کے طریقہ کی طرف متوجہ رہوں اور شرک سے منہ موڑوں، کیونکہ یہ الٰہی آئین معتدل اور استوار ہے اور اس میں گمراہی نہیں ہے۔ اسی طرح مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مشرکوں سے نہ بنوں کیونکہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔

وَ لَا تَدۡعُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُکَ وَ لَا یَضُرُّکَ ۚ فَاِنۡ فَعَلۡتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾

"اور اللہ کے سوا ایسی چیز کو نہ پکار جو نہ تیرا بھلا کرے اور نہ برا، پھر اگر تو نے ایسا کیا تو بے شک ظالموں میں سے ہو جائے گا"۔

بتوں میں نفع یا نقصان پہنچانے کی صلاحیت نہیں

اس آیت میں تاکید کی گئی ہے کہ مشرکین نے جن چیزوں کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے (یعنی بت) وہ نہ تو کوئی فائدہ پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی نقصان پہنچا سکتے ہیں تاکہ انسان کسی فائدے کو حاصل کرنے یا کسی نقصان سے بچنے کی امید میں ان کی عبادت کرے۔ وہ تو جمادات ہیں ان میں ارادہ اور قدرت نہیں ہے۔ اگر انسان ان کی پرستش کرے تو وہ ظالموں میں سے ہوگا۔ کیونکہ شرک انسان کو ظالموں کے گروہ میں لا کھڑا کرتا ہے وہ ظالم جن کے بارے میں عذاب کا فیصلہ حتمی ہو چکا ہے۔

وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ہُوَ ۚ وَ اِنۡ یُّرِدۡکَ بِخَیۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِہٖ ؕ یُصِیۡبُ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ ؕ وَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۰۷﴾

"اور اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے ہٹانے والا کوئی نہیں، اور اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچانا چاہے تو کوئی اس کے فضل کو پھیرنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے، اور وہی بخشنے والا مہربان ہے"۔

نفع و نقصان پہنچانا اللہ کا اختیار

اللہ تعالیٰ قادر اور قاہر ہے، اس کے علاوہ کوئی اور قادر اور قاہر نہیں ہے۔ لہٰذا اگر وہ کسی کو نقصان دینا چاہے تو اس کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کرسکتا اور کوئی اسے دفع نہیں کرسکتا اور اگر اللہ کسی کو فائدہ پہنچانا چاہے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور کوئی اس خیر کے آگے مانع نہیں بن سکتا۔ اللہ اپنے ارادے سے اپنے بندوں کو خیر دیتا ہے، ان کو معاف کرتا ہے، ان پر مہربانی اور رحم کرتا ہے۔ جس رب کے ایسے اوصاف ہوں تو اسی کی عبادت کی جانی چاہیے، اسی سے دعا مانگی جائے اور اس کے علاوہ کسی اور کو معبود قرار نہ دیا جائے، پرستش فقط اسی کی ہونی چاہیے۔

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَکُمُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۚ فَمَنِ اہۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَہۡتَدِیۡ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡہَا ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۱۰۸﴾ؕ

"کہہ دو اے لوگو! تمہیں تمہارے رب سے حق پہنچ چکا ہے، پس جو کوئی راہ پر آئے

سو وہ اپنے بھلے کے لیے راہ پاتا ہے، اور جو گمراہ رہے گا اس کا وبال اسی پر پڑے گا، اور میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں"۔

حق کا اثبات

حق سے مراد یا قرآن ہے جو دعوت حق پر مشتمل ہے یا خود دعوت حق یعنی دین حق مراد ہے جس کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہنچایا ہے۔ جو بھی اس حقیقت کو سمجھ جائے، اس کا فائدہ اسی کو ہوگا اور جو اس سے منہ موڑلے اور ہدایت کو قبول نہ کرے تو اس کا نقصان خود اس کو ہوگا۔ لہٰذا انسان اپنے لیے زندگی کا طریقہ اور روش انتخاب کرنے میں آزاد ہے، ہدایت کو چن لے یا گمراہی کو چن لے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے وکیل نہیں ہیں کہ ان کے لیے خود سے کوئی روش یا طریقہ انتخاب کریں اور بتائیں کہ یہ کرو یا یہ نہ کرو، اللہ نے راستہ بتادیا ہے کہ یہ نجات کا راستہ ہے اور یہ گمراہی کا راستہ ہے۔ اس کے بعد ہر شخص اپنے علم اور بصیرت سے ہدایت کے راستے کو اپنائے۔ اس آیت میں یہ کنایہ موجود ہے کہ لوگوں پر ضروری ہے کہ وہ ہدایت پر آئیں کیونکہ ہدایت پانا اور حق کی طرف آنا خود ان کے اپنے فائدے میں ہے۔[1]

وَ اتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ وَ اصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ ۚۖ وَ ہُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾

[1] ۔ سورہ انسان کی آیت نمبر 3 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّا ہَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا" "ہم نے اسے راستے کی ہدایت کر دی خواہ وہ شکر گزار بنے اور یا چاہے تو ناشکرا بنے"۔

"اور جو کچھ تیری طرف وحی کیا گیا ہے اس پر چلو اور صبر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے، اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"۔

رسول خداؐ کو وحی کی پیروی کرنے کا حکم

اس آیت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا ہے کہ وہ فقط اللہ کے احکام کے تابع رہیں جو ان تک وحی کے ذریعے پہنچائے گئے ہیں۔ اس راہ میں آنے والے مصائب پر صبر کریں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وعدہ دے رہے ہیں کہ بہت جلد اللہ ان کے اور ان کی قوم کے درمیان فیصلہ دے گا اور خدا ایسا فیصلہ دے گا جس سے رسول اللہؐ کا دل خوش ہو اور جس سے آپؐ کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملے۔ حکم دینے اور فیصلہ کرنے کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ہمیشہ اللہ کا فیصلہ عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ خدا ہی بہترین فیصلہ دینے والا ہے۔ اچھی عاقبت فقط رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل ایمان کے لیے ہے کسی اور کے لیے نہیں ہے۔

سورۂ ھود

(مکی۔ کل آیات: ۱۲۳)

اس سورت کے مطالب

دینی معارف کا ذکر، عبادات، معاملات اور کلی سیاست کے احکام، اخلاقی اوصاف، مبدا اور معاد کی توصیف، انسان کے عمل کا اس کے ساتھ ربط و تعلق۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۙ﴿۱﴾

"ا ل ر" یہ ایسی کتاب ہے کہ جس کی آیتیں حکیم خبردار کی طرف سے مستحکم کر دی گئی ہیں پھر مفصل بیان کی گئی ہیں"۔

کتاب کا تعارف

"الف، لام، راء" حروف مقطعات میں سے ہیں جن کے بارے میں پہلے بھی بتایا گیا ہے۔ یہ انسانوں کے لیے معجزہ ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان حروف کے ذریعے ایک ایسا کلام ایجاد کیا ہے جس کی مانند لانے سے بشر عاجز ہے۔ عرب شعراء اور ادباء ان ہی حروف اور الفاظ کو استعمال کر کے معرکۃ الآرا کلام پیش کرتے تھے اور اپنے لکھے ہوئے اشعار کعبہ کے ساتھ لٹکا دے دیتے تھے، ان میں سے جو بہتر ہوتا تھا اس کا انتخاب ہوتا تھا اور وہ کعبہ کے ساتھ لٹکایا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان ہی حروف سے ایسا کلام ایجاد کیا جو انسانی فہم سے ماوراء اور بالاتر ہے۔ انسان اس سے پہلے ان مطالب سے آگاہ نہیں تھا اور یہ سارے مطالب اس سے غائب تھے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی ان مطالب سے آگاہ اور با خبر ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ان حروف کا اس سورہ میں بیان شدہ مطالب کے ساتھ گہرا ربط ہے جس کے شروع میں یہ حروف مقطعات ذکر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کتاب کے بارے میں فرمایا کہ یہ کتاب ایک ایسی کتاب ہے جس

کی آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط و تعلق ہے اور سب کے سب ایک امر کی طرف واپس پلٹتے ہیں۔ اگرچہ ان کے مضامین مختلف ہیں لیکن ان سب کے مقاصد اور اہداف ایک ہیں اور وہ مقصد اور ہدف اللہ کی توحید کا بیان ہے۔ توحید ایک ایسی روح ہے جو تمام قرآنی آیات میں جاری و ساری ہے۔

اور دوسرے پہلو سے ان آیات اور ان کے اجزا کے درمیان انفصال ایجاد کیا گیا ہے تاکہ ان میں سے ہر ایک معین حکم پر دلالت کرے۔ لہٰذا قرآن کریم کی آیات کے درمیان ایک لحاظ سے وحدت پائی جاتی ہے اور دوسرے لحاظ سے ان میں کثرت پائی جاتی ہے اور ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں لیکن یہ جدائی انہیں اس ایک ہدف سے دُور نہیں کرتی اور نہ ہی آیات کا آپس میں ربط اور تعلق ٹوٹتا ہے۔ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے جو کہ حکیم ہے۔ اور اس کا کلام حکمت پر مبنی ہے۔ یہ ایسا پختہ کلام ہے، ایسا مضبوط اور محکم کلام ہے جس میں کوئی عیب و نقص نہیں ہے۔ اللہ خبیر ہے وہ تمام موجودات اور ان کے اجزاء کے حالات سے باخبر ہے۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ۙ۝۲

''یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں''۔

رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد

قرآن کریم کی دوسری آیات کی طرح اس آیت میں بھی قرآنی آیات کی غرض بیان ہوئی ہے اور وہ اللہ کی توحید ہے۔ اس جملے میں توحید پرستی کی دعوت دی گئی ہے اور اللہ کے علاوہ فرضی معبودوں کی عبادت سے منع کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ عبادت فقط اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس کے بعد حضور پاک ﷺ کی زبان سے نقل فرمایا کہ

میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ تمہیں انذار کروں اور تمہیں بشارت دوں لہٰذا آپؐ کی بشارت اور انذار کی بازگشت بھی توحید کی جانب ہے۔

وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ یُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ كَبِیْرٍ ۳

''اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو تاکہ تمہیں ایک وقت مقرر تک اچھا فائدہ پہنچائے اور جس نے بڑھ کر نیکی کی ہو اس کو بڑھ کر بدلہ دے، اور اگر تم پھر جاؤ گے تو میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں''۔

قرآن کے نزول کا ہدف

رسول اللہ ﷺ کے کلام کے تسلسل میں ارشاد ہو رہا ہے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے نازل فرمایا ہے تاکہ تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اچھے اعمال انجام دینے کے ذریعے للہ کی طرف رجوع کرو۔ کیونکہ یہ وہی راستہ ہے جو تمہیں حق تعالیٰ کی رحمت کے قرب تک لے جاتا ہے۔ انسان کی زندگی کا صحیح راستہ یہی ہے کہ وہ غیر خدا کی عبادت کو ترک کرے اور خدائے واحد کی طرف رجوع کرے اور اس سے مغفرت طلب کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو قربِ الٰہی تک پہنچے گا۔ لہٰذا پہلی آیت ''اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ'' کے ذریعے باطنی اعتقاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور دوسری آیت ''وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ'' کے ذریعے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ

عمل کا مرحلہ، عقیدے کے مرحلے کے نتائج اور فروعات میں سے شمار ہوتا ہے۔ "یُمَتِّعْکُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا" اگر تم رب تعالیٰ کی درگاہ سے مغفرت طلب کرو گے اور توبہ کرو گے اور اعمال صالح بجا لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ بھی تمہیں دنیاوی زندگی کے فوائد اور نعمتوں سے نوازے گا جیسے وسعت رزق، امن، عزت، شرافت۔

لہٰذا ایک صالح اور اچھے معاشرے کے لیے حیات حسنہ اور اچھی زندگی یہ ہے کہ اس معاشرے کے سارے افراد نعمتوں کی بہروری سے مساوی طور پر لطف اندوز ہوں، وہ نعمتیں جن کو انسان کی فطرت پسندیدہ شمار کرتی ہے۔ اس امر کو مفید علم اور نیک عمل کے سایے تلے مادی نعمتوں کے استعمال میں اعتدال اور میانہ روی کہا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے کے افراد اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے اور انہیں ایمان کی وجہ سے دنیاوی زندگی میں بھی آرام سکون اور مادی نعمتوں سے بھی نوازا جاتا ہے۔ کیونکہ ایسے معاشرے کے افراد اپنی نوع کے دوسرے افراد کو بھی مادی نعمات میں شریک کرتے ہیں اور اس طرح معاشرے کے افراد کے درمیان ہم آہنگی اور باہمی قرب وجود میں آتا ہے اور طبقاتی فاصلے ختم ہو جاتے ہیں، تضاد اور تنافی دور ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر اس فرد کو جس کے اعمال دوسروں سے بہتر ہوتے ہیں وہ اجر اور سعادت عطاء کرتا ہے جو اسی کے ساتھ مختص ہوتی ہے، بغیر اس کے کہ دوسرے کے حق کو ضائع کرے یا اس کا جو حق بنتا ہے اس سے غصب کرے اور اسے دوسرے کو عطا کردے۔ کسی کا حق اٹھا کر دوسرے کو نہیں دیا جائے گا لیکن غیر دینی معاشرے کے افراد اگرچہ بظاہر ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ ہی کیوں نہ ہوں دو گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

(۱) ایک مستکبرین اور برتر لوگوں کا گروہ۔

(۲) دوسرا مستضعف اور ذلیل وخوار اور مظلوم لوگوں کا گروہ۔

معاشرے کے اس طبقاتی فاصلے کو توحیدی آئین اور نظام کے علاوہ کوئی دوسرا نظام

ختم نہیں کر سکتا ہے۔ صرف توحیدی نظام ہی معاشرے کے افراد کے درمیان توازن اور تعادل ایجاد کر سکتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر تم نے الٰہی دعوت سے رخ موڑ لیا تو میں تو اللہ کا رسول ہوں، مجھے تمہارے بارے قیامت کے دردناک عذاب کا خوف ہے۔ تمہیں اس دن کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکے گا، اس دن کے عذاب میں آسمانی آوازیں اور گہرا دھواں، پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہونا، ستاروں کا ٹوٹ جانا اور زمین کا اپنی جگہ پر نہ رہنا شامل ہیں۔ اس دن اللہ کے سوا کوئی فریاد سننے والا نہ ہوگا۔

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٤﴾

"تمہیں اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

ساری مخلوقات کی بازگشت اللہ کی طرف

اس آیت میں پچھلی آیت کے آخری حصے کی وجہ بیان کی جارہی ہے جس میں رسول اللہؐ کی زبان سے یہ جملہ نقل ہوا کہ اگر تم رخ موڑ لو گے تو میں تمہارے بارے بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں، تمہیں بڑے دن کا عذاب آگھیرے گا۔ اس لیے کہ قیامت کے دن تم سب اٹھائے جاؤ گے، سب مردے زندہ ہونگے اور سب کے سب اللہ کی طرف پلٹیں گے اور خدا کے پاس پہنچیں گے۔ یہ بات تمھارے لیے بعید نہ ہو کہ یہ کیسے ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر امر پر قادر ہے۔ لہٰذا وہ تمہارے مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کرنے اور تمہارے اعمال کا احتساب کرنے سے عاجز نہیں ہے۔

أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٥﴾

''خبردار! بے شک وہ اپنے سینے دوہرے کر رہے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں، خبردار! جس وقت وہ کپڑے ڈھانکتے ہیں وہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپا کر اور ظاہر کرکے کرتے ہیں، بے شک وہ دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے''۔

اللہ مشرکین کے اعمال سے آگاہ ہے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ مشرکین اپنے سینوں کو پیچھے کھینچتے ہیں اور اپنے سروں پر کپڑا ڈال لیتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو خدا سے اور خدا کی آیات سننے سے چھپا لیں اور اس طرح ان پر اللہ کی حجت تمام نہ ہو توآگاہ ہوجاؤکہ جب تم اپنے سروں کو کپڑوں کے نیچے چھپا رہے ہوتے ہو اور اپنے سینوں کے پیچھے کھینچ رہے ہو تو اللہ تمہارے چھپے ہوئے اور آشکار سب امور سے آگاہے۔ لہٰذا تمہارا یہ عمل تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا اور تم اس طریقے سے قرآن کی آیتوں کو سننے اور اس کے لوازمات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے ہو۔ کیونکہ تمہارے سارے اعمال اللہ کے پاس آشکار ہیں اور اللہ دلوں کی چھپی ہوئی باتوں سے آگاہ ہے، اللہ کے پاس ہر چیز کا علم ہے کچھ بھی اس سے مخفی نہیں ہے۔

وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُہَا وَ یَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّہَا وَ مُسۡتَوۡدَعَہَا ؕ کُلٌّ فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ۝۶

''اور زمین پر کوئی چلنے والا نہیں مگر اس کی روزی اللہ پر ہے اور جانتا ہے جہاں وہ ٹھہرتا ہے اور جہاں وہ سونپا جاتا ہے، سب کچھ واضح کتاب میں موجود ہے''۔

علم الٰہی کی وسعت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہاہے کہ جتنے بھی متحرک اور جاندار موجودات ہیں ان سب کا رزق اللہ تعالیٰ ذمہ ہے لہٰذا کوئی بھی جاندار بغیر رزق کے نہیں رہ جاتا، ہر ایک کو اس کی روزی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے رہنے، ٹھہرانے اور ان کے آنے جانے کی جگہ سب سے آگاہ ہے۔ یہاں پر "مُسْتَقَرَّ" سے ٹھہرانے کی معین جگہ مراد ہیں جیسے مچھلی کے لیے پانی، چینٹوں کے لیے زمین کے اندر بل۔ "مُسْتَوْدَعَ" سے موقت (عارضی) طورپر ٹھہرانے کی جگہ مراد ہے جیسے ہوا میں پرندے یا وطن سے دور مسافر یا ماں کے رحم میں بچہ۔ بہرحال اللہ تعالیٰ متحرک موجودات کے تمام احوال سے آگاہ ہے اور یہ سارے موارد علم الٰہی کی کتاب مبین میں حساب شدہ ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی رزق لینے والے کا رزق اللہ کے علم کے بغیر اس تک نہیں پہنچتا۔ہم نے سورۃ انعام کی آیت نمبر 59 میں اس مطلب کی وضاحت بیان کی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

"اور وہی ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے اور اس کا تخت پانی پر تھا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے، اور اگر تو کہے کہ مرنے کے بعد اٹھو گے تو منکرین یہ کہیں گے کہ یہ تو صریح جادو

ہے۔"

کائنات کی خلقت

"السَّمٰوٰتِ" سے کرہ زمین کے اوپر مشاہدہ کیے جانے والے جسمانی طبقات مراد ہیں جو زمین کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ آسمان اول وہی ہے جس پر ستارے موجود ہے اور اس کو زینت دے رکھی ہے۔ "الۡاَرۡضَ" ہر نچلی اور پست چیز کو کہتے ہے اور یہاں پر اس سے کرہ زمین مراد ہے۔ بہر حال اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ مرحلوں میں خلق کیا ہے۔[1] عربی زبان میں زمانہ کے ایک حصے کے لیے "یوم" کا استعمال عام ہے۔

قرآنی آیات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو مرحلوں میں خلق کیا ہے۔[2] اور چار مرحلوں میں روزیوں کی اندازہ گیری کی۔[3] چار مرحلوں میں روزی کے اندازہ گیری کرنے سے سال کے چار فصل اور چار موسم مراد ہیں۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آسمانوں اور زمین کی خلقت ناگہانی اور عدم محض سے نہیں ہوئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک ایسے مادہ سے خلق کیا ہے جو متراکم اور اس کے اجزاء ایک دوسرے کے مشابہ تھے۔ خدا نے اس مادہ کو جز جز بنایا اور اس کے ایک حصے سے دو مرحلوں میں زمین کو خلق کیا اور پھر دو مرحلوں میں سات آسمانوں کو خلق کیا جو اس موقع پر دھواں تھا۔ اور اسے جز جز کیا اور پھر دو مرحلوں میں اسے سات آسمان بنایا۔ پھر دو مرحلوں میں باقی مخلوقات کو خلق کیا۔

---

[1]۔ سورہ یونس کی آیت 3 اور سورۃ کی آیت نمبر 54 میں ذکر ہو چکا کہ خلقت کے چھ مراحل سے کیا مراد ہے۔

[2]۔ سورہ حٰمٓ سجدہ کی آیت نمبر 9 ۔ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ ۔

[3]۔ سورہ حٰمٓ سجدہ آیت نمبر 10 ۔ وَقَدَّرَ فِیۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا فِیۡۤ اَرۡبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ ۔

موجودات کی خلقت کے بارے میں دوسری بات یہ ہے کہ سارے زندہ موجودات کو پانی سے خلق کیا گیا ہے۔

جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر 30 میں اس بارے آیا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ

عرش خدا کا پانی پر قائم ہونا اس بات سے کنایہ کہ اس وقت اللہ کی مالکیت پانی پر مستقر تھی جو تمام زندہ موجودات کا مائع (مادہ) حیات ہے۔ کیونکہ عرش اور تخت سلطنت ہر بادشاہ کی سلطنت کے ظہور کی جگہ ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا ''استوای علی العرش'' کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کی خلقت کے بعد جو کہ دو مرحلے میں تھی، مخلوقات کی تدبیر شروع کی۔

پھر فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کو حیرت انگیز صورت میں اس لیے خلق کیا ہے تاکہ تمہیں آزمایا جائے اور نیکو کاروں کو بدکاروں سے جدا کیا جائے اور معلوم ہو جائے کہ کون شاکر اور اطاعت گزار ہے تاکہ انہیں اچھا بدلہ دیا جائے اور کون کافر اور نافرمان ہے تاکہ اسے سزا دی جائے۔ البتہ یہ جو کہا گیا کہ آسمانوں اور زمین کی خلقت کا ہدف اچھے کو برے سے الگ کرنا تھا، اس بات سے منافات نہیں رکھتا ہے کہ دوسری آیات میں انسانوں اور جنات کی خلقت کے غرض کو عبادت بیان کیا گیا ہے۔[1] کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے انسان کامل ترین اور متقی ترین موجود ہے۔ انسان اگر علمی اور عملی کمال کے مدارج اور مرحلوں کو طے کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی افضل اور شریف ترین مخلوق بن جاتا ہے۔ اس بنا پر انسان، اللہ کی خلقت کا مقصد نہائی اور آخری غرض اور ہدف ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے: '' لولاك لما خلقت الافلاك'' اے ہمارے رسول ﷺ! اگر تم

---

[1] ۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۔ سورہ ذاریات، آیت 56۔

نہ ہوتے تو ہم اپنی دوسری مخلوقات کو خلق نہ کرتے۔ اس بناء پر انسان وہ کامل ترین موجود ہے جس کی خاطر پوری کائنات خلق کی گئی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان سارے قدرت الٰہی کے مظاہر اور نمونوں کو دیکھنے کے باوجود بھی یہ لوگ حق کا انکار کرتے ہیں۔ اور اگر تم ان سے کہو کہ تم نے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے اور تم نے قیامت کے دن مبعوث ہونا ہے تو یہ لوگ قرآنی معارف اور قرآنی آیتوں کو سحر اور جادو کا نام دے دیتے ہیں۔ قرآن کے فصیح و بلیغ الفاظ کو سحر و جادو کہہ کر درحقیقت وہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور قرآن کے الفاظ کے علاوہ اس کے مطالب اور معارف کو بھی سحر و جادو کہتے ہیں۔ یہ اللہ کی کتاب پر افتراء باندھنے کی انتہاء ہے اور اس کی وجہ ان کی ہٹ دھرمی اور اللہ کی آیات سے دشمنی ہے۔

شاید یہاں پر سحر سے مغالطہ مراد ہو، وہ کہنا چاہتے تھے کہ پیغمبرؐ باطل کو حق کی صورت میں پیش کر رہے ہیں کیونکہ قرآن کو جادو کہنا ملزوم پر لازم کے اطلاق کے باب سے ہے۔ لازم بول کر ملزوم کا ارادہ کیا جائے۔ البتہ یہ معنی آیت کے ظاہر کے ساتھ ساز گار نہیں ہے۔

وَ لَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۠۸

''اور اگر ہم ایک مدت معلوم تک ان سے عذاب کو روک رکھیں تو ضرور کہیں گے کس چیز نے عذاب کو روک دیا، خبردار! جس دن ان پر عذاب آئے گا ان سے نہ پھیرا جائے گا اور انہیں وہ چیز گھیر لے گی جس پر ٹھٹھا

مذاق کیا کرتے تھے"۔

اللہ کے عذاب کو کوئی نہیں روک سکتا

یہاں لام، لام قسم ہے، اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ قسم ہے اگر ہم ان کافروں کو عذاب دینے میں کچھ مدت تاخیر کریں تو وہ ٹھٹھامذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کون سی چیز اللہ کے عذاب بھیجنے میں مانع ہوئی ہے؟ کیوں عذاب نازل نہیں ہوا ہے؟ اگر " اُمَّۃٍ " کو جماعت کے معنی میں لے لیں تو اس کا معنی یہ ہوگا ہے کہ اگر ہم ان کے عذاب کو ایک مومن جماعت اور گروہ کے تیار ہونے تک موخر کریں، ایسی مومن جماعت جو اللہ اور اللہ کے احکام پر کسی دوسری چیز کو مقدم نہیں سمجھتے اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے تو پھر کفار کہنے لگتے ہیں کہ کیوں عذاب نہیں آیا؟ اس جماعت کے اوصاف (سورہ مائدہ کی آیت نمبر54) میں ذکر ہوئے ہیں۔ البتہ پہلا معنی یعنی " اُمَّۃٍ " کو وقت کے معنی میں لینا درست تر اور آیت کے سیاق کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

بہرحال ان کا مقصد رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مذاق اڑانا تھا اور وہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر عذاب کا وعدہ حق تھا تو پھر وہ عذاب کیوں نہیں اترا؟ درحقیقت کفار عذاب کے نزول کی تاخیر کو عذاب کے وعدے کے جھوٹے ہونے کی دلیل سمجھتے تھے، اور ان کا خیال تھا کہ پیغمبرؐ عذاب کے آنے کے حوالے سے سچے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کفار کے اس باطل خیال کے جواب میں فرمارہا ہے: آگاہ رہو! جس دن اللہ کے عذاب کا وعدہ محقق ہوگا اور عذاب آپہنچے گا تو پھر کفار کو اللہ کے عذاب سے کوئی بھی چیز نہیں بچاسکے گی اور کوئی بھی چیز عذاب الٰہی کو ان سے دور نہیں کرسکے گی۔ ان دن دنیاوی عذاب ان سب کو گھیرے میں لے لے گا جنہوں نے اس عذاب کے آنے کو جھوٹ شمار کیا تھا اور اس کا

مذاق اڑایا تھا۔ اس دن عذاب الٰہی سے کوئی بھی فرار نہیں کر سکے گا اور کوئی بھی اس سے بچ نہیں سکے گا۔

وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹

"اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھا کر پھر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ نااُمید ناشکرا ہو جاتا ہے"۔

ناشکرا انسان

"ذوق" چکھنے کے معنی میں ہے۔ دنیاوی لذتوں کے لیے اس لفظ کو اس لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ دنیاوی لذتیں کھانا چکھنے کی طرح ناپائیدار اور جلدی ختم ہو جانے والی ہیں۔ "نزع" کسی چیز کو اکھاڑنا اور اس سے الگ کرنے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں نعمت کے لیے رحمت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہوا کرتا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ انسان کی طبیعت ہی ایسی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے کوئی نعمت اور رحمت ملتی ہے اور کچھ مدت یہ نعمت اس کے پاس رہتی ہے اور پھر وہ نعمت اس سے واپس لی جاتی ہے تو انسان مایوس ہو جاتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ اس نعمت نے واپس نہیں آنا ہے، اور اس طرح وہ ناشکری کرنے لگتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ نعمت کا مالک اور صاحب اختیار اللہ کو سمجھیں اس طرح کہ وہ جب چاہے نعمت عطا کرے اور جب چاہیے نعمت لے لے۔ یہی

ذات اس نعمت کو دوبارہ عطا کر سکتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ خود کو اس حالت تک پہنچا دے کہ اللہ سے درخواست کرے کہ وہ پھر یہ نعمت اسے عطا کرے، لیکن وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اور ناشکری کرتا ہے اور اس میں اس کا اپنا نقصان ہے۔

وَ لَئِنۡ اَذَقۡنٰهُ نَعۡمَآءَ بَعۡدَ ضَرَّآءَ مَسَّتۡهُ لَيَقُوۡلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّىۡ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوۡرٌ ۙ‏ ﴿۱۰﴾

"اور اگر مصیبت پہنچنے کے بعد نعمتوں کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ میری سختیاں جاتی رہیں، کیونکہ وہ اِترانے والا شیخی خورا ہے"۔

نعمت ملنے پر انسان کا اترا جانا

"نَعۡمَآءَ" ایسی نعمت کو کہتے ہی جس کا اثر صاحب نعمت پر واضح اور آشکار ہو۔ "ضراء" ایسی مصیبت اور مشکل جو مشکل اور مصیبت میں پھنسے شخص کے حالات سے معلوم ہو۔ "فرح" خوشی اور سرور کے معنی میں ہے۔ "فخر" غرور اور تکبر کو کہا جاتا ہے۔ "سَیِّاتِ" انسان کو پیش آنے والی سختیاں۔

انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ مصیبت میں مبتلا ہو جانے کے بعد جب وہ مصیبت ٹل جاتی ہے اور اس مصیبت کے بعد اسے نعمت مل جاتی ہے تو کہتا ہے کہ میرے اوپر بڑی مصیبت آئی ہوئی تھی جو ٹل گئی ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ مصیبت پھر نہیں آئے گی اور وہ پھر دوبارہ مشکلات میں مبتلا نہیں ہوگا۔ انسان اس نعمت کو جب دائمی اور ہمیشہ رہنے والی تصور کرتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور دوسروں پر فخر کرتا ہے۔ اگر وہ اللہ کو اس نعمت کا مالک اور صاحب اختیار جانتا تو کبھی بھی اس نعمت کو دائمی خیال نہیں کرتا اور اس نعمت کی وجہ سے دوسروں پر فخر و تکبر نہ کرتا۔ کیونکہ فخر اس

کرامت اور فضیلت پر کی جاتی ہے جسے انسان نے خود حاصل کیا ہو۔ لیکن جو نعمت اللہ کی طرف سے ملی ہو تو اس پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر آج اللہ نے نعمت دی ہے تو کل لے بھی سکتا ہے۔

پیغام: انسان کو ہر حال میں اپنے رب سے رابطے میں رہنا چاہیے، نعمت اور مصیبت دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ سے رابطے میں رہنا چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ نعمت ملے تو اللہ کا شکر ادا کرے اور اگر نعمت چلی جائے تو صبر کرے۔ مصیبت آئے تو صبر کرے اور اگر مصیبت ٹل جائے تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾

"مگر جو لوگ صابر ہیں اور نیکیاں کرتے ہیں ان کے لیے بخشش اور بڑا ثواب ہے"۔

صابر نیکوکاروں کیلئے بخشش اور ثواب

پچھلی دو آیتوں میں بیان کیا گیا کہ انسان طبیعی طور پر تنگ نظر اور کوتاہ فکر ہے اور آئندہ سے غافل اور بے خبر ہے۔ جب اسے نعمت ملتی ہے تو خوشحال ہوتا ہے اور جب نعمت ہاتھ سے چلی جاتی ہے تو ناامید اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ مصیبت برطرف ہوجائے تو مسرور اور مغرور ہوجاتا ہے۔ اس آیت میں اس کلی حکم سے بعض لوگوں کو استثناء کیا گیا ہے، ایک وہ شخص اس حکم سے مستثنیٰ ہے جس میں صبر ہو اور ہر مشکل میں صبر کرتا ہو، حوصلے میں ہوتا ہو۔ دوسرا وہ شخص جو نیک اور صالح عمل انجام دینے والا ہو۔ کیونکہ جن مذموم صفات کا پچھلی دو آیتوں میں ذکر ہو وہ ان لوگوں یعنی صابر

اور مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والوں میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ وہ مصیبت میں ناامید اور ناشکرے نہیں ہوتے بلکہ صبر کرتے ہیں۔ اور جب مصیبت ٹل جاتی ہے اور نعمتیں آجاتی ہیں تو وہ نعمت عطا کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ سے غافل نہیں ہوتے بلکہ اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بجا لاتے ہیں۔ جب ایک نعمت ہاتھ سے چلی جاتی ہے تو ناشکرے اور بے حوصلہ نہیں ہوتے اور بے صبری نہیں کرتے بلکہ اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ انہیں پھر نعمتوں سے نوازتا ہے تو وہ اعمال صالح بجا لاتے ہیں۔

یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ صبر اور عمل صالح، ایمان کے اوصاف میں سے ہیں۔ بے ایمان آدمی میں صبر اور عمل صالح نہیں آسکتا۔ دوسری آیت میں صبر اور نیک عمل کے حامل افراد کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ دیا ہے۔[1] اسی طرح اللہ تعالیٰ سورۂ نساء کی آیت نمبر 116 میں ارشاد فرماتا ہے: " اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ۔۔۔" اللہ تعالیٰ مشرکین کی مغفرت نہیں کرتا۔ لہٰذا صرف مومن افراد ہی حقیقی صابر ہیں اور وہی عمل صالح بجا لاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی ان کو ناپسندیدہ صفات سے رہائی دلاتا ہے اور ان کے دلوں سے ان بری صفات کو دور کرتا ہے۔ اور ان بری صفات کی جگہ پسندیدہ صفات ڈال دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں انہیں مغفرت ملتی ہے اور بڑا اجر ان کے نصیب ہوتا ہے۔

---

[1]۔ سورۃ فاطر کی آیت نمبر 7۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعۡضَ مَا يُوۡحٰۤى اِلَيۡكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدۡرُكَ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ‌ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِيۡرٌ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ وَّكِيۡلٌ ؕ﴿۱۲﴾

''پھر شاید آپ اس میں سے کچھ چھوڑ بیٹھیں گے جو آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے اور ان کے اس کہنے سے آپ کا دل تنگ ہوگا کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتر آیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا، آپ تو محض ڈرانے والے ہیں، اور اللہ ہر چیز کا ذمہ دار ہے''۔

رسول اللہؐ کیلئے تسلی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن اور دوسرے بڑے واضح اور روشن دلائل لے کر آئے تھے، ان قطعی دلائل کے ہوتے ہوئے عقل اور فطرت سلیم آپؐ کی دعوت کا انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے مشرکین کا انکار کرنا اور کفر اختیار کرنا غیر عقلی اور غیر متوقع بات تھی لہٰذا اس آیت میں اس امر کی وضاحت کے لیے چند وجوہات بیان کی گئی ہیں اور فرمایا ہے کہ اے ہمارے رسولؐ! شاید آپؐ نے قرآن کے کچھ حصے کو ان تک نہیں پہنچایا ہے یا اس بات سے ڈر گئے ہو کہ جب یہ آیت ان تک پہنچاؤ گے تو وہ تم پر اللہ کی طرف سے افتراء اور جھوٹ باندھنے کا الزام لگائیں گے یا کہیں گے کہ تم پر بڑا خزانہ کیوں نہیں اترا یا تمہاری رسالت کی گواہی دینے کے لیے کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔

اے ہمارے رسول! تم ان کی جھٹلانے والی اور گھٹیا گفتگو کی پرواہ مت کرو کیونکہ تیرا کام پیغام پہنچانا اور ان کو خطرے سے ڈرانا ہے۔ اگر انہوں نے دعوت کو قبول نہ کیا تو تیرے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے اس کو ہدایت ملتی ہے۔

سارے امور کی تدبیر اللہ کے پاس ہے خواہ یہ امور معمول کے مطابق اور عادی ہوں یا غیر معمولی اور غیر عادی ہوں، سب کچھ تیرے اللہ کے پاس ہے وہی سارے امور کا مدبر ہے، وہی سارے بندوں کے معاملات کو دیکھنے والا ہے، ہر چیز اس کے سامنے تسلیم ہے، سارے عالم میں اسی کا حکم نافذ ہے، وہی سارے نظام کو چلانے والا ہے، کل کائنات کا اختیار اسی کے پاس ہے۔

اس آیت سے یہ بات نہ سمجھی جائے کہ اس میں پیغمبر اکرم ﷺ کی تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ بلکہ رسول پاک ﷺ کو یہ بات بتائی جارہی ہے کہ ان کافروں کے کفر کا سرچشمہ کیا ہے اور وہ کس وجہ سے انکار کرتے ہیں تاکہ پیغمبرؐ کو معلوم ہو کہ ان کی ہدایت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، پیغمبرؐ کا کام فقط پیغام پہنچانا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنے حبیب کو تسلی دے رہا ہے کہ اگر پیغام پہنچانے کے بعد وہ آپ کی بات نہیں مانتے تو آپ کو تکلیف نہیں ہونی چاہیے اور آپؐ کو رنجیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ سارے امور اللہ تعالیٰ کے اپنے ہاتھ میں ہیں اور وہ سارے امور کو دیکھ رہا ہے۔ یہ لوگ خود بد فطرت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کی توفیق سلب کی ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۳

”کیا کہتے ہیں کہ تو نے قرآن خود بنا لیا ہے، کہہ دو تم بھی ایسی دس سورتیں بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جس کو بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو“۔

قرآن کی جیسی دس صورتیں لانے کا چیلنج

مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں "ام" متصلہ ہے جو "یا" کے معنی میں ہے۔ یہ جملہ استفہام کے معنی میں ہےاور اس کی تقدیر اس طرح ہے کہ کیا کافروں کا بہانہ یہ ہے کہ جو کچھ تیرے اوپر وحی ہوئی ہے آپؐ نے کفار کے اعتراض کے ڈر سے اس کے کچھ حصے کو ان تک نہیں پہنچایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان آیات کو سننے کے بعد معجزے کی درخواست کریں۔ یا آپ اس بات سے ڈریں کہ یہ آیتیں کفار کے سامنے پڑھیں گے تو وہ قرآن کے بارے میں شک کرنے لگیں گے اور کہنا شروع کردیں گے کہ آپ اس کی غلط نسبت اللہ کی طرف دے رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ کا کلام ان کے کانوں تک پہنچ جائے اور وہ ایمان نہ لائیں۔ پس ان کا ایمان نہ لانا مذکورہ دو دلیلوں میں سے ایک وجہ سے ہوسکتا ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں "ام" منقطعہ ہے۔[1] بنابرایں یہاں پر "ام" بلکہ کے معنی میں ہے۔ ان مفسرین نے صاحب تفسیر المیزان کی رائے کے برعکس رائے دی ہے۔ اس بناپر کلام کی تقدیر اس طرح ہوگی کہ کفار کا بہانہ یہ نہیں ہے بلکہ وہ قرآن کریم کو اللہ کا کلام ہی نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ آپ ناحق طور پر اس کو اللہ کی طرف نسبت دے رہے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو دستور دیا ہے کہ ان کو چیلنج کرو اور کہو کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ قرآن افتراء اور جھوٹ ہے اور سمجھتے ہو کہ میں خود اسے بنا کرلے آتا ہوں تو تم جس سے مدد لینا چاہتے ہو لے لو اور اس قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ۔ اور اگر تم اکیلے یہ کام نہیں کرسکتے ہو تو اپنے فرضی

---

[1]۔ مجمع البیان، جلد سوئم ، پارہ گیارہ صفحہ 123۔ تفسیر روح المعانی، جلد دو تفسیر ،کشاف، جلد 2 صفحہ 383 اور مصطفیٰ شاکر۔

خداؤں سے مدد لو تاکہ وہ تمہارے لیے سارے اسباب فراہم کردیں۔ اگر یہ قرآن میری طرف سے ہے تو عقلی اعتبار سے تم بھی اس جیسا قرآن لا سکتے ہو، اور اگر میں نے کچھ چیزیں گھڑ کر اللہ کی طرف نسبت دی ہے تو تم بھی ایسا کر لو۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان ہوچکا ہے کہ قرآن کریم کا یہ چیلنج اب بھی باقی ہے اور ان تمام انسانوں کو یہ چیلنج کر رہا ہے کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں ہے تو تم اس جیسا قرآن لے کر آؤ یا کم از کم اس کی سورتوں جیسی دس سورتیں لے آؤ۔ لیکن قرآن کریم فصاحت و بلاغت اور وسیع ترین معانی اور ظاہری دلائل، اخلاقیات اور غیبی خبروں کے اعتبار سے ایک نظام واحد اور کھلا معجزہ ہے جس کی مثل اور مانند لانے پر انسان قادر نہیں ہے حتی کہ وہ اس کی جیسی کچھ آیات لانے کی بھی توانائی نہیں رکھتا۔

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

”پھر اگر تمہارا کہنا پورا نہ کریں تو جان لو کہ قرآن اللہ کے علم سے نازل کیا گیا ہے اور یہ بھی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پس کیا تم فرمانبرداری کرنے والے ہو“۔

علم الٰہی سے قرآن کا نزول

اس آیت میں مشرکین سے خطاب ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے چیلنج والی بات کا تسلسل ہے کہ مشرکین سے کہو کہ تمہارے سارے بت، تمہارے علما، تمہارے ادبا، تمہارے ہم مسلک اور تمہارے ہم خیال سب اکٹھے ہو کر بھی میرے اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکتے اور اس قرآن جیسی دس صورتیں بنا کر نہیں لا سکتے۔ جان لو! یہ قرآن

میرا بنایا ہوا نہیں ہے اور نہ ہی کسی بشر کا ہے۔ بلکہ کلام الٰہی ہے اور اللہ کے مخزن علم سے نازل ہوا ہے۔اور جان لو کہ اللہ کی توحید برحق ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی خد انہیں ہے۔ پس اسی سے مدد مانگ لو کیونکہ وہی حقیقی مدد دینے والا ہے۔ کسی اور جگہ سے تمہیں مدد مل نہیں سکتی۔اے مشرکو! ان سب کھلے دلائل پیش کرنے کے بعد بھی تم شرک پر کیوں قائم ہو؟ اور اللہ کے سامنے تسلیم ہو کر مسلمان کیوں نہیں ہوتے؟

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾

”جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی آرائش چاہتا ہے تو ان کے اعمال ہم یہیں پورے کر دیتے ہیں اور انہیں کچھ نقصان نہیں دیا جاتا“۔

طالب دُنیا کو دُنیا کا مل جانا

”توفیۃ“ صاحب حق کو اس کا حق پورا دینے کے معنی میں ہے۔ ” بخس“مزدور کو اس کی اجرت سے کم تر دینے کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں کافروں کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم نے حق کو پہچان لینے کے بعد پھر بھی دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور حق کے سامنے خاضع اور خاشع نہیں ہوئے اور آخرت کو بھلا بیٹھے اور دنیاوی زندگی کی جستجو میں رہے اور دنیاوی زینتوں کے طالب رہے تو تمہیں دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کامل طور پر ملے گی اور دنیا کے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہیں کیا جائے گا اور تمہیں تمہارے اعمال کا پورا اجر اسی دنیا میں ملے گا۔ کیونکہ اس جہان کا نظام علت و معلول اور اسباب و مسببات کے تحت جاری و ساری ہے اور ہر عمل کا عکس العمل ہوا کرتا ہے۔ جیسا کام کرو گے اس کام کا نتیجہ ملے گا۔ اگر انسان دنیا کے لیے کام کر رہا

ہو تو اسے دنیا میں اس کے کام کا پورا نتیجہ ملے گا۔ انسان جس قسم کا ہدف متعین کرے اور اس کے لیے سعی و تلاش کرے وہ اپنا ہدف پا لیتا ہے۔ لیکن اخروی اہداف اس طرح نہیں ہیں اور فقط عمل انجام دینے سے انسان ہدف تک نہیں پہنچتا بلکہ اخروی ثواب اور اجر کے لیے عمل کے ساتھ عمل انجام دینے والے کے قصد کا رضای الٰہی کے لیے ہونا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں اخروی اجر کے لیے عمل کا ''قربۃ الی اللہ'' ہونا ضروری ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾

''یہ وہی ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں، اور برباد ہوگیا جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا تھا اور خراب ہو گیا جو کچھ کمایا تھا''۔

طالب دنیا کا آخرت کے اجر سے محروم ہونا

جو لوگ دنیا کے طالب ہیں اور ان کی سعی و کوشش دنیا کے لیے ہے ان کا اجر و ثواب دنیا ہیں میں ملے گا اور وہ آخرت کے اجر و ثواب سے محروم رہیں گے، آخرت میں ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے۔ کیونکہ ان کے دنیاوی اعمال کو آتش نگل لے گی اور وہ بے اجر ہونگے اور ان پر اثر مرتب نہیں ہوگا۔ لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ ہر عمل انجام دینے والا اپنے عمل سے قصد کیے گئے ہدف تک پہنچ جائے بلکہ عمل انجام دینے والے کو اس کے عمل کا وہ نتیجہ ملتا ہے جسے اس کی زندگی میں موثر عوامل اور اس کے اعمال معین کرتے ہیں۔ اس بنا پر دنیا کے لیے عمل انجام دینے والے کو دنیا کی زندگی میں سب کچھ مل جاتا ہے اور یہ اعمال چونکہ آخرت کے لیے نہیں تھے تو اسے آخرت میں کچھ نہیں ملے گا اور اس کے لیے آخرت میں سوائے خسارے اور نقصان کے کچھ نہیں ہوگا۔ آخرت میں جہنم کی آگ اس

کے انتظار میں ہے۔

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ وَ يَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَ مِنۡ قَبۡلِهٖ
كِتٰبُ مُوۡسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحۡمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَ مَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ
مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ ۚ اِنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ
رَّبِّكَ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۷﴾

''بھلا (برابری ہو سکتی ہے) وہ شخص جو اپنے رب کے صاف راستہ پر ہو اور اس کے ساتھ اللہ کی طرف سے ایک گواہ بھی موجود ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب گواہ تھی جو امام اور رحمت تھی، یہی لوگ قرآن کو مانتے ہیں، اور جو کوئی ان گروہوں میں سے اس بات کا منکر ہو تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، سو تو قرآن کی طرف سے شبہ میں نہ رہو، بے شک یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے''۔

قرآن کی حقانیت

اس آیت میں استفہام انکاری کے ذریعے کہا گیا ہے کہ کیا وہ شخص جو محبت کے اور یقینی علم کے ساتھ آیا ہے وہ اس کی مانند ہو سکتا ہے جو اس طرح نہیں ہے؟اے پیغمبرؐ!جب آپ میں یہ سارے اوصاف ہیں اور آپ ہر ایک سے محبت کرتے ہیں، ہر ایک کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے ہیں تو آپؐ کو ذرہ برابر بھی شک و تردید نہیں کرنا چاہیے کہ آپ حق پر ہیں اور حق آپ کے ساتھ ہے۔

یہاں پر ''بَيِّنَةٍ'' سے وہ الٰہی بصیرت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی

تھی۔ اس جگہ شہادت اور گواہی سے مراد گواہ کو اٹھنا نہیں ہے بلکہ گواہی دینا ہے۔ شاہد اور گواہ سے مراد وہ افراد ہیں جنہیں قرآن کی حجیت (دلیل ہونے) پر یقین ہے اور وہ قرآن کی حقانیت کے معترف ہیں۔ اور ان کا ایمان بصیرت کے تحت ہے لہٰذا ان کے سبب باقی انسانوں سے شک وتردید ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے افراد ہیں جو رسولؐ سے ملحق ہیں اور رسول اللہؐ کا نفس اور جان ہیں۔ وہ رسول اللہؐ کی حقانیت کی گواہی دیتے ہیں۔ اس آیت کا مل ترین مصداق امیر المومنین علی علیہ السلام کی ذات گرامی ہے جس کے متعلق اہل سنت اور شیعہ کتب احادیث میں بہت ساری روایات اور احادیث نقل ہوئی ہیں۔[1]

اس کے بعد فرمایا کہ قرآن ایسا ہدایت کا طریقہ اور راستہ نہیں ہے جو بے سابقہ ہو، بلکہ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تھی جس میں معارف حق اور شریعت الٰہی بیان ہوئی جو رحمت کا سبب تھی اور اس میں لوگوں کے لیے ہدایت تھی۔ لہٰذا دانا اور بصیر لوگ قرآن پر ایمان لے آتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بصیرت سے ہدایت فرمائی۔ اور لوگوں میں سے جو بھی دشمنی اور ہٹ دھرمی کی بناء پر قرآن کے واضح بیانات اور روشن دلائل سے دشمنی رکھے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ لہٰذا اے پیغمبرؐ! تمہیں قرآن کے بارے میں کوئی شک و تردید نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کے پاس پروردگار کی جانب سے واضح و روشن دلیل موجود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خود تیرے اندر سے قرآن کی صداقت پر گواہ اور شاہد موجود ہے، اس سے حضرت امیر المومنینؑ مراد ہیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب جو رحمت کا سبب اور لوگوں کی ہدایت کا سرچشمہ تھی وہ بھی موجود تھی۔ ان سارے دلائل

---

[1]۔ اصول کافی جلد ول، صفحہ 190 اور امالی شیخ صدوق، بصائر الدرجات، صفحہ 152، امالی مفید، صفحہ 86، کشف الغمہ، جلد اول، صفحہ 315، تفسیر عیاشی، جلد 2، صفحہ 142، مناقب ابن شہر آشوب، جلد 3، صفحہ 85، مجمع البیان، جلد 3، جزء 12، صفحہ 130۔

کے باوجود قرآن کے بارے تمہیں کسی قسم کا کوئی شک و تردید نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو حق پر ایمان نہیں لاتے اور حق کی مخالفت کرتے ہیں جبکہ حق خدا کی طرف سے ہے۔

وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ؕ اُولٰٓئِکَ یُعۡرَضُوۡنَ عَلٰی رَبِّہِمۡ وَ یَقُوۡلُ الۡاَشۡہَادُ ہٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ کَذَبُوۡا عَلٰی رَبِّہِمۡ ۚ اَلَا لَعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ۙ۱۸﴾

"اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے، وہ لوگ اپنے رب کے روبرو پیش کیے جائیں گے اور گواہ کہیں گے کہ یہی ہیں کہ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا تھا، خبردار !ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے"۔

اللہ پر افتراء باندھنے والے ظالم

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ کسی پر افتراء باندھنا ظلم ہے، خاص کر اگر حق تعالیٰ پر کوئی افتراء باندھے تو یہ سب سے بڑا ظلم ہے، اس سے بڑا ظلم ہے ہی نہیں۔ کیونکہ گناہ کا متعلق جتنا بڑا ہوگا اتنا ہی اس کا گناہ بڑا اور اس کی قباحت زیادہ ہوگی۔ اس بناء پر یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اللہ پر افتراء باندھا ہو اور قرآن کی جھوٹی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی ہو۔ کیونکہ آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہ اور بینہ موجود ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نہ تو ظالم ہیں اور نہ ہی ستمگر۔

پروردگار پر افتراء باندھنے والے قیامت کے جب اس کی بارگاہ میں حاضر ہونگے تو وہ ان کے متعلق فیصلہ دے گا۔ اور ان کے اعمال کے گواہ موجود ہوں گے جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ انبیاء، ۱۴ معصومین علیہم السلام، شہدا، صدیقین، انسان کے اپنے

اعضاء یہ سب اس پر گواہی دیں گے۔اس دن کوئی بھی حق کے سواء کسی قسم کی کوئی بات نہیں کرسکے گا۔

بہرحال اس دن گواہی دینے والے گواہی دیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروددگار کی طرف جھوٹی نسبت دیتے تھے،انہوں نے پروردگار کے دین حق کو چھوڑ کر دوسرا دین اپنا لیا تھا، باطل عقائد رکھتے تھے، مبدأ اور معاد کے انکاری تھے۔ یہ مادہ پرستوں، ملحدوں اور دہریوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنی زندگی کے لیے الٰہی سنت اور دستور کو چھوڑ کر اپنے بنائے ہوئے طریقے اور سنت اور روش کو اختیار کیا۔آج کے دن ان کے لیے درد ناک عذاب ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جان لو کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۹

”جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور وہی آخرت کے منکر ہیں“۔

اللہ کی راہ روکنے والے ستمگار

اس آیت میں ستمگاروں کی توصیف بیان کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو الٰہی دین اور فطری روش کے آگے رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اور راہ فطرت پر چلنے کی بجائے انحرافی راستے پر چلتے ہیں، شہوات اور خواہشات کے پیروکار ہیں اور اپنے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق عمل کرکے انحرافی روش اور طریقے کے پیروکار بن گئے ہیں۔ یہ لوگ خواہ خالق کے وجود کے معترف ہوں یا نہ ہوں ان کے اعمال اس طرح ہیں

کہ وہ آخرت کے وجود اور پروردگار کی ملاقات پر یقین نہیں رکھتے۔ لہٰذا یہ ظالم اور اللہ پر افتراء باندھنے والے ہیں۔ قرآنی اصطلاح میں دین اس قانون، روش اور سنت کا نام ہے جو کسی بھی معاشرے میں حاکم اور رائج ہوتا ہے۔ یہ دین یا تو حق اور فطری ہوتا ہے جو کہ اسلام ہے یا ناحق اور غیر فطری ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دین، لوگوں کی زندگی میں جاری روش کا نام ہے، اس سے ہٹ کر کوئی الگ چیز نہیں ہے۔

أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾

"یہ لوگ زمین میں عاجز کرنے والے نہیں تھے اور ان کے لیے سوائے اللہ کے کوئی دوست نہ تھا، انہیں دگنا عذاب کیا جائے گا، یہ لوگ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے"۔

ستمگاروں کیلئے دوگنا عذاب

دُنیاوی زندگی میں بندگی کی روش چھوڑنے والے اور اللہ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والے ظالم اور کافر اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھ کر اسے عاجز نہیں کر سکتے اور نہ ہی اللہ کی روش کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان امور کی وجہ سے ان کی وقتی طور پر ملی ہوئی قدرت، اللہ کی لا محدود قدرت پر غالب آئی ہے اور ان کی مشیت نے اللہ کی مشیت پر غلبہ حاصل کرلیا ہے یا وہ خدا کی ولایت اور سرپرستی سے خارج ہوئے ہیں اور کسی دوسرے کی ولایت اور سرپرستی میں داخل ہوگئے ہیں، حالانکہ اللہ کے سواء کوئی ولی اور کوئی مدبر نہیں ہے۔ جس خدا نے ان کے ان اعمال کے ذریعے انہیں امتحان

اور آزمائش میں مبتلا کیا ہے وہی خدا ان کی بری نیتوں اور ان کے پست اور گھٹیا اعمال کی ایسی سخت سزا دے سکتا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔[1]

اللہ تعالیٰ انہیں استدراج (یعنی آہستہ آہستہ برائی کی طرف کھینچے چلے جانے) کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے اور قیامت میں ان کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ لوگ فاسق تھے اور اپنے فسق پر اصرار اور ہٹ دھرمی کرتے تھے۔ یا ان کو دوگنا عذاب دینے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔ اور یہ لوگ کافر ہوئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا ارادہ اللہ کے ارادے پر غالب آیا ہے یا خدا کے علاوہ جن کو انہوں نے اپنا ولی بنایا ہے اس نے خدا کو شکست دی ہے۔ بلکہ ان کے کفر کی وجہ یہ ہے کہ وہ انبیاء الٰہی کی بشارت اور انذار کو سن نہیں سکتے اور سمجھ نہیں سکتے۔ ان میں حق کی آیات کو دیکھنے اور ان پر ایمان لانے کی صلاحیت موجود نہیں تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پلید اعمال کی وجہ سے ان کے دلو ں پر مہریں لگا دی ہیں اور ان کی آنکھوں اور کانوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ حقیقت کو درک کرنے سے عاجز ہیں۔[2]

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾

"انہوں نے اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال دیا اور ان سے ضائع ہو گیا جو جھوٹ وہ باندھتے تھے"۔

---

[1]۔ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ ۚ "جب وہ منحرف ہو گئے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو منحرف کر دیا۔" (سورہ صف، آیت نمبر 5)

[2]۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر 7۔

نافرمانوں کا خسارہ

اس آیت میں دو مطلب بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان فقط اپنی ذات کا مالک ہے، البتہ یہ مالکیت بھی اللہ کی طرف سے ملی ہوئی ہے۔ اگر انسان اپنے لیے کوئی ایسی چیز خریدے جو اس کی ہلاکت کا باعث ہو تو گویا وہ اپنا سرمایہ ضائع کر رہا ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی کے سرمائے کے مقابلے میں کفر اور معصیت خریدے تو حقیقت میں وہ خسارہ و نقصان اٹھا رہا ہے۔ کیونکہ اس نے بغیر کسی معاوضے کے اپنا اصل سرمایہ گنوا دیا ہے۔ اس کے سرمائے کے مقابلے میں نہ فقط کوئی چیز اسے نہیں ملی ہے بلکہ اس نے اپنے لیے عذاب و ہلاکت حاصل کر لیا ہے اور یہی امر انسان کے لیے بہت بڑا خسارہ اور نقصان ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کافر اور وہ افراد جو خدا کے شریک بناتے ہیں اور خدا پر افتراء باندھتے ہیں اور خدا کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہیں، قیامت کے دن ان کا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔ کیونکہ ان کے عقائد باطل، جھوٹے اور ان کے خیالات کی پیداوار تھے اور ان کا حقیقت سے کوئی سروکار نہیں تھا، ان کے عقائد ان کے نفسانی خواہشات اور زائل ہونے والے دنیاوی مقاصد ان کی نظر میں جلوہ گر تھے۔ لہٰذا جب آخرت میں حجاب اور پردے ہٹ جائیں گے تو ان کے لیے ساری چیزیں روشن ہو جائیں گی، اس دن معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے جو خیالی اور وہمی چیزیں بنا رکھی تھی وہ باطل محض تھیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور خدا ہی حق مبین ہے، اس دن ہر طرف اسی کی سلطنت ہوگی۔ اور اس دن اللہ کی سلطنت واضح ہو کر سامنے آئے گی۔[1] انہیں پتا چل جائے گا کہ جس کو وہ حق سمجھتے تھے وہ وہم اور جھوٹ کے سواء کچھ نہ تھا۔ یہی بڑا

[1]۔ سورہ غافر کی آیت نمبر 16۔

خسارہ ہے جو ان کو ملے گا۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ هُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ۝۲۲

"بے شک یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان میں ہوں گے"۔

قیامت میں نقصان اُٹھانے والے

"لَا جَرَمَ" قطعاً، یقیناً اور حتمی طور پر کے معنی میں ہے۔ جن لوگوں نے دنیا میں اپنا نقصان کیا ہے، آخرت میں یہی لوگ سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔ کیونکہ باقی گناہگاروں کو نجات کی امید ہے لیکن جنھوں نے اپنی ذات کو کفر کے فساد میں داخل کیا اور تباہی کی طرف چلے گئے اور اپنے اصلی سرمائے کو ضائع کر دیا، جس طرح دنیامیں ان کی سعادت اور ہدایت کی کوئی امید نہیں تھی اسی طرح آخرت میں ان کی نجات کی کوئی امید نہیں ہے۔ کیونکہ جو شخص دنیا میں بصیرت کی آنکھ نہیں رکھتا تھا اور اندھا تھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا، دنیا کا گمراہ آخرت کا بھی گمراہ ہوگا۔[1]

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخۡبَتُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ ۙ اُولٰۤـئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ‌ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝۲۳

"البتہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی وہ جنت میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

---

[1] سورۃ اسراء کی آیت نمبر 72۔

عمل صالح انجام دینے والے بہشتی مومنین

جو لوگ اللہ کی عبادت کرنے میں تکبر نہیں کرتے، ناک منہ نہیں چڑھاتے، جن کے دل خاشع ہیں، جن کا ایمان متزلزل نہیں ہوتا، جو اعمال صالح بجا لاتے ہیں اور اہل بصیرت ہیں، یہی خاص مومنین اور اہل بہشت ہیں۔ وہ اپنے عقائد حقہ، اعمال صالح اور اللہ کے ہاں خاشع و انکساری کی وجہ سے بہشت میں داخل ہوں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اہل بصیرت مومنین کی وضعیت اور حالت کا کافروں کی وضعیت اور حالت کے ساتھ مقایسہ اور مقابلہ کیا ہے جو بے بصیرت اور حق سے ناآشنا ہیں۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

"دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا، کیا دونوں کا حال برابر ہے، پھر تم کیوں نہیں سمجھتے"۔

دو گروہوں کی مثال

"مثل" ایسی بات کو کہتے ہیں جس میں مبہم اور مخفی معنی کو ایک محسوس اور واضح امر کے ذریعہ کسی کے لیے توضیح دی جائے تاکہ اس کا معنی سمجھ آجائے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافر کی حالت کو بیان کرنے کے لیے ایک واضح مثال دی ہے، ظالم اور کافر کو بہرے اور نابینا شخص کی مانند قرار دیا ہے اور مومن افراد کو بینا اور سننے والے شخص کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور سوال کیا ہے کہ کیا یہ دو

نوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں، ظالمین اندھے اور بہرے ہیں اس لیے وہ کبھی بھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے، وہ گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن مومن کو ایمان کے نور نے بینا اور دیکھنے والا بنا دیا ہے جس کے نتیجہ میں وہ حق بات سن سکتا ہے لہذا وہ ہدایت یافتہ اور کامیاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مثالیں اور تشبیہات ان لوگوں کے لیے ہیں جو چشم بینا، سننے والے کان اور قلب خاشع کے مالک ہیں۔ اس بارے سورۂ ق کی آیت نمبر 37 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: ''اس بات میں یاددہانی ہے اس کے لیے جس کا دل ہو اور جو کان لگا کر بات سنے اور گواہ ہو۔

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ ۫ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿ۙ۲۵﴾

''اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا بے شک میں تمہیں صاف ڈرانے والا ہوں''۔

نوحؑ کا پیغام رسانی کا عمل

حضرت نوح علیہ السلام کو رب تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لیے ان کی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ وہ اپنی قوم کے پاس آئے اور انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا اور فرمایا کہ میرا کام اللہ کا پیغام پہنچانا اور تمہیں عذاب الٰہی سے ڈرانا ہے۔ میں تمہیں سمجھانے کے لیے آیا ہوں کہ اللہ پر ایمان لے آؤ، اگر تم اللہ پر ایمان نہیں لاؤ گے اور کفر کرو گے تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ میں تو صرف اللہ اور تمہارے درمیان اللہ کا پیغام پہنچانے کا واسطہ ہوں اور ڈرانے کے لیے آیا ہوں اور تمہیں ہدایت دینے کے لیے آیا ہوں۔

اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡكُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۶﴾

''کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تم پر دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں''۔

نوحؑ کی رسالت کی توضیح

ان تین آیتوں میں حضرت نوح کے پیغام کی وضاحت ہے جس میں آپؑ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں تمہیں اللہ کے عذاب سے ڈرانے کے لیے آیا ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو وہی پیغام دیا جو پیغام ہر پیغمبر اپنی قوم کو دیتا رہاہے، آپؑ نے کہااے میری قوم! اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ کیونکہ اگر تم اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کروگے تو مجھے ڈر ہے کہ تم سخت ترین عذاب میں مبتلا ہو جاؤگے۔ بظاہر اس آیت میں عذاب سے دنیاوی عذاب مراد ہے کہ تم صفحہ ہستی سے مٹ جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے طوفان کے عذاب کے ذریعے زمین سے ان کی نسل ختم کردی۔

فَقَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیۡنَ هُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاۡیِ ۚ وَ مَا نَرٰی لَكُمۡ عَلَیۡنَا مِنۡ فَضۡلٍۭ بَلۡ نَظُنُّكُمۡ كٰذِبِیۡنَ ﴿۲۷﴾

''پھر اس کی قوم کے جو کافر سردار تھے وہ بولے کہ ہمیں تو تم ہم جیسے ہی ایک آدمی نظر آتے ہو اور ہمیں تو تمہارے پیروکار وہی نظر آتے ہیں جو ہم میں سے رذیل ہیں وہ بھی سرسری نظر سے، اور ہم تم میں اپنے سے کوئی فضیلت بھی نہیں پاتے بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں''۔

قوم نوحؑ کی اشرافیہ کا جواب

یہ سن کر حضرت نوحؑ کی قوم کے بڑے لوگ اور اشرافیہ کہنے لگے: ہم تمہاری پیروی کرنے کی کوئی وجہ نہیں پاتے کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم ہمارے جیسا بشر کے سوا کچھ نہیں ہو۔ لہٰذا تمہارے اندر ہمارے اوپر برتری والی کوئی بات نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے پیروکار ہمارے معاشرے کے ضعیف ترین افراد ہیں۔ اور یہ افراد اس لائق نہیں ہیں کہ ہم ان کے ساتھ تمہارے دین کے پیروکار بن جائیں، ہمیں ان کی ہم نشینی سے نفرت ہے۔ یہ ان کی جہالت اور بے فکری اور بے شعوری کا نتیجہ تھا چونکہ انسانوں کے درمیان تعلقات کی بنیاد افراد کی فضیلت اور استعداد ہونی چاہیے، جس کے اندر زیادہ فضائل اور کمالات اور استعداد ہو اس کی پیروی کی جانی چاہیے۔ اس کے علاوہ نہ تو تمہارے پاس مال و ثروت ہے اور نہ ہی تمہارے پاس علم غیب اور نہ فرشتے تمہاری تائید کے لیے اترے ہیں۔ لہٰذا ہمارا تو خیال ہے کہ تم جھوٹے ہو۔

ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے استدلال کے ذریعے اس بات کو سمجھانا چاہتے تھے کہ مذکورہ باتوں کی وجہ سے تم اس لائق نہیں ہو کہ ہم تمہاری پیروی کریں اور تمہارے دین کو قبول کریں۔ معاشرے کے خوشحال طبقہ کا ہمیشہ یہی رویہ رہا ہے کہ وہ معاشرے کے کمزور طبقات کا احترام نہیں کرتے اور ان کو کچھ بھی نہیں سمجھتے، ان کا خیال ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ اور ان کی رائے صحیح نہیں ہوتی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝۲۸

"اس نے کہا اے میری قوم! دیکھو اگر میں اپنے رب کی طرف سے صاف

راستہ پر ہوں اور اس نے مجھ پر اپنے ہاں سے رحمت بھیجی ہو پھر وہ تمہیں دکھائی نہ دے، تو کیا میں زبردستی تمہارے گلے مڑھ دوں اور تم اس سے نفرت کرتے ہو"۔

حضرت نوحؑ کا بیان

حضرت نوح علیہ السلام نے سب سے پہلے تو "یا قوم" کہہ کر انہیں اپنی طرف منسوب کیا تاکہ ان کے جذبات کو ابھارے۔ پھر فرمایا کہ تم کہہ رہے ہو کہ میں تمہاری طرح کا انسان ہوں، تو جان لو کہ رسالت اور نبوت ایک طرح کا عالم غیب سے متصل ہونا ہے اور یہ اتصال غیر معمولی اور طبیعی اسباب سے بالاتر ہے۔ لہٰذا رسالت اور نبوت ایک غیبی امر سے ثابت ہو سکتی ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں اللہ کی طرف سے معجزہ اور دلیل لے کر آیا ہوں۔ خدا نے مجھے اپنی طرف سے علم عطا کیا ہے، آسمانی کتاب دی ہے جو اللہ کی رحمت کا ایک جلوہ ہے۔ لیکن تمہاری جہالت، تمہارا حق کو ناپسند کرنا، تمہارا تکبر اور میری دعوت کے ساتھ تمہاری دشمنی اور تمہاری سرکشی سبب ہوئی کہ تم میری دعوت کو ٹھکراؤ اور مجھ پر ایمان نہ لاؤ۔ لیکن دین میں جبر نہیں ہے کسی کو زبردستی دین قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس بناء پر اب جب کہ تم میرے دین کو ناپسند کرتے ہو تو میں تمہیں اسے قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

حضرت نوح کا یہ کلام اس بات سے کنایہ ہے کہ اب کافروں پر حجت تمام ہو گئی ہے اور ان پر حقیقت آشکار ہو چکی ہے۔ اگر وہ اس کے باوجود ایمان نہ لائیں تو خدا کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کرتا۔ خدا تو یہ چاہتا ہے کہ ہر فرد اپنے علم، ارادہ اور اختیار کی بنیاد پر صحیح راستے کا چناؤ کرے۔

وَ يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا بِطَارِدِ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۹

''اور اے میری قوم! میں تم سے اس پر کچھ مال نہیں مانگتا، میری مزدوری اللہ ہی کے ذمہ ہے، اور میں ایمانداروں کو ہٹانے والا نہیں، بے شک وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں لیکن میں تمہیں جاہل قوم دیکھتا ہوں''۔

کافروں کی تہمت کا جواب

حضرت نوح علیہ السلام نے کافروں کی تہمت کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

میری پیغام رسانی کے عمل کا مقصد مال کی جمع آوری نہیں ہے اور نہ ہی میں لوگوں سے مالی فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی اس پیغام رسانی میں جھوٹا نہیں ہوں۔ میرا ہدف فقط تمہاری ہدایت اور سعادت ہے۔ میری اس پیغام رسانی کا بدلہ اور معاوضہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ میں تمہیں خوش کرنے کے لیے ان مومنوں کو اپنے سے دور نہیں کرسکتا جنہیں تم گھٹیا اور پست سمجھتے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ لوگ محترم اور مکرم ہیں، وہ اپنے رب پر ایمان لائے ہیں اور ان کا اپنے رب سے رابطہ ہے۔ وہ بہت جلد اپنے رب کی طرف واپس پلٹیں گے اور ان کے اعمال کا حساب اللہ کے ذمہ ہے، خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو ان کے بارے کوئی اختیار نہیں ہے۔ (مومنوں کو اپنے آپ سے دور کرنے کے حوالے سے سورہ انعام کی آیت نمبر 52 میں بھی تذکرہ ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کا جواب دیا ہے)۔

در حقیقت اس جواب میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ مومنین جو اس قدر محترم ہیں کہ انہیں اپنے رب تعالیٰ سے ملاقات کا یقین ہے وہ کس طرح گھٹیا اور پست ہو سکتے ہیں؟ اور

میں کس طرح اتنی جرأت کرسکتاہوں کہ ایسے محترم اور معظم افراد کو اپنے سے دور کر دوں؟ لیکن تم ایسے نادان اور جاہل افراد ہو جو معاد اور حساب اور جزا پر ایمان نہیں رکھتے اور تم خیال کرتے ہو کہ انسان کی برتری کا ملاک اور معیار دنیاوی مال اور ظاہری جاہ و حشم ہے۔ جبکہ برتری کا معیار حق کی پیروی، نیک عمل اور اپنے آپ کو تقویٰ، فضائل اور خوبیوں سے آراستہ کرنا ہے۔

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰

"اور اے میری قوم! اگر میں انہیں اپنے سے دور کر دوں تو مجھے اللہ سے کون چھڑائے گا، تو کیا پھر بھی تم اس بات کو نہیں سمجھتے ہو"۔

اللہ کے ہاں مومنوں کا احترام

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں: اے میری قوم! بتاؤ اگر میں ان مومنوں کو اس جرم میں کہ وہ معاشرے کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے سے دور کردوں تو پھر اللہ کے عذاب سے مجھے کون بچائے گا؟ وہ لوگ اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اللہ کے ہاں ان کا احترام ہے۔ تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کو اپنے سے دور بھگانا ظلم ہے اور خدا، ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کرتا ہے اور ظالم سے مظلوم کا انتقام لیتاہے۔ ظالم اور مظلوم برابر نہیں۔ خدا ظالم کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ تو تم بتاؤ کہ میں کس طرح ان پر ظلم کر سکتا ہوں اور اس بنیاد پر کہ وہ معاشرے کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا تعلق اشرافیہ سے نہیں ہے، میں انہیں اپنے سے کیسے دُور کر سکتا ہوں؟

وَ لَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَ لَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ وَ لَاۤ اَقُوۡلُ اِنِّیۡ مَلَکٌ وَّ لَاۤ اَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ تَزۡدَرِیۡۤ اَعۡیُنُکُمۡ لَنۡ یُّؤۡتِیَہُمُ اللّٰہُ خَیۡرًا ؕ اَللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ۚۖ اِنِّیۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾

"اور میں تمہیں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب دان ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ یہ کہوں گا کہ جو لوگ تمہاری نظر میں حقیر ہیں اللہ ان کو بھلائی نہ دے گا، اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، ایسا کہوں تو پھر میں بے انصاف ہوں"۔

برتری کا معیار

اس آیت میں بھی کافروں کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آپ کو ہمارے اوپر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ حضرت نوحؑ ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ اگر اس برتری سے تمہاری مراد مادی فضیلت ہے تو جان لو کہ پیغمبر ہونے کا لازمہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مادی خزانوں کا مالک ہو۔ لہٰذا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خزانوں کا مالک نہیں ہوں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ پیغمبر کے پاس غیب کا علم ہونا چاہیے اور وہ ہر بات سے آگاہ ہو تو ایسا بھی نہیں ہے۔ میں تو علم غیب کی اتنی مقدار جانتا ہوں جتنا مجھے پروردگار نے تعلیم دیا ہے۔ لہٰذا میں اپنے فائدے کے تمام امور کو حاصل کرنے اور نقصان پہنچانے والے سارے امور کو دفع کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ اسی طرح اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ پیغمبر فرشتوں کی مانند مادیت اور جسمانیت کے لوازمات سے برتر ہوتا ہے تو تمہارا یہ خیال بھی درست نہیں ہے۔ میں

بھی انسان ہوں، تمہاری طرح کھاتا پیتا ہوں اور باقی جسمانی لوازمات کی مجھے بھی ضرورت ہے ۔ جن چیزوں کو تم پیغمبر کے لیے فضل اور برتری شمار کرتے ہو، وہ برتری کا معیار نہیں ہیں۔ پیغمبر کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا ہے، وہ اس کے علاوہ کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ میں بھی تمہاری مانند بشر ہی ہوں لیکن میرے اور تمہارے درمیان ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ مجھ میں وحی سننے اور عالم غیب سے پیغامات لینے کی صلاحیت موجود ہے اور یہی بات سبب ہے کہ باقی لوگ میری پیروی کریں اور میری دعوت کو قبول کریں۔

پھر فرماتے ہیں کہ جن مومن اور معاشرے کے فقیر افراد کی تم تحقیر کرتے ہو اور ان کو سلام کرنے کے قائل نہیں ہو، میں ان کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ ان کو خیر نہیں دے گا کیونکہ حقیقی خیر اور اچھائی پانے کا ملاک اور معیار افراد کا ظاہری احترام اور کرامت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا معیار باطن اور دل کے خفیہ خانوں میں موجود ایمان ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سواء کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی کے خیر و سعادت سے محروم ہونے کا فیصلہ دے دے اور دلیل کے بغیر ان کے باطن کے بارے میں فیصلہ کریں۔ کیونکہ یہ ایسی بات ہوگی جو بے دلیل ہوگی اور بے دلیل بات بے ہودہ بات ہے اور مجھے حق نہیں ہے کہ میں بغیر دلیل کے کسی کے متعلق بے ہودہ بات کہہ دوں۔ کیونکہ یہ ظلم ہے اور میں ہر گز اپنے آپ کو ستمگاروں میں سے قرار دینا نہیں چاہتا۔

سورۃ انعام کی آیت نمبر 50 میں بھی کافروں اور اسی طرح کا جواب دیا گیا ہے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٣٢﴾

"کہا اے نوح !تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کر چکا اب لے آ جو تو ہم سے وعدہ کرتا ہے اگر تو سچا ہے"۔

قوم نوحؑ کے کافروں کی بات

جب قوم نوح ان کی منطقی اور دلیل پر مبنی بات کا جواب دینے سے عاجز ہوئی تو ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہنے لگے کہ تم کس قدر ہم سے بحث مباحثہ کرتے ہو؟ اگر تم سچے ہو تو جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو وہ لے آؤ اور اس قوم کو ختم کرو۔ تمہاری ان باتوں سے ہم پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ہم تمہاری اس گفتگو سے تھک گئے ہیں۔ ہم کبھی بھی آپ پر ایمان نہیں لائیں گے اور تم ہمارے ایمان لانے کے بارے میں کوئی امید نہ رکھو! اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو جس عذاب کا وعدہ کر رہے ہو اسے لے آؤ۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٣٣﴾

"نوح نے کہا عذاب تو اگر اللہ چاہے گا تو اللہ ہی لائے گا اور تم اسے روک بھی نہ سکو گے"۔

عذاب کا مشیت الٰہی پر موقوف ہونا

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے عذاب کا تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا: عذاب لانا میرا کام نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی دوسرے پیغمبر کا کام ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور اللہ ہی تمہارے امر کا مالک ہے۔ اگر اللہ چاہے تو اس عذاب کو تم پر نازل کر سکتا

ہے جس کا میں نے تمہیں وعدہ دیا ہے۔ کیونکہ سارے امور کا مدبر وہی ہے اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے سامنے بالکل محکوم اور مقہور نہیں ہے، کوئی بھی چیز نہ تو اس پر غلبہ کر سکتی ہے اور نہ ہی اسے مجبور کر سکتی ہے۔ وہ ان چیزوں سے پاک و منزہ ہے۔ دوسری جانب وہ اس بات سے بھی منزہ ہے کہ تم اس کے ارادے کے آگے رکاوٹ بنو کیونکہ خدا قدرت مطلقہ کا مالک ہے، وہ جب چاہے تمہارے اوپر عذاب نازل کر سکتا ہے۔ اگرچہ تم اپنی جہالت کی وجہ سے اس دردناک عذاب کی پرواہ نہیں کررہے اور خیال کر رہے ہو کہ ایسا عذاب کبھی تم پر نہیں آئے گا۔ جبکہ ایسا نہیں ہے اور جب چاہے گا تم پر عذاب اُتار دے گا اور پھر تم اس عذاب کو اپنے سے ٹال نہ سکو گے۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۳۴

"اور میری نصیحت تمہیں فائدہ نہ دے گی خواہ میں کتنی ہی نصیحت کرنا چاہوں اگر اللہ کو تمہیں گمراہ رکھنا ہی منظور ہے، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تمہیں پھر جانا ہے"۔

بندوں کے امور کی تدبیر اللہ کے اختیار میں

بندوں کے امور کی تدبیر کا اختیار فقط اللہ کے ہاتھ میں ہے لہٰذا اگر اللہ بندوں کے فسق و گناہ کی وجہ سے انہیں گمراہی پر باقی رکھنا چاہے تو کوئی بھی پیغمبر انہیں ہدایت نہیں دے سکتا۔ جس طرح اگر اللہ تعالیٰ بندوں پر عذاب نازل کرنا چاہے تو پیغمبر رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ تمام مخلوقات کے امور کا مدبر اللہ تعالیٰ ہے۔ اور سارے امور کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ حضرت نوح کے اس کلام کا مقصد اپنی قوم کے

کافروں کو لا جواب اور ان پر حجت تمام کرنا تھا، لیکن جہالت اور گناہوں کے سمندر میں غرق ہونے کی وجہ سے ان میں حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ‌ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَيۡتُهٗ فَعَلَىَّ اِجۡرَامِىۡ وَاَنَا بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ ۞۳۵

''کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کو وہ خود بنا لایا ہے، کہہ دو اگر میں بنا لایا ہوں تو اس کا گناہ مجھ پر ہے اور میں تمہارے گناہوں سے بری ہوں''۔

کفار کا اللہ پر افتراء باندھنا

''جرم'' ناپسندیدہ اور مکروہ عمل انجام دینے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ اے ہمارے حبیب! کافروں کا تم پر ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تم اور تمہارے پیروکاروں کے پاس دنیا کا مال نہیں ہے یا تمہارا تعلق اشرافیہ سے نہیں ہے یا تم میں فلاں صفت اور خصوصیت نہیں ہے۔ یہ سارے بہانے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ انہیں یقین ہی نہیں کہ تم اللہ کے نبی ہو اور اللہ کی طرف سے پیغام لے کر آئے ہو، وہ خیال کرتے ہیں کہ تمہارا دعویٰ نبوت، اللہ پر افتراء ہے۔ یہ گفتگو کفار قریش کی اس گفتگو کی مانند ہے جو انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کے متعلق کی تھی، جس کا تفصیلی تذکرہ سورہ انعام میں بیان ہو چکا ہے۔ لہٰذا یہ آیات، کفار مکہ کے متعلق بھی کنایہ ہیں اور انہیں سمجھایا جارہا ہے کہ رسول خداؐ اپنے دعویٰ میں سچے ہوں یا نہ ہوں تم ہر صورت میں مجرم ہو۔ جس طرح اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام سے کہہ رہا ہے کہ ان کافروں سے کہہ دو کہ اگر میں نبوت کے دعوے میں جھوٹا ہوں اور میں نے اللہ پر افتراء باندھا ہو تو اس کی سزا مجھے ملے گی! اس میں تمہارا کیا نقصان ہے؟ لیکن تم یقینی طور

پر مجرم ہو کیونکہ تم نے ان مضبوط عقلی دلائل کو ٹھکرایا ہے جنہیں تم جھٹلا نہیں سکتے تھے اور ہدایت کو قبول نہیں کر رہے ہو اور فسق و گناہ کو جاری رکھا ہوا ہے۔ تم اپنے اس جرم کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

وَ اُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّہٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾

''اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے اب کوئی ایمان نہیں لائے گا مگر وہ جو لا چکا، پھر غم نہ کر وان کاموں پر جو کر رہے ہیں''۔

قوم نوحؑ کے ایمان نہ لانے کی خبر

''ابتئاس'' ذلت و خواری کے ساتھ غم و اندوہ قبول کرنے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو ان کی قوم کے کافروں کے ایمان لانے سے کلی طور پر مایوس اور ناامید کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں سمجھا رہا ہے کہ اتنے واضح دلائل کے بعد جب وہ ایمان نہیں لائے ہیں تو اب ان کے ایمان لانے کا انتظار نہ کرو اور اپنے آپ کو انہیں دعوت دینے میں نہ تھکاؤ۔ کیونکہ ان پر حجت تمام ہو چکی ہے۔ اگر ان میں ایمان لانے کی صلاحیت ہوتی تو اتنے کھلے دلائل کے ہوتے ہوئے تیری دعوت کو قبول کر لیتے اور ایمان لے آتے اور دل کے کان سے سنتے اور اطاعت کرتے۔ لہٰذا تم اب ان کے ایمان نہ لانے پر افسوس بھی نہ کرو۔ گویا اس کلام میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو تسلی دے رہا ہے اور ان کا حوصلہ بڑھا رہا ہے، کیونکہ حضرت نوح نے تقریباً ہزار سال اپنی قوم میں زندگی گزاری اور انہیں دین حق کی دعوت دیتے رہے لیکن اتنی لمبی مدت میں صرف تھوڑے ہی افراد ان پر ایمان لے آئے۔ اس کلام میں اس بات کی جانب

اشارہ ہے کہ بہت جلد اللہ تعالیٰ کا حتمی فیصلہ ان کے خلاف آجائے گا اور ان کو ان کے کئے کی سزا ملے گی۔ لہٰذا آپ ان کے حال پر افسردہ نہ ہوں۔

وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝

"اور ہمارے روبرو اور ہمارے حکم سے کشتی بنا اور ظالموں کے حق میں مجھ سے کوئی بات نہ کر، بے شک وہ غرق کیے جائیں گے"۔

نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم

"فُلْكَ" سفینہ اور کشتی کو کہتے ہیں۔ "اَعْيُنِ" عین کی جمع ہے جس کا معنی آنکھ ہے۔ اس تعبیر (ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بناؤ) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کشتی بنانے کے کام پر تاکید کرنا چاہتا ہے یہ کام ہماری نگرانی میں انجام پائے گا۔ اس آیت میں "وحی" روح القدس کی تائید کے ذریعے حضرت نوح عملی ہدایت کے معنی میں ہے کہ کشتی کس طرح بنانی ہے، آپ کو عملی طور پر سمجھایا گیا کہ کس طرح کشتی تیار کریں اور اس کے بنانے میں کیا کیا چیزیں استعمال کریں۔ جس طرح آل ابراہیم کے اماموں کے بارے میں فرمایا:

" وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝[1]

ترجمہ "اور ہم نے ان کو نیک کام انجام دینے، نماز قائم کرنے اور زکواۃ دینے کے بارے میں وحی کی اور وہ ہماری عبادت کرنے والے تھے"۔ یعنی جب حضرت نوح علیہ

---

[1]۔ سورہ انبیا آیت نمبر 73۔

السلام کشتی بنا رہے تھے تو اس کے بارے میں انہیں خصوصی طور پر وحی اور ہدایت مل رہی تھی کہ اسے کیسے بنایا جائے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ظالموں کے بارے میں مجھ سے بات نہیں کرنا، مجھ سے انہیں سزا نہ دینے اور ان کے عذاب کو ٹالنے کی درخواست نہ کرنا۔ کیونکہ ان کے غرق ہونے کا حکم حتمی ہے اور یہ طے ہوچکا ہے اور اس حتمی حکم کو واپس نہیں لیا جائے گا۔ ان سب نے اب غرق ہی ہونا ہے اور عذاب الٰہی کا ان پر آنا حتمی ہے۔

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ؕ﴿۳۸﴾

"اور وہ کشتی بناتے تھے اور جب اس کی قوم کے سردار اس کے نزدیک سے گزرتے تو اس پر ہنسی مذاق کرتے، کہتے اگر تم (ہمارا مذاق اڑتے ہو اور) ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنسیں گے جیسے تم ہنستے ہو"۔

نوحؑ کا کشتی بنانا

یہ آیت حضرت نوحؑ کے حالات کو بیان کر رہی ہے اس لیے فعل مضارع کے صیغہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جب حضرت نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے تو لوگ ٹولیوں میں قریب آکر کشتی بنانے کا نظارہ کرتے تھے اور حضرت نوحؑ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ شخص پاگل ہوگیا ہے! لیکن حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی خاطر اور ان پر اتمام حجت کرنے کی خاطر ان تمام تکالیف اور ان کے طعنوں کو برادشت کرتے تھے اور اپنے کام میں نہ کوئی کمزوری دیکھا رہے تھے اور نہ سستی، بڑی ہمت کے ساتھ کشتی بنانے میں مشغول تھے۔ مذاق اڑانے والوں کے جواب میں فقط اتنا

کہتے تھے کہ اگر تم آج ہمارا مذاق اڑا رہے ہو تو بہت جلدی جب تمہارے اوپر عذاب آئے گا تو ہم تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں نے کافروں کے مذاق اُڑانے کی بات کی تو ان کا مذاق اڑانا ابتدائی نہیں تھا تاکہ یہ ایک ناپسندیدہ امر شمار ہو بلکہ یہ کافروں کے مذاق اڑانے کے جواب کے طور پر تھا اور ایک طرح سے ان کے کیے کی سزا تھی، لہٰذا یہ مذموم امر نہیں بنتا۔ جیسا کہ سورۂ توبہ آیت نمبر 79 میں کفار کا مذاق اڑانے کی نسبت خود اللہ کی طرف دی ہے۔

فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: "وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَ یَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۳۹﴾

"تمہیں جلدی معلوم ہو جائے گا کہ کس پر عذاب آتا ہے (ایسا عذاب) جو اسے رسوا کرے گا اور کسی پر دائمی عذاب اترتا ہے۔"

کفار کیلئے رسواء کرنے والا عذاب

بہت جلد پتہ چل جائے گا کہ کن پر عذاب آتا ہے، ہم پر یا تم پر۔ یہ ایک طرح سے ان کا مذاق اڑانا تھا۔ البتہ حق بات سے مذاق اڑانا تھا چونکہ اُنہیں تہس نہس کر دینے والا عذاب بہت جلد اپنے گھیرے میں لے گا یعنی بہت جلد ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ ان کے لیے دنیاوی ذلت اور خواری تھی جس کا لازمہ اخروی اور جاودانی عذاب ہے جو قیامت کے دن ان کے گریبان گیر ہوگا جس سے وہ ہر گز رہائی نہیں پا سکیں گے۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡہَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَ اَہۡلَکَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡہِ الۡقَوۡلُ وَ مَنۡ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ ﴿۴۰﴾

''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم پہنچا اور تنور (سیلاب) نے جوش مارا، ہم نے کہا کشتی میں ہر قسم کے جوڑے ''نر مادہ'' چڑھا لے اور اپنے گھر والوں کو مگر وہ (نہیں بٹھاؤ) جن کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے اور سب ایمان والوں کو (بھی بٹھا لو)، اور اس کے ساتھ ایمان تو بہت کم لائے تھے''۔

کشتی نوحؑ کے سوار

بہر حال کشتی تیار ہو گئی، اشرافیہ اور کفار حضرت نوحؑ کا مذاق اڑاتے رہے۔ جب عذاب کا وقت آگیا تو تنور سے پانی نکلنا شروع ہوا۔ تنور وہ جگہ ہے جہاں روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ تنور سے پانی نکلنے کے متعلق روایت میں آیا ہے کہ سب سے پہلے ایک بوڑھی عورت کے گھر کے تنور سے پانی نکلنا شروع ہوا۔ اس بارے دوسرا احتمال یہ ہے کہ تنور سے پانی نکلنا اس بات سے کنایہ ہے کہ اللہ کا نہایت سخت اور شدید غضب آیا۔ بہر صورت اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ہم نے نوحؑ سے کہا کہ سارے موجودات کا ایک ایک جوڑا، مومنین اور اپنے خاندان کے افراد کشتی میں سوار کرو، سوائے ان کے کہ جن کی ہلاکت کا حکم جاری کر دیا گیا ہے۔ بعد والی آیات میں بتایا جائے گا کہ اس سے نوحؑ کی بیوی اور ان کا بیٹا مراد تھا جو کافر اور غیر صالح تھے۔ جن کی ہلاکت کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہو چکا تھا۔ آخر میں فرمایا کہ قوم نوحؑ سے تھوڑے افراد ایمان لائے۔ ''مَآ اٰمَنَ مَعَہٗۤ'' سے خود نوح اور ان پر ایمان لانے والے مومنین مراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے

عذاب سے بچایا۔

وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

"اور کہا اس میں سوار ہو جاؤ اس کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے، بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے"۔

کشتی کا اللہ کے نام سے چلنا اور ٹھہرنا

"مَجْرا" کشتی کے حرکت کرنے کے معنی میں ہے۔ "مُرْسَا" کشتی کے ٹھہرنے اور توقف کرنے کو کہتے ہیں۔ بہر حال حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ کا نام لے کر اپنے پیروکاروں کو کشتی میں سوار کیا اور اللہ کے نام سے خیر و برکت طلب کی۔ اللہ کا نام لینے کا مقصد ہلاکت اور نقصان سے بچنا تھا کیونکہ سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ جس کام کے شروع میں اللہ کا نام لیا جائے تو اس کام میں برکت عطا ہوتی ہے اور مشکلات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔[1] کیونکہ کسی بھی کشتی کی نجات کے لیے اس کا صحیح موقع پر چلنا اور صحیح موقع پر ٹھہرنا ضروری ہے۔ یہ سب اس وقت ممکن ہے جب اللہ کی عنایت اور توجہ اس کشتی والوں کے شامل حال ہو۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت اس وقت ان کے شامل حال ہوگی جب مغفرت الٰہی ان افراد کے شامل حال ہو تاکہ وہ رحمت حق کے مستحق قرار پائیں۔ جس کے نتیجے میں وہ غرق ہونے سے نجات پائیں۔ اسی لیے حضرت نوحؑ نے اللہ کو ان دو ناموں سے یاد کیا ہے، ایک غفور اور دوسرا رحیم کہ اللہ

[1] ۔ روایت میں آیا ہے کہ اگر کوئی اہمیت والا کام بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے تو وہ کام ابتر ہو جاتا ہے اور وہ کام اپنے اختتام کو نہیں پہنچتا۔

تعالیٰ بخشنے والا اور گناہوں سے در گزر کرنے والا بھی ہے اور مہربان بھی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی رحمت سے اس کشتی کو غرق ہونے سے بچائے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام وہ پہلی شخصیت ہیں جس نے اللہ کو بسم اللہ کے نام سے یاد کیا۔ اسی طرح آپؑ وہ پہلی شخصیت ہیں جس نے اللہ کی توحید کے لیے دلائل پیش کیے، وہ پہلی شخصیت ہیں جن پر شریعت اور کتاب اتری اور وہ ہی ایسی شخصیت ہیں ابراہیم خلیل نے خود کو ان کے شیعوں میں سے قرار دیا، آپؑ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے معاشرے کے طبقاتی اختلافات کے خاتمے کے لیے عملی اقدام اُٹھایا تاکہ معاشرے میں توازن اور اعتدال برقرار ہو۔ عدالت پر مبنی متوازن معاشرہ وجود میں آئے اور کوئی گروہ بھی دوسرے پر بالادست نہ ہو۔

وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾

"اور وہ انہیں پہاڑ جیسی لہروں میں لیے جارہی تھی، اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا جب کہ وہ کنارے پر تھا کہ اے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ نہ ہو جا"۔

نوحؑ کی بیٹے کو کشتی پر سوار ہونے کی دعوت

طوفانِ نوح اتنا عظیم تھا کہ اس کی موجیں اور لہریں پہاڑ کی مانند تھی اور کشتی کے سامنے اوپر اٹھ رہی تھیں۔ اسی اثناء میں نوحؑ کی نگاہ اپنے بیٹے پر پڑی جو ایک دور جگہ پر کھڑا تھا۔ حضرت نوحؑ نے انہیں آواز دی اور بڑے پیار و محبت سے کہا: اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی پر سوار ہو جاؤ اور کافروں سے مت بنو کیونکہ

اگر کافروں کا ہم نشین بنوگے تو تیرا انجام بھی کافروں جیسا ہوگا اور تیرے اوپر بھی عذاب آئے گا۔ آپؑ نے یہ نہیں کہا وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْكٰفِرِيْنَ" بلکہ کہا:" وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ " کافروں کا ہم نشین مت بنو، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت نوحؑ کو اپنے بیٹے کے باطنی نفاق کی اطلاع نہ تھی۔ اسی وجہ سے آپ نے بیٹے کو کشتی پر سوار ہونے کی دعوت دی تھی۔ دو باتیں ہیں: (۱) ایک ہے کافروں میں سے ہونا۔ (۲) دوسری کافروں کے ساتھ ہونا، حضرت نوحؑ اپنے اس کلام میں بیٹے کو کافروں کے ساتھ رہنے اور ان کا ہم نشین بننے سے منع کر رہے ہیں اس کے کافر ہونے کا نہیں کہہ رہے۔

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

"(نوح کے بیٹے نے) کہا میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لیتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا، (نوح نے) کہا آج اللہ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں مگر جس پر وہی رحم کردے، اور دونوں کے درمیان ایک موج حائل ہوگئی اور وہ (نوح کا بیٹا) ڈوبنے والوں میں ہوگیا"۔

نوحؑ کے بیٹے کا غرق ہونا

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے نے اپنے والد کی دعوت کو قبول نہ کیا اور کہا کہ میں پہاڑ پر پناہ لے لوں گا اور خود کو طوفان سے بچا لوں گا اور اپنے آپ کو پانی میں غرق ہونے سے بچا لوں گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ بہت اونچی بلندی پر چڑھ گیا۔ حضرت نوح

علیہ السلام نے کہا اللہ کا فیصلہ ہوچکا ہے، آج سارے زمین والوں نے غرق ہونا ہے سوائے ان کے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی پناہ میں ہوں۔ یہ گفتگو زیادہ لمبی نہ ہوئی اور اچانک پانی کی ایک لمبی لہر آئی اور نوحؑ اور ان کے بیٹے کے درمیان حائل ہو گئی اور نوحؑ کا بیٹا غرق ہوگیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور ان کی گفتگو جاری رہتی اور نوح کو اپنے بیٹے کے کفر کے بارے پتہ چل جاتا تو وہ اس سے بیزاری کا اعلان فرما دیتے۔

وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

''اور حکم آیا اے زمین! اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا اور پانی سکھا دیا گیا اور کام پورا ہو چکا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی، اور کہہ دیا گیا کہ ظالموں پر پھٹکار ہے''۔

کشتی کا کوہ جودی پر آکر رکنا

''بلع'' کسی چیز کو نگلنے کے معنی میں ہے۔ ''اقلاع'' کسی چیز کو چھوڑ دینا، ترک کرنا اور ٹھہر جانے کے معنی میں ہے۔ ''غیض'' زمین کا پانی یا کسی دوسری مائع چیز کو اپنے اندر لے لینا۔ ''جودی'' مطلق پہاڑ اور پتھر اور سنگلاخ زمین کو کہتے ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے اس سے معین پہاڑ مراد لیا ہے جو سرزمین موصل کے آرارات پہاڑی سلسلوں میں موجود ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کی کبریائی کی جانب سے یہ فرمان صادر ہوا اور کلمہ کن سے امر تکوینی کر دیا کہ زمین پانی اپنے اندر لے جائے اور آسمان بارش برسانا روک دے۔ اور باقی سارا پانی زمین میں چلا جائے۔ اس طرح قوم نوحؑ کے عذاب کے متعلق اللہ تعالیٰ

کا وعدہ پورا ہوا۔ کشتی نوح پہاڑ کے اوپر ٹھہر گئی اور طوفان ختم ہوا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرمان جاری ہوا کہ ظالم لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرامت کے دائرے سے محروم رہیں گے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لینے کا مقصد مقام الوہیت کی تعظیم اور اس ذات پاک کی بلند شان کو بیان کرنا ہے۔ اس آیہ کریمہ میں عجیب فصاحت و بلاغت ہے جس نے علماء فصاحت و بلاغت کو حیران کر دیا ہے۔ علماء علم فصاحت و بلاغت نے اب تک اس آیہ کریمہ سے جو ادبی نکات استفادہ کئے ہیں وہ سمندر کے مقابلے میں قطرہ جتنے ہیں۔

وَ نَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَكَ الۡحَقُّ وَ اَنۡتَ اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِیۡنَ ﴿۴۵﴾

"اور نوح نے اپنے رب کو پکارا کہ اے رب! میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے"۔

بیٹے کے لیے نوحؑ کی دعا

اس آیت میں اپنے بیٹے کے حق میں حضرت نوحؑ کی دعا ذکر ہوئی ہے۔ حضرت نوحؑ کا اپنے بیٹے کے حق میں دعا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہیں بیٹے کے کافر ہونے کا علم نہ تھا۔ اور آپ نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ سن رکھا تھا جس میں آپ کے گھرانے کے افراد کی نجات کا وعدہ دیا گیا تھا۔ اسی لیے آپ نے اپنے بیٹے کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ کلمہ "نادٰی" سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ بیٹے کے غرق ہونے پر بہت غمگین تھے اس لیے بلند آواز سے اللہ کو پکارا۔ بظاہر آپ نے یہ دعا بیٹے کے غرق ہونے کے فوراً بعد کی ہے نہ کہ طوفان کے ختم ہو جانے کے بعد۔ حضرت نوحؑ اولوالعزم پیغمبروں میں سے تھے لہٰذا آپ کو اللہ تعالیٰ کے

مقام الوہیت اور اپنی بندگی کے متعلق علم تھا۔ اسی لیے آپ نے اپنی دعا کو سوال کی صورت میں پیش کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نوحؑ اور اس کے گھرانے کی نجات کا وعدہ دیا تھا، اور نوحؑ اپنے بیٹے کو مومن سمجھتے تھے۔

لہٰذا آپ نے ادب بندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اپنے بیٹے کی نجات کی دعا کی۔ آخر میں فرمایا کہ اس بارے حکم اور فیصلہ کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور میں اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم ہوں۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ "اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝۴۵" ہے لہٰذا وہ جو بھی حکم دے گا، عدل و انصاف پر مبنی ہوگا۔ یہ لقب اللہ تعالیٰ کی ذات سے مختص ہے، لیکن آج کے زمانے میں یہ لقب یعنی "اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝۴۵" ہر ظالم اور جائر قاضی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے!

قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝۴۶

"فرمایا اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، کیونکہ اس کے عمل اچھے نہیں ہیں، سو مجھ سے مت پوچھ جس کا تجھے علم نہیں، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں جاہلوں میں نہ ہو جاؤ"۔

فرزند نوحؑ کے بارے اللہ کا حکم

جب حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے بیٹے کی نجات کی درخواست کی اور کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ اے نوحؑ! یہ لڑکا تیرے خاندان سے نہیں ہے۔ لہٰذا تیرے خاندان کی نجات کا وعدہ اس کو شامل نہیں

ہے۔ کیونکہ وہی تیرے خاندان سے ہے جو تیرے عقید ے پر ہو۔ معیار دین اور عقیدہ ہے، خونی قرابت داری نہیں ہے۔ پس تمہیں معلوم ہو کہ یہ تمہارے خاندان سے نہیں ہے کیونکہ اس کا عمل غیر صالح ہے، وہ تیرا لائق اور نیک بیٹا نہیں ہے کیونکہ اس کا عمل ناشائستہ نہیں ہے۔ لہٰذا اسے اس کے عمل کی بنیاد پر دیکھا جائے گا نہ کہ اس کی قرابت داری اور نسب کے لحاظ سے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو خبردار کیا کہ دیکھو چوکنا رہو! اور ایسا سوال نہ کرو جس کے متعلق تمہیں خبر نہیں ہے۔ حضرت نوح کو معلوم نہ تھا کہ ان کا بیٹا اہل ایمان سے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص توجہ کے ذریعے انہیں اس بات سے آگاہ کیا تاکہ آپؑ بے جا اپنے بیٹے کی نجات کی درخواست نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ تم جاہلوں سے بن جاؤ، تمہارا اپنے بیٹے کی نجات کی درخواست کرنا ایک جاہلانہ عمل ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو منع کیا ہے۔ جاہل سے وہ شخص مراد ہے جو اپنے جاہلانہ عمل پر اصرار کرے۔ کیونکہ اہلیت اور تعلق کا معیار عقیدہ و ایمان ہے، جب یہ تعلق کٹ جائے تو دوسرا کوئی رابطہ اور رشتہ داری باقی نہیں رہتی ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ اَسۡـَٔلَکَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ اَکُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۴۷﴾

"کہا اے رب! میں تیری پناہ لیتا ہوں اس بات سے کہ تجھ سے وہ بات

[1] ۔ پسر نوح بابدان بنشست　　خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کھف روزی چند　　پی نیکان گرفت و مردم شد (سعدی)
ترجمہ: "نوحؑ کا بیٹا برے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کی وجہ سے خاندان نبوت گنوا بیٹھا جبکہ اصحاب کہف کا کتا کچھ دن نیک لوگوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے انسان جیسا بن گیا۔"

پوچھوں جو مجھے معلوم نہیں، اور اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں نقصان اُٹھانے والوں سے ہو جاؤں گا"

اللہ کی تنبیہ پر نوحؑ کا بیان

جب حضرت نوح علیہ السلام کو پتہ چل گیا کہ ان کا بیٹا فقط کافروں کے ساتھ نہیں تھا بلکہ کافروں میں سے تھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے بیٹے کی نجات کی درخواست کرتے تو ایک جاہلانہ عمل کا مرتکب ہوتے۔ اسی لیے بڑی عاجزی کے ساتھ اللہ سے التجاء کی اور پناہ مانگی اور اللہ کا شکر بھی ادا کیا کہ اس قسم کی درخواست کے مرتکب نہیں ہوئے۔ ایسا سوال نہیں کیا جس کے صحیح یا فاسد ہونے سے ناواقف تھے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت طلب کرتے ہوئے التجاء کی کہ اے میرے پروردگار! اگر تو نے میری توبہ کے بعد میرے اوپر مغفرت اور عفو و درگزر کی نگاہ نہیں فرمائی اور اپنی عنایت اور رحمت کے دائر میں مجھے نہیں لے لیا تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجاؤں گا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا یہ کلام حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے حضور شکر گزاری کا اظہار ہے کہ اس نے احسان کیا اور انہیں بتا دیا کہ ا ن کا بیٹا ان کے عقیدے پر نہیں تھا۔ فقط اتنی بات نہیں تھی کہ ان کا بیٹا کافروں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا، بلکہ وہ دل سے ہی کافر تھا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو آگاہ کیا جس کا آپ نے اس انداز میں شکر بجا لایا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾

"کہا گیا اے نوح! کشتی سے اُترو ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ جو تم پر اور تمہارے ساتھ رہنے والوں پر رہیں گی، اور کچھ دوسرے گروہ ایسے ہیں کہ ہم انھیں دنیا میں تو فوائد دیں گے لیکن اس کے بعد انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا (بوجہ ان کی نافرمانیوں کے)"۔

نوحؑ پر اللہ کا انعام

"سَلَامٍ" عذاب سے محفوظ رہنااور ایک طرح کی تحیت و درود اور سلامتی کے معنی میں ہے۔ "برکات" ان نعمتوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کے لیے خیر و سعادت اور اچھی عاقبت کا وسیلہ بنتی ہیں۔ آیت کے شروع میں اس کلام کے کہنے والے کا نام لینے کی بجائے جو کہ اللہ تعالیٰ ہے اس لیے "قیل" کہا گیا ہے تاکہ کہنے والے کی عظمت کو اثبات کیا جائے اور اس ذات پاک کی تعظیم کا لحاظ رکھا جائے۔ آیہ شریفہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نوحؑ کو خطاب کر کے فرمارہا ہے کہ اے نوحؑ! اب اس طوفانی پانی سے زمین پر اتر آؤ جبکہ تم اللہ کے عذاب سے محفوظ ہوگئے ہو اور ہم نے تم پر اور ان لوگوں پر جو تیرے ہمراہ کشتی پر سوار تھے اور قیامت تک آنے والی نسلوں پر اپنی نعمتیں اور برکتیں نازل کی ہیں۔اس مقام پر اللہ کے خطاب میں عمومیت اور شمول ہے جو کشتی سے اترنے کے بعد تاریخ میں آنے والے تمام انسانوں کو شامل ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ تمہارے علاوہ دوسری امتیں بھی ہیں جنہیں ہم نے دنیا کی نعمتیں دیں۔اور ان کے ناشایستہ اعمال کی بنیاد پر انہیں آخرت میں دردناک عذاب دیں گے۔ ان امتوں کو علیحدہ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ امتوں کو اللہ تعالیٰ کی کرامت اور رحمت سے دھتکارا گیا ہے۔ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ پہلے گروہ کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی دنیاوی زندگی کے چال چلن میں اعتدال اور میانہ روی سے

خارج ہوئے ہیں اور دین فطری سے نکلے ہیں۔ لہٰذا یہ آخرت میں عذاب الٰہی چکھیں گے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

"(اے محمد) یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں، اس سے پہلے نہ تو آپ ہی جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی، پس صبر کرو کیونکہ بہتر انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے"۔

پیغمبر اسلامؐ کو خطاب

اس آیت میں اللہ تعالیٰ پیغمبر اسلام سے کہہ رہے ہیں کہ اے محمد ﷺ ہم نے وحی کے ذریعہ نوحؑ کا قصہ اور ان کی قوم کا انجام تمہارے لیے بیان کر دیا ہے یہ سب غیبی خبریں تھیں، اس سے پہلے نہ آپؐ ان سے آگاہ تھے اور نہ ہی آپ کی قوم کو اس کی خبر تھی۔ البتہ اس قصہ کی تحریف شدہ شکل اہل کتاب کے پاس موجود تھی۔ اب جبکہ تمہیں نوحؑ کا سارا قصہ اور اس کے ساتھ صبر کرنے والے مومنین کے حالات کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی ہے تو تم بھی صبر کرنے والوں میں سے ہو جاؤ اور مذاق اڑانے والوں اور تکلیف پہنچانے والے مشرکین سے نہ گھبراؤ، بلکہ حوصلہ رکھو، کیونکہ عاقبت اہل تقویٰ کے لیے ہے اور خدا صبر کرنے والوں کو ان کا اجر دیتا ہے اور زمین صالحین کے اختیار میں دی جائے گی۔

"اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾"۔[1]

[1] ۔ سورہ انبیاء آیت 105 ۔

ترجمہ: ''بلاشک و تردید زمین کے وارث میں صالح بندگان ہوں گے یعنی زمین پر نیک بندگان کی حکمرانی ہو گی''۔

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝۵۰

''اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا، اے قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں، تم سب جھوٹ کہتے ہو''۔

قوم عاد کا قصہ

قرآن کریم نے حضرت ہودؑ کو اس لیے ان کی قوم کا بھائی کہا ہے کیونکہ نسب کے اعتبار سے ان کا تعلق اسی قوم و قبیلے سے تھا اور ان سب کا نسب ایک ہی فرد سے جا ملتا تھا۔ حضرت ہودؑ نے ''یا قوم'' کہہ کر اپنی قوم کو پکارا تا کہ ان کے جذبات کو اپنی جانب جلب کر سکیں اور ان کو دعوت الٰہی قبول کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ اس کے بعد انہیں خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی اور اللہ کے سواء دوسرے معبودوں کی عبادت کرنے سے منع کیا اور فرمایا: اللہ کے سواء کوئی تمہارا معبود نہیں ہے۔ بتوں کے شفیع ہونے کا تمہارا دعویٰ افتراء کے سواء کچھ نہیں ہے اور اس بارے تمہارے پاس کوئی عقلی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔

يٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۵۱﴾

''اے قوم !میں اس پر تم سے مزدوری نہیں مانگتا، میری مزدوری اسی پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا، پھر کیا تم نہیں سمجھتے''۔

حضرت ھودؑ کا بیان

حضرت ھودؑ نے اپنی قوم کو سمجھانے کے لیے کہا کہ تبلیغ کرنے میں میرا کوئی مادی مفاد نہیں ہے اور میں اس کام کے عوض تم سے کوئی مزدوری بھی نہیں چاہتا تاکہ تم مجھ پر مادی منافع حاصل کرنے کا الزام لگا سکو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایسا بھی نہیں ہے کہ میری پیغام رسانی کا بالکل کوئی اجر نہ ہو کیونکہ اس صورت میں یہ بے ہودہ کام شمار ہوگا، بلکہ اس کا اجر اس ذات کے ذمہ ہے جس نے مجھے خلق کیا ہے، جس نے مجھے وجود کی نعمت عطا کی ہے اور جس نے مجھے پیغمبری کے لیے چنا ہے۔ کیا تم اپنی عقل کی طرف رجوع نہیں کرتے ہو تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ میرا مقصد صرف تمہاری خیر خواہی اور تمہاری ہدایت اور حق بات پہنچانے کے سواء کچھ نہیں ہے۔

وَيٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا وَّيَزِدۡكُمۡ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمۡ وَلَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ﴿۵۲﴾

''اور اے قوم !اپنے رب سے معافی مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم پر خوب بارشیں برسائے گا اور تمہاری قوت کو اور بڑھائے گا اور تم نافرمان ہو کر نہ پھر جاؤ۔''

قوم کے لیے ھودؑ کی خیر خواہی

حضرت ھودؑ نے اپنی قوم کی خیر خواہی کے لیے کہا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت کی درخواست کرو تاکہ وہ تمہارے گناہوں پر پردہ ڈال دے۔ توبہ کرتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تمہارے لیے آسمان سے برکت والی بارش اتارے۔ جب بارش آئے گی تو تمہارے کھیت ہریالے ہونگے، بھرپور اناج ہوگا اور تم خوش وخرم ہوگے۔ اس طرح تمہاری جسمانی طاقت کے ساتھ ایمانی قوت میں بھی اضافہ ہوگا۔ کبھی بھی یکتا اللہ سے منہ موڑ کر غیر خدا اور ان معبودوں کی پرستش نہ کرو۔ اللہ کی نافرمانی نہ کرو، اللہ کے علاوہ کسی کو معبود مت بناؤ۔

اس آیت میں دو باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ھودؑ کی قوم خشک سالی اور قحط میں مبتلا تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسانوں کے اعمال اور کائنات میں رونما ہونے والے حادثات اور واقعات کا آپس میں براہ راست اور گہرا تعلق ہے۔ نیک اعمال آسمان سے برکات اور خیرات الٰہی کے نزول کا سبب بنتے ہیں۔ اسی طرح گناہ اور ناشائستہ اعمال مصائب، مشکلات اور بدبختی اور ہلاکت کا سبب بنتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر96 میں اسی مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے۔[1]

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

---

[1] ۔ وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ۔۔۔ ترجمہ: ”اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقوای اختیار کرتے تو یقینی طور پر ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔۔۔“

"کہا اے ہود !تو ہمارے پاس کوئی معجزہ بھی نہ لایا اور ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تجھے ماننے والے ہیں"۔

قوم ھودؑ کا جواب

حضرت ھودؑ نے اپنی قوم سے دو باتیں چاہی تھیں: (۱)ایک اللہ وحدہ لا شریک پر ایمان لے آؤ اور اپنے جھوٹے خداؤں کی عبادت چھوڑ دو۔ (۲) دوسری بات استغفار کرو، رب کے آگے توبہ کرو اور میری خیر خواہی کی دعوت کو قبول کرو۔

حضرت ھودؑ کی قوم نے ان کی دونوں باتوں کو ٹھکرا دیا اور حضرت ھودؑ کو مکمل طور پر مایوس کیا۔انہوں نے پہلے تو اجمالی طور پر کہا کہ تم کوئی معجز ہ نہیں لے آئے ہو تاکہ ہم تمہاری دعوت قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ پھر صریحاً کہہ دیا کہ ہم تیر ی دعوت پر اپنے خداؤ ں کی عبادت نہیں چھوڑیں گے اور ہم بالکل تم پر ایمان نہیں لائیں گے اور تمہاری اطاعت نہیں کریں گے۔ اس طرح انہوں نے حضرت ھودؑ کو مایوس کر دیا کہ ہم تمہارے اوپر ایمان نہیں لائیں گے۔ان کی باتوں سے ضمنی طور پر یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ ہمیں اللہ کی جانب دعوت سے دینے سے باز آجاؤ۔

إِنْ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ۗ قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ ﴿٥٤﴾

"ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تجھے ہمارے کسی معبود نے بری طرح جھپٹ لیا ہے، (ھود نے) کہا بے شک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جنہیں تم اللہ کے سوا شریک کرتے ہو"۔

حضرت ھودؑ کا امتحان

"اِعۡتَرٰا" کسی پر کوئی شے طاری ہونے کے معنی میں ہے۔ قوم ھودؑ نے حضرت ھودؑ سے کہا تمہارے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ تم نے ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہا ہے اور ان کی توہین کی ہے اس وجہ سے تمہاری عقل کمزور ہو گئی ہے اور تم دیوانہ ہوگئے ہو اور تم پر جنون طاری ہوا ہے۔ لہٰذا ہمیں تمہاری باتوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ حضرت ھودؑ نے ان کے جواب میں کہا: (۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں۔ (۲) دوسری بات یہ ہے کہ تم خود بھی اس بات کی گواہی دو کہ میں تمہارے شرک آمیز اعمال اور جھوٹے خداؤں کی پرستش سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مِنۡ دُوۡنِهٖ فَكِيۡدُوۡنِىۡ جَمِيۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۵۵﴾

"اس کے سوا، سو تم سب مل کر میرے حق میں برائی کرو پھر مجھے مہلت نہ دو"۔

حضرت ھودؑ کا کھلا چیلنج

حضرت ھودؑ نے اپنی قوم کے جواب میں کہا کہ اگر تم سچ بولتے ہو کہ میں پاگل ہوگیا ہوں اور تمہاری بات صحیح ہے تو پھر میرے ساتھ مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ تم خود اور تمہارے سارے خدا ہاتھ میں ہاتھ دو، اگر تم میں طاقت ہے تو میرے خلاف سازش کرو، مجھے ختم کرنے میں دیر نہ کرو، مجھے بالکل مہلت نہ دو۔ حضرت ھودؑ کا یہ بیان اپنی قوم کے لیے چیلنج تھا اور انہیں سمجھایا گیا کہ تم ایسا کرنے سے عاجز ہو، تمہارے بتوں میں اگر علم وقدرت اور ارادہ ہوتا تو وہ انتقام لینے پر قادر

ہوتے۔ وہ لوگ خود بھی بڑے طاقتور تھے، ان سے بھی کہا کہ تم سب اکٹھے ہو جاؤ، اگر اللہ کی طرف سے حضرت ہودؑ کی تائید نہ ہوتی اور وہ اپنے دعوے میں سچے نہ ہوتے تو وہ بڑی آسانی سے حضرت ہودؑ کو ختم کر سکتے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ہودؑ سے نجات دے سکتے تھے۔ لہٰذا حضرت ہودؑ کا یہ کلام ان کی دعوت اور ان کے عقائد کی حقانیت اور ان کے مخالفین کے عقائد کے باطل ہونے پر دلیل ہے۔ لہٰذا یہ ایک عقلی اور منطقی دلیل ہے کہ تمہارے معبود اور جن کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے ان کے باطل ہونے پر قطعی ثبوت موجود ہے اور حضرت ہودؑ کے پیغمبرؑ ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

اِنِّیۡ تَوَکَّلۡتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیۡ وَ رَبِّکُمۡ ؕ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ اِلَّا ہُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِہَا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۵۶﴾

"میں نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے جو میرا اور تمہارا رب ہے، کوئی بھی زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ جس کی چوٹی اس نے نہ پکڑ رکھی ہو، بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے"۔

حضرت ہودؑ کا واضح اعلان

پچھلی آیت میں ذکر شدہ حضرت ہودؑ کی گفتگو کے بارے میں دو احتمال تھے:
(۱) ایک احتمال یہ تھا کہ آپ کے پیغمبر ہونے اور آپ کی حقانیت اور کفار کے عقائد کے باطل ہونے پر آپ کے پاس نشانی موجود تھی۔ (۲) دوسرا احتمال یہ تھا کہ آپؑ کو کافروں سے کوئی ڈر نہیں اگرچہ وہ آپ کو نابود کرنے پر قادر بھی کیوں نہ ہوں۔
آپ نے اس آیت میں اس دوسرے احتمال کی نفی اور اپنی بات کی تائید کو جاری رکھتے

ہوئے فرمایا کہ میں نے اپنے کام میں اپنے رب پر توکل کیا ہوا ہے جو میرے امور کا مدبر اور مدیر ہے اور تمہارے امور کی تدبیر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ آپ نے ان کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے، مزید فرمایا: زمین پر موجود ہر ذی روح کا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے تمام امور کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ان پر خدا کا مکمل تسلط ہے۔ وہ اپنی قدرت کاملہ سے اپنی ساری مخلوقات پر احاطہ رکھتا ہے اور وہ حق کی تائید فرماتا ہے اور باطل کو رسوا کرتا ہے۔ تم اور تمہارے جھوٹے خدا ہر گز اللہ کے ارادے کے سامنے رکاوٹ نہیں بن سکتے اور نہ ہی دین حق کو نابود کر سکتے ہو۔ میرا اللہ سیدھے راستے پر ہے وہ اس سے ہٹتا نہیں ہے۔ ہمیشہ اس کی عادلانہ روایت یہی رہی ہے کہ دین حق کی تائید کرے اور اسے تمہارے شر سے محفوظ رکھے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَیْكُمْ ؕ وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۚ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۵۷﴾

”پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو جو مجھے دے کر بھیجا گیا تھا وہ تمہیں پہنچا دیا، اور میرا رب تمہاری جگہ اور قوم پیدا کر دے گا اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے، بے شک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے“۔

اپنی قوم کو ھودؑ کا جواب

جب حضرت ھودؑ اپنی قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہوئے تو ان سے کہا: اگر تم خدا پر ایمان نہیں لاتے ہو اور میری دعوت کو ٹھکراتے ہو تو اس سے نہ تو مجھے کوئی نقصان پہنچتا ہے اور نہ ہی میرے پروردگار کو۔ میرے ذمے جو الٰہی فریضہ تھا اسے میں

نے انجام دیا ہے اور اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے۔ لہٰذا تم پر حجت تمام ہوئی ہے اور تم پر عذاب کا آنا حتمی ہوگیا ہے۔ اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا جو حق کی دعوت کو قبول کرے گی اور ایمان لے آئے گی۔ تمہارے ایمان نہ لانے سے اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک لمحہ میں نابود کرسکتا ہے اور دوسری قوم کو خلق کرسکتا ہے جو تمہاری طرح نہیں ہونگے۔ اللہ ہر عمل پر قادر ہے۔ کوئی چیز اللہ کے علم کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔ اللہ کا سب پر تسلط ہے، اللہ سب پر نگہبان اور ناظر ہے۔ پس تم کس طرح ایسی قدرت کے مالک اللہ کو نقصان پہنچا سکتے ہو؟!

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

"اور جب ہمارا حکم پہنچا تو ہم نے ہود کو اور انہیں جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا، اور ہم نے انہیں سخت عذاب سے نجات دے دی"۔

ھودؑ پر ایمان لانے والوں کی نجات

یہاں پر نزول امر سے عذاب کا آنا مراد ہے۔ جب امر الٰہی صادر ہوتا ہے تو اللہ کا آخری فیصلہ آجاتا ہے اور اس کے بعد رسول اور اس کی قوم کے درمیان جدائی ڈال دی جاتی ہے۔

جیسا کہ سورۂ مومن آیت نمبر 78 میں ارشاد ہوا ہے:

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾

ترجمہ: "جب اللہ کا امر آجاتا ہے تو رسول اور اس کی قوم کے درمیان حق کا فیصلہ کیا

جاتا ہے اور اس وقت اہل باطل خسارے میں ہوں گے"۔

جب عذاب آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت کے صدقے حضرت ھودؑ اور ان پر ایمان لانے والوں کو سخت عذاب سے نجات دے دی اور اس طرح اپنے بندوں کی مدد کی اور کفار کو اس سخت عذاب میں مبتلا کر دیا۔

وَ تِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۵۹﴾

"اور یہ عاد تھے، اپنے رب کی باتوں سے منکر ہوئے اور اس کے رسولوں کو نہ مانا اور ہر ایک جبار سرکش کا حکم مانتے تھے"۔

قوم عاد کا واقعہ

اس آیت میں قوم عاد کے ماجرا کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت ھودؑ کی حکیمانہ باتوں، ان کے معجزات اور ہدایت کی جانب راہنمائی کرنے والی نصیحتوں کو ٹھکرایا اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسولوں جیسے حضرت ھودؑ اور ان سے پہلے جو رسول آئے تھے ان سب کی نافرمانی کی۔ کیونکہ ایک پیغمبر کی نافرمانی سابقہ سب پیغمبروں کی نافرمانی شمار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے پیغمبر ایک ہی ہدف کے لیے آئے ہیں اور ان سب کا دین ایک ہے۔ لہٰذا ایک پیغمبر کا انکار سب کے انکار کے مترادف ہے۔

سورہ شعرا آیت نمبر 23-24 میں آیا ہے:

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۲۳﴾ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ۚ

"قوم عاد نے رسولوں کو جھٹلایا جب ان کے بھائی ھود نے ان سے کہا کہ تم اللہ کی پروا کیوں نہیں کرتے ہو؟"

اس بناء پر قوم عاد، اللہ تعالیٰ اور اس کے نمائندوں کی بات نہیں سنتے تھے اور جابروں اور سرکشوں کی بات پر کان دھرتے تھے اور ان کی پیروی کرتے تھے۔" جبار" اسے کہتے ہیں جو زبردستی اپنے فیصلے دوسروں پر مسلط کرے اور زبردستی دوسروں سے کام لے لے۔"عنید" سخت دشمنی کرنے والے اور حق کو قبول نہ کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا قوم عاد میں تین ناپسندیدہ عادتیں تھیں: 1۔آیات الٰہی کا انکار 2۔انبیاء الٰہی کا انکار 3۔ جابروں، ستمگاروں اور ظالموں کی پیروی۔

وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿٦٠﴾

"اور اس دنیا میں بھی اپنے پیچھے لعنت چھوڑ گئے اور قیامت کے دن بھی، خبردار !بے شک عاد نے اپنے رب کا انکار کیا تھا، خبردار !عاد جو ہود کی قوم تھی اللہ کی رحمت سے دور کی گئی"۔

رحمت حق سے دُوری کا سبب

قوم عاد پر ان ناپسندیدہ عادتوں کی وجہ سے دنیا میں لعنت اور پھٹکار ہوئی یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوئے اور قیامت میں بھی ان کے لیے لعنت ہے۔اس لعنت کا ایک مصداق وہی عذاب تھا جو انہیں ملا اور یہ ان کے گناہوں اور برے اعمال کا نتیجہ تھا۔ قیامت تک ان کو ان اعمال کی سزا بھگتنا پڑے گا کیونکہ قیامت تک جو بھی مشرک پیدا ہوگا اس کے گناہ ان کے حساب میں جائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے کفر اور شرک کی سنت کو رواج دینے میں پہل کی ہے۔ قرآن فرماتا ہے جس نے جو روش اپنائی اسے اس کی سزا یا جزا ملے گی۔

سورۂ یٰسٓ آیت 12 میں آیا ہے:

وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ؕ

ترجمہ: "جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے اور ان کے آثار کو ہم لکھ دیں گے"۔

قیامت کا عذاب جاودانی ہے اور یہ عذاب برحق ہے جو ان کو ملے گا۔ ان کے اس عذاب کا سبب ان کا کفر اور آیات الٰہی کا انکار ہے اور اسی وجہ سے وہ رحمت حق سے دور ہوں گے۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾

"اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا، کہا اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اسی نے تمہیں زمین سے بنایا اور تمہیں اس میں آباد کیا پس اس سے معافی مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو، بے شک میرا رب نزدیک ہے قبول کرنے والا"۔

قوم صالحؑ کا قصہ

حضرت ھودؑ کی قوم کے تذکرے کے بعد حضرت صالح کی قوم کا ذکر ہوا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کو بھی قوم ثمود کا بھائی کہا گیا ہے۔ کیونکہ حضرت صالح، قوم ثمود کے قبیلہ سے تھے اور وہ آپس میں رشتہ دار تھے۔ حضرت صالح نے بھی اپنی قوم کو شوق دلانے کے لیے انہیں میری قوم کہہ کر پکارا ہے اور انہیں خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی ہے اور کہا ہے کہ عبادت فقط اللہ کی کی جانی چاہیے، اللہ کے سوا

کوئی معبود نہیں ہے۔ اللہ ہی نے تمہیں زمینی مواد سے خلق کیا ہے اور تمہاری ہدایت کے اسباب فراہم کئے ہیں اور تمہیں مکمل بنایا ہے تاکہ تم زمین میں رہ کر اس سے استفادہ کرو اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرور ہو جاؤ۔ تم نہ تو پیدا ہونے کے لیے اور نہ ہی باقی رہنے کے لیے بتوں کے محتاج ہو بلکہ تم سب اللہ کے محتاج ہو۔ لہٰذا بتوں کی پوجا کرنے پر اللہ سے اس گناہ کی معافی مانگو کہ وہ آپ کے اس گناہ پر پردہ ڈال دے اور اس کے حضور توبہ کرو اور اللہ کی عبادت میں مصروف ہو جاؤ اور اللہ پر ایمان لے آؤ۔ میرا پروردگار تمہارے بتوں کے برعکس کہ جن میں کوئی ادراک اور شعور نہیں ہے اور ان کی عبادت کرنا اور اس کے سامنے قربانی پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، میرا رب کریم ہے، وہ سارے ظاہری اسباب سے انسان کے زیادہ قریب ہے۔ میرے رب کو بتوں کی سفارش پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میرے رب کے درمیان کوئی واسطہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا رب مجیب ہے تمہاری بات کو سنتا ہے اور تمہاری ساری درخواستوں کا جواب بھی دیتا ہے۔ اس بناء پر جب اللہ تعالیٰ تمہارے قریب ہے اور تمہاری باتوں کو سنتا ہے اور تمہاری ساری مشکلات کو حل کرتا ہے تو لازم ہے کہ تم اپنے گناہوں کی معافی اسی سے مانگو اور اسی کی طرف پلٹ آؤ۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾

"انہوں نے کہا اے صالح! اس سے پہلے تو ہمیں تجھ سے بڑی امید تھی، تم ہمیں ان معبودوں کے پوجنے سے منع کرتے ہو جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں اور جس طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس سے تو ہم بڑے شک میں ہیں"۔

قوم صالحؑ کا بیان

قوم صالح یہ بتانا چاہتی تھی کہ ہم اس سے پہلے تمہارے بارے امید رکھتے تھے کہ تم اچھے آدمی ہو اور تم سے یہ توقع نہیں تھی کہ تم اس طرح کی بات کرو گے۔ ہم تم سے خیراور مفید بات کی توقع رکھتے تھے کیونکہ ہماری نظر میں تم ایک عقل مند انسان تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ تم کمال اور ہدایت پر ہو لیکن آج تم نے ایک نئی بدعت ڈال دی ہے اس لیے ہم تم سے مایوس ہوگئے ہو۔ پھر حضرت کی مذمت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ہم کس طرح اپنے آباء واجداد کی پرستش کرنے کی روش کو چھوڑ دیں؟ کیونکہ یہ ہمارے آباء واجداد کا طریقہ اور ایک مقدس روایت ہے جسے ہم ترک نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ تم ہمیں جس روش اور طریقے کی دعوت دے رہے ہو اس کے بارے میں ہمیں یقین نہیں ہے، ہمیں اس بارے شک وتردید ہے۔ لہٰذا ہم کس طرح بغیر یقین کے تمہاری بات کو مان سکتے ہیں۔ تم تو اپنی بات پر کوئی دلیل لے کر نہیں آئے ہو لہٰذا ہمیں تمہاری بات کے سچ ہونے پر شک ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

"صالح نے کہا اے میری قوم! بھلا دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے کوئی کھلی دلیل رکھتا ہوں اور اس کی طرف سے میرے پاس رحمت بھی آ چکی ہو پھر اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو مجھے اس سے کون بچا سکتا ہے، پھر تم مجھے نقصان کے سوا اور کیا دے سکو گے"۔

اللہ کی نافرمانی واضح خسارہ

"بَيِّنَةٍ" سے آشکار اور روشن دلیل اور معجزہ مراد ہے۔ "رَحْمَةً" سے نبوت مراد ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: مجھے بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے ذریعے میری تائید کی ہو جو میرے نبوت کے دعویٰ کی تصدیق کر رہا ہو اور اللہ تعالیٰ نے مجھے رسالت کی عظیم نعمت عطا کی ہو اور مجھے اپنا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری دی ہو اور میں تمہاری خواہشوں کی اطاعت کروں تو میں معصیت کاروں میں سے ہو جاؤں گا اور اس صورت میں مجھے کون اللہ کے عذاب سے نجات دلائے گا۔ اس طرح حضرت صالح نے اپنی قوم کے دونوں اعتراضات کا جواب دے دیا۔ اور اپنی رسالت اور دعوت کی توجیہ کی۔

اس کے بعد فرمایا: اگر تم ان ساری باتوں کے باوجود مجھے اپنی دعوت کے ترک کرنے اور تمہارے مسلک اور روش کی جانب پلٹنے پر اصرار کروگے اور میں تمہارے مسلک کی جانب پلٹ جاؤں گا تو میں خسارہ کرنے والوں اور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گا۔ کیونکہ حق کی مخالفت واضح اور آشکار خسارہ اور نقصان ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ان باتوں سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے سوائے اس کے میں تمہیں اہل خسارہ جان لوں۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾

"اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے سو اسے چھوڑ دو اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اسے برائی سے چھونا بھی نہیں کہ پھر تمہیں عذاب بہت جلد آ پکڑے گا"۔

ناقۂ صالح اللہ کی نشانی

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! یہ وہی اونٹنی ہے جو تمہاری درخواست پر اللہ تعالیٰ کے اذن سے پہاڑ سے نکلی ہے۔ اسے آزاد چھوڑو اور اس کے لیے کسی قسم کی رکاوٹ نہ بنتا تاکہ یہ آزادی کے ساتھ زمیں پر چر سکے۔ اس کو اذیت اور تکلیف نہ دو۔ (یعنی اس کو زخمی کرنے اسے مارنے اور قتل کرنے سے پرہیز کرو)۔ کیونکہ اگر تم ایسا کروگے تو تم اپنے اس عمل کی وجہ سے بہت جلد عذاب کے شکار ہو جاؤ گے، جس سے بچنے کی تمہیں مہلت بھی نہیں دی جائے گی۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾

"پھر انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے تب صالح نے کہا تین دن تک اپنے گھروں میں رہ کر فائدہ اٹھا لو، یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا"۔

ناقۂ صالح کو نحر کرنے پر حتمی عذاب

"عقر" اونٹ ذبح کرنے کے طریقے کو کہا جاتا ہے۔ "دار" گھر کے معنی میں ہے لیکن یہاں پر اس سے شہر مراد ہے۔ جب قوم صالح نے ناقہ صالح کو نحر کر دیا تو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکو گے۔ وہ ان تین دنوں میں دنیاوی نعمتوں سے بہرور ہو سکتے ہیں لیکن اس کے بعد وہ حتمی اور یقینی عذاب میں مبتلا ہوں گے جس سے انہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَمِنۡ خِزۡىِ يَوۡمِئِذٍ‌ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡقَوِىُّ الۡعَزِيۡزُ ۞٦٦

''پھر جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے صالح کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے نجات دے دی، بے شک تیرا رب وہی زور والا زبردست ہے''۔

صالحؑ اور مومنین کی عذاب سے نجات

''خِزۡىِ'' ایسے عیب کو کہتے ہیں جس کی رسوائی برملا اور آشکار ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنے رسول سے فرما رہا ہے کہ جب قوم صالح کے اوپر عذاب کے متعلق ہمارے وعدے کا وقت آگیا تو ہم نے صالح پیغمبر اور ان مومنین کو اس دن کے رسوا کرنے والے عذاب سے نجات دی جو ان پر ایمان لائے تھے اور خدائے واحد پر عقیدہ رکھتے تھے۔ ہم نے انہیں قوم صالح کے ستمگاروں سے نجات دی۔ ہمارا یہ امر اس خاص رحمت کی بنا پر تھا جسے ہم نے اپنے مومن بندوں سے مخصوص کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد اس عذاب کی وجہ بتاتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا پروردگار ایسا مقتدر اور شکست ناپذیر ہے جو ہر وہ کام انجام دے سکتا ہے جس کا ارادہ کرے، اور اس قوم پر اپنا عذاب نازل کر سکتا ہے اور مومنین کو اس عذاب سے نجات بھی دے سکتا ہے۔

وَاَخَذَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دِيَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ۞٦٧

''اور ان ظالموں کو ہولناک آواز نے پکڑ لیا پھر صبح کو اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے ہوئے رہ گئے''۔

ستمگروں کا عذاب میں مبتلا ہونا

"جَاثِمِ" اس شخص کو کہتے ہیں جو منہ کے بل زمین پر گر پڑے۔ اس آیت میں قوم صالح پر آنے والے عذاب کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ بظاہر وہ سب آسمانی زوردار آواز کے نتیجے میں ہلاک ہوئے اور سب منہ کے بل زمین پر گر پڑے اور اپنے پلید اور برے اعمال کے انجام تک پہنچ گئے۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾

"گویا کہ کبھی وہاں رہے ہی نہ تھے، خبردار! ثمود نے اپنے رب کا انکار کیا تھا، خبردار! ثمود پر پھٹکار ہے"۔

قوم ثمود کا انجام

اس آیت میں قوم ثمود کے انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ آیت کے پہلے جملے میں قوم صالح کا ماجرا بیان کیا گیا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام انہیں دعوت دیتے رہے، ناقۂ صالحؑ کو معجزہ کے طور پر لے آئے لیکن انہوں نے دعوت صالحؑ کو قبول کرنے کے بجائے اونٹنی کو بھی قتل کر دیا۔ دوسرے جملے میں ان پر آنے والے عذاب کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ قوم ثمود ایک زوردار آسمانی آواز کے نتیجے میں ہلاک ہوئے اور ان کی بے جان لاشیں اس طرح زمین پر گری کہ گویا وہاں پر کوئی رہتا ہی نہیں تھا۔ یہ حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کے انکار اور ان کے کفر کا نتیجہ تھا، اور وہ اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے اور ہمیشہ کے لیے رحمت الٰہی سے دھتکارے گئے۔ جو بھی ایسا کرے گا، اس کا انجام بھی اسی طرح ہو گا۔ جس طرح عاد نے حضرت ہودؑ کا انکار کیا تو ان کے ساتھ یہی ہوا، ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کا انکار کیا اور اللہ کی نافرمانی کی تو

ان کا بھی یہی حال ہوا۔ ظالموں اور ستمگاروں کے متعلق سنت الٰہی یہی ہے۔ اس سے مشرکین مکہ کو یہ پیغام دیا گیا ہے اگر تم میرے حبیب ﷺ کی دعوت کا انکار کر رہے ہو اور ان کی لائی ہوئی کھلی نشانیوں اور ان کی دعوت پر ایمان نہیں لا رہے ہو اور بت پرستی نہیں چھوڑ رہے ہو تو تمہیں بھی اسی طرح کے انجام کا سامنا کرنا پڑے گا۔

وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾

"اور ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے، انہوں نے کہا سلام، اس نے کہا سلام، پس دیر نہ کی کہ ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آیا"۔

ابراہیمؑ کو فرشتوں کی بشارت

فرشتے حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت اور قوم لوط پر عذاب کی خبر لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ہم نے اپنے نمائندے ابراہیمؑ کے پاس بھیجے۔ ابراہیم اور ان کی بیوی بوڑھے ہو چکے تھے اور ان کی زوجہ بانجھ بھی تھی۔ فرشتوں نے ان کے پاس آکر انہیں حضرت اسحاق کی ولادت کی بشارت دی اور جناب لوط کے پاس جا کر انہیں ان کی قوم کے ہلاک ہونے کی خبر دی۔ تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان فرشتوں کی تعداد دو سے زیادہ تھی۔ اہل بیت علیہم السلام کی روایات کے مطابق ان کی تعداد چار تھی۔ انہوں نے ابراہیمؑ پر سلام کیا اور آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کے جواب میں "سَلٰمٌ" کہا کیونکہ یہ "سَلٰمًا" کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا سلام

فرشتوں کے سلام کرنے سے بہتر تھا اور فرض بھی یہی بنتا ہے کہ جب کوئی سلام کرے تو اس کا جواب اس کے سلام سے بہتر دیا جائے۔ اس لیے جب کوئی السلام علیکم کہے تو اس کے جواب میں کہا جائے وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ برکاتہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خیال کیا کہ ان کے پاس آنے والے مہمان ہیں، لہٰذا ان کی پذیرائی میں دیر نہ کی اور ان کے لیے بھنا ہوا بچھڑا پکا کر لے آئے جس سے پانی اور تیل ٹپک رہا تھا۔

اللہ اگر چاہے تو اپنے پیغمبر سے کسی چیز کو پوشیدہ رکھ سکتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اللہ کے پیغمبر اور رسول تھے لیکن اللہ نے اس چیز کو ان سے پوشیدہ رکھا اور وہ فرشتوں کو انسان سمجھ بیٹھے اور ان کے لیے فوراً کھانے کا انتظام کیا اور بھنا ہوا گوشت ان کے سامنے آکر رکھا کہ وہ اسے کھائیں۔

فَلَمَّا رَآ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾

"پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس تک نہیں پہنچتے تو انہیں اجنبی سمجھا اور ان سے ڈرا، انہوں نے کہا خوف نہ کرو ہم تو لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں"۔

فرشتوں کے کھانا نہ کھانے پر ابراہیمؑ کا ردعمل

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ مہمان کھانا نہیں کھا رہے تو آپ کو تکلیف ہوئی اور آپ نے ان کے اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور اس کو دشمنی کی علامت سمجھا۔ کیونکہ میزبان کے گھر آکر کھانا نہ کھانا باطنی دشمنی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے آپ نے دل میں خوف اور خطرہ محسوس کیا کہ یہ کون ہیں جو اس

طرح ادب کے خلاف کھانا نہیں کھا رہے ہیں۔ اس پر فرشتوں نے کہا کہ آپ نہ ڈریں ہم قوم لوط کو عذاب دینے کے لیے اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ "خِيْفَةً" خوف کا احساس اور ناپسندیدہ اور مکروہ امر کو دیکھ کر نفس کا متاثر ہونا جس کے نتیجے میں انسان اپنے آپ کو اس سے بچانے اور دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح کا خوف ناپسندیدہ اور پست صفت شمار نہیں ہوتا ہے۔ اس حوالے سے جو چیز ناپسندیدہ اور مکروہ ہے وہ ایسا تاثر ہے جس کے سبب انسان مقابلہ کرنے سے عاجزی کا اظہار کرے جسے جُبن اور بزدلی کہا جاتا ہے۔ بہرحال جب ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان ہوا کہ آپ کے پاس آنے والے اللہ کے فرشتے ہیں اور انہیں مادی چیزوں جیسے کھانا، پینا اور دوسری مادی چیزوں کی ضرورت نہیں ہے تو آپ کو سکون ہوا اور آپ کی پریشانی ختم ہوئی۔

وَ امْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾

"اور اس کی عورت (قریب) کھڑی تھی (ان کی بات سن کر) تب وہ ہنس پڑی پھر ہم نے اسے اسحاق کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی، اور اسحاق کے بعد یعقوب کی"۔

فرشتوں کی بشارت پر سارہ کا ردعمل

لفظ "ضَحِكَتْ" اگر "ضَحك" کے ریشہ اور اصل سے ہو تو یہ حیض کے معنی میں ہے۔[1] اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جناب سارہ میں اولاد ہونے کی نشانی

---

[1]۔ اس مطلب کی تائید میں امام صادق علیہ السلام سے معانی الاخبار صفحہ 224 میں ایک روایت نقل ہوئی ہے۔

ظاہر ہو گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی بوڑھاپے کے عالم میں تھی اور اسے اولاد کی امید نہ تھی۔ وہ وہاں کھڑی ہوئی اپنے شوہر اور مہمانوں کی باتیں سن رہی تھی کہ اچانک اس نے خون حیض کی نشانی مشاہدہ کی اور اسے اسحاقؑ اور اسحاقؑ کے بعد یعقوبؑ کی ولادت کی بشارت دی گئی۔ چونکہ انہوں نے اس سے پہلے اولاد ہونے کی نشانی یعنی حیض کا مشاہدہ کیا تھا اس لیے انہیں فرشتوں کی بشارت پر یقین ہو گیا۔

بعض مفسرین نے "ضَحِكَتْ" کو "ضِحك" کے ریشہ اور اصل سے قرار دیا ہے جس کا معنی ہنسنا ہوتا ہے۔ اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی فرشتوں کی بشارت سن کر مسکرائی۔ یا یہ سن کر کہ ان کے پاس آئے ہوئے مہمان دشمن نہیں بلکہ فرشتے ہیں، خوش ہوئی اور مسکرانے لگی۔ اس صورت میں افعال میں تقدم و تاخر لازم آئے گا۔

بہر حال فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحاقؑ بیٹے کی خوشخبری دی اور ساتھ یہ خوشخبری بھی دی کہ اسحاق کی نسل سے یعقوبؑ پیدا ہو گا۔ تورات میں آیا ہے کہ حضرت اسحاقؑ نے چالیس سال کی عمر میں رفقہ نامی عورت سے شادی کی جس سے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے ان میں سے ایک کا نام عیسو تھا۔ اور دوسرے بیٹے کا نام اس لیے یعقوب رکھا گیا کیونکہ اس نے عیسو کے پاؤں کی ایڑی کو پکڑا ہوا تھا۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾

"وہ بولی ہائے یہ کیسی خبر ہے تو کیا میں جبکہ بوڑھی ہو چکی ہوں، اس حالت میں بچہ جنوں گی جبکہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے، یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے"۔

ابراہیمؑ کی بیوی کا تعجب

"وَيْل" ایسی برائی اور قباحت کو کہتے ہیں جو حسرت اور غم اندوہ کا سبب بنے۔ فارسی میں کہا جاتا ہے، وائے ہو مجھ پر، میرے سر پر خاک ہو یہ کیسی عجیب بات یا مصیبت آ گئی! جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی نے بشارت سنی تو کیونکہ وہ بہت بوڑھی ہو چکی تھی اور ان کے شوہر حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے بڑے تعجب کے ساتھ کہنے لگی کی ایک بڑھیا اور بانجھ عورت ایک بوڑھے مرد سے بچہ پیدا کرے گی تو لوگ ان کا مذاق اڑائیں گے اور ان پر ہنسیں گے اور یہ امر ان کے لیے ننگ وعار اور رسوائی کا سبب بنے گا، اس لیے انہوں نے "يٰوَيْلَتٰٓى" کہا ہے۔

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝۷۳

"انہوں نے کہا کیا تم اللہ کے فیصلہ پر تعجب کر رہی ہو، اور آپ اہل البیت (نبوت کے گھر والوں) پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکات ہوں، بے شک وتعریف کیا ہوا بزرگ وعظمت والا ہے"۔

ابراہیمؑ کی بیوی کو فرشتوں کا جواب

"مَّجِيْدٌ" کریم، بزرگوار اور عظمت والے کو کہتے ہیں۔ فرشتے استفہام انکاری کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کے تعجب اور حیرانگی کا انکار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ وہ خدا جو قادر مطلق ہے اور ہر کام کرسکتا ہے تو اس کے کسی کام کے متعلق تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا تمہیں بڑھاپے کی حالت میں بچہ دار ہونا اور اولاد پیدا کرنے کے بارے

میں بھی تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

اس کے علاوہ اس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے خاندان ابراہیم کو بہت بڑی برکتیں اور نعمتیں عطا کی ہیں۔ لہٰذا تعجب اور حیرانگی کی کوئی بات نہیں۔ اس بناء پر پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ کے کسی کام پر تعجب نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر کام پر قادر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہمیشہ اس خاندان پر نازل ہوتی رہی ہیں اور یہ گھرانہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں غرق رہا ہے لہٰذا بوڑھے اور بانجھ ماں باپ سے بیٹے کی پیدائش پر بھی تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ حمید و مجید ہے اس کا ہر عمل پسندیدہ ہے اور اس کے سارے اعمال کا منشاء اس کا جود و کرم ہے وہ بزرگ اور عظمت والا ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازتا ہے۔[1]

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَٰهِيمَ ٱلرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ ٱلْبُشْرَىٰ يُجَٰدِلُنَا فِى قَوْمِ لُوطٍ ﴿٧٤﴾

"پھر جب ابراہیم سے ڈر جاتا رہا اور اس کے لئے خوشی کی خبر آگئی تو ابراہیم ہم سے قوم لوط کے حق میں بحث کرنے لگے"۔

فرشتوں کے ساتھ ابراہیمؑ کی گفتگو

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ ان کے پاس آنے والے مہمان

---

[1] ابن کثیر نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا اس طرح درود پڑھا کرو: اے پروردگار! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آل محمد پر درود بھیج جس طرح آپ نے ابراہیمؑ اور ان کی آل پر درود بھیجا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آل محمدؐ پر برکت نازل کر جس طرح ابراہیم اور ان کی آل پر برکت نازل کی ہے۔ تو حمید و مجید ہے۔

فرشتے ہیں اور ان کا کھانا نہ کھانا بے ادبی نہیں اور فرشتوں نے اس کے ساتھ ساتھ انہیں بیٹے کی بشارت بھی دے دی تھی تو اس وقت انہوں نے قوم لوط کے بارے میں فرشتوں سے گفتگو شروع کردی اور کوشش کی کہ قوم لوط سے عذاب ٹل جائے۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ ﴿٧٥﴾

"بے شک ابراہیم بردبار نرم دل اور اللہ کی طرف بہت زیادہ رجوع کرنے والا تھا"۔

ابراہیمؑ کے اوصاف

اس آیت میں حضرت ابراہیم کی تین صفات بیان ہوئی ہیں:

1. ان کی پہلی صفت یہ تھی کہ وہ حلیم تھے یعنی دشمن سے انتقام لینے میں جلدی نہیں کرتے تھے۔
2. ان کی دوسری صفت یہ تھی کہ وہ اواہ تھے، بہت زیادہ آہ وزاری کرتے تھے۔
3. تیسری صفت یہ تھی کہ وہ منیب تھے، (اللہ کی طرف) بہت زیادہ رجوع کرنے والا۔

درحقیقت اس آیت میں فرشتوں کے ساتھ حضرت ابراہیم کی گفتگو کی وجہ بتائی جارہی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ چونکہ بہت زیادہ حلیم، بڑے حوصلے والے اور بردبار تھے اور دشمن کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتے تھے اس لیے انہوں نے فرشتوں کے ساتھ قوم لوط سے عذاب کے ٹالنے کے متعلق گفتگو کی۔ کیونکہ انہیں امید تھی کہ اللہ تعالیٰ قوم لوط پر مہربانی کرے گا اور ان کی اصلاح کرے گا۔ ان کی بات دل سوزی کی وجہ سے تھی

اور لوگوں کی گمراہی کی وجہ سے ان پر جو عذاب آنے والا تھا آپ کو تکلیف ہو رہی تھی اس لیے ان کو بچانے کے لیے اللہ کی طرف بہت زیادہ رجوع کرتے اور بہت زیادہ گریہ و زاری کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ ستمگاروں کے حامی تھے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ آپ نہایت بردبار اور دل سوز تھے اس لئے قوم کی بخشش کی امید لیے اللہ کی جانب رجوع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان سے اس عذاب کو ٹال دے۔

يٰٓاِبۡرٰهِيۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمۡ اٰتِيۡهِمۡ عَذَابٌ غَيۡرُ مَرۡدُوۡدٍ ﴿۷۶﴾

”اے ابراہیم! یہ خیال چھوڑ دے، کیونکہ تیرے رب کا حکم آ چکا ہے، اور بے شک ان پر عذاب آ کر ہی رہے گا جو ٹلنے والا نہیں“۔

ابراہیمؑ کو فرشتوں کا جواب

فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ ابھی آپ اس مسئلے پر بحث نہ کریں، کیونکہ اللہ کی طرف سے قوم لوط پر عذاب کا فیصلہ حتمی ہے اور اس فیصلے نے واپس نہیں ہونا ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پتہ چلا کہ اب عذاب الٰہی نہیں ٹلے گا اور بات اس مرحلے سے گزر چکی ہے تو آپ نے اپنی بات ختم کر دی۔ کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ جب عذاب الٰہی کا حتمی فیصلہ آ جاتا ہے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا اور للہ کے اس فیصلے کو کوئی مؤخر بھی نہیں کر سکتا۔

وَ لَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَ ضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّ قَالَ هٰذَا يَوۡمٌ عَصِيۡبٌ ﴿۷۷﴾

"اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس پہنچے تو وہ ان کے کے پاس آنے سے غمگین ہوئے اور دل تنگ ہوئے اور کہا آج کا دن (میرے لیے) بڑا ہی سخت ہے"۔

فرشتوں کی آمد پر لوط کی پریشانی

"ساء ہ الامر" فرشتوں کی بات نے انہیں پریشان کیا۔ "ضاق بالامر ذرعا" اس کے لیے سارے راستے بند ہو گئے اور ان کے لیے کوئی چارہ نہ رہا۔ "عصیب" ایسا سخت مشکل مسئلہ جو حل نہ ہو سکے۔

جب اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے لوط کے پاس آئے تو حضرت لوط بہت غمگین اور پریشان ہوئے کیونکہ آنے والے بہت ہی خوبصورت تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ان کی بد کار قوم ان پر چڑھائی کردے گی اور ان کے ساتھ بد فعلی کے لیے آمادہ ہوجائے گی۔ حضرت لوط اپنے آپ کو اپنی قوم کے سامنے کمزور سمجھ رہے تھے اس لیے وہ بہت پریشان تھے اور اپنے آپ سے کہہ رہے تھے کہ میں انہیں اس قوم کے شر سے کیسے بچاؤں۔ اسی وجہ سے حضرت لوط بہت زیادہ غمزدہ ہوئے اور کہنے لگے کہ آج کا دن میرے لیے بہت ہی سخت ہے جس کے لیے میرے پاس کوئی راہ حل اور چارہ کار نہیں ہے۔

وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ﴿۷۸﴾

"اور اس کے پاس اس کی قوم بے اختیار دوڑتی آئی، اور یہ لوگ پہلے ہی

سے برے کام کیا کرتے تھے، کہا اے میری قوم ! یہ میری بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے سامنے مجھے ذلیل نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی موجود نہیں"۔

لوطؑ کے پاس قوم کے بدکاروں کی آمد

قوم لوط کے بد کردار لوگ تیزی کے ساتھ فحشاء اور برے عمل یعنی لواطت کے قصد سے حضرت لوط کے گھر کی طرف آنا شروع ہوئے۔ حضرت لوطؑ نے ان کو نصیحت کی اور انہیں اس برے کام سے منع کیا۔ اور انہیں اس برے عمل سے روکنے کے لیے یہاں تک کہہ دیا کہ اس برے کام سے ہاتھ اٹھا لو اور اس کے بدلے میری بیٹوں سے شادی کر لو، وہ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ نیک بھی ہیں۔ اللہ سے ڈرو اور برے کام سے باز آجاؤ اور مجھے میرے مہمانوں کے سامنے رسوا نہ کرو۔ پھر ان کی غیرت کو جگانے کے لیے کہا کہ کیا تم میں کوئی عقل مند اور سمجھدار موجود نہیں جو میری مدد کرے اور میرے مہمانوں کو ان کے شر سے بچائے؟ وہ اس قدر انحراف اور فحاشی میں غرق تھے کہ اپنے زمانے کے پیغمبر کی بات کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾

"انہوں نے کہا البتہ تحقیق تو جانتا ہے کہ ہمیں تیری بیٹیوں سے کوئی غرض نہیں، اور تجھے معلوم ہے جو ہم چاہتے ہیں"۔

لوطؑ کی پیشکش کا جواب

بعض مفسرین نے کہا کہ اس آیت میں " حق " سے "حاجت " مراد ہے کہ ہمیں اپنی شہوت مٹانے کے لیے عورتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بظاہر چونکہ یہاں

پر فعل ماضی استعمال ہوا ہے اس لیے اس سے مراد ان کی قومی روایت کو یاد دلانا ہو سکتا ہے۔ وہ لوط سے کہنا چاہتے تھے کہ تمہیں ہمارے قومی آداب و رسوم کے متعلق معلوم ہے جس کے مطابق ہمیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ ہم عورتوں سے اپنی شہوت مٹائیں۔ ہم صرف مردوں سے اپنی شہوت پوری کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب ایک عمل کسی معاشرے کے لوگوں میں طریقہ، روش اور سنت بن جاتا ہے تو اس عمل کا انجام دینا محقق اور ثابت ہو جاتا ہے اور اس کو چھوڑنا جائز نہیں ہوتا۔ لہٰذا اے لوط! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری اس چڑھائی کا مقصد کیا ہے! اور ہم تم سے کیا چاہتے ہیں۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾

''کہا کاش! کہ میرے پاس تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کی پناہ جا لیتا''۔

لوطؑ کا اپنی بے کسی کا اعلان

جب حضرت لوطؑ کی نصیحتوں کا ان کی قوم پر کوئی اثر نہیں ہوا اور انہیں کوئی ایسا بندہ بھی نہیں ملا جو ان کی مدد کرتا تو آپ نے غم و اندوہ کی حالت میں کہا کہ اے کاش! کوئی میرا یاور و مددگار ہوتا اور مجھے ان ظالموں کے شر سے بچاتا اور میرے مہمانوں کو ان ظالموں کے شر سے دور رکھتا یا میرا کوئی قوم، قبیلہ ہوتا جو میرا سہارا بنتے اور میں اپنے آپ کو ان ظالموں کے شر سے بچا لیتا۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾

"فرشتوں نے کہا اے لوط ! بے شک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں یہ تم تک ہرگز نہ پہنچ سکیں گے، سو کچھ حصہ رات رہے اپنے لوگوں کو لے کر نکل اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے مگر تیری عورت (کے علاوہ)، کہ اس پر بھی وہی بلا آنے والی ہے جو ان پر آئے گی، ان کے وعدہ کا وقت صبح ہے، کیا صبح کا وقت نزدیک نہیں ہے"۔

فرشتوں کا اعلان

فرشتوں نے حضرت لوطؑ کی پریشانی دیکھ کر ان سے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم تیرے رب کے نمائندے اور فرشتے ہیں اور اس قوم پر عذاب اتارنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتے۔ تمہارا سہارا اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔جب تمہارا یقین اللہ پر ہے تو اللہ اپنے اولیاء کو تنہانہیں چھوڑتا، خدا تیرا حامی و ناصر ہے۔ سورۂ قمر آیت نمبر 37 میں اس ماجرا کے متعلق آیا ہے:

وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ۔۔۔

"انہوں نے بری نیت سے لوط کے مہمانوں پر حملہ کیا تو ہم نے انہیں نابینا کر دیا"۔

فرشتوں نے حضرت لوط سے کہا کہ اپنے گھر والوں کو رات کے وقت شہر سے باہر لے جاؤ اور کہا کہ یاد رکھنا باہر جاتے ہوئے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ بعد

والا جملہ "اهلك" سے استثنیٰ ہے نہ کہ "احد" سے۔ اپنے سارے گھر والوں کو لے جاؤ سوائے تمہاری بیوی کے کہ وہ بھی اسی عذاب میں مبتلا ہو گی۔ کیونکہ حضرت لوطؑ کی بیوی مومنہ نہیں تھی اور وہ قوم لوط کے گندے کام کو پسند کرتی تھی۔ خدا نے ارادہ کیا کہ وہ بھی ہلاک ہونے والوں میں سے ہو۔ اس کے بارے میں سورۂ حجر کی آیت نمبر 60 میں آیا ہے:

اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۶۰

اس کے بعد فرمایا کہ ان پر آنے والے عذاب کا وقت صبح ہے اور کیا صبح بہت قریب نہیں ہے؟

فرشتوں نے اس لیے حضرت لوطؑ کو جلدی سے اپنے گھر والوں کو شہر سے باہر لے جانے کا کہا تھا کیونکہ عذاب کے آنے کا وقت صبح تھی اور صبح کا وقت قریب تھا یا اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت لوطؑ نے فرشتوں سے قوم لوط پر جلد عذاب اتارنے کی درخواست کی تھی جس کے جواب میں فرشتوں نے کہا کہ صبح ہونے میں زیادہ دیر باقی نہیں ہے۔ اس طرح طلوع فجر کے وقت عذاب نے ان کو گھیرے میں لے لیا، جس کے متعلق سورۂ حجر کی آیت نمبر 73 میں آیا ہے:

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ۝۷۳

ترجمہ: "صبح کے وقت زور دار آسمانی آواز نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا اور انہیں ہلاک کر دیا"۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۝۸۲

"پھر جب ہمارا حکم آن پہنچا تو ہم نے وہ بستیاں الٹ دیں اور اس زمین پر

کھنگر کے پتھر برسانا شروع کیے جو لگاتار گر رہے تھے"۔

قوم لوط پر آنے والے عذاب کی کیفیت

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جب ہمارے طے شدہ عذاب کا وقت آگیا تو ہم نے ان کی سر زمین کو تہہ و بالا کر دیا، بلندیوں کو پستی اور پستی کو بلندیوں میں تبدیل کر دیا جس کے نتیجے میں زمین پر ہلچل چل مچ گئی۔ ان پر اس طرح کے عذاب کے اتارنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے فطری طریقے کو الٹا کر دیا تھا اور حیوانی شہوت میں غرق ہوئے تھے۔ ہمارا عذاب کلمہ "کن" سے محقق ہوااور ان پر پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ پتھر، مٹی اور گارا تسبیح کے منظّم دانوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے ان پر برسنے لگے۔

مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ بِبَعِيۡدٍ ﴿۸۳﴾

"جن پر تیرے رب کے ہاں سے خاص نشان بھی تھا، اور یہ بستیاں ان ظالموں سے زیادہ دور نہیں ہیں"۔

قوم لوط پر برسنے والے پتھروں کی خصوصیات

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر برسنے والے پتھروں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمارہاہے کہ ان پر برسنے والے پتھروں پر تیرے پروردگار کے علم میں نشان لگا ہوا تھا اور وہ اپنے نشانے اور معین فرد پر آکر لگتے اور اسے ہلاک کردیتے تھے۔ ممکن ہے ان پر آنے والا عذاب آتش فشان کی شکل میں ہو اور زلزلہ آیا ہو اور اس کے بعد ان پر پہاڑوں سے پتھر بارش کی طرح برسے ہوں۔ (واللہ العالم)

پھر اللہ تعالیٰ فرماتاہے کہ اسی طرح کا عذاب ستمگاروں سے بعید نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ستمگاروں سے اہل مکہ یا رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے

مشرکین مراد ہیں اور ان کو دھمکایا گیا ہے کہ دیکھو اگر تم بھی ستمگار بنو گے تو تم پر بھی ایسا عذاب آسکتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا عذاب ستمکاروں سے دور نہیں ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے کل کے ظالموں کے بارے میں اس طرح کا فیصلہ کیا تھا آج کے ظالموں کے بارے میں بھی اسی طرح کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کو تباہ کر دیا اسی طرح وہ مکہ والوں کو بھی تباہ کر سکتا ہے کیونکہ مکہ، قوم لوط کی بستی سے زیادہ دور نہیں تھی کیونکہ قوم لوط مکہ سے شام کے راستے میں آباد تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پتھروں کی بارش قوم لوط کے ظالموں سے بعید نہیں ہے۔ "عند ربك" کے ذریعے مشرکین اور ستمگاروں سے اعراض (ان کی طرف اشارہ دیا ہے) کیا گیا ہے۔

وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ وَ لَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَ الۡمِیۡزَانَ اِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ بِخَیۡرٍ وَّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ ﴿۸۴﴾

"اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، کہا اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اور ناپ اور تول کو نہ گھٹاؤ، میں تمہیں آسودہ حال دیکھتا ہوں اور تم پر ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔

قوم شعیبؑ کی داستان

یہ آیت سابقہ انبیاء کی داستانوں پر عطف ہے۔ چونکہ شعیب بھی اسی قوم میں سے تھے اس لیے ان کو بھی ان کی قوم کا بھائی کہا گیا ہے۔ حضرت شعیبؑ نے بھی سابقہ

انبیاء کی طرح اپنی قوم کو اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، عبادت فقط اللہ کی ہو سکتی ہے۔ قوم شعیبؑ چونکہ معاملات اور کاروبار میں عدالت کا لحاظ نہیں رکھتے تھے اور ناپ تول میں کمی کرتے تھے اس لیے حضرت شعیبؑ نے ان کی خیر خواہی کے طور پر ان سے کہا کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں خوشحالی، خیر و برکت اور مال کی فروانی عطا کر رکھی ہے لہٰذا تمہیں چوری اور ناپ تول میں کمی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان ساری نعمتوں کے ہوتے ہوئے تمہیں دوسروں کے مال میں طمع و لالچ نہیں کرنا چاہیے اور زیادہ منافع کمانے کے لیے دوسروں پر ظلم و سرکشی کا راستہ اختیار نہ کرو۔

اس صورت میں جملے کا آخری حصہ پہلے جملے یعنی ناپ تول میں کمی نہ کرنے کی وجہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے یعنی خدا کی عبادت کرنے کی علت (وجہ) اور وجہ کے طور پر بیان ہوا ہو۔ حضرت شعیب علیہ السلام کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو کیونکہ اس نے تمہیں اتنی ساری نعمتیں دی ہیں، تمہیں اپنی عنایت سے عقل کی نعمت دی ہے، تمہارے لیے ترقی کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ ان ساری نعمتوں کے ہوتے ہوئے کوئی جواز نہیں بنتا ہے کہ تم اللہ کا شرک کرو اور اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کی عبادت کرو۔ پھر فرمایا کہ مجھے تمہارے بارے میں قیامت کے عذاب یا دنیاوی عذاب کا ڈر ہے جو تمہیں ختم کر کے رکھ دے گا اور جب یہ عذاب آئے گا تو تمہیں اس عذاب سے بچنے کی فرصت بھی نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ کوئی بھی اللہ کے عذاب سے مانع اور رکاوٹ نہیں بن سکتا اور اللہ کے عذاب کے مقابلے میں کوئی تمہاری مدد بھی نہیں کر سکتا۔

وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾

''اور اے میری قوم !انصاف سے ناپ اور تول کو پورا کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد نہ مچاؤ''۔

اپنی قوم کو شعیبؑ کی نصیحت

حضرت شعیب نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ ''ایفاء'' حقدار کو اس کا پورا حق دینے کو کہتے ہیں۔ ''بخس '' عیب، نقص اور کمی کرنے کے معنی میں ہے۔

حضرت شعیبؑ نے تاکید کرتے ہوئے اپنی قوم سے کہا کہ فقط ناپ تول میں کمی کرنے سے اجتناب کافی نہیں ہے بلکہ تم پر لازم ہے کہ ترازو اور پیمانے کا حق ادا کرو۔ یعنی لوگوں کا سودا سلف پورے طور پر دو اور ان کی امانتوں کا خیال رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ جب دوسروں سے کوئی چیز لینا چاہو تو اس میں نقائص نکالو تاکہ اسے کم قیمت پر خرید سکو اور جب اپنی چیز بیچنا چاہو تو اس کی تعریف کرو تاکہ اسے زیادہ قیمت پر بیچ سکو۔ اور زمین پر فساد مت پھیلاؤ جس میں قتل کرنا، زخمی کرنا، مالی ظلم کرنا، دوسروں کی آبرو ریزی کرنا اور دوسروں کی ناموس پہ حملہ آور ہونے کو شامل ہے۔ شاید اس سے کم فروشی اور ناپ تول میں کمی نہ کرنے کی تاکید مراد ہو۔

ترازو اور میزان میں کمی کرنا اور کم فروشی زمین میں فساد پھیلانے کا مصداق ہے کیونکہ کسی بھی معاشرے کی بنیاد معاملات اور ایک دوسرے کے ساتھ کاروبار اور لین دین پر ہوتی ہے۔ جب کسی معاشرے کے افراد زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کریں اور لین دین میں ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کو روا رکھیں تو اس کا نقصان خود اسی معاشرے کو ہوگا۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں ان کی معاشی زندگی تباہ ہوجاتی ہے اور زندگی کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ اگر لین دین میں عدالت

اور انصاف نہ ہو تو انسان جو کچھ خرید رہا ہوتا ہے اور اس کی جو قیمت دے رہا ہوتا ہے دونوں میں دوسروں کو نقصان دے رہا ہوتا ہے۔ جس سے معاشرے کا اقتصادی توازن بگڑ جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر معاملات میں خیانت ہوگی تو انسان کی ضروریات زندگی پوری نہیں ہوں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نے جو چیز وصول کی ہے اس سے زیادہ پیسے ادا کیے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ آیندہ اس چیز کو بیچنے والے پر اعتبار نہیں کرے گا، اس طرح وہ زندگی کے معاملات میں سرگرداں اور پریشان ہو گا اور یہی فساد کا مصداق ہے۔ کیونکہ معاملات اور کاروبار میں اس قسم کے مسائل کے عام ہونے سے اقتصادی امن ختم ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی، ایک دوسرے کی ضرورت کو پورا کرنے کی بجائے مکر و فریب اور دغابازی حاکم ہو جاتی ہے اور معاشرہ فساد اور تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو اسی نقطے کی جانب متوجہ کیا ہے کہ معاشرے کے امن کے لیے عدل و انصاف کو بروے کار لاؤ، لین دین اور کاروبار میں انصاف کو بنیاد بناؤ۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿٨٦﴾

"اللہ کا دیا جو باقی بچ رہے وہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم ایماندار ہو، اور میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں"۔

اپنی قوم سے شعیبؑ کی دو ٹوک بات

حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو جو فائدہ تمہیں جائز کاروبار اور معاملے سے ملے گا وہ نامشروع، ناجائز طریقے اور کم فروشی اور ناپ تول میں کمی کے ذریعے کمائے گئے مال سے بہتر ہے۔ کیونکہ مومن حلال طریقے سے مال

سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ میں تمہارے اوپر نگہبان نہیں ہوں اور نہ ہی تمہارے اعمال کا ذمہ دار ہوں۔ میرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ اچھائی یا برائی کا انتخاب تمہارے اپنے اختیار میں ہے۔ میں نہ تو تمہارے لیے خیر کھینچ کر لا سکتا اور نہ ہی تم سے شر کو دور کر سکتا ہوں۔ تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ سب اللہ کی دی ہوئی ہیں۔

پس جو شخص بصیرت کو استعمال میں لے آئے اس نے اپنے فائدے کے لیے عمل کیا ہے اور جس نے اپنے آپ کو اندھا بنایا اس نے اپنے خلاف اقدام کیا ہے۔ میں تو تمہارے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اس بارے سورۂ انعام آیت نمبر 104 آیا ہے: ''فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾''

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰۗؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾

''انہوں نے کہا اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ باپ دادا پوجتے تھے یا اپنے اموال میں اپنی خواہش کے مطابق تصرف نہ کریں، بے شک توں تو یقینی طور پر بردبار، نیک چلن ہے''۔

اہل مدین کا شعیبؑ کو جواب

اہل مدین نے حضرت شعیبؑ کی دلیل کے جواب میں استفہام انکاری کی صورت میں دو باتیں کہیں:

(ا) پہلی بات یہ کی کہ کیا ہم تمہاری عبادت یعنی نماز کی وجہ سے اپنی اس عبادت کو چھوڑ دیں جسے ہمارے باپ دادا انجام دیتے رہے ہیں؟ اور اپنے مال میں اس طرح تصرف نہ

کریں جیسے ہمارا دل چاہے؟ ہمارے ان اعمال کو جس چیز نے تمہاری نگاہ میں ناپسند کیا ہے وہ تیری نماز ہے، جبکہ توں اور تم اپنی نماز کی وجہ سے ہمارے سرنوشت کے مالک نہیں ہو سکتے ہو اور نہ ہی تم ہمارے خلاف کچھ کر سکتے ہو۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ ہم آزاد ہیں لہٰذا جیسے چاہیں اپنے مال میں تصرف کر سکتے ہیں اور اپنی مرضی سے جس معبود کی چاہیں عبادت کر سکتے ہیں۔ ہم تیری بات کو کیوں مانیں؟ جبکہ ہمارے آباء و اجداد اسی روش پر چل رہے تھے۔ ہم تو تمہاری ان باتوں کو حماقت اور بے وقوفی کے سواء کچھ نہیں سمجھتے ہیں، جبکہ تم ہماری نگاہ میں حلیم اور بردبار آدمی تھے جو بدکار افراد کو برائی سے روکنے اور مجرموں سے انتقام لینے میں جلدی نہیں کرتا اور حقیقت کے آشکار ہونے تک صبر کرتا ہے۔ ہم تو تمہیں رشید اور سنجیدہ شخص سمجھتے تھے جو بغیر سوچے سمجھے گمراہ کرنے والے کام نہیں کرتا۔ تم ان صفات کے حامل ہونے کے باوجود کس طرح اس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ اور ہم سے اس قسم کی چیزوں کا تقاضا کر رہے ہو؟

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ رَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًاؕ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُؕ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُؕ وَ مَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَیْهِ اُنِیْبُ ﴿۸۸﴾

"(شعیب) کہا اے میری قوم! دیکھو تو سہی اگر مجھے اپنے رب کی طرف سے سمجھ آ گئی ہے اور اس نے مجھے عمدہ روزی دے دی ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس کام سے تمہیں منع کروں میں خود اس کے خلاف کروں، میں تو

اپنی طاقت کے مطابق اصلاح ہی چاہتا ہوں، اور مجھے تو صرف اللہ ہی سے توفیق حاصل ہوتی ہے، میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں"۔

شعیبؑ کا اپنی قوم سے مکالمہ

حضرت شعیبؑ کے اس کلام "اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ "میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل رکھتا ہوں، کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف سے اپنی نبوت کے دعوے کی سچائی پر معجزہ اور نشانی لے کر آیا ہوں۔ "رِزۡقًا حَسَنًا" اچھی روزی سے مراد وحی ہے جو اصول عقائد اور شریعت کی فروعات پر مشتمل تھی۔

اس کے بعد فرمایا کہ مجھے خبر دو کیا خدا کی طرف سے معجزہ لانے اور مجھ پر وحی ہونے کے باوجود بھی میں تمہاری نظر میں بے عقل اور احمق فرد لگتا ہوں؟ یا میری دعوت تمہاری آزادی کو سلب کر رہی ہے یا میں نے اپنی دعوت کو قبول کرنے پر زبردستی کی ہے؟ ہر گز ایسا نہیں ہے بلکہ پروردگار عالم جو اس کائنات کا خالق، مالک اور مدبر ہے اسی نے یہ احکام مجھ پر وحی کیے ہیں اور عقل کا بھی یہی حکم ہے کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے سامنے جھک جاؤ کیونکہ تم نے ایک دن اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ میرا مقصد تمہاری اصلاح کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حق کی جانب دعوت دینے میں تمہارے مفاد کا خیال رکھوں۔

"اُخَالِفَکُمۡ اِلٰی" کسی چیز کی طرف جھکاؤ اور رجحان رکھنے کے معنی میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جس چیز سے تمہیں روک رہا ہوں میں اس میں تمہاری مخالفت کروں۔ میری ساری باتیں معاشرے کے مفاد میں ہیں۔ اگر میں تمہیں کسی چیز سے روک رہا ہوں تو اس اعتبار سے ہے کہ میں بھی اسی معاشرے کا ایک فرد ہوں اور معاشرے کی

بہتری کا تقاضا یہ ہے کہ ان امور کا لحاظ رکھا جائے جو معاشرے کے تمام افراد کے حقوق کی حفاظت کے ضامن ہیں۔ اور جس میں سب کا فائدہ ہے۔ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد اپنی نفسانی خواہشات کے حصول میں مطلقاً آزاد نہ ہو بلکہ کسی بھی اجتماع میں رہنے والا انسان کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنے بعض حقوق سے چشم پوشی کرے تاکہ معاشرے کے باقی افراد اپنے حقوق سے بہرہ مند ہو سکیں۔

پھر فرمایا کہ میری توفیق تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری اصلاح کے لیے جو کام میں انجام دیتا ہوں وہ سب اللہ کی دی ہوئی توفیق اور قدرت سے انجام دیتا ہوں۔ میرا توکل اللہ پر ہے اور میرے سارے امور کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہے، میں اسی کے سامنے تسلیم ہوں اور میں اسی کی طرف پلٹتا ہوں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان اپنے عمل میں مختار ہے لیکن اس کے باوجود انسان جو بھی عمل انجام دیتا ہے وہ اللہ کی مشیت اور اللہ کے ارادے سے باہر نہیں ہوتا۔ انسان اگر عمل خیر انجام دیتا ہے تو خدا نے اسے اس کی توفیق دی ہے کہ وہ خیر کا عمل انجام دے۔ اسے اپنی اطاعت اور بندگی کی توفیق دے رکھی ہے۔ اور اگر معصیت کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے اس کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے اور اس کی معصیت کے درمیان حائل نہیں ہوا ہے اور معصیت کے انجام دینے پر اس کی مدد نہیں کی ہے کیونکہ یہ کام اللہ کے دستور کے خلاف ہے۔ اس پر اللہ نے زبردستی نہیں کی بلکہ وہ اپنے اختیار سے معصیت کی طرف گیا ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے انسان کو اعمال انجام دینے میں اختیار دیا ہے۔ البتہ انسان اپنے اعمال میں اس وقت تک آزاد ہے جب تک اس کے اعمال اللہ تعالیٰ کے اعمال اور احکام کے خلاف نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ جو کہ مدبر اور حاکم مطلق ہے اس نے یہ اختیار اپنے رسولوں اور اولی الامر کو بھی دیا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے امت کے تمام افراد

کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق عطا کیا ہے۔ لہٰذا امت کے کسی بھی فرد کو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول، اولوالامر اور اہل ایمان کی طرف سے صادر ہونے والے کلمہ حق کو پامال کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انہیں اس بات کی آزادی حاصل تھی اور انبیاء اور اولامر نے ان کی یہ آزادی سلب کی ہو۔ جیسا کہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر 36 میں آیا ہے:

وَ مَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّ لَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗۤ اَمۡرًا اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ ؕ

ترجمہ: ''جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کرے تو اس میں کسی مومن یا مومنہ کو اختیار کا حق حاصل نہیں ہے''۔

اللہ کے حکم کی اتباع کرنی ہوتی ہے، انسان کو اس کی پامالی کا اختیار نہیں ہے۔ خواہ اس امر میں اس کا فائدہ ہو یا ظاہری نقصان، دونوں صورتوں میں اسے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو پامال کرنے کا حق نہیں۔ ایسے مواقع پر انسان کو حق خودارادیت اور اختیار و آزادی نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر کوئی اللہ کا حکم پہنچا رہا ہو اور احکام دین کی تبلیغ کر رہا ہو تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اسے کہے کہ تمہاری بات آزادی کے خلاف ہے، کیونکہ یہاں پر آزادی کا سلب ہونا معنی نہیں رکھتا۔

وَ يٰقَوۡمِ لَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شِقَاقِىۡۤ اَنۡ يُّصِيۡبَكُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ قَوۡمَ هُوۡدٍ اَوۡ قَوۡمَ صٰلِحٍ ؕ وَ مَا قَوۡمُ لُوۡطٍ مِّنۡكُمۡ بِبَعِيۡدٍ ﴿۸۹﴾

''اور اے میری قوم! کہیں میری ضد سے ایسا جرم نہ کر بیٹھنا جس سے وہی مصیبت نہ آ پڑے جیسی کہ قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر پڑی تھی، اور لوط کی قوم بھی تم سے زیادہ دور نہیں''۔

شعیبؑ کا اپنی قوم کو خطاب

"جرم" کسی بھی ناپسندیدہ اور برے عمل کے معنی میں ہے۔ "شقاق" مخالفت اور دشمنی کو کہا جاتا ہے۔ آیت کا معنی واضح ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ خبردار! میری ذات اور میری دعوت کی مخالفت اور دشمنی کی وجہ سے تم پر پچھلی اقوام پر آنے والا عذاب نہ آجائے۔ جیسے قوم نوح طوفان سے غرق ہوئے۔ قوم ھود کو سخت قسم کی آندھی نے تباہ وبرباد کر دیا اور خاک میں دفن ہوگئے۔ قوم صالح کو زور دار آسمانی آواز نے نابود کردیا اور قوم لوط زلزلہ اور پتھروں کی بارش سے تباہ ہوگئے۔ زمان اور وقت کے اعتبار سے قوم شعیب اور قوم لوط کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا کیونکہ قوم شعیب اور قوم لوط کے درمیان تقریباً تین صدیوں کا فاصلہ تھا۔ اسی لیے حضرت شعیبؑ نے ان کا حوالہ دیا اور کہا کہ قوم لوط اور تمہارے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ اس طرح حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ان کے انجام کی طرف توجہ دلائی۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰

"اور اپنے اللہ سے معافی مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو، بے شک میرا رب مہربان محبت والا ہے"۔

قوم کے لیے ایک تجویز

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف پلٹ آؤ کیونکہ میرا پروردگار بہت مہربان ہے اور توبہ کرنے والوں اور استغفار کرنے والوں پر مہربانی کرتا ہے اور اللہ تم سے محبت بھی کرتا ہے۔ "وَّدُوْدٌ" اسے کہتے ہیں جو اس کے ساتھ محبت

کرنے والے سے اپنی محبت کا اظہار کرے۔ اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرنے والوں سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اس کی نشانی اس کی عطا کی ہوئی نعمتیں ہیں۔ آیت کے شروع میں "رَبَّکُمْ" تمہارا رب، اور آخر میں "رَبِّیْ" کہنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ پہلا جملہ استغفار اور توبہ کے مقام پر تھا اور اس مقام کا تقاضا یہ تھا کہ بندوں کا اپنے رب سے تعلق کی طرف اشارہ کیا جائے۔ اسی لیے وہاں پر کہا گیا ہے۔ اور یہ کہ تمہارا رب، اللہ تعالیٰ جو سارے عالمین کا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اسی رب سے معافی مانگ لو اس کے علاوہ کسی دوسرے کو رب مت بناؤ، تمہارا رب وہی ہے۔ لیکن آخر میں اس لیے "رَبِّیْ" کہا ہے کیونکہ پہلے ثابت ہوچکا ہے کہ اللہ ہی ان سب کا رب ہے تو دوبارہ تکرار کرنے کی ضرورت نہیں تھی اسی لیے کہا میرا رب۔ اس آیت میں اس بات کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ میرا اور تمہارا رب ایک ہی ہے جو رحیم اور ودود ہے، گناہوں کو معاف کرنے والا اور اپنے بندون سے محبت کرنے والا ہے۔

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ کَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا ۚ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ ﴿۹۱﴾

"انہوں نے کہا اے شعیب! ہم بہت سی باتیں نہیں سمجھتے جو تم کہتے ہو اور بے شک ہم تمہیں اپنے میں کمزور پاتے ہیں، اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو تجھے ہم سنگسار کر دیتے، اور ہماری نظر میں تیری کوئی عزت نہیں ہے۔"

قوم کا شعیبؑ کو جواب

جب حضرت شعیب علیہ السلام نے بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ اپنی قوم کو مغلوب کرلیا اور ان کے پاس کوئی منطقی جواب نہیں تھا اور وہ حضرت شعیبؑ کے

دلائل کے سامنے لاجواب ہوگئے تو پہلے تو کہہ دیا کہ تمہاری باتیں ہمارے سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ "فقہ" گہرائی میں جا کر کسی بات کو سمجھنے کو کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ فہم اور سمجھنے سے زیادہ بلیغ ہے۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم تمہاری باتوں کا جواب اس لیے نہیں دیتے کیونکہ تیری باتیں ہمیں سمجھ نہیں آتیں لہذا تیری گفتگو کا ہم پر کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوگا۔

دوسرے مرحلے میں کہنے لگے کہ تم ایک کمزور آدمی ہو۔ تمہارے پاس طاقت نہیں ہے اگر تم طاقتور شخص ہوتے تو ہم مجبور ہو کر بھی کسی طرح تمہاری بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ لیکن اب جب تم بنیادی طور پر کمزور شخص ہو لہذا ہمیں تو تیری کوئی پرواہ نہیں ہے۔ آخر میں حضرت شعیبؑ کو دھمکی دیتے ہوئے کہنے لگے کہ اگر تیرا چھوٹا سا قبیلہ نہ ہوتا، تیرے رشتہ دار نہ ہوتے تو ہم تمہیں سنگسار کرتے۔ ہمیں تو تمہارے رشتے داروں کا لحاظ ہے اس لیے ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے۔ "رَھْط" تھوڑی تعداد کو کہتے ہیں۔ حضرت شعیبؑ کے رشتہ داروں کو اس لیے رھط کہا گیا ہے تاکہ ان کے قبیلے اور خاندان کی تعداد کی جانب اشارہ کریں اور کہیں کہ تمہارے خاندان کی تعداد اتنی کم ہے کہ اگر ہم تمہیں قتل بھی کرنے کا ارادہ کریں تو ان چند آدمیوں سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر ہم نے آج تک تجھے کچھ نہیں کہا تو تیرے رشتہ داروں کے احترام میں نہیں کہا نہ کہ کسی ڈر کی وجہ سے۔ پھر اپنی بات کی تاکید کرتے ہوئے کہنے لگے کہ تم اتنے طاقتور نہیں ہو اور نہ ہی تمہاری کوئی حیثیت اور بڑا مقام ہے نہ ہی تم اتنے محترم ہو تاکہ تجھے قتل کرنے سے ہم باز آجائیں یا تمہارے قتل سے ہاتھ اٹھالیں۔ اس بنا پر ان کے ہاں قبیلے اور خاندانی رابطے کا زیادہ احترام تھا۔ عقیدہ اور ایمانی رابطے کی ان کے ہاں کوئی حیثیت نہیں تھی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾

''شعیب نے کہا اے میری قوم !کیا میری برادری کا دباؤ تم پر اللہ سے زیادہ اہم ہے کہ اس کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے، بے شک میرا رب تمہارے سب اعمال کا احاطہ کرنے والا ہے''۔

قوم کو شعیبؑ کا جواب

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی ان باتوں پر اعتراض کیا اور کہنے لگے کہ تم لوگ کیوں اللہ کو عزیز اور محترم نہیں جانتے ہو اور اس کے احترام کے قائل نہیں ہو؟ اس کا لحاظ نہیں رکھتے؟ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔ میرا اللہ تمہارے سارے اعمال پر احاطہ رکھتا ہے اور آگاہ ہے۔ علم و قدرت کے لحاظ سے پورا عالم اس کے کنٹرول میں ہے۔ اس آیت میں حضرت شعیبؑ نے ضمنی طور پر اپنی قوم کی رائے کو جاہلانہ اور احمقانہ رائے قرار دیا ہے۔ جیسا کہ سابقہ آیت میں آپ کی قوم نے آپ کے عقائد کو عجیب اور احمقانہ قرار دیا تھا۔

وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَ ارْتَقِبُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾

''اور اے میری قوم !اپنی جگہ پر کام کیے جاؤ میں تم بھی کام کرتا ہوں، آئندہ معلوم کرلو گے کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور جھوٹا کون ہے؟ اور انتظار کرو بے شک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں''۔

قوم کو شعیبؑ کی دھمکی

حضرت شعیبؑ نے بڑی سنجیدگی سے اپنی قوم کو دھمکی دے دی اوران کو خطرے سے بھی آگاہ کر دیا اور بتا دیا کہ مدین کے لوگو! تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کرلو۔ آپ نے بڑے اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے پاس جتنی طاقت ہے وہ استعمال میں لے آؤ اور جو کچھ کر سکتے ہو کرلو۔ میں بھی اپنا کام کروں گا۔ تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے ہو۔ عنقریب ایسا عذاب آئے گا جو تمہارا صفایا کر دے گا اور میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کن ثابت ہوگا اور پتہ چل جائے گا کہ جھوٹا کون ہے اور کون عذاب کا مستحق ٹھہراتا ہے، میں یا تم؟ تم بھی اس عذاب کے انتظار میں رہو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں اور ہم اس وقت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، اکٹھے رہیں گے لیکن عذاب آنے سے پتہ چل جائے گا کہ کون جھوٹا ہے اور کون حق پر ہے۔

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۹۴﴾

”اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے شعیب کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا، اور ان ظالموں کو کڑک نے آ پکڑا پھر صبح کو اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے رہ گئے“۔

قوم شعیبؑ پر عذاب

اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرما رہا ہے کہ جب عذاب الٰہی کے متعلق ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی خاص رحمت کے صدقے میں شعیبؑ اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اس عذاب سے نجات دیا جیسا کہ ہم نے اہل ایمان کو نجات دینے کا وعدہ کر رکھا

ہے۔ اور ستمگروں کو زوردار آسمانی آواز کی شکل میں عذاب الٰہی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑے اور ہلاک ہو گئے۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾

"گویا وہ لوگ کبھی وہاں بستے ہی نہ تھے، خبردار !مدین پر پھٹکار ہے جیسے ثمود پر پھٹکار ہوئی تھی"۔

عذاب کا نتیجہ

جب عذاب الٰہی نے قوم شعیب کو گھیرے میں لے لیا تو وہ بے جان جسموں میں تبدیل ہو گئے اور ایسا لگ رہا تھا کہ گویا اس سر زمین پر رہتے ہی نہیں تھے۔ پھر ہمارا حکم جاری ہوا کہ اہل مدین پر لعنت ہو جس طرح ثمود پر لعنت ہوئی تھی۔ کیونکہ اہل مدین ظالم تھے اس لیے وہ ہماری رحمت سے دور رہے اور ان پر پھٹکار اور عذاب آیا۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾

"اور البتہ تحقیق ہم نے موسٰی کو اپنی نشانیاں اور واضح سند دے کر بھیجا"۔

موسیٰ علیہ السلام کی رسالت

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر شروع ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات، روشن دلیل اور غیر معمولی معجزات دے کر بھیجا۔ "سُلْطَانٍ" ایسی واضح دلیل اور برہان کو کہتے ہیں جس کے سامنے عقل اور فہم مغلوب ہو جائے لہٰذا سلطان، آیات سے عام تر ہے۔ شاید اس سے حضرت موسیٰ کا فرعون اور اس کے دربار کے حالات پر غالب آنا مراد ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ایسی جبار اور سرکش و ظالم پر غلبہ عطا کیا جس کی تاریخ میں کوئی مثال

نہیں ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی فوج کو سمندر میں غرق کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دی جو انتہائی کمزور تھے۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾

"فرعون اور اس کے سرداروں کے ہاں، پھر وہ فرعون کے حکم پر چلے، اور فرعون کا حکم ٹھیک بھی نہ تھا"۔

موسیٰؑ، فرعون کے دربار میں

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ "مَلَاۡءِ" کسی قوم کے بزرگوں اور اشرافیہ کو کہا جاتا ہے۔ اشرافیہ کو اس لیے "مَلَاۡءِ" کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی ہیبت اور شکوہ سے لوگوں کی آنکھیں بھری ہوئی ہوتی ہیں اور لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔ "اَمْرُ فِرْعَوْنَ" سے فرعون کی روش، اس کا طریقہ اور اس کی وضع کی ہوئی شریعت مراد ہے، کیونکہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتا تھا کہ میں تمہیں ہدایت اور رشد کی جانب راہنمائی کرتا ہوں۔

فرعون یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اسی کا راستہ صحیح ہے اور اس کی اشرافیہ اس کی تائید کرتی تھی۔ اس آیت میں فرعون کے اس دعویٰ کو رد کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فرعون کی روش اور اس کا طریقہ گمراہی اور جہالت پر مبنی تھا اور وہ لوگوں کو گمراہ کر رہا تھا۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾

"قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے ہوگا پھر انہیں آگ میں لا ڈالے گا، اور برا گھاٹ ہے جس پر وہ پہنچے"۔

آل فرعون کے لیے دردناک عذاب

جس طرح فرعون کی قوم دنیا میں اس کی پیروی کرتی تھی، قیامت کے دن بھی وہ ان کا پیشوا ہوگا اور اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور انہیں آتش جہنم میں لے جائے گا۔ جیسا کہ سورۂ قصص کی آیت نمبر 41 میں اس بارے آیا ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ

ترجمہ: "ان کو ہم نے جہنم کی طرف لے جانے والے رہبر اور پیشوا بنا دیا"۔

فرعون اور اس کے ساتھی اگرچہ ابھی جہنم میں داخل نہیں ہوئے ہیں لیکن آیت میں ان کے جہنم میں داخل ہونے کے متعلق فعل ماضی استفادہ کر کے یہ بتا یا جارہا ہے کہ ان کا جہنم جانا حتمی ہے۔ بعض مفسرین سورہ مومن کی آیت نمبر 46 "اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝٤٦" کو مد نظر رکھتے ہوئے اس بات کے قائل ہیں کہ آل فرعون موت کے وقت سے لے کر قیامت تک جہنم کی آگ میں ہیں۔ لیکن صاحب تفسیر المیزان کا نظریہ ہے کہ آل فرعون کے سامنے آتش جہنم کو پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ قیامت کے دن ہی آتش جہنم میں داخل ہوں گے۔

"وِرد" دریا کے کنارے کے معنی میں ہے جہاں پر آکر پیاسے پانی پیتے ہیں۔ یہاں ایک لطیف تشبیہ دی گئی ہے کہ فرعون اور فرعون کے پیروکار جو دنیا میں گمراہ تھے، قیامت کے دن بھی وہ سعادت اور حق تعالیٰ کی وصال کی لذت سے محروم ہونگے اور آتش جہنم کے کنارے پر پہنچیں گے اور یہ کتنا برا ٹھکانہ ہے۔ کیونکہ "وِرد" دریا کے کنارے پر پہنچ کر پیاسا شخص لذت محسوس کرتا ہے لیکن آل فرعون گرم اور جلانے والی آگ

کے کنارے پر پہنچیں گے اور یہ بہت ہی ناپسندیدہ جگہ ہوگی اور وہاں پر ایسا گرم پانی ہوگا جو ان کی انتڑیوں کو جلادے گا۔

وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

"اور اپنے پیچھے اس جہان میں بھی لعنت چھوڑ گئے اور قیامت کے دن کے لیے بھی، برا ہی انعام ہے جو انہیں دیا جائے گا"۔

برائی کا انجام

آل فرعون نے دنیا میں فرعون کے برے اعمال کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی ان پر لعنت کی اور قیامت میں بھی ان پر لعنت اور پھٹکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیامیں انہیں دریا میں غرق کیا اور اپنی رحمت سے دور کیا اور آخرت میں بھی انہیں اپنی رحمت سے دور کرے گا۔ اور یہ کتنا برا بدلہ ہے جو انہیں دیا گیا ہے دنیامیں بھی ان پر لعنت ہے اور یہ لعنت آخرت میں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی یہاں تک کہ انہیں جہنم کی بھڑکتی آگ میں پہنچائے گی، جیسا کہ سورۂ قصص کی آیت نمبر42 میں آیا ہے:

وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً ۚ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ ﴿۴۲﴾

ترجمہ: " ہم نے اس دنیامیں بھی ان پر لعنت کی اور قیامت میں بھی وہ رحمت خدا سے دور ہوں گے۔ "

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰی نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِیْدٌ ﴿۱۰۰﴾

"یہ بستیوں کے تھوڑے سے حالات ہیں کہ تجھے سنا رہے ہیں، ان میں سے کچھ تو اب تک باقی ہیں اور کچھ اجڑی پڑی ہیں"۔

پیغمبر اکرمؐ کو خطاب

اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کو خطاب ہے کہ ہم نے تمہارے لیے جن آبادیوں کی داستانیں بیان کی ہیں ان میں سے کچھ آبادیاں ختم ہو گئی ہیں اور ان میں سے کچھ آبادیوں کے آثار باقی ہیں۔ جیسے قوم لوط کے آثار کے متعلق سورہ عنکبوت آیت نمبر 35 میں آیا ہے:

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةً ۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ

ترجمہ: ”ہم نے قوم لوط کے آثار صاحبان عقل و خرد کے لیے باقی رکھے ہیں تاکہ وہ ان سے عبرت حاصل کر سکیں“۔

ان میں سے بعض آبادیاں بالکل نابود ہو گئی ہیں اور ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا ہے۔ اگر قریٰ سے بستیوں میں رہنے والے مراد ہوں تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض اقوام مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی ہیں بلکہ ان کے کچھ افراد اب بھی موجود ہیں جیسے حضرت نوحؑ اور حضرت صالح علیہ السلام کی امت۔ اور ان میں سے بعض اُمتیں بالکل ختم ہو گئی ہیں ان اقوام کے افراد باقی نہیں رہے جیسے قوم لوط کا کوئی فرد اور کوئی سلسلہ باقی نہیں رہا سوائے حضرت لوطؑ کے گھرانے کے، باقی سب افراد ختم ہو گئے۔

وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ﴿۱۰۱﴾

”اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہی اپنی جانوں پر ظلم کر گئے، پھر ان

کے وہ معبود کچھ کام نہ آئے جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے جس وقت تیرے رب کا حکم آ پہنچا، اور ان معبودوں نے سوائے ہلاکت کے انہیں کچھ بھی فائدہ نہ دیا"۔

اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جن اقوام پر ہم نے عذاب اتارااور انہیں نابود کیا، یہ ان پر اللہ کی طرف سے ظلم نہیں تھا بلکہ وہ خود روش بندگی سے خارج ہوگئے، توحید کو قبول نہیں کیا اور فسق اور گناہ کا راستہ اپنایا، ہدایت کے راستے کو اپنے اوپر بند کر دیا تو ہلاکت کا شکار ہوئے۔ انہوں نے اپنی ہلاکت کے اسباب خود مہیا کیے تھے لہٰذا انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ کیونکہ ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے جو اس عمل کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ ان کا عمل فسق وفجور اور گناہ تھا تو اس کا نتیجہ بھی انہیں بھگتنا تھا اور وہ ان کی ہلاکت کی صورت میں انہیں ملا۔ اس نتیجے سے فرار کرنے کا ان کے پاس کوئی راہ حل بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہر عمل کے پیچھے اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ عمل جس کا نتیجہ عقوبت اور سزا ہو، یا تو وہ عمل ظلم ہے یا وہ سزا ظلم ہے۔ اگر سزا ظلم نہیں ہے تو پھر عمل ظلم ہے جس کی وجہ سے عقوبت اور سزا دی گئی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن جھوٹے خداؤں کی وہ عبادت کرتے تھے اور اللہ وحدہ لاشریک کا شریک سمجھتے تھے تاکہ انہیں خیر پہنچا سکیں اور شر کو ان سے دور کر سکیں، جب اللہ کا عذاب ان پر آیا تو ان کے جھوٹے خدا، عذاب الٰہی کو ان سے ٹال نہیں سکے اور انہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکے۔ جب انہوں نے عذاب کی نشانیاں دیکھی تو ان بتوں اور جھوٹے خداؤں کی پناہ لینے گئے، لیکن ان کا بتوں کی پناہ میں جانا ایک اور گناہ تھا جس کی وجہ سے ان کے عذاب میں اور شدت آگئی۔ لہٰذا بتوں کی پرستش نہ فقط انہیں

کوئی فائدہ نہ دے سکی بلکہ ان کے عذاب کو اور بڑھا دیا۔

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۰۲﴾

"اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے جب وہ ظالم بستیوں کو پکڑتا ہے، اور اس کی پکڑ سخت تکلیف دہ ہے"۔

ظالم بستیوں پر اللہ کی سخت گرفت

اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں عموم اور شمول پایا جاتا ہے جس میں ارشاد فرمایا ہے کہ جب کوئی بستی ظلم کی مرتکب ہوتی ہے تو ہم اسے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور ہماری گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ ظالم اقوام کا مواخذہ کیا گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ گئے۔ مثال کے طور پر قوم لوط، قوم ھود، قوم صالح اور قوم شعیب، اللہ کی پکڑ میں آگئے اور دردناک عذاب کا شکار ہو گئے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی گرفت بہت سخت اور دردناک ہوتی ہے چاہے وہ گذشتگان کی ہو یا آئندہ گان کی۔ لہٰذا اہل فکر کو ان قوموں کی داستانوں سے عبرت لینا چاہیے اور اپنے لیے دین الٰہی کے علاوہ کسی اور دین کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے اور شرک، فساد اور ظلم کے ارتکاب سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾

"اس بات میں نشانی ہے اس کے لیے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے، یہ ایک ایسا دن ہوگا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور یہی دن ہے جس

میں سب حاضر کیے جائیں گے"۔

آخرت کا خوف رکھنے والوں کے لیے نشانیاں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ گذشتہ اقوام کی داستانوں میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جنہیں قیامت کے دن کا خوف ہے۔ خدا قیامت کے دن ستمگاروں کو ان کے جرم کی وجہ سے دردناک اور سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔ قیامت کے دن سارے انس و جن جمع اور محشور ہوں گے اور سب انسان کے اعمال کے شاہد اور ناظر ہوں گے۔

انسان کا ایک عمل اس کے تمام گذشتہ اعمال سے مرتبط ہے جس کا اس کے باطن کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے آئندہ کے اعمال کا بھی اس کے قلبی حالات کے ساتھ تعلق اور ربط ہوتا ہے۔ جس طرح ایک فرد کے اعمال کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اسی طرح مختلف افراد جن کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہوتا ہے ان کے اعمال کے بھی ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اور ربط ہوتا ہے۔ لہٰذا گذشتگان کے اعمال آئندہ آنے والوں کے اعمال کے ساتھ ربط رکھتے ہیں۔ کیونکہ گذشتگان ان کے پیشوا تھے جو یا تو لوگوں کی ہدایت کی جانب راہنمائی کرتے تھے یا ان کو گمراہ کرتے تھے۔ بنابراین گذشتگان کے اعمال کے اثرات آئندہ آنے والوں کے اعمال پر ہوتے ہیں۔ اس بارے سورۂ یٰسٓ کی آیت نمبر 12 میں آیا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ نَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَ اٰثَارَهُمۡ ؕ وَ کُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰهُ فِیۡۤ اِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۲﴾

"اور ہم ان کے آگے بھیجے ہوئے اور ان کے آثار کو لکھ لیتے ہیں اور ہم نے ہر چیز کو امام مبین میں حساب کیا ہوا ہے"۔

اسی طرح آئندہ آنے والے لوگوں میں کچھ ایسے ہوں گے جن سے گزرے ہوئے پیشواؤں کے نقش قدم پر چلنے اور ان سے دھوکہ کھانے کے متعلق سوال ہوگا جیسا کہ

سورہ اعراف کی آیت نمبر 6 میں آیا ہے:

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ۝۶

عنقریب ہم ان قوموں سے سوال کریں گے جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ہم ان رسولوں سے بھی سوال کریں گے۔ دوسری طرف جزا و سزا کا فیصلہ اور حق و باطل کی جدائی ہر صورت ہونی ہے۔ پس ایسی عدالت کا سسٹم جس کا دائرہ، بشریت کی ابتداء سے انتہاء تک ہو، اسی دن صورت میں امکان پذیر ہوگا جب اولین و آخرین سارے اکٹھے ہوں۔ لہٰذا دنیا دار عمل ہے، برزخ حساب و جزا کے لیے تیاری کا مرحلہ ہے اور آخرت دار حساب اور دار جزا ہے۔

وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ؕ۝۱۰۴

"اور ہم اسے تھوڑی مدت کے لیے ملتوی کیے ہوئے ہیں"۔

قیامت کے آنے کا معین وقت

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ روز اجل کے وقوع پذیر ہونے کا دن مقرر ہے۔ یہ دن نہ تو اس کے مقررہ وقت سے پہلے آسکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس دن کے متعلق اللہ کے فیصلے کو موئخر کرسکتا ہے۔ اللہ کی قضا اور اللہ کے فیصلے کو کوئی ہٹا ٹال سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس کے طے شدہ وقت سے موئخر نہیں کرتا۔ قیامت کا دن اللہ تعالیٰ کے طے شدہ وقت سے نہ آگے ہوگا نہ پیچھے ہٹے گا۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ ۝۱۰۵

"جب وہ دن آئے گا تو کوئی شخص اللہ کی اجازت کے سوا بات بھی نہ کر سکے گا، سو ان میں سے بعض بدبخت ہیں اور بعض نیک بخت"۔

قیامت، نیک بخت اور بد بختوں کی جدائی کا دن

قیامت کے دن سوائے اس کے جسے اللہ کی طرف سے بولنے کی اجازت ہو، کوئی بول نہیں سکے گا۔ قیامت کا دن دنیا کی طرح نہیں ہوگا جہاں ہر کوئی جو چاہے بولتا ہے، خواہ شریعت کی نگاہ میں اس کا بولنا جائز ہو یا جائز نہ ہو۔ اصولی طور پر عالم وجود میں کوئی بھی حادثہ اور واقعہ اللہ کے اذن سے رونما ہوتا ہے۔ لیکن قیامت کے دن سارے اسباب جن کو انسان مستقل خیال کرتا تھا وہ منقطع ہوجائیں گے اور ان کا اثر ختم ہوجائے گا۔ اس دن ان کے خیالی ستارے ٹوٹ جائیں گے اور انہیں ظلمت اور تاریکی میں گمراہی کی جانب ہدایت کرنے والے خیالی چاند اور سورج سب خاموش ہوجائیں گے اور ان کی روشنائی ختم ہوجائے گی۔ کسی بھی مالک کو اس کے ملک میں کوئی استقلال نہیں ہوگا۔ اس دن دلوں کی چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہوجائیں گی۔ قیامت کے دن کا حساب و کتاب اندرونی نیتوں اور باطنی حالات کی بنیاد پر ہوگا۔

دنیا میں بول چال اجتماعی لوازمات میں سے ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے ما فی الضمیر کو بیان کرتا ہے۔ اگر ہمارے پاس ایسے وسائل ہوتے جن کے ذریعے ہم ذہنی مفاہیم اور معانی کو بغیر کسی واسطے کے وصول کر لیتے تو پھر لغات اور زبانیں وضع کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ چونکہ قیامت کے دن انسانوں کے سارے راز اور باطن آشکار ہوجائیں گے۔ لہٰذا اس دن بولنے اور قیل و قال کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جیسا کہ سورۂ طارق آیت نمبر9 میں اس بارے ارشاد ہے:

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾

ترجمہ: ''اس دن باطن آشکار ہو جائیں گے''۔

اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہیں پوچھا جائے

گا کیونکہ اس دن گناہگار پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے اور انہیں سر اور پاؤں سے پکڑ کر آگ میں ڈالا جائے گا۔ جیسا کہ سورہ رحمٰن کی آیت 41 میں اس بارے ارشاد ہوا ہے:

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۝

اس کے بعد فرمایا کہ اس دن بعض افراد نیک بخت اور کچھ بد بخت ہوں گے۔ سعادت، کسی چیز کا اپنے وجود کے خیر تک پہنچنے کو کہتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے اپنے مطلوبہ کمال کو پہنچنے اور اس سے بہرہ ور ہوسکے۔ انسان کی جسمانی اور روحانی سعادت یہ ہے کہ وہ جسم اور روح کی لذتوں اور نعمتوں تک پہنچے اور اس سے استفادہ کرے۔ اور اس کی شقاوت یہ ہے کہ وہ ان لذات اور نعمتوں سے محروم رہے۔ یہ آیت جس میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن کچھ لوگ نیک بخت اور کچھ لوگ بد بخت ہوں گے، کسی بھی طور پر مذہب اشاعرہ کے نظریے پر دلالت نہیں کرتی ہے جو انسان کے اپنے اعمال میں مجبور ہونے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ جب ابھی ہی سے معلوم ہے کہ قیامت کے دن کس نے بد بخت ہونا ہے اور کس نے نیک بخت، لہٰذا ہمارے افعال اور اعمال کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ آیت مذہب معتزلہ کے نظریہ پر دلالت کرتی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ قیامت میں کسی شخص کا بد بخت ہونا یا نیک بخت ہونا فقط اس کے عمل کا نتیجہ ہے۔ بلکہ ہمارا مذہب امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث کی رو سے نہ جبر ہے اور نہ تفویض بلکہ امر بین الامرین ہے۔ ہر انجام پانے والا عمل ایک جہت سے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اور دوسری جہت سے انجام دینے والے یعنی خود انسان کی طرف منسوب ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان سے صادر ہونے والا ہر عمل ایک جہت سے اپنی علت تامہ (مکمل سبب جو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے) کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور دوسری جہت سے یہ عمل انسان کے ارادے کے ساتھ بھی جہت امکانی رکھتا ہے۔ (اس کام کے صادر ہونے میں انسان کے

ارادے کا بھی عمل دخل ہے) ان میں سے کوئی ایک جہت دوسری جہت کو باطل یا زائل نہیں کرتی۔ لہٰذا انسان کے عمل کے متعلق اللہ تعالیٰ کا علم اس کے اختیار کو ختم نہیں کرتا اور انسان کا اپنے عمل میں مجبور ہونے کا سبب نہیں بنتا ہے۔ انسان کا اختیاری عمل اللہ تعالیٰ کے علم کا متعلق ہے نہ کہ اس کا جبری عمل۔

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ شَقُوۡا فَفِی النَّارِ لَهُمۡ فِیۡهَا زَفِیۡرٌ وَّ شَهِیۡقٌ ﴿۱۰۶﴾

"پھر جو بد ہوں گے تو وہ آگ میں ہوں گے کہ اس میں ان کی چیخ و پکار پڑی رہے گی"۔

قیامت میں بد بختوں کی حالت

"زَفِیۡرٌ" گدھے کی آواز کو کہتے ہیں۔ "شَهِیۡقٌ" گدھوں کی لمبی آواز کے آخری حصے کو کہتے ہیں۔ "زَفِیۡرٌ" سانس لینے کو اور "شَهِیۡقٌ" سینے سے سانس نکالنے کو بھی کہتے ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اہل جہنم اور بد بخت لوگ آتش جہنم کی گرمی کی شدت سے گدھوں کی طرح آوازیں نکالیں گے اور ان کی سانس سینے تک چلی جائے گی اور دوبارہ واپس آئے گی۔ وہاں پر ان کے چلانے کی آوازیں ہونگی، چیخ و پکار ہوگی، ہائے ہائے اور واویلا ہوگا۔ وہ وہاں پر گرمی کی شدت اور عظیم مصیبت کی وجہ سے گدھوں کی طرح بلند آواز سے چلا رہے ہوں گے۔

خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ﴿۱۰۷﴾

"اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں ہاں اگر تیرے

اللہ ہی کو منظور ہو، بے شک تیرا رب جو چاہے اسے پورے طور سے کر سکتا ہے"۔

بدبختوں کیلئے جہنم کا ابدی عذاب

"خلود" کسی چیز کا خراب ہونے سے دور ہونا اور اسی حالت میں باقی رہنے کے معنی میں ہے جس حالت میں ہے۔ اس آیت میں ایک قسم کی تقیید پائی جاتی ہے جو خلود کی تاکید کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ جب تک آسمان اور زمین باقی ہیں وہ اسی جہنم میں رہیں گے۔ لیکن یہاں پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن آسمان اور زمین کے متعلق کہہ رہا ہے کہ وہ ایک معین مدت تک باقی رہیں گے، ابدی اور ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں ہیں جیسا کہ سورہ احقاف کی آیت نمبر3 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝۳

"بتحقیق ہم نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ اور ایک معین مدت کے لیے خلق کیا ہے"۔

لہٰذا یہ آیت اہل جہنم کے ہمیشہ کے لیے آتش جہنم میں رہنے کے ساتھ منافات رکھتی ہے۔ جیساکہ سورہ تغابن کی آیت 9 میں آیا ہے:

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ

اسی طرح سورہ احزاب کی آیت نمبر 64،65 میں اہل جہنم کے بارے میں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾

لیکن یہ اشکال سورہ ابراہیم کی آیت نمبر 48 سے حل ہو جاتا ہے جس میں آیا ہے

:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ

"اس دن زمین دوسری زمین میں بدل جائے گی اور آسمان بھی تبدیل ہو جائیں گے اور سب خدائے واحد قہار کے سامنے آشکار ہو جائیں گے"۔ قیامت کے دن آسمان اور زمین نابود نہیں ہوں گے بلکہ تبدیل ہوں گے۔ قیامت کے دن دوسرے آسمان اور زمین ہوں گے جو بہشت اور دوزخ کی طرح ہمیشہ رہیں گے یعنی ابدی ہوں گے۔

آیت کا دوسرا حصہ جس میں فرمایا کہ اہل جہنم ہمیشہ کے لیے آتش جہنم میں ہوں گے سوائے اس کے کہ خدا چاہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی قدرت لا محدود ہے، اللہ کی قدرت کی کوئی حد نہیں ہے، اس لیے ممکن ہے اللہ تعالیٰ اہل جہنم میں سے کچھ افراد کو شفاعت کے ذریعہ یا کسی اور واسطے سے دوزخ سے نجات دے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ اس کی قدرت لامحدود اور مطلق ہے۔ لہٰذا ممکن ہے اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو اپنی رحمت اور بخشش کے صدقے معاف کردے اور انہیں جہنم سے نکال دے۔ اس مطلب کی تائید میں احادیث بھی نقل ہوئی ہیں۔

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

"اور جو لوگ نیک بخت ہیں سو جنّت میں ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں ہاں اگر تیرے اللہ ہی کو منظور ہو، یہ بے

انتہا عطیہ ہوگا"۔

خوش بختوں کے لیے ابدی بہشت

اَمَّا الَّذِیۡنَ سُعِدُوۡا جن کو سعادت دی گئی ہے۔ یہاں پر مجہول کا صیغہ استعمال کر کے ایک لطیف نکتے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سعادت اور خوشبختی انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ لیکن شقاوت اور بدبختی کو خود انسان کسب کرتا ہے۔ اسی لیے بعد والی آیت میں اشقیاء کو معلوم کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے " الَّذِیۡنَ شَقُوۡا" "جَذَذ" قطع کرنے اور کاٹ دینے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا "عَطَآءً غَیۡرَ مَجۡذُوۡذٍ" ختم نہ ہونے والی اور مستمر عطا کے معنی میں ہے۔ وہ تمام مطالب جو پچھلی آیت میں بیان کئے گئے، اس آیت میں بھی جاری ہیں۔ سوائے اس کے کہ جو لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہ وہاں پر ہمیشہ رہیں گے اور کبھی بھی بہشت سے نکل کر جہنم میں نہیں جائیں گے۔ یہ بات قرآن و سنت سے قطعی طور پر ثابت ہے۔ اس کے علاوہ عقلی قاعدہ "وجوب وفاء عہد" کی رو سے بھی یہ بات ثابت ہے۔ کیونکہ وعدے کو پورا نہ کرنا ظلم ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات ظلم سے پاک و منزہ ہے۔

اس بناء پر "الا ما شاء ربك" کی قید اس حوالے سے ہے کہ اللہ کی قدرت لامحدود ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر کوئی بہشت میں داخل ہوا تو اللہ کی قدرت سلب ہو جائے گی اور اللہ اسے جنت سے نکال نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ اسے جنت سے نکال دے۔ لیکن اس عمل کے واقع نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقلاً ممکن نہیں ہے۔ لیکن فاعل کے لحاظ سے جو کہ اللہ تعالیٰ ہے اس فعل کے واقع ہونے میں کوئی مانع نہیں ہے کہ کسی کو جنت سے نکالے، کیونکہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ اس کی قدرت لامحدود ہے۔ اس امر کی تاکید کے لیے اگلا جملہ بیان فرمایا اور کہا "عَطَآءً غَیۡرَ

مَجْذُوْذٍ" بہشت ایسا عطیہ ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

"سو تو ان چیزوں سے شک میں نہ رہ جنہیں یہ پوجتے ہیں، یہ لوگ کچھ نہیں پوجتے مگر اسی طرح سے کہ جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا پوجتے تھے، اور بے شک ہم انہیں عذاب کا پورا حصہ دے کر رہیں گے"۔

پیغمبرؐ اکرم کو خطاب

اس آیت میں اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہہ رہے ہیں کہ اس مشرک قوم کی سرنوشت کے بارے میں شک نہ کرو۔ کیونکہ ان کے پاس بھی شرک کرنے پر اپنے مشرک آباء واجداد کی مانند کوئی دلیل اور منطق نہیں ہے۔ یہ بھی آخر کار اپنے مشرک آباء واجداد کی طرح ہلاک ہو جائیں گے۔ اور ان کا انجام بھی ان کے آباء واجداد جیسا ہوگا اور ہم انہیں ان کے برے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیں گے۔ جس طرح ہم نے ان کے آباء و اجداد کو ان کا پورا بدلہ دے دیا تھا اور ان کے لیے شفاعت اور معاف کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہ تھی۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾

"اور البتہ ہم نے موسٰی کو کتاب دی تھی پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات مقرر نہ ہو چکی ہوتی تو ان میں

فیصلہ ہو جاتا، اور بے شک اس کی طرف سے ایسے شک میں ہیں کہ مطمئن نہیں ہونے دیتا"۔

تورات کے متعلق یہودیوں کا اختلاف

اس آیت میں تورات کے متعلق یہودیوں کے اختلاف کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تورات میں اختلاف کیا اور اس اختلاف کی وجہ یہ تھی ان کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تھا۔ دنیاوی امور کے بارے اختلاف ایک طبیعی اور فطری امر ہے۔ لیکن دینی امور کے بارے میں اختلاف کی کوئی وجہ نہیں بنتی ہے سوائے اس کے کہ انسان سرکشی اور ہٹ دھرمی کا شکار ہو جائے۔ کیونکہ آسمانی کتاب اور رسول کے آنے کے بعد ان پر حجت تمام ہو گئی ہے۔

کلمہ الٰہی جس کے بارے میں انہوں نے اختلاف کیا تھا اس سے مراد اللہ کا حکم تھا، کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ نے وعدہ دیا ہے کہ عمل کرنے والے کو اس عمل کا اجر دے گا اور جرم کرنے والے کو سزا دے گا اور اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ خدا نے ارادہ کیا ہر قوم اور ملت کو ایک معین مدت تک باقی رکھے گا تاکہ زمین آباد رہے اور ہر ایک اپنے لیے آخرت کا توشہ اٹھائے۔ ان دو حکموں کو ملا کر یہ نتیجہ لیا جا سکتا ہے کہ دینی امور کے متعلق آپس میں اختلاف کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فیصلہ کرنے میں جلدی نہیں کرتا ہے بلکہ اس اختلاف کے فیصلے کو قیامت تک موخر کرتا ہے۔ اگر قضاء الٰہی اور اللہ کا فیصلہ نہ ہوتا تو ان کے درمیان اسی دنیا میں فیصلہ ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ اہل باطل کو ہلاک کر دیتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہودی تورات کے بارے میں شک و تردید میں ہیں۔ "ریب" دل میں شک و شبہ ڈالنے کے معنی میں ہے۔ یہودیوں کو حقیقت میں بھی تورات

کے بارے میں شک کرنا چاہیے کیونکہ موجودہ تورات کی سند یقینی نہیں ہے،اس کی سند عزراء نامی ایک بڑے کاہن تک منتہی ہو جاتی ہے۔اس کاہن نے تورات اس وقت لکھی ہے جب یہودی قید کی مدت کو پورا کرنے کے بعد بابل سے بیت المقدس کی طرف جانے والے تھے۔ وگرنہ اصلی تورات کافی عرصہ پہلے ھیکل پر لگنے والی آگ کے نتیجے میں جل گئ تھی۔ انجیل بھی اسی طرح ہے اور اس کی سند بھی ایک آدمی تک پہنچتی ہے لہٰذا اس میں بھی شک و تردید ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ تورات اور انجیل میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جنہیں عقل سلیم اور فطرت انسان قبول نہیں کرتی کہ آسمانی کتابوں میں ایسی باتیں موجود ہوں۔

بعض مفسرین نے ”اِنَّھُمۡ“ کی ضمیر کو عرب مشرکوں کی طرف پلٹایا ہے اور کہا ہے کہ مشرکین مکہ قرآن کے بارے میں شک کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات ٹھیک نہیں ہے کیونکہ قرآن کئی بار ان کو چیلنج دے چکا ہے کہ اس جیسی ایک سورہ بھی لے آؤ اور وہ قرآن جیسی ایک سورہ بھی نہیں لاسکے اور اس بات سے عاجز رہے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کے مطابق مشرکین مکہ کو قرآن کی حقانیت کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں تھا اور ان پر حجت تمام ہو گئی تھی جیساکہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر2 اس بارے ارشاد باری تعالیٰ ہے : ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ”اس کتاب میں کوئی شک نہیں ہے، یہ اہل تقویٰ کے لیے ہدایت ہے۔“

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝111

”اور جتنے لوگ ہیں جب وقت آیا تیرا رب انہیں ان کے اعمال پورے دے گا، بے شک وہ خبردار ہے اس چیز سے جو کر رہے ہیں“۔

اعمال کا پورا بدلہ

یعنی اے میرے رسول ﷺ قسم ہے، تیرا رب ان مشرکین، سابقہ اقوام اور یہودیوں اور مسیحیوں کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔انہیں ان کے نیک اعمال کا بدلہ نیکی کے ساتھ اور برے اعمال کا بدلہ برائی کے ساتھ ملے گا۔ان کے اعمال کے بدلہ بغیر کسی کمی بیشی کے ان کو ملے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال خواہ اچھے ہوں یا برے سب سے آگاہ ہے۔ وہ اپنی اس آگاہی کی بنیاد پر ان کے درمیان فیصلہ دے گا۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱۲

"سو تو پکار جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے اور جنہوں نے تیرے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو، بے شک وہ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو"۔

رسول اللہؐ کیلئے خصوصی خطاب

استقامت کا مطلب قیام کو طلب کرنا ہے۔یعنی اس امر کے سارے منافع اور آثار کے ظاہر ہونے کو طلب کرنا۔ اس بناء پر انسان کی استقامت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بہتری اس انداز سے ہو کہ اس میں کسی قسم کی خرابی اور نقصان کا امکان نہ ہو۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے رسول ﷺ دین کے معاملے میں اس طرح ثابت قدم رہو جس طرح ثابت قدم رہنے کا حق ہے اور استقامت دیکھاؤ۔دین کے معاملے میں کسی قسم کی لغزش نہیں آنی چاہیے اور جو تمہیں حکم دیا گیا اس میں پائیداری ہونی چاہیے اور جو بھی تیرے ہمراہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

یہاں توبہ سے اللہ پر ایمان لانا مراد ہے کیونکہ ایمان، شرک سے توحید اور اللہ کی طرف رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے فطرت کی جو راہ اور روش متعین کی ہے اور جو روڈ میپ دے دیا ہے اور اس کی حدود متعین کی ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور اس کی اطاعت، اسی پر قائم رہو۔ سابقہ امتوں نے جب حدود الٰہی سے تجاوز کیا اور شرک کے مرتکب ہوئے تو ہلاکت کو پہنچ گئے۔ تم ایسا نہیں کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اعمال سے آگاہ ہے۔ اگر تم اس کے اوامر کی مخالفت کرو گے تو پھر تم سے جواب طلب کیا جائے گا اور تمہیں گرفت میں لیا جائے گا۔ یہ آخری جملہ پچھلے جملوں کی علت کے طور پر بیان ہوا ہے۔[1]

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿١١٣﴾

"اور ان کی طرف مت جھکو جو ظالم ہیں پھر تمہیں بھی آگ چھوئے گی، اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے پھر کہیں سے مدد نہ پاؤ گے"۔

ظالموں سے دُوری

"رکون" کسی چیز کی طرف رجحان رکھنے اور اس کی طرف توجہ کرنے اور اس سے سکون حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں مومنوں کو ستمگاروں سے دوری اختیار کرنے اور ان پر اعتماد کرنے سے منع کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کو حکم دے

---

[1] ۔ روایت میں آیا کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ سورہ ھود کی اس آیت نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ اور سورہ شوریٰ میں بھی یہی کلام تکرار ہوا ہے۔

رہا ہے کہ ستمگاروں سے رغبت اور دلچسپی نہ رکھو اور ان پر کسی قسم کا اعتماد نہ کرو۔ خواہ یہ اعتماد اصول دین کے حوالے سے ہو، جیسے دین کے ان اصولوں اور عقائد کو کفار کے لیے بیان کرے جو ان کے فائدے میں ہوں اور ان اصول اور عقائد کو بیان نہ کرے جو ان کے نقصان میں ہوں۔ خواہ یہ اعتماد دینی زندگی کے بارے میں ہو مثلاً ستمگاروں کو معاشرے کے امور میں مداخلت کرنے کی اجازت دے اور امور عامہ کی سرپرستی ان کے سپرد کردے۔ یا ان کے ساتھ دوستی کی شکل میں ہو جس کے نتیجے میں ان کے ساتھ مل جول رکھے اور اس میل جول کے انسان کی انفرادی اور اجتمائی زندگی میں منفی اثرات پڑیں۔

لہٰذا یہ آیت مومنوں کو ظالموں سے دوستی رکھنے، اور ان کی ہم نشینی سے منع کر رہی ہے کیونکہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ان کے اعمال سے راضی ہوجانے، ان کے مانند بننے، ان کے راہ و روش پہ چلنے اور ان کی باتوں کو قبول کر لینے کے مترادف ہے۔ یہ سب ستمگاروں کی جانب جھکاؤ کا نتیجہ ہے۔ ظالمین وہ ہیں جن کے حالات اور ان کی صفات ان ظالمین جیسے ہوں جن کا تذکرہ سابقہ آیات میں ہوا ہے۔ وہ لوگ جو اللہ کی دعوت کو ٹھکراتے ہیں۔

بہر حال اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ تمہارا ان کی طرف میلان اور جھکاؤ ان ظالموں کی طرح تمہارے جہنمی بن جانے کا سبب بنے گا۔ کیونکہ ظالم پر اعتماد اور اس کی طرف میلان اور جھکاؤ ظلم ہے اور ظلم کا انجام جہنم کی آگ ہے۔ دوسرے لفظوں میں ظلم خود آگ ہے، گویا کہ ظلم کی طرف میلان اور جھکاؤ اپنے آپ کو اس آگ کے ساتھ جوڑنا ہے۔

پھر فرمایا کہ جب تم آگ میں چلے گئے تو وہاں اللہ کے سواء تمہارا کوئی یاور اور مدد گار نہیں ہوگا جو تمہاری سفارش کرے۔ پھر تم جتنا بھی خدا کو پکاروگے وہ تمہاری

بات نہیں سنے گا اور کبھی تمہاری نصرت نہیں کرے گا۔ اور اس کے بعد تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔ جس کے نتیجے میں تم ہمیشہ کے لیے ناامیدی اور رسوائی تمہارے نصیب میں ہوگی۔ لہٰذا ظالموں کے ساتھ میل ملاپ، ظالموں سے پیار محبت کرنا، ظالموں کو رعایت دینا، ان کو معاشرے کے امور میں دخالت کرنے کی اجازت دینا، انسان کو ظالموں کے ظلم میں شریک بنا دیتی ہے اور ظالم کو ظلم کی سزا بھگتنا پڑے گا۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰی لِلذّٰكِرِیْنَ ۟ۚ﴿۱۱۴﴾

"اور دن کے دونوں طرف اور کچھ حصہ رات کا نماز قائم کر، بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں، یہ نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے"۔

پنجگانہ نماز کے اوقات

دن کے دو اطراف سے صبح اور عصر مراد ہے۔ "زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ" رات کا وہ حصہ جو دن کے قریب ہوتا ہے۔ اس آیت میں کہا جارہا ہے کہ صبح، عصر اور رات کے اس حصے میں نماز قائم کرو جو دن کے قریب ہوتا ہے۔ یہ آیت نماز صبح اور عصر پر تطبیق ہوتی ہے جو دن کے ایک طرف ہیں۔ اسی طرح نماز مغرب پر بھی صدق کرتی ہے جس کا وقت رات کے ابتدائی حصے میں ہوتا ہے۔ بہر حال اس آیت میں پانچ وقت کی نمازوں کے اوقات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ نیکیاں، برائیوں کو ختم کردیتی ہیں۔ پنجگانہ نمازیں ایسی نیکیاں ہیں جن کی وجہ سے گناہوں کے اثرات مٹ جاتے ہیں۔ جو کچھ بیان ہوا وہ ان لوگوں کے لیے تذکر اور یادآوری ہے جو خدا کا ذکر

کرنے والے اور اللہ کو یاد کرنے والے ہیں۔

وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۱۵﴾

"اور صبر کرو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔

صبر کا حکم

صبر مکارم اخلاق اور نماز، عبادتوں کے بزرگ ترین ارکان میں سے ہیں۔[1] یہ دو ایسے امور ہیں جن کے ذریعہ سے زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور اتار چڑھاؤ اور مسائل پر غلبہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ صبر مشکلات پر انسان کو واویلا اور آہ و نالہ کرنے اور اضطراب و بے سکونی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور نماز انسان کو اپنے رب کی طرف متوجہ کرتی ہے جس کے نتیجے میں نامناسب حالات کا مقابلہ اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں پر صبر کا حکم مطلق ہے اس سے استفادہ ہوتا ہے کہ اس سے صبر کی تینوں قسمیں مراد ہیں:

(۱) عبادت پر صبر (۲) مصیبت پر صبر (۳) معصیت پر صبر

سابقہ آیات میں ذکر شدہ اوامر اور نواہی یعنی "فاستقم"، "لا ترکنوا"، "لا تطغوا" اور "اقم الصلواۃ" کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر عبادات کے انجام دینے اور نواہی کو ترک کرنے پر صبر کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ لیکن دوسری جانب آیت کے مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں اس لیے یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ یہاں پر صبر سے مراد مشرکین کی طرف سے دی جانے والی تکالیف، اذیتوں اور ان کے ظلم پر صبر کرنا مراد ہو۔ اور نماز کے بارے میں کیونکہ مفرد کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس لیے اس سے مراد پیغمبر

---

[1]۔ سورہ بقرہ آیت نمبر 45 ۔ و استعینوا بالصبر و الصلواۃ۔ اور نماز اور صبر کے ذریعے مدد مانگو۔

اکرم ﷺ ہو سکتے ہیں گویا آپؐ کو نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ یہاں پر نماز اور صبر احسان کے مصادیق میں سے ہیں۔ نمازی اور صبر کرنے والے، نیکوکار اور محسن ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِى الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾

"سو ان جماعتوں میں ایسے لوگ کیوں نہ ہوئے جو تم سے پہلے تھیں جو ملک میں فساد پھیلانے سے منع کرتے بجز چند آدمیوں کے جنہیں ہم نے ان میں سے بچا لیا تھا، اور جن لوگوں نے نافرمانی کی تھی وہ تو انہیں لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جو ان کو دی گئی تھیں اور وہ مجرم تھے"۔

سابقہ اقوام کی بات

"لَوْلَا" یہاں پر "هَلَّا" کے معنی میں ہے، جو ایسے تعجب کے معنی میں ہے جس میں سرزنش ہو۔ اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ سابقہ اقوام میں سے تھوڑی تعداد ہی نجات پائی اور باقی سب ہلاک ہو گئے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے فساد کو نہیں روکا، فساد پھیلنے دیا، نیکی کا حکم نہیں دیا۔ اگر وہ اپنی امتوں کو نیکی کا حکم دیتے تو انہیں عذاب اور ہلاکت سے نجات ملتی۔ لیکن ان کی اکثریت نجات نہ پا سکی، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ظالم اور مادی لذتوں کے پیروکار تھے، مال کی جمع آوری، شہوتوں اور مقام اور شہرت کے حصول میں غرق تھے جس کے نتیجے میں وہ جرم اور گناہ میں آلودہ

ہو گئے۔ لہذا سابقہ اقوام میں دو گروہ تھے۔ (۱) ایک وہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے عذاب سے نجات دی۔ (۲) دوسرے وہ جو گناہگار اور ستمگار تھے اور ظاہر ہے کہ ستمگاروں نے تو ہلاک ہونا ہے۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

"اور تیرا رب ہرگز ایسا نہیں جو بستیوں کو زبردستی ہلاک کر دے اور وہاں کے لوگ نیک ہوں"۔

اللہ نیکوکاروں کو ہلاک نہیں کرتا

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگر بستیوں والے اپنی اصلاح کر لیتے اور نیک ہوتے اور ظلم اور ستم سے پرہیز کرتے تو اللہ تعالیٰ ہرگز انہیں ہلاک نہ کرتا۔ کیونکہ نیک عمل کرنے والوں کو ہلاک کرنا ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

"لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾"[1] اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ سنت الٰہی یہی رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ ایسی اقوام کو ہلاک کیا ہے جو اہل فساد تھے، اللہ کے علاوہ دوسروں کی بندگی میں مصروف تھے، شرک جیسے گناہ کا ارتکاب کرتے تھے، ظلم و فساد میں آلودہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے ان گناہوں کی سزا دی۔

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

1، سورہ کہف آیت، 49۔

"اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک راستہ پر ڈال دیتا، اور ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے"۔

اگر اللہ چاہتا تو سارے انسان ایک دین پر ہوتے

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر اللہ ارادہ کرتا تو سارے انسان ایک دین پر ہوتے اور کوئی بھی مشرک نہ ہوتا لیکن سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ لوگوں کو اختیار دیا جائے تاکہ وہ اپنی رغبت سے ہدایت کا راستہ اختیار کریں اور نجات پائیں۔ یا گمراہی کا راستہ اختیار کریں اور ہلاک ہو جائیں۔ اللہ نے تمام انسانوں کو فطرت توحید اور اپنی معرفت کی بنیاد پر پیدا کیا ہے۔ توحیدی فطرت سے انحراف اس پر غفلت کا پردہ پڑنے یا اس سے بھول جانے کا نتیجہ ہے۔ دین کے معاملے میں ان کا اختلاف ان کا ایک دوسرے پر ظلم کرنے اور ایک دوسرے سے کینہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔ لیکن ان ساری چیزوں کے باوجود وہ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے کیونکہ وہ تو قادر مطلق ہے۔

جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 213 میں ارشاد ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۖ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ

"لوگ ایک ہی امت تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں بشارت دینے اور ڈرانے کے لیے پیغمبر بھیجے تاکہ آسمانی کتاب کے ذریعے ان کے اختلافات کا فیصلہ کر لیں۔ انہوں نے اس کتاب کے متعلق اختلاف نہیں کیا مگر واضح نشانیوں کے آجانے کے بعد۔ وہ لوگ سرکشی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اختلاف کا شکار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اپنے اذن سے حق کی جانب ہدایت کی"۔

لہٰذا دنیاوی امور میں لوگوں کا اختلاف کرنا طبیعی امر ہے لیکن ان کا دینی امور میں اختلاف کرنے کا انگیزہ ظلم اور تجاوز ہے۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

”مگر جس پر تیرے رب نے رحم کیا، اور اسی لیے انہیں پیدا کیا ہے، اور تیرے رب کی یہ بات پوری ہو کر رہے گی کہ البتہ دوزخ کو اکٹھے جنوں اور آدمیوں سے بھر دوں گا“۔

جہنم کو ظالموں سے پُر کرنے کا وعدہ

اس آیت میں کہا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دینی معاملات میں پائے جانے والے اختلافات کو دور کرکے بعض افراد؛ مومنوں پر رحم کیا ہے۔ اور انہیں حق کے راستے کی ہدایت دی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ نہیں فرمایا ہے کہ لوگوں کے دنیاوی امور سے متعلق اختلافات کو بالکل ختم کردے۔ کیونکہ یہ اختلافات انسانی معاشرے کے لوازم اور ضروریات میں سے ہیں۔ کیونکہ مختلف افراد کے مختلف اہداف اور مقاصد ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک جسمی اور روحی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے متفاوت ہیں۔ اور یہ ایک طبیعی امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس امر یعنی ان پر رحمت کرنے کے لیے خلق کیا ہے۔ لیکن ستمگاروں نے ظلم اور تجاوز کرتے ہوئے اختلاف کیا ہے اور حق اور باطل کو ایک دوسرے کے ساتھ مشتبہ کیا ہے۔ جیسا کہ پچھلی آیات میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی ان امتوں کو ہلاک نہیں کرتا جو اپنی اصلاح کرلیتے ہیں۔ یہاں پر بھی یہی کہا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس لئے خلق نہیں کیا ہے تاکہ وہ زمین پر فساد پھیلائیں اور ایک دوسرے پر ظلم

کریں اور ایک دوسرے کا خون بہائیں۔ اور آخر میں انہیں ہلاک کرے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ اس کی تسبیح کریں اور اس کی حمد بجالائیں۔ اس بارے سورۂ ذٰریت کی آیت 56 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: "میں نے جن وانس کو پیدا نہیں کیا ہے مگر اس لیے کہ وہ عبادت کریں"۔

آخر میں فرمایا کہ تمہارے پروردگار کا کلمہ محقق ہوا، اور اپنے مصداق کو ان سے لے لیا۔ کیونکہ انہوں نے علم حاصل کرنے کے بعد حق کے بارے میں اختلاف کرے کہ اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اپنے آپ کو جہنم کے عذاب کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلمہ یہ ہے کہ اس نے قسم اُٹھائی کہ وہ جہنم کو جن وانس کے ظالموں سے بھر دے گا۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

"اور ہم رسولوں کے حالات تیرے پاس اس لیے بیان کرتے ہیں کہ ان سے تیرے دل کو مضبوط کر دیں، اور ان واقعات میں تیرے پاس حق بات پہنچ جائے گی اور ایمانداروں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے"۔

پیغمبروں کے حالات بیان کرنے کا مقصد

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کی خبریں بیان کرنے کا ہدف بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم نے ان داستانوں کو اس لیے بیان کیا ہے تاکہ مبداء و معاد اور بندوں کے بارے اللہ کی سنت کے متعلق اللہ کے کلام کا حق ادا ہو جائے۔ یعنی اس کلام کا مقصد رسول اللہ ﷺ کو حق کی تعلیم دینا اور مومنوں کو تذکر دینا اور یاد دہانی اور نصیحت

کرنا اور کافروں کے لیے اتمام حجت کرنا ہے۔ جیسا کہ اس کے متعلق بعد والی آیت میں بیان کیا جائے گا۔

لہٰذا اس آیت میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب کیا گیا ہے کہ آپؐ کے لیے انبیاء کے قصے بیان کرنے کا مقصد تیرے دل کو استوار کرنا ہے تاکہ تم الٰہی طریقے اور حق کی دعوت پر استقامت کرو اور شریعت کے تقاضوں کے مطابق اور احکام الٰہی کی روشنی میں فساد کی جڑوں کو اکھاڑ ڈالو۔ یہ سارے معارف برحق ہیں جو مومنین کو فطری امور کی یادآوری کراتے ہیں جن سے وہ غافل ہو چکے ہیں۔ اور ان کے لیے سرمایہ عبرت ہیں۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

"اور ان سے کہہ دو جو ایمان نہیں لاتے کہ اپنی جگہ پر کام کیے جاؤ، ہم بھی کام کر رہے ہیں"۔

وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

"اور انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہیں"۔

کافروں کو انتباہ

یہ آیت بھی اسی خطاب کا تسلسل ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا ہے کہ اگر یہ کفار ان حالات اور واقعات سے متذکر نہیں ہوتے اور ان آیات سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور تم سے دشمنی ختم نہیں کرتے تو ان سے کہہ دو کہ ٹھیک ہے تم اپنے اسی مقام پر رہو اور جو تم اپنے لیے بہتر سمجھ رہو وہ کرتے رہو اور اس میں کوتاہی نہ کرو۔ ہم بھی اپنا عمل جاری رکھیں گے اور پھر منتظر رہو۔ تاکہ دیکھیں کہ تمہارے اعمال کا

انجام تمہیں کہاں لے جاتاہےاور ہم بھی منتظر رہتے ہیں تاکہ بہت جلد الٰہی خبر کی سچائی ثابت اور تمہارا جھوٹ آشکار ہو جائے۔

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

"اور آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ بات اللہ ہی جانتا ہے اور سب کام کا رجوع اللہ کی طرف ہے پس اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو، اور تیرا رب بے خبر نہیں اس سے جو کرتے ہو"۔

پوشیدہ امور کے متعلق اللہ کا علم

کفار کے کام کا انجام اور ان کے امر کی عاقبت اور حکم الٰہی کی بنیاد پر جو تمہارے درمیان فیصلہ ہونا ہے یہ ان غیبی علوم میں سے ہے جس کا علم صرف تیرے پروردگار کے پاس ہے۔ اجمالی طور پر جان لو کہ سارے امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں، نہ کہ ان خیالی معبودوں کے ہاتھ میں جنہیں مشرکین نے اپنا معبود بنا رکھا ہے اور نہ ان اسباب ظاہری کے پاس جن پر وہ اعتماد کرتے ہیں۔ لہٰذا اے پیغمبرؐ! تم اپنے فریضے کو جاری رکھو اور اپنے پیروکاروں کے ساتھ مطمئن رہو کہ بہت جلد زمانہ پلٹے گا اور حالات کافروں کے خلاف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سارے امور کو اپنے فائدے اور اپنی نفع میں مکمل کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی وہ پناہ گاہ اور سہارا ہے جس پر کوئی غالب نہیں آسکتا ہے اور کوئی بھی اسے مغلوب نہیں کرسکتا لہٰذا مناسب یہی ہے کہ تم فقط اسی کی پرستش کرو، اسی پر اعتماد کرو اور اس کے علاوہ کسی اور کا سہارا نہ لو اور اللہ کے علاوہ کسی اور پر توکل نہ کرو۔ کیونکہ ظاہری اسباب پر اعتماد کرنے کا منشاء جہالت ہے۔ تمام اسباب

کی سببیت اللہ کی جانب سے ہے اور خدا اپنے بندوں کے اعمال سے بالکل غافل نہیں ہے لہٰذا اس کی عبادت میں کوتاہی بالکل جائز نہیں ہے۔

سورۂ یوسف

(مکی۔ کل آیات 111)

اس سورت کے مطالب

یوسفؑ اور خاندان یعقوبؑ کے واقعات کا بیان۔ اللہ کے مخلص بندوں کے لئے اللہ کی ولایت کا تذکرہ۔ اللہ کے اس خالص عبد کا حوالہ جس نے اغیار سے اپنے دل کو خالی کیا اور دل میں فقط اللہ کو بسایا تو اللہ ہی نے اس کے سارے امور کو سنبھال لیا، اگرچہ سارے لوگ اس

کے خلاف تھے۔ اللہ کی بزرگی وعظمت اور غالب ہونے کا بیان۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۟﴿۱﴾

"ال ر، یہ روشن کتاب کی آیات ہیں۔"

کتاب کا تذکرہ

ا،ل ر، حروف مقطعات میں سے ہیں۔ جیسے ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے درمیان خاص رموز ہیں۔ سورہ کے شروع میں ذکر شدہ ان حروف مقطعات کا اس سورہ کے مضمون سے تعلق ہوتا ہے۔ وہ سورتیں جو حروف مقطعات سے آغاز ہوئی ہیں ایک طرح سے یہ ساری سورتیں بعض موارد میں مشترک ہیں۔ یہ حروف اس بات کی جانب بھی اشارہ ہیں کہ قرآن معجزہ ہے اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان ہی حروف تہجی سے جنہیں سارے لوگ استعمال کرتے ہیں استفادہ کیا ہے اور ایسی کتاب ترتیب دے دی ہے جس کے مضامین بہت بلند ہیں اور اعلیٰ مطالب پر مشتمل ہیں۔ تِلۡکَ، یہ دُور کے لئے اشارہ ہوتا ہے لیکن یہاں تِلۡکَ کہہ کر قرآن کی عظمت اور اس کی بزرگی کو بیان کیا گیا ہے۔ تو یہاں پر "تِلۡکَ" اسم اشارہ ہے جو دور کے اشارے کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہاں پر قرآن کی عظمت اور بلند شان کو بیان کرنے کے لیے اس سے لایا گیا ہے۔ کتاب مبین سے قرآن پاک مراد ہے کہ جو خود واضح ہے اور اس میں حقائق اور معارف الٰہی جن میں مبداء و معاد کی باتیں ہیں سب کو روشن کیا گیا ہے اور ان کی وضاحت دی گئی ہے۔ اس سورہ میں قرآن کو "کتاب مبین" کے لفظ سے یاد کرنے کا مقصد شاید یہ ہو کہ اس میں یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا تذکرہ ہوا ہے، تو ممکن ہے کہ یہاں پر کتاب مبین سے لوح محفوظ مراد ہو۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲﴾

''ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں تمہارے سمجھنے کے لیے نازل کیا''۔

قرآن کا عربی زبان میں نزول

اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرمارہا ہے کہ ہم نے قرآن کو نازل کرنے کے مرحلے میں عربی زبان میں اتارا۔ اس طرح کے الفاظ ہم نے قرار دیے جو عربوں کے ہاں معمول کے مطابق استعمال ہوتے تھے تاکہ تیری امت اسے سمجھ سکے۔ اگر ان حقائق اور رموز کو وحی کے مرحلہ میں پڑھے جانے والے الفاظ کے سانچے میں نہ ڈھالتے تو تیری قوم انہیں سمجھ نہ سکتی اور یہ حقائق اور رموز فقط تیری دریافت اور تیری سمجھ تک محدود رہتے۔ عقلمند انسان تھوڑے سے تدبر کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ یہ عظیم کتاب جو اس زبان میں نازل ہوئی ہے جو زبان پوری اُمت عرب کے دسترس میں ہے اور لوگ اس جیسی ایک سورہ لانے سے بھی عاجز ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب حتمی طور پر وحی ہے اور اللہ کی جانب سے نازل ہوئی ہے، اس بارے سورۂ زخرف کی آیت ۲ اور ۴ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّا جَعَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۳﴾ وَ اِنَّهٗ فِيۡۤ اُمِّ الۡكِتٰبِ لَدَيۡنَا لَعَلِىٌّ حَكِيۡمٌ ﴿۴﴾

ترجمہ: ''بتحقیق ہم نے قرآن کو عربی زبان میں قرار دیا ہے تاکہ تم اس کو سمجھ سکو اور بتحقیق یہ کتاب اُم الکتاب میں ہمارے پاس بہت ہی بلند جگہ پر موجود ہے اور محکم ہے اسے کوئی نقصان نہیں دے سکتا۔''

اس میں نہایت ہی لطیف اشارہ موجود ہے کہ عرب لوگ حروف تہجی کے ساتھ ہی عربی جملے تیار کرتے تھے۔ قرآن مجید بھی ان ہی حروف تہجی سے مرتب ہوا ہے اور انہی حروف تہجی سے جملہ بندی کرکے اس میں اعلیٰ مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ان حروف تہجی کو

وہ بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن اس ترتیب سے ایک سورہ بھی اس جیسی بنا کر نہیں لا سکتے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کلام عام انسان کا تیار کردہ نہیں ہے، یہ خالق کائنات کا تیار شدہ ہے۔

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ ‌ۖ وَاِنۡ كُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِيۡنَ ۝۳

''ہم تیرے پاس بہت اچھا قصہ بیان کرتے ہیں اس واسطے کہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن بھیجا ہے، اور تو اس سے پہلے البتہ بے خبروں میں سے تھا''۔

قرآن میں بہترین قصے

'' نَقُصُّ '' کسی نشان کی پیروی کرنے اور پاؤں کے اثر اور نشان کے پیچھے چلنے کے معنی میں ہے۔ یوسف علیہ السلام کا واقعہ بہترین داستان ہے جس میں عبودیت میں توحید کا اخلاص بیان ہوا ہے۔ نیز اس قصے سے بندے پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ولایت آشکار ہوتی ہے کہ وہ کس طرح اپنے خاص بندے کو ذلت اور پستی کے گڑھے سے نکال کر عزت کی بلندی پر پہنچاتا ہے اور اسے اپنی روش اور محبت کے راستے میں تربیت کرتا ہے۔ اگر داستان سرائی بھی ہو تو پھر یہ بہترین داستان ہے کیونکہ عاشقانہ قصے کو اس طرح بیان کرنا ممکن نہیں ہے، کوئی ایسی داستان کو اس طرح پاکیزہ تر اور پوشیدہ تر بیان نہیں کر سکتا۔ بہر صورت پیغمبر ﷺ کو خطاب ہے کہ ہم نے وحی کے ذریعے اس داستان کو تیرے لئے آشکار کیا ہے، تو اس سے پہلے اس واقعہ سے بے خبر تھا۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ جو موضوعات ہم قرآن میں بیان کر رہے ہیں اس سے پہلے ان موضوعات کے متعلق تمہیں کوئی خبر نہیں تھی۔

اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡہِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ رَاَیۡتُہُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ ﴿۴﴾

''جس وقت یوسف نے اپنے باپ سے کہا اے باپ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو خواب میں دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں''۔

یوسفؑ کے ماجرا کا آغاز

یوسفؑ کے قصے کا آغاز ایک خواب سے ہے۔ وہ اس خواب کو اپنے بابا یعقوبؑ کے لئے بیان کرتے ہیں۔ اس خواب میں حضرت یعقوب کو یوسفؑ کے متعلق دو طرح کی چیزیں دکھائی گئیں۔ ان میں سے ایک مادی امر تھا جس میں حضرت یوسفؑ اپنے بابا سے کہتا ہے کہ میں نے خواب میں ستارے، چاند اور سورج دیکھا ہے۔ دوسرا معنوی امر، جس میں انہوں نے اپنے بابا سے کہا کہ ستارے، چاند اور سورج خضوع اور تعظیم کے ساتھ ارادے، علم اور عقل سے ان کے لیے سجدہ کر رہے ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس سچے خواب کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کی تربیت کا آغاز کیا اور اس جانب اشارہ کیا کہ ان کا مستقبل درخشاں ہے تاکہ ان کے لئے بشارت ہو اور آئندہ کے نامناسب حالات برداشت کرنے سے نہ گھبرائیں۔

روایت میں آیا کہ یہ سورہ عام الحزن کے بعد نازل ہوئی، یعنی حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا اور حضرت ابو طالب علیہ السلام کے وفات کے سال یہ سورہ نازل ہوئی۔ اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے پیغمبر اکرم ﷺ کو تسلی دی جائے اور انہیں خوشحال کیا جائے اور بتا دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کے لیے مشکلات اور سختیوں سے گزرنے کے بعد ہی راہ نکلتی ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ مکہ میں جن مشکلات

میں تھے، مکہ سے نکلنے کے بعد ان کی یہ سختیاں، آزمائشیں اور دشواریاں دور ہو جائیں گی اور ان کے حالات میں بہتری آئے گی۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۵

''کہا اے بیٹے اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے نہ بیان کرنا وہ تیرے لیے کوئی نہ کوئی سازش تیار کر دیں گے، بے شک شیطان انسان کا صریح دشمن ہے''۔

بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع

''بُنَيَّ'' تصغیر کے لیے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ، یوسف سے بہت پیار و محبت کرتے تھے۔ جب حضرت یعقوبؑ نے یوسفؑ کا خواب سنا تو انہیں پتا چلا کہ ان کے امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور عنقریب وہ اسے بلند مرتبہ عطا کرے گا۔ وہ یوسفؑ کو بہت چاہتے تھے، اس لیے اس بات سے ڈر گئے کہ اگر یوسفؑ اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان کریں گے تو کہیں وہ حسد کی وجہ سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں تاکہ ان کے خواب کی تعبیر کو پورا نہ ہونے دیں۔ ان کے اس احتمالی کام کو شیطان کی طرف نسبت دی، کیونکہ شیطان انسان کو دھوکہ دے کر اسے برے کام کا ارتکاب کرواتا ہے۔ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے کیونکہ حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ کو بہت چاہتے تھے اس لئے انہوں نے حضرت یوسفؑ کو ان کے مستقبل کے متعلق بشارت دینے سے پہلے، بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع کیا۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۠﴿۶﴾

''اور اسی طرح تیرا رب تجھے برگزیدہ کرے گا اور تجھے خواب کی تعبیر سکھائے گا اور اپنی نعمتیں تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر پوری کرے گا جس طرح کہ اس سے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق پر پوری کر چکا ہے، بے شک تیرا رب جاننے والا حکمت والا ہے''۔

روشن مستقبل کی بشارت

حضرت یعقوبؑ نے یوسفؑ کو ان کے روشن مستقبل کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہیں برگزیدہ قرار دے گا۔ اور تجھے خواب کی تعبیر سکھائے گا اور اپنی نعمتیں تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر پوری کرے گا جس طرح کہ اس سے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق پر پوری کر چکا ہے، بے شک تیرا رب جاننے والا حکمت والا ہے۔ ''تَاْوِيْلِ'' ایسا واقعہ جو خواب دیکھنے کے بعد پیش آتا ہے جس سے خواب کی تعبیر پوری ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسفؑ نے خواب میں دیکھا تھا کہ سورج، چاند اور ستارے ان کو سجدہ کر رہے ہیں، تو ان کے خواب کی تعبیر، ان کے والدین اور بھائیوں کے ان کے سامنے سجدہ کرنے کی صورت میں پوری ہوئی۔ ''اَحَادِيْثِ'' ان واقعات اور حوادث کو بھی کہا جاتا ہے جنہیں انسان خواب میں دیکھتا ہے اور ان واقعات اور حوادث کو بھی کہا جاتا ہے جن کا وہ بیداری کی حالت میں مشاہدہ کرتا ہے۔

انسان کے خواب کی حالت میں دیکھے گئے واقعات اور بیداری کی حالت میں رونما

ہونے والے واقعات کے درمیان قریبی رابطہ ہوتا ہے۔ اصولی طور پر انسان کے سارے خواب سچے نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان میں سے کچھ شیطان کے القائات ہوا کرتے ہیں اور بعض خواب انسان کے مزاج کا نتیجہ ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو انسان کے روزمرہ کے کاموں کا اثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا تعبیر خواب کا علم حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک طرح کی ہدایت تھی جسے اس نے اپنے بندے یوسفؑ کو عطا کیا۔ جس کے نتیجے میں یوسفؑ اللہ کے اذن سے خواب کی تعبیر بیان کر سکتے تھے اور خواب اور واقعیت کے درمیان رابطہ برقرار کر سکتے تھے۔ حدیث نفس اور حقائق کی تعبیر بیان کر سکتے تھے۔

"نِعۡمَت" اچھی اور خوشحال کرنے والی حالت کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ساری چیزیں جیسے مال و دولت، مقام، زوجہ اور اولاد اور ان جیسی چیزیں مطلق طور پر نعمت نہیں ہوا کرتی۔ یہ چیزیں اس صورت میں نعمت شمار ہوتی ہیں جب یہ سعادت کے راستے پر چلنے میں انسان کی مدد کریں اور انسان کے رنگ الٰہی میں رنگنے کا سبب بنیں اور اسے اللہ کے نزدیک کردیں۔ اگر اللہ کی دی ہوئی چیزوں میں یہ خصوصیات نہ پائی جائیں تو وہ نعمت نہیں بلکہ نقمت اور عذاب ہوتی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوسفؑ کے لیے جس نعمت کے تکمیل کرنے کی بات کی ہے اس سے حکم، نبوت، مصر کی حکومت اور عزت مراد ہے۔ اسی طرح ان کو اپنے خالص بندوں میں سے قرار دینا، انہیں خواب کی تعبیر سکھانا بھی ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کی نعمات میں سے ہے۔ خاندان یعقوبؑ پر اللہ کی نعمات سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے یعقوبؑ کو یوسفؑ جیسا بیٹا عطا کیا، انہیں اور ان کے خاندان والوں کے صحرا سے شہر لے آیا اور مصر کے بادشاہوں کے محلوں میں ان کو خوشحال زندگی گزارنے کا موقع فراہم کیا۔ ان کے آبا و اجداد یعنی ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر نعمت عطا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں دنیا اور آخرت کے خیر سے نوازا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی یہ نعمات حضرت یعقوبؑ کے خاندان میں ہمیشہ جاری رہیں۔ تمہارا پروردگار علیم

ہے اور کوئی بھی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔ وہ اپنے بندوں کے حالات سے بھی آگاہ ہے اور حکیم بھی ہے لہٰذا وہ ہر کسی کو اتنا عطا کرتا ہے جتنا وہ حقدار ہے۔ وہ اپنی تدبیر میں خطا نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ آپ پر ستم کرنے والے کتنے عذاب کے حقدار ہیں۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝۷

''البتہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں پوچھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں''۔

یوسفؑ اور ان کے بھائیوں میں نشانیاں

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول خداﷺ سے کچھ لوگوں نے داستان یوسفؑ کے متعلق سوال کیا تو ان کے جواب میں یہ سورہ نازل ہوئی۔ حضرت یوسفؑ کی داستان کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ ان کے بھائیوں نے ان سے حسد کرتے ہوئے انہیں کنویں میں ڈال دیا اور پھر ایک قافلہ والوں نے انہیں غلام بنا کر مصر میں بیچ دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے یوسفؑ کو اپنے راستے سے ہٹا دیا ہے اور انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یوسف کو ان ہی کے مشکل وقت میں کام آنے کے واسطے زندہ رکھا، ان کے بھائیوں نے ان کو جتنا ذلیل اور رسوا کرنے کا ارادہ کیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں اتنی ہی عزت اور مقام عطا کیا۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی خالصانہ عبادت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے امور کو اپنے ہاتھ لے لیتا ہے اور اسے بلند مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت ایسی نہیں اور وہ اس قوم کے واقعات کو سمجھتے ہی نہیں۔

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۝۸

''جب انہوں نے کہا البتہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارا ہے جبکہ ہم مضبوط جماعت ہیں، بے شک ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے''۔

یوسفؑ کے بھائیوں کا اعتراض

یوسفؑ اور اس کا بھائی بنیامین ایک ماں سے تھے اور باقی بھائی دوسری ماؤں سے تھے۔ وہ بہت طاقتور اور تگڑے جوان تھے اور گھر کے سارے امور اور معاملات وہی سنبھالتے تھے۔ جانور اور اموال سب ان کے سپرد تھے۔ وہ ایک دوسرے کے مددگار اور دشمن کے مقابلے میں دفاعی قوت بھی تھے۔ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی جو ابھی چھوٹے بچے تھے ان سے زیادہ پیار و محبت کرتے تھے۔ یہ بات دوسرے بھائیوں کو اچھی نہیں لگتی تھی اور اُن کی نظر میں یہ سب سیدھے راستے سے گمراہی اور کج سلیقے کا نتیجہ تھی۔ اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ یعقوبؑ کے بیٹے خداپرست تھے اور اپنے بابا کی نبوت کا عقیدہ بھی رکھتے تھے۔ لیکن حسد نے انہیں یہاں لاکھڑا کیا تھا۔ ان کا ہدف یہ تھا کہ اپنے بابا کی محبت اپنی طرف کھینچ لیں۔ لیکن یہ سوال ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ان دو بیٹوں سے زیادہ پیار کیوں کرتے تھے؟ اس کے بارے میں کہا جائے کہ اللہ کا نبی علم نبوت سے دیکھ رہا تھا کہ ان کی پیشانی میں کمال اور تقویٰ کے آثار موجود ہیں لہٰذا ان سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ ان سے حضرت یعقوبؑ کی محبت ہوا و حوس اور خواہشات نفسانی کی بنا پر نہیں تھی کیونکہ پیغمبر معصوم ہوتا ہے اور ہر قسم کے وہمیات سے عاری ہوتا ہے۔

اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ﴿٩﴾

''یوسف کو مار ڈالو یا کسی زمین (ویرانے) میں پھینک دو تاکہ باپ کی توجہ اکیلے تم پر

رہے اور اس کے بعد نیک آدمی ہو جانا''۔

یوسفؑ کے خلاف بھائیوں کی سازش

انہوں نے آپس میں مشورہ کر لیا کہ کس طرح اپنے باپ کی محبت اپنی جانب کھینچ لیں؟ اس پر یوسفؑ کے بھائیوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ یوسفؑ کو کہیں دور پھینک آئیں یا اسے قتل کر دیں۔ قتل کرنا، شرک کے بعد سب سے بڑا جرم ہے۔ ''طرح'' کا مطلب ہے یوسف علیہ السلام کو ایسی دور جگہ چھوڑ دیں جہاں سے وہ واپس نہ آسکیں۔ اس کے بعد جب یوسف علیہ السلام جن سے بابا بہت پیار کرتے ہیں نہیں رہے گا تو پھر ان کی محبت ہمارے ساتھ ہو گی اور ان کی ساری توجہ ہماری طرف ہو جائے گی۔ انہوں نے خود ہی کہا کہ اس گناہ کرنے کے بعد ہم توبہ کرلیں گے اور نیک لوگ بن جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مومن تھے اور گناہ اور صحیح بات کو سمجھتے تھے۔ لیکن حسد ان پر غالب تھا اور شیطان نے ان کے لئے یہ برا عمل خوبصورت بنا کر پیش کر دیا اور اُن کو یہ تلقین کی تھی کہ اس عمل کے کرنے کے بعد وہ توبہ کر سکتے ہیں۔ وہ اس بات سے غافل تھے کہ ایسی توبہ کبھی قبول نہیں ہوتی، توبہ اُن کی قبول ہوتی ہے جو جہالت کی وجہ سے گناہ کا ارتکاب کریں، خطاء کو صحیح سے جدا نہ کر سکیں، لیکن جو جانتے ہوں کہ گناہ ہے اور یہ بات غلط ہے اور پھر سازش کریں، چکر چلائیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں کرتا۔
سورہ النساء آیت ۱۷ میں ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ . . .

ترجمہ: ''سچ بات تو یہ ہے کہ توبہ اللہ کے ہاں ان کے لئے ہے جو ناجائز عمل کرتے ہیں، جہالت کی وجہ سے برا عمل کرتے ہیں اور پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں...''۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں اصلاح سے دُنیاوی زندگی میں صحیح راستے

پر ہونا اور بہتری پر ہونا اور دُنیا کے امور کو اچھے انتظام سے چلانا مراد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسفؑ کے بعد ہم اچھی زندگی گزار رہے ہوں گے اور باپ کے ہمراہ خوش و خرم رہیں گے، ہماری خوشحال زندگی ہوگی۔[1]

قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ وَ اَلۡقُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُبِّ يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّيَّارَةِ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ۝۱۰

"ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو اور اسے گمنام کنوئیں میں ڈال دو کہ اسے کوئی مسافر اٹھالے جائے اگر تم کرنے ہی والے ہو"۔

یوسفؑ کے قتل کی راہ میں رکاوٹ

"جُبّ" ایسا کنواں جس کا کنارہ نہ ہو۔ جب یوسفؑ کے کچھ بھائیوں نے انہیں قتل کرنے کا مشورہ دیا تو ان میں سے بعض نے جنہیں یوسفؑ سے ذرا پیار تھا[2] کہا اسے گہرے کنوئیں میں پھینک دو تاکہ وہاں سے گزرنے والے مسافروں کے قافلے اس کنوئیں کے قریب سے گزریں اور اسے اٹھالیں اور کسی دُور سرزمین پر لے جائیں۔ پھر ایسے ہی ہوا اور یہ فیصلہ ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو لے جائیں گے لیکن قتل نہیں کریں گے بلکہ انہیں کنوئیں میں ڈال دیں گے۔

قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاۡمَنَّا عَلٰى يُوۡسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوۡنَ ۝۱۱

---

[1] ۔ رُوح المعانی جلد ۱۲، صفحہ ۱۹۲۔

[2] ۔ جو قوی احتمال کی بنا پر روبین، یہودا یا لاوی میں سے ایک تھا۔

''انہوں نے کہا اے باپ کیا بات ہے کہ توں یوسف کے متعلق ہمارے اوپر اعتبار نہیں کرتے اور ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں۔''

یوسفؑ کو اپنے ساتھ لے جانے کی منصوبہ بندی

بظاہر حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اس بھائی کی تجویز کو قبول کیا تھا جس نے انہیں قتل نہ کرنے کی تجویز دی تھی۔ اب اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پہلی بات تو یہ تھی کہ والد کے اعتماد کو جلب کیا جائے۔ لہٰذا وہ والد کے پاس گئے اور بڑے پیار و محبت کے انداز میں ان سے کہا بابا جان! ہم تو یوسف کے بڑے خیر خواہ ہیں اور ہم ہمیشہ ان کی رضایت اور شادمانی چاہتے ہیں، اسے ہمیشہ خوش رکھتے ہیں اور ہم تو ان کے بارے میں کوئی غلط خیال نہیں رکھتے اور ایسا بھی نہیں چاہتے کہ کوئی ایسا کام کریں جس سے ہمارے بابا کا دل رنجیدہ ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے کہ یوسفؑ ہمارے ساتھ ہو، ہم تو ان کے خیر خواہ ہیں۔

اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا یَّرۡتَعۡ وَ یَلۡعَبۡ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۱۲﴾

''کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کہ وہ کھائے، پیئے اور کھیل کود سے لطف اندوز ہو اور بے شک ہم اس کے نگہبان ہیں''۔

یوسفؑ کو سیاحت کے لیے لے جانا

''ارتع'' اگر حیوان کے لئے استعمال ہو تو حیوان کے چرنے کے معنی میں ہوتا ہے اور اگر انسان کے لئے استعمال ہو تو سیر سپاٹا اور پھل فروٹ کھانے اور خوشگوار ماحول میں گھومنے پھرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ یوسفؑ کے بھائیوں نے بڑی تاکید کی جس کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے، سب سے پہلے حرف تاکید ''انّ'' لایا گیا ہے، اس کے بعد ''لام تاکید'' ذکر ہوا ہے،

تیسری تاکید جملے کا اسمیہ ہونا ہے جو تاکید کے معنی میں ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ ضرور اور ہر صورت میں ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ تاکہ وہ اس طرح اپنے والد کے دل کو مطمئن کر سکیں۔ پہلی آیت میں انہوں نے کہا تھا کہ ہم ان کے خیر خواہ ہیں اور یہاں کہا کہ ہم ان کی حفاظت کریں گے۔ یہ سب اس لئے کہہ رہے تھے تاکہ اپنے باپ کو مطمئن کر سکیں تاکہ وہ یوسفؑ کو ان کے ساتھ بھیج دیں۔ اس طرح انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو راضی کر لیا تاکہ یوسفؑ کو ان کے ساتھ صحراء بھیج دیں۔

قَالَ اِنِّیۡ لَیَحۡزُنُنِیۡۤ اَنۡ تَذۡهَبُوۡا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنۡ یَّاۡکُلَهُ الذِّئۡبُ وَ اَنۡتُمۡ عَنۡهُ غٰفِلُوۡنَ ﴿۱۳﴾

''اس نے کہا مجھے اس سے غم ہوتا ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا نہ کھا جائے اور تم اس سے بے خبر رہو''۔

حضرت یعقوبؑ کی پریشانی

اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا جواب ذکر ہوا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے نہیں کہا کہ میں تمہاری باتوں سے مطمئن نہیں ہوں بلکہ ایک اور انداز سے اپنے مقصد کو بیان کیا اور بڑے پیار و محبت سے اس کی شرح دی اور کہا کہ یوسفؑ کو تمہارے ساتھ نہ بھیجنا اس کے ساتھ تمہاری دشمنی کی وجہ سے نہیں۔ اور نہ ہی اس انداز سے کہا کہ ان کی مخالفت کو بھڑکا دیں، بلکہ تاکید کی کہ جب تم اس کو لے جاؤ گے تو حتمی طور پر میں اس کے جانے سے پریشان ہوں گا اور مجھے ڈر ہے کہ تم ایک ایسا عذر پیش کرو جو قابل قبول ہو یا تم وہاں اس سے غافل ہو جاؤ اور بھیڑیا اسے کھا جائے، کیونکہ چراہ گاہ اور بیابان میں بھیڑیئے تو بہت زیادہ ہوتے ہیں، اور یوسفؑ سے غافل ہونا بھی ایک طبیعی امر ہے ممکن ہے اس طرح یوسفؑ کو نقصان پہنچے

۔مجھے یہ غم کھائے جارہا ہے۔اس بہانے سے حضرت یعقوبؑ چاہ رہے تھے کہ حضرت یوسفؑ کے جانے کے سامنے رکاوٹ بنیں اور یوسفؑ کو ان کے ساتھ نہ بھیجیں۔

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

''انہوں نے کہا اگر اسے بھیڑیا کھا گیا جبکہ ہم تو ایک طاقتور جماعت ہیں تو بے شک (ایسی صورت میں) ہم حتمی طور پر ہم نقصان اٹھانے والے ہوں گے''۔

یوسفؑ کے بھائیوں کا جواب

حضرت یعقوبؑ کے جواب میں یوسفؑ کے بھائیوں نے اپنے آپ کو جاہل بنا کر پیش کیا۔ گویا وہ کہنا چاہتے تھے کہ ہمیں سمجھ نہیں آرہی کہ ہمارے باپ کا مقصد کیا ہے اور وہ ہمیں امین نہیں سمجھتا۔ بلکہ انہوں نے اس طرح کہا کہ ہم اتنے بڑے طاقتور اور تعداد میں زیادہ لوگ ہیں اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بھیڑیا آئے اور ہمارے بھائی کو کھا جائے۔ ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اگر اس حالت میں بھیڑیا اسے کھا جائے تو پھر ہم نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔ ان کی تاکید اور قسم کھانے کا سبب والد کے دل کو خوش رکھنا اور یوسفؑ کو اپنے ہمراہ لے جانا تھا تاکہ حضرت یعقوب راضی ہو جائیں اور رکاوٹ نہ بنیں۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''جب اسے لے کر چلے اور متفق ہوئے کہ اسے گمنام کنوئیں میں ڈالیں، تو ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی کہ تو ضرور انہیں ایک دن آگاہ کرے گا ان کے اس کام سے اور وہ تجھے نہ پہچانیں گے''۔

یوسفؑ کے متعلق بھائیوں کا اجماع

بہرحال یوسفؑ کے بھائی انہیں اپنے ساتھ صحراء لے جانے میں کامیاب ہوئے اور والد کو راضی کر لیا۔ اس بات پر بھی انہوں نے اتفاق کر لیا کہ یوسفؑ کو گہرے کنوئیں میں ڈالیں گے۔ آیہ شریفہ میں "لمّا" کا جواب حذف ہے تاکہ ان کے عمل کی برائی اور قباحت کی شدت کی جانب اشارہ کیا جا سکے۔ ان کا جرم اتنا بڑا ہے کہ اسے بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اصل واقعہ کے متعلق خاموشی اختیار کرنے کے بعد واقعہ کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو بیان کرنا شروع کر دیا ہے۔

فرمایا ہم نے اس بے گناہ بچے کو وحی کے ذریعے بتا دیا کہ تم انہیں ان کے اعمال کی خبر دو گے، جسے اس کے بھائیوں نے اپنے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا تھا، تم اپنے بھائیوں کو ان کے اعمال کی تاویل اور حقیقت کی خبر دو گے کہ تجھے دھتکار رہے تھے اور تیرے نور کو خاموش کرنے کے حوالے سے کتنے برے عمل کے مرتکب ہوئے تھے۔ وہ اس بات سے غافل ہیں کہ اُن کا یہ عمل تجھے سلطنت کے تخت پر پہنچانے اور اس کے قریب کرنے کے مقدمات میں سے ہے اور یہ تیرے مقام کی رفعت اور بلندی کا سبب ہوگا۔ بہت جلد تم ہی یہ مطلب انہیں سمجھاؤ گے۔ البتہ جملہ "لَا یَشْعُرُوْنَ" کے بارے میں کچھ اور مطالب بھی ذکر ہوئے ہیں لیکن وہ کمزور مطالب ہیں۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾

"اور کچھ رات گئے اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے"۔

قَالُوْا یٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾

''کہا اے ہمارے باپ ہم تو آپس میں دوڑنے میں مصروف ہوئے اور یوسف کو اپنے اسباب کے پاس چھوڑ گئے تب اسے بھیڑیا کھا گیا، اور توں ہمارے کہنے پر یقین نہیں کرے گا اگرچہ ہم سچے ہی کیوں نہ ہوں''۔

والد کے سامنے واقعہ کو بیان کرنا

ان دو آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کو انہوں نے کنوئیں میں پھینک دیا اور غروب کے کچھ وقت بعد رات کو واپس آئے۔ اب جب شام کو واپس آئے تو سوچا کہ ایسا طریقہ اپنائیں جس سے اُن کا والد ان کی بات کو مان جائے۔ اس لیے روتے پیٹتے ہلکان پہنچ گئے اور آکر کہا کہ بابا جان! بڑا ظلم ہو گیا ہم گئے تھے اور شکار کر رہے تھے اور آپس میں مقابلے میں لگے ہوئے تھے اور یوسفؑ کو ہم سامان کے پاس چھوڑ گئے تھے اور بھیڑیا آیا اور بھیڑیے نے ان کو کھا لیا اور ہمارے ساتھ ظاہری اسباب جو تھے وہ بھی ختم ہو گئے اور ہمارے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا، بدبختی اور ہماری نااُمیدی یہ ہے کہ ہم سچ بولیں تو بھی آپ ہماری بات کو نہیں مانوگے، یقین نہیں کروگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتے تھے کہ اُن کی یہ بات قابل قبول نہیں ہے اور ان کا عذر گناہ سے بدتر ہے لیکن وہ خود کو سچے اور حق پر ظاہر کر رہے تھے۔ یہ تعبیر اس بات سے کنایہ تھی کہ ہم سچ بول رہے ہیں۔

وَ جَآءُوْ عَلٰی قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور اس کے کُرتے پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے، اس نے کہا نہیں بلکہ تم نے دل سے ایک بات بنائی ہے، اب صبر ہی بہتر ہے، اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس بات پر جو تم بیان کرتے ہو''۔

حضرت یعقوبؑ کا جواب

اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ قمیض کو جو خون لگا ہوا تھا اس سے ان کا جھوٹ واضح ہو رہا تھا کیونکہ جس شخص کو درندہ پارہ پارہ کرتا ہے، اسے کھا جاتا ہے تو معقول نہیں ہے کہ اس کی قمیض سالم ہو۔ لہٰذا جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور جھوٹی بات اور گفتگو میں تناقض ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ چیز اُن کے جھوٹے ہونے پر گواہ تھی۔ اگرچہ ظاہری طور پر انہوں نے واقعہ کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی جس سے ان کا جھوٹ ظاہر نہ ہو لیکن پھر بھی ان کا جھوٹ فاش ہوا کیونکہ عالَم وجود کے اجزاء اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مرتب ہیں کہ اگر انسان ان میں سے کسی ایک جزء کو مخفی کرنا بھی چاہے تو ان تمام حقائق کو کبھی بھی مخفی نہیں کر سکتا جو اس کے ساتھ مربوط ہیں۔ اس لیے ہمیشہ حق کی حکومت برقرار رہتی ہے اور باطل کی حکومت ختم ہو جاتی ہے، اگرچہ لمبے عرصہ تک حکمرانی کرتی رہے، ایک دن باطل حکومت نے ختم ہو کر رہنا ہے۔

اس بارے سورۂ زمر، آیت: ۳ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝۳

ترجمہ: ''سچ یہ ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ جھوٹے کافر کو ہدایت نہیں کرتا''۔

حضرت یعقوبؑ کا صبر

حضرت یعقوبؑ نے ان کے جھوٹ کے مقابلے میں صبر کیا اور فرمایا تمہارے نفس نے اس امر کو تمہارے لئے بڑا خوبصورت بنا کر پیش کیا ہے اور تمہیں وسوسہ کیا ہے وگرنہ امر ایسا نہیں ہے کہ جیسے تم کہہ رہے ہو۔ میں صبر کرتا ہوں، صبر کرنا اچھی بات ہے، شکایت بھی نہیں کرتا، میرے اوپر جو مصیبت وارد ہوئی ہے اسے برداشت کرتا ہوں، بردباری سے کام لیتا ہوں۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ جب ان کے بڑے بیٹے جو قدرت مند تھے اس مصیبت کو

لانے کا سبب تھے تو وہ کس طرح ان سب کو اپنے قریب سے دور بھگا سکتے تھے؟ لہٰذا صبر کرنے کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں تھا۔

اس کلام میں آنحضرت نے سبب کو مسبّب کی جگہ قرار دیا ہے یعنی بجائے اس کے کہ یہ کہے میں مصیبت پر صبر کرتا ہوں کہا کیونکہ صبر اچھی بات ہے لہٰذا صبر کرتا ہوں۔ صبر کو نکرہ لایا گیا ہے تاکہ اس کی عظمت پر دلالت کرے اور اس تحمل کی دشواری اور تلخی کو بیان کرے۔ صبر کا معنی یہ نہیں ہے کہ انسان خود کو ہر مصیبت کے لئے آمادہ کرلے اور اس پست زمین کی مانند بن جائے جو دوسروں کے قدموں تلے روندی جاتی ہے۔ بلکہ صبر یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں استقامت رکھتا ہو، اپنے نفس کو کنٹرول کرے جس سے انسان کی حیات اور پائیداری وابستہ ہے، اپنے دل منتشر ہونے سے اور تدبیر کی بھول سے اور رائے کے فساد سے روک لے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے فطری طور پر انسان کو ایسے پیدا کیا ہے کہ اپنے اوپر آنے والے ناپسندیدہ حالات کو اپنے آپ سے دور کرسکے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ اسے ایسے وسائل دیتا ہے، ایسے ذرائع دیتا ہے کہ جس سے وہ اپنے اندر توانائی پیدا کرتا ہے اور مشکلات کو اپنے سے دُور کرتا ہے۔ صبر اگر مصیبت کے مقابلے میں بیٹھ جانے کے معنی میں ہو تو یہ فضیلت نہیں ہے، صبر کا معنی یہ ہے کہ مصائب میں انسان استقامت کرے اور مشکلات مصائب کو اپنے آپ سے دور کرنے کے لیے سعی وتلاش کرے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

”وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝۱۸“ (سورۂ یوسف، آیت: ۱۸)

یہ یعقوب کی دُعا ہے توکل کے مقام پر، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تم نے اس سلسلے میں چالاکی کی ہے، سازش کی ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یوسفؑ کو بھیڑیئے نے نہیں کھایا لیکن تمہارے جھوٹ کے کشف ہونے اور ظاہری اسباب کے ذریعے یوسفؑ تک دسترسی تک اللہ کے اذن سے میں اللہ پر توکل کرتا ہوں اور صبر کرتا ہوں اور

حقیقت مطلب کے واضح کرنے کی درخواست اللہ تعالیٰ سے کرتا ہوں۔ میں اس مشکل وقت میں اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں اللہ سے مدد مانگتا ہوں، اللہ ان بیٹوں کے مقابلے میں میری مدد کرے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے گویا اپنے اس کلام میں توحید عملی اور توحید فعلی کے اعلیٰ درجے کو بیان کیا ہے کہ تنہا فریاد رس اور مدد دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے علاوہ کوئی مددگار نہیں ہے۔ عبودیت کے مقام پر اپنا نام بالکل نہیں لائے، نہ کہا کہ میں صبر کرتا ہوں یا میں توکل کرتا ہوں بلکہ اللہ کا نام لیا ہے۔ اس قدر یوسفؑ سے محبت تھی اور ان سے تعلق تھا اور غم و اندوہ میں تھے لیکن اس کے باوجود اللہ کی یاد کو نہیں بھولے اور اس مصیبت کے مقابلے میں اللہ سے عشق کو مقدم رکھا اور کہا فقط اللہ ہی میرا مددگار ہے۔ یہ توحید عملی اور فعلی کی اعلیٰ مثال ہے۔ حضرت یعقوبؑ سب کچھ جاننے کے باوجود کہتے ہیں کہ جو بھی ہوا ہے یہ تمہارے نفس نے تمہارے لئے خوبصورت بنا کر پیش کیا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ میرا مددگار ہے اور میں اسی پر توکل کرتا ہوں۔ یعنی توحید عملی اور توحید فعلی کا اعلیٰ نمونہ آپ نے پیش کیا۔

وَ جَآءَتۡ سَیَّارَۃٌ فَاَرۡسَلُوۡا وَارِدَہُمۡ فَاَدۡلٰی دَلۡوَہٗ ؕ قَالَ یٰبُشۡرٰی ہٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَ اَسَرُّوۡہُ بِضَاعَۃً ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾

”اور ایک قافلہ آیا انہوں نے کنوئیں کے پاس اپنا پانی بھرنے والا بھیجا اس نے اپنا ڈول کنوئیں میں لٹکایا، اس نے اچانک کنوئیں سے اس ڈول کے ساتھ ایک لڑکے کو دیکھا تو بے ساختہ قافلوں والوں کے لئے یہ ایک خوشی کی بات ہے کہ کنوئیں سے ایک لڑکا ملا ہے اور اسے تجارت کا مال سمجھ کر چھپالیا اور اللہ خوب جانتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے تھے“۔

یوسفؑ کا کنوئیں سے نجات پانا

کنوئیں کے قریب سے گزرنے والے قافلہ والوں نے ایک شخص کو کنوئیں سے پانی لانے کے لیے بھیجا۔ جب سے وہ شخص پانی لینے کے لئے گیا اور اپنا ڈول کنوئیں میں پھینکا اور ڈول کو باہر کھینچا تو اچانک اس نے کہا خوشخبری! یہ تو لڑکا ہے۔ یوسفؑ بہت ہی خوبصورت تھے تو قافلے والوں نے انہیں چھپا لیا تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کے گھر والے آجائیں اور اسے لے لیں۔ انہوں نے سوچا کہ یوسفؑ ان کا سرمایہ بن گیا ہے اسے بیچ کر پیسے حاصل کریں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے آگاہ تھا جو وہ کیا کر رہے تھے اور کیا سوچا تھا اور ان کے اس عمل کا ان سے مؤاخذہ کرے گا۔ یا یہ کہ ان کے سارے اعمال علم الٰہی کے مطابق انجام پار ہے تھے، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ یوسفؑ کو ایسی راہ پر ڈالیں جس کا اختتام نبوت اور سلطنت پر ہو۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾

"اسے ناقص قیمت پر بیچ آئے گنتی کی چونیوں پر، اور اس سے بیزار ہو رہے تھے"۔

یوسفؑ کا بازار میں فروخت ہونا

حضرت یوسفؑ کو قافلے والوں نے معمولی اور کم قیمت پر بیچ دیا جو اصلی قیمت سے بہت کم تھی کیونکہ وہ ڈر رہے تھے کہ کہیں ان کے گھر والے نہ پہنچ جائیں اور وہ ان کے ہاتھ سے چلا نہ جائے۔ انہیں اس سے زیادہ دلچسپی بھی نہ تھی۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ بچہ ہمارے غلام کا بیٹا ہے اس لیے معمولی قیمت پر کاروان والوں نے اسے بیچ دیا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قافلہ والوں کے لئے یوسفؑ کے بھائیوں نے یوسفؑ کو فروخت کیا، وہ یوسفؑ کی خریداری کے معاملے میں کوئی زیادہ رغبت نہیں رکھتے۔ جب وہ کنوئیں سے یوسفؑ کو نکال لائے تو ایسا لگتا ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں کو پتہ چل گیا کہ قافلہ والوں کے پاس یوسفؑ ہے تو

قافلہ والوں نے ان کے بارے شک کیا۔ یوسفؑ کے بھائیوں نے قافلہ والوں سے کہا کہ ہمارے غلام کا بیٹا ہے اور کہا کہ ہم اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں اس کو خرید لیں۔ قافلہ والے بے رغبت تھے انہوں نے اسے کم قیمت پر خرید کر لیا لیکن آیات کا معنی پہلے معنی سے زیادہ سازگار ہے۔

وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ٘ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اور جس نے اسے مصر میں خرید کیا اس نے اپنی عورت سے کہا اس کی عزت کر شاید ہمارے کام آئے یا ہم اسے بیٹا بنالیں، اس طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں جگہ دی اور تاکہ ہم اسے خواب کی تعبیر سکھائیں، اور اللہ اپنا کام جیت کر رہتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"۔

یوسفؑ کا خریدار

کاروان والے یوسفؑ کو لے آئے، راستے میں انہیں کسی سے ملنے نہ دیا اور پھر مصر میں لاکر بیچ دیا۔ جس شخص نے یوسفؑ کو خریدا تھا وہ مصر کے معزز لوگوں اور اشرافیہ میں سے تھا۔ جب اس نے یوسفؑ کو دیکھا تو اُس کے چہرے پر اُنہیں ہدایت اور رشد و خاندانی شرافت کے آثار نظر آئے۔ اس لئے اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کا خیال رکھو، اس کو عزت دو اور اُن کے معاملات خود دیکھا کرو، ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے بلند مقاصد میں کام آئے اور ہمارے

لئے فائدہ مند ہو اور ہو سکتا ہے ہم اسے اپنی اولاد بنا لیں۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے پھر بات کو اپنی طرف سے بیان کیا کہ ہم نے اس طرح یوسفؑ کو سرزمین مصر میں جگہ عطا کی اور اسے ٹھہرایا۔ "کَذٰلِکَ" اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ہم نے یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالا، عزیز مصر کے گھر میں رہائش دی اور زندگی کی بہترین سہولیات مہیا کیں۔ شاید یہ اشارہ ہو اس قصے کے جاری رہنے کا یعنی ہم اس طرح اسے اس سرزمین پر قدرت دیں گے، وہ جہاں چاہے گا زندگی بسر کرے گا اور لوگوں پر مسلط ہو گا اور اس قدرت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے یوسفؑ کو احادیث کی تعبیر اور تاویل سکھا دی۔ اللہ اپنے امر پر غالب ہے اور ہر چیز اللہ کی اطاعت میں ہے اور سارے اسباب جو بھی تاثیر رکھتے ہیں ان پر اللہ کا غلبہ اور تسلط ہے، سب اللہ کے اذن سے عمل کرتے ہیں۔ اللہ جو چاہے جس پر چاہے ان اسباب کو مسلط کر سکتا ہے۔

ان میں اللہ کی اطاعت کرنے اور اللہ کی بات سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس مطلب کو نہیں سمجھتی۔ کیونکہ وہ ظاہری اسباب کو تاثیر میں مستقل سمجھ رہے ہوتے ہیں، حالانکہ ظاہری اسباب تاثیر میں مستقل نہیں ہوتے، وہ اپنی فعالیت میں اللہ تعالیٰ سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اگر سارے ظاہری اسباب اکٹھے ہو جائیں اور کسی فرد کو ذلیل و خوار کرنا چاہیں لیکن اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو نہیں کر سکتے۔ پس سارے اسباب کی تاثیر اللہ کے اذن سے مربوط ہے۔ وہ جسے چاہے ذلت اور خوارگی سے نکال کر عزت پر پہنچائے یا جسے چاہے عزت سے نکال کر ذلت پر پہنچائے، سب اس کے ہاتھ میں ہے۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

"اور جب اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے حکم اور علم دیا، اور نیکوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں"۔

یوسفؑ کے لیے علم و حکمت

"بلوغ اشُد" عمر کا وہ حصہ جس میں بدنی قوت مضبوط ہو جاتی ہے اور بچگانہ آثار ختم ہو جاتے ہیں، بظاہر یہاں پر اس سے جوانی کی ابتداء سے لے کر عمر کے درمیانی حصہ مراد ہے، یعنی اٹھارہ سال سے چالیس سال تک۔ "حکم" سے حق پر مبنی گفتگو مراد ہے جو ان امور سے اختلاف کو دور کرے جن میں شبہہ اور تردید کا احتمال ہو۔ جس کے پاس حکم ہے، تمام معاملات میں چاہے انسانی ہوں یا دینی یا اخلاقی یا اجتماعی، اس کی بات آخری بات اور حق پر مبنی بات ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جتنے انسانی معارف ہیں یا دینی معلومات ہیں یا اخلاقی اور اجتماعی امور ہیں ان سب میں صحیح اور حتمی رائے رکھنے والی شخصیت کے پاس حکم ہوتا ہے۔ "علم" سے مراد اللہ کا وہ عطیہ ہے جس میں جہالت نہیں ہوتی، نفسانی خواہشات نہیں ہوتیں، شیطانی وسوسے اس میں ملے ہوئے نہیں ہوتے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی بلند حکمت اور یوسف کی لیاقت کی بنیاد پر اسے علم اور حکم کیا۔ ایسا علم جو جہل، وسوسہ اور خواہشات نفسانی سے دور ہو اور فیصلہ کرنے کی ایسی قوت جس میں کوئی شک و تردید نہ ہو۔ آخر میں فرمایا ہم نیک لوگوں کو اس طرح اجر اور بدلہ دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ علم و حکمت اللہ کے دو ایسے عطیے ہیں جو بغیر کسی وجہ کے نہیں ملتے بلکہ ایسی شخصیت کو ملتے ہیں جس میں ان عطیوں کو قبول کرنے کی لیاقت اور ذاتی استعداد اور قابلیت ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہ نیک عمل کا بدلہ ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہر فرد کو اس کے نیک اعمال کی مقدار کے مطابق علم و حکمت عطا کرتا ہے۔

وَ رَاوَدَتۡهُ الَّتِیۡ هُوَ فِیۡ بَیۡتِهَا عَنۡ نَّفۡسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الۡاَبۡوَابَ وَ قَالَتۡ
هَیۡتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیۡۤ اَحۡسَنَ مَثۡوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ
الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۳﴾

''اور جس عورت کے گھر میں تھا وہ اسے پھسلانے لگی اور دروازے بند کر لیے اور کہنے لگی لو آؤ، اس نے کہا اللہ کی پناہ، وہ تو میرا آقا ہے جس نے مجھے عزت سے رکھا ہے، بے شک ظالم نجات نہیں پاتے''۔

یوسفؑ کو زلیخا کی گناہ کی دعوت

''رود'' کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش میں بڑے اطمینان کے ساتھ رفت و آمد کرنے کے معنی میں ہے۔ ''مراودۃ'' کسی کے ارادے میں جھگڑنے کو کہتے ہیں۔ ''هُوَ فِیۡ بَیۡتِهَا'' اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ حالات یوسفؑ کے خلاف تھے کیونکہ یوسفؑ اس عورت کے امر کے تحت تھا، اس عورت کا ان پر غلبہ تھا اور بڑی سخت قسم کی صورتحال یوسفؑ کے لئے پیش آچکی تھی۔

عزیز مصر کی بیوی یوسفؑ کے بے نظیر حسن و جمال کی وجہ سے اس کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ جتنا یوسفؑ بڑا ہوتا جا رہا تھا یہ عورت اس کی محبت میں اتنی ہی زیادہ فریفتہ ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ اس کی طاقت جواب دے گئی۔ جبکہ اس کے مقابلے میں یوسفؑ کی طرف سے کوئی اشارہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ بھی اسے چاہتا ہے؛ آخر کار خود ہی اس نے اپنے آپ کو آمادہ کیا اور یوسفؑ پر سارے دروازے بند کر دیے اور اس کے لئے خلوت مہیا کی اور اپنی عزت نفس اور برتری کو محفوظ رکھنے کے لیے بڑے تحکمانہ انداز میں اسے کہا تم آجاؤ۔ سارے اسباب موجود تھے، خلوت تھی، جوانی تھی، عشق تھا، عورت کا حکم تھا، خوبصورتی

تھی لیکن ان سب کے باوجود یوسفؑ، اللہ کی محبت میں اس قدر غرق تھے، ان کے دل میں غیر خدا کی محبت کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں تھی، وہ اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال میں غرق تھے لہٰذا ایک ہی جملے سے اُس عورت کو نااُمید کر دیا۔ اس لحاظ سے کہ وہ اللہ کے عشق میں غرق تھے، اپنا نام تک نہیں لیا اور نہیں کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، بلکہ یہ کہا معاذ اللہ! اللہ کی پناہ، یعنی مجھ میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کا ہے، اسی کی طرف سے ہے اور وہ میرا یکتا رب ہے جس نے مجھے عزت و کرامت عطا کی ہے اور مجھے اچھا مقام دیا ہے۔ میں کس طرح اس ظالمانہ عمل کا ارتکاب کروں جبکہ میرا پروردگار ظالموں کو کامیاب نہیں کرتا۔

یہ عبارت توحید کے کمال اور حضرت یوسفؑ کی نیت کے خلوص کو بیان کر رہی ہے کہ جس میں شرک اور خود بینی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ یہ عشق و محبت اور جذبہ الٰہی اور مجازی اور حیوانی دلدادگی کے درمیان حقیقی کشمکش تھی۔ اس لحاظ سے کہ ہمیشہ کلمتہ اللہ ہی برتر اور غالب ہے لہٰذا یوسفؑ نے الٰہی اور معنوی جذبہ اور آسمانی عشق کے ساتھ اپنے نفسانی خواہشات اور میلانات کو اپنے آپ سے دُور کیا اور وہ اس پر غالب آئے اور خداوند تبارک و تعالیٰ اس طرح اپنے امر کو غلبہ دیتا ہے۔

"وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ" (سورۂ یوسفؑ آیت: ۲۱)

یوسفؑ نے عزیز مصر کی بیوی کے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا:۔

اللہ کی بندگی کا اعلیٰ نمونہ

"اللہ میرا تربیت کرنے والا ہے اور میرا اختیار اللہ کے پاس ہے، اگر میں اس عمل کا مرتکب ہو جاؤں تو اللہ کی ولایت اور حاکمیت سے نکل جاؤں گا"۔

حضرت یوسفؑ نے اپنی اس گفتگو میں بندگی کے ادب کا انتہاء درجے کا لحاظ رکھا ہے۔ پہلے لفظ جلالہ "اللہ" کو یاد کیا ہے پھر اللہ کی صفت ربوبیت اور توحید کا ذکر کیا ہے۔ اس کے

بعد اللہ کی تدبیر والی صفت کو بیان کیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے متعلق ہماری رائے یہی ہے، لیکن بعض مفسرین نے " اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ " میں ھاء ضمیر کا مرجع عزیز مصر کو قرار دیا ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنی اس طرح ہوگا کہ عزیز مصر نے مجھے احترام دیا، مجھے اچھا مقام دیا لہٰذا میں اس کے ان احسانات کے مقابلے میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کروں گا۔ لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہے کیونکہ مقام نبوت اور حضرت یوسفؑ کے عقیدہ توحید کے منافی ہے۔ عزیز مصر کو رب کہنا آپ کی نبوت اور شان کے منافی ہے۔ اگر رب سے عزیز مصر مراد ہوتا تو آیت کے آخر میں " اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ " کے بجائے " اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْخَآىِٕنُوْنَ " کہتے۔

وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

"اور البتہ اس عورت نے تو اس پر ارادہ کر لیا تھا، اور اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا تو اس کا اردہ کر لیتا، اسی طرح ہوا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ٹال دیں، بے شک وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا"۔

اللہ کا یوسفؑ کو بے حیائی کے عمل سے بچانا

یوسفؑ کی محبت نے اُس عورت کو مسخر کر رکھا تھا کیونکہ یوسفؑ بہت خوبصورت جوان تھے، بالغ اور رشید بھی تھے اور ان کی جسمانی اور جنسی توانائی اپنی پوری بلندیوں کو چھو رہی تھیں، ایسی خوبصورتی اور حسن و جمال کہ جس کی کوئی مثال نہیں تھی اور ناز و نعمت میں غرق رہے تھے، یہ سارے اسباب ہر ایک کو عیش و نوش کی طرف کھینچتے ہیں۔ دوسری طرف عزیز مصر کی بیوی بڑی شان والی عورت تھی وہ بھی بہت خوبصورت اور جوان تھی۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ حکمرانوں کے حرم میں خوبصورت ترین عورتیں آتی ہیں۔ ایسی عورت جو خود بھی حسین و جمیل ہو پھر ظاہری زیب و زینت میں ہو اور جس کے پیچھے سینکڑوں لوگ ہوں وہ یوسفؑ کو اپنا دل دے بیٹھی تھی۔ وہ یوسفؑ کو اپنا مدیون اور مقروض بھی جانتی تھی۔ ان ساری شرائط کا تقاضا یہ تھا کہ یوسفؑ بے چوں وچرا اس کی خواہش و تمنا کو پورا کرتا۔ یہ حالات اور اس عورت کی دلربائی اور اُس کی حرکات پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھیڑ سکتے ہیں۔ یوسفؑ کے لئے کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی کیونکہ اس عورت نے تمام احتیاطی تدابیر کا لحاظ رکھا ہوا تھا۔ اگر یوسفؑ کے دل میں ذرہ برابر بھی خلل اور رخنہ ہوتا تو تسلیم ہو جاتے لیکن یوسفؑ کا اللہ پر ایمان تھا اور یوسف کی رُوح اور دل پر اللہ کی توحید کا غلبہ تھا اور خدا نے انہیں اپنی طرف سے برہان عطاء کیا ہوا تھا اس لیے وہ اس برائی اور فاحشہ سے پیچھے ہٹ گئے۔ اگر یہ برھان نہ ہوتا تو ممکن تھا وہ بھی اس عورت کا قصد کرتے، زیادہ دیر نہ لگتی کہ وہ معصیت کر بیٹھتے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس برائی اور فحاشی کو یوسفؑ سے دُور کیا۔

''سُوۡءَ'' ہر وہ عمل جسے ایک بندے کو انجام نہیں دینا چاہئے۔ اس جگہ سوء سے گناہ کا فیصلہ کر لینا، گناہ کا میلان، فاحشہ، برے عمل کا ارتکاب یعنی زنا مراد ہے۔ ''برہان'' سلطان کے معنی میں ہے ایسا سبب جو یقین آور ہو۔ وہ برہان جو یوسفؑ نے اپنے رب سے دیکھا وہی کھلا ہوا علم تھا یقین شہودی جسے خداوند تبارک و تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کو دکھاتا ہے کہ اس کے دیکھنے سے وہ اس طرح اللہ کے مطیع و فرمانبردار ہو جاتے ہیں کہ اُن میں ذرہ برابر بھی معصیت کا اور گناہ کا میلان اور رجحان نہیں ہوتا۔ یہ وہی ملکہ عصمت ہے۔ یہ برہان کسی بھی حوالے سے آدمی کے اختیار سے منافات نہیں رکھتا۔ ایسا نہیں ہے کہ معصوم شخص معصیت کے انجام دینے کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور معصیت پر اس کا اختیار ہی نہ ہو۔ بلکہ وہ یقینی علم کی اس منزل پر ہوتا ہے کہ وہ معصیت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر دسویں منزل سے کوئی بھی عقلمند چھلانگ نہیں لگائے گا کیونکہ وہ یقین کی اس منزل پر ہے اور اسے پتہ ہے کہ اگر

چھلانگ لگاؤں گا تو میری ہڈی، پسلی ایک ہو جائے گی، میں مر جاؤں گا۔ تو یہ اس کے یقین کی منزل ہے اور وہ دسویں منزل سے نیچے کود جانے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح معصوم شخص گناہ کا سوچ ہی نہیں سکتا۔

خداوند فرما رہا ہے کہ ہم نے اس سوء، فاحشہ اور معصیت اور بدکاری سے پھیرنے کے لئے یوسفؑ کو اپنا برہان دکھا دیا، یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے اُنہیں گناہ اور فحاشی سے روک لیا۔ بلکہ فرمایا کہ ہم نے انہیں برہان دکھا دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احسان اور اپنے نیک عمل کی وجہ سے کبھی بھی ان میں برائی اور گناہ کی طرف میلان نہیں تھا تاکہ اُس کو اُس سے پھیرا جائے۔ اس امر کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے خالص بندوں سے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل کو اپنے لئے خالص کیا ہوا ہے، اللہ کی یاد اور اللہ کے عشق کے علاوہ اُن کے دل میں کسی چیز کی جگہ نہ نہیں تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ حق تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار ہیں اور غیر اللہ کی اطاعت نہیں کرتے اور کسی معصیت کا ارتکاب نہیں کرتے۔ یہ وہی عصمت الٰہی ہے۔ البتہ بعض مفسرین نے اس کے علاوہ بھی چند اقوال یہاں پر بیان کئے ہیں جو زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتے۔

وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

"اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور عورت نے اس کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا اور دونوں نے عورت کے خاوند کو دروازے کے پاس پایا، کہنے لگی کہ جو تیرے گھر کے لوگوں سے برا ارادہ کرے اس کی تو یہی سزا ہے کہ اسے قید کیا جائے یا سخت سزا

دی جائے"۔

حضرت یوسفؑ کا فرار ہونا

"استباق" مقابلہ اور ایک دوسرے کے ساتھ دوڑنے کے معنی میں ہے۔ "قدّ" پھاڑنے کو کہتے ہیں۔ "الفا" موجود پانا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسفؑ اور زلیخا کے درمیان مقابلہ ہوا، یوسفؑ زلیخا کے چنگل سے فرار چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ جلدی خود کو دروازے تک پہنچادے اور وہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن زلیخا چاہتی تھی کہ جلدی دروازے پر پہنچ جائے اور اُسے دروازے سے نکلنے نہ دے اور اُسے موقع نہ دے کہ دروازہ کھول دے اور بھاگ جائے۔ وہ چاہ رہی تھی کہ اپنا مقصد پالے۔ لیکن یوسفؑ زلیخا سے پہلے دروازے پر پہنچا۔ زلیخا نے اُس کے پیچھے سے اس کی قمیض کو ہاتھ سے پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچا تاکہ اُس کا ہاتھ دروازے تک نہ پہنچے۔ اس طرح یوسفؑ کی قمیض اوپر سے نیچے کی طرف پھٹ گئی۔ اسی اثناء میں دروازہ کھل گیا۔ زلیخا اور یوسفؑ نے دیکھا کہ زلیخا کا شوہر، عزیز مصر دروازے کے پیچھے کھڑا ہے۔

اس موقع پر زلیخا اچانک "مراودہ" کی حالت سے تحقیق و جستجو کی حالت میں آگئی اور جلدی سے اپنے شوہر سے یوسفؑ کی شکایت کر ڈالی اور کہا کہ اسے جیل میں ڈالو یا سخت سزا دو۔ عزیز مصر کے سامنے ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے یا اس کے احترام میں یوسفؑ کا نام نہیں لیا اور کھلے الفاظ میں برائی کا ذکر بھی نہیں کیا بلکہ کنایہ میں اس ماجرے کو بتا دیا۔ تاکہ اس کی غیرت کو ابھارے اور اپنے آپ کو پاک و صاف ظاہر کرے۔ یوسفؑ کی سزا کو اس لیے متعین نہیں کیا اور نہیں کہا کہ اسے جیل میں ڈالا جائے یا سخت سزا دے دی جائے کیونکہ وہ یوسفؑ کی شیدائی تھی اور اس کا عشق اس بات کا مانع تھا کہ قطعی طور پر اس کے لئے کوئی ایک سزا متعین کرے۔ کیونکہ سزا کے تعین کرنے میں اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ اس نے اپنے

طور پر سوچا کہ اگر وہ یہ ظاہر کرے کہ وہ اس واقعہ سے خوش نہیں ہے تو اس کا شوہر اُس سے جواب طلبی بھی نہیں کرے گا اور وہ بڑی آسانی سے یوسفؑ کی بازپرس یا اس کی سخت سزا سے بھی اسے منصرف کرلے گی۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾

''کہا یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کو پھسلاتی تھی، اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہوا ہے تو عورت سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے''۔

یوسفؑ کا اپنی صفائی پیش کرنا

جب یوسفؑ پر زلیخا نے تہمت لگائی تو انہوں نے ان کا جواب دینے کے لئے فوراً کہا کہ حق مطلب بیان کردوں کہ میں نے برائی کا کوئی ارادہ نہیں کیا، خود اُس نے برائی کا ارادہ کیا اور مجھ سے چھیڑ خانی کی اور مجھ سے برائی چاہی۔ اسی دوران زلیخا کے رشتہ داروں میں سے کسی نے جو اہل بیت علیہم السلام سے منقول روایات کے مطابق گھوارے میں موجود ایک بچہ تھا، اس نے یوسفؑ کے حق میں گواہی دے دی اور کہا کہ اگر یوسفؑ کی قمیض آگے سے پھٹی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ زلیخا یوسفؑ کو اپنے سے دُور کرنے کے لئے اس سے جھگڑ رہی تھی لہٰذا یوسفؑ قصور وار ہے اور اگر یوسفؑ کی قمیض پیچھے سے پھٹی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زلیخا جھوٹ بول رہی ہے کیونکہ یوسفؑ اُس سے اپنے آپ کو بچا رہا تھا اور بھاگ رہا تھا اور زلیخا اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾

''اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے''۔

یوسفؑ کی قمیض کا پھٹ جانا

بچے نے کہا دیکھا جائے کہ یوسفؑ کی قمیض آگے سے پھٹی ہے یا پیچھے سے پھٹی ہے؟ اگر یوسفؑ کی قمیض آگے سے پھٹی ہے تو زلیخا سچی ہے۔ اور اگر پیچھے سے پھٹی ہے تو یوسفؑ سچا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ زلیخا یوسفؑ کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ اس گواہ نے ایک عقلی دلیل بیان کی جو یوسفؑ اور زلیخا میں سے ایک کے فائدے میں اور دوسرے کے نقصان میں تھی۔ اس قسم کے بیان کو عرفاً گواہی دینا نہیں کہتے کیونکہ گواہ وہ ہوتا ہے جس نے ماجرا کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہو یا کان سے سنا ہو یعنی گواہی اسے کہتے ہیں جو حواس کے ذریعے درک کی گئی ہو اور گواہ واقعے کے موقع پر موجود ہو۔ لہٰذا جس کا تعلق فکر و عقل سے نہ اسے گواہی نہیں کہا جاتا۔ روایات بھی اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ بات ایک ایسے بچے سے صادر ہوئی ہے جو گہوارے پر تھا جو ابھی سوچ سمجھ اور فکر کے مرحلے پر نہیں پہنچا تھا۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے طرف سے یوسفؑ کی تائید میں معجزہ تھا۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

''پھر جب عزیز نے اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو کہا بے شک یہ تم عورتوں کا ایک فریب ہے، بے شک تمہارا فریب بڑا ہوتا ہے''۔

عزیز مصر کا فیصلہ

جب عزیز مصر نے قمیض کو دیکھا تو قمیض تو پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی تو وہ ماجرا کو سمجھ گیا اور کہا کہ یہ تم عورتوں کی سازش ہے اور تمہارا سازش کرنا بہت عجیب ہوتا ہے۔ عزیز مصر

نے سازش کی نسبت ساری عورتوں کی طرف دی حالانکہ زلیخا اس کی مرتکب ہوئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جو عمل تجھ سے صادر ہوا ہے کیونکہ تم ایک عورت ہو اور عورتیں ساری اس قسم کی باتوں میں مشہور ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے مردوں میں عورتوں کو جذب کرنے کا میلان قرار دیا ہے لیکن عورتوں میں ایسی طاقت رکھی گئی ہے کہ جو اسباب اُن کے اختیار میں ہوتے ہیں وہ اُن کو استعمال میں لاتی ہیں تاکہ مردوں کے دل کو جذب کر سکیں اور اپنی طرف مائل کر سکیں۔ پس عورتیں مختلف جلوؤں اور سحر آمیز حرکات کے ذریعہ مردوں کے دلوں کو مسخر کرتی ہیں اور اُن کی عقل کو مسخر کرتی ہیں۔ یہ وہی عورتوں کی مکر و سازش ہے جس کے ذریعے وہ مردوں کی توجہ اپنی طرف جلب کرتی ہیں۔ اور عورتیں اپنی خواہشات کے مطابق مردوں کو اپنی طرف کھینچ کر لے آتی ہیں۔ لہٰذا عزیز مصر نے عورتوں کی سازشوں کو بڑی اور عظیم سازش قرار دیا۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۜ وَ اسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ۝۲۹

''یوسف تو اس سے در گزر کر، اور تو اے عورت اپنے گناہ کی معافی مانگ، کیونکہ تو ہی خطا کار ہے''۔

عزیز مصر کی اپنی زوجہ اور یوسفؑ کو نصیحت

جب عزیز مصر حقیقت کو سمجھ گیا تو اس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے یوسفؑ سے درخواست کی کہ وہ اس پر پردہ پوشی کرے اور اس واقعہ کو کسی سے بیان نہ کرے اور عورت سے بھی کہا کہ تم اپنے گناہ کے لیے استغفار کرو اور اللہ سے معافی مانگو اور اپنا قطعی فیصلہ بھی سنا دیا کہ خطاء کار تم ہی تھی۔ اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے اعمال اہل

مصر کے درباریوں میں عام طور پر ہوتے تھے، یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ لہٰذا عزیز مصر نے اپنی بیوی کے حوالے سے اسی مقدار نصیحت کو کافی سمجھا اور یوسفؑ سے اس قصے کو چھپانے کی درخواست کی۔ اس نے اپنی بیوی کو سزا بھی نہیں دی کیونکہ اس کا اس سے بہت زیادہ تعلق تھا اور اسے زلیخا سے محبت تھی اس لیے اس نے اس کی غلطی سے درگذر کر دیا۔

وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۰﴾

"اور عورتوں نے شہر میں چرچا کیا کہ عزیز کی عورت اپنے غلام کو چاہتی ہے، بے شک اس کی محبت میں فریفتہ ہو گئی ہے، ہم تو اسے صریح غلطی پر دیکھتے ہیں"۔

مصر کی عورتوں کی طعنہ زنی

یہ خبر شہر میں پھیل گئی اور ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری عورت تک پہنچی۔ کیونکہ اُن کے محلوں کی دیواروں کے کان ہوتے ہیں جو دوسری طرف سنے جاتے ہیں۔ اگرچہ یوسفؑ نے یہ ماجرا کسی کو نہیں بتایا۔ بلکہ عزیز مصر کے محل کے غلام اور نوکرانیوں نے اس ماجرا کو شہر میں پھیلا دیا کیونکہ نوکر چاہتے ہیں کہ ان کے مولا کی برائی شہر میں پھیل جائے تاکہ دشمن خوش ہوں۔ اسی طرح دُور نزدیک میں کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ برائی عام ہو تاکہ اس قسم کی تہمتیں ان پر لگیں تو وہ اپنا دفاع کر سکیں اور اُن کی طرف اگر کسی کی توجہ ہے تو اس کو منحرف کر سکیں۔

اس قسم کا واقعہ زیادہ دیر پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لہٰذا عورتوں نے زلیخا کے خلاف مکر و حیلہ، سازش اور بدگوئی کرنا شروع کر دی اور کہا کہ عشق، عزیز مصر کی بیوی پر غالب آگیا، وہ اپنے غلام کی محبت میں غرق ہو گئی اور اس کے دل کا پردہ پھٹ گیا، صبر اور دل اور ہوش حواس

ہاتھ سے دے بیٹھی اور اپنے غلام کے ساتھ غلط تعلق قائم کیا اور اُسے اپنی طرف مائل کرنا چاہتی تھی۔ یہ تو بہت بڑی گمراہی ہے کیونکہ وہ آزاد عورت اور اشراف کے طبقات سے ہے اور یہ غلام ہے، یہ عورت اپنے غلام سے ایسا کام لے؛ یہ تو بہت ہی بے شرمی ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ عزیز مصر کی شرافت کی حفاظت کرتی لیکن وہ تو اپنے غلام پر فریفتہ ہو گئی اور اس سے برائی کی خواہش کر بیٹھی۔ جب غلام نے انکار کیا تو پھر بھی اس عمل سے باز نہ آئی اور اصرار کیا۔ زلیخا بہت بڑی گمراہی میں ہے۔ اس نے کتنا بڑا غلط کام کیا ہے!

فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَكۡرِهِنَّ اَرۡسَلَتۡ اِلَيۡهِنَّ وَ اَعۡتَدَتۡ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتۡ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنۡهُنَّ سِكِّيۡنًا وَّ قَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَيۡهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيۡنَهٗۤ اَكۡبَرۡنَهٗ وَ قَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ وَ قُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيۡمٌ ﴿۳۱﴾

''پھر جب عزیز کی بیوی نے ان کی ملامت سنی تو انہیں بلا بھیجا اور ان کے واسطے ایک مجلس تیار کی اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری دی اور (یوسف سے) کہا کہ ان کے سامنے نکل آ، پھر جب انہوں نے اسے دیکھا تو حیرت میں رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہا اللہ پاک ہے یہ انسان تو نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے''۔

زلیخا کے ہاں مصر کی عورتوں کی دعوت

''مَکۡرِ'' کسی مقصد تک پہنچنے کے لئے حیلہ سازی کرنے کو کہتے ہیں۔ شہر مصر کی عورتیں زلیخا سے حسد کرتے ہوئے اور اسے رسوا کرنے کے لیے یہ باتیں کر رہی تھیں۔ زلیخا

نے انہیں یہ بتانے کے لیے کہ کس نے اسے فریفتہ کیا ہے چاہا کہ اُنہیں یوسفؑ دکھائے تاکہ اُن کو بھی یوسفؑ کے عشق میں مبتلا کرے تاکہ وہ اُس کی ملامت کرنا بند کردیں۔ اُس نے کسی کو اُن عورتوں کے پاس بھیجا تاکہ انہیں یوسفؑ کے دیدار کی دعوت دے۔ اور اس طرح یوسفؑ کے ساتھ عشق کرنے پر اسے معذور سمجھیں۔

بہرحال زلیخا نے ہر ایک کے لئے ایک تکیہ لگا دیا، ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری دے دی تاکہ وہ اس سے میوہ اٹھا کر کھائیں اور اسے چھری سے کاٹ کر کھائیں اور اس کے ساتھ ہی اچانک یوسفؑ سے کہا کہ عورتوں کے سامنے آئے۔ ایسا لگتا ہے کہ یوسفؑ پس پردہ کسی کمرے میں موجود تھے اور اُس کمرے سے صحن میں آنے کا راستہ تھا یا جس ہال میں عورتوں کو بٹھایا تھا اور عورتیں خالی الذہن تھیں اور وہ میوہ یا پھل کاٹنے، چھلکا اتارنے میں مصروف تھیں کہ اچانک یوسفؑ باہر آئے اور ان کے بے نظیر حسن و جمال دیکھ کر عورتیں حیران ہوئیں اور میوہ کو کاٹنے کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور اس کے دیدار کو عظیم شمار کیا اور دہشت اور حیرت میں مبتلا ہو گئیں اور شعور و ادراک ہاتھ سے دے بیٹھیں اور اپنا ہاتھ کاٹ لیا۔

انہوں نے حیا اور ملاحظہ کو ایک طرف رکھ دیا اور کہنے لگیں "حَاشَ لِلّٰہِ" اللہ پاک ہے، امر یوسفؑ میں اور پھر کہا یہ غلام اس خوبصورت چہرے کے ساتھ سیرت اور حسن و جمال کے ساتھ یہ جو اس کی خلقت ہے، ظاہر و باطن ہے، کمال ہے یہ انسان نہیں ہے بلکہ محترم اور مکرم فرشتہ ہے۔ چونکہ بت پرستوں کا عقیدہ تھا کہ فرشتے مکرم اور باکرامت موجودات ہیں اور اُن میں حیات بھی ہے، علم بھی ہے، ظاہری اور معنوی جمال بھی ہے اور دنیا کی ہر خیر و سعادت ان سے رونما ہوتی ہے اور اس کا منبع اور سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ کلام بغیر کسی منصوبہ یا ارادہ کے فقط یوسفؑ کا جمال دیکھ کر ان عورتوں سے صادر ہوا۔ حتی وہ اس بات کی جانب بھی متوجہ نہیں تھیں کہ اس جملے کے کہنے سے وہ خود ہی رسوا ہو رہی ہیں

اور خود اسی جال میں پھنس گئی ہیں جس کی نسبت زلیخا کی طرف دیتی تھیں اور زلیخا کو مطعون کرتی تھیں اور اس کی مذمت کرتی تھیں۔ زلیخا کہنے لگی یہ وہی چیز ہے کہ جس کے بارے میں تم میری مذمت کرتی تھیں، میں اسے اپنے دامن میں لینا چاہتی تھی لیکن وہ آمادہ نہیں ہوا، جو میں نے اسے کہہ دیا ہے اگر وہ اسے انجام نہ دے تو حتمی طور پر جیل میں ہوگا اور خوار و ذلیل ہوگا۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَ لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَ لَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

''کہا یہی ہے وہ کہ جس کے معاملہ میں تم نے مجھے ملامت کی تھی، اور البتہ تحقیق میں نے اس سے دلی خواہش ظاہر کی تھی پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا، اور اگر وہ میرا کہنا نہ مانے گا تو ضرور قید کر دیا جائے گا اور ذلیل ہو کر رہے گا''۔

زلیخا کی عورتوں پر چڑھائی

جب مصر کی عورتوں نے یوسفؑ کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ دئے اور یہ جملہ کہا کہ یہ تو انسان نہیں ہے تو اس طرح سب عورتوں نے خود کو رسواء کر لیا اور زلیخا کا عذر قبول کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا کہ وہ حق رکھتی تھیں کہ یوسفؑ سے عشق کرے۔ لہٰذا زلیخا نے اپنی بات کو اور اپنے کردار کو درست قرار دیا کہ یہ وہی چیز ہے جس نے مجھے اس کا عاشق بنا دیا اور تم میری مذمت کرتی رہی اور عملی طور پر اس کا جواب دے دیا تاکہ وہ جانیں کہ یہ عجوبہ سبب ہوا کہ اس کی شرافت اور آبرو جو اس کے شوہر کی عزت تھی وہ زائل ہو اور اس کی پاکدامنی پر حرف آئے۔ اور پھر اعتراف کیا کہ اس نے یوسفؑ کے ساتھ غلط رابطے کی

کوشش کی لیکن یوسفؑ پاکدامن نکلا اور اس نے انکار کر دیا۔ زلیخا اس قدر یوسفؑ کو دل دے بیٹھی تھی کہ بغیر کسی شرم و حیاء کے بے پرواہ اپنا سارا واقعہ سنا دیا، کیونکہ ساری عورتیں یوسفؑ کے عشق میں گرفتار ہو چکی تھیں اور اب وہ سب زلیخا سے ہمدردی کا قصد دل میں رکھتی تھیں۔ اس نے اپنا قطعی فیصلہ سنا دیا کہ میں تو یوسفؑ کو چھوڑنے والی نہیں ہوں اور یوسفؑ کو سمجھایا ہے اگر وہ بات نہیں مانے گا تو پھر اسے سزا ملے گی۔ اس نے اپنی بات تاکید کے ساتھ کہی اور قسم بھی کھائی کہ میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔

زلیخا کی ان باتوں کا مقصد مصر کی عورتوں کے سامنے فخر کرنا اور یوسفؑ کو دھمکی دینا تھا۔ یہ دھمکی پہلے دن کی دھمکی سے سخت تر تھی کیونکہ وہاں تو فقط اتنا کہا تھا کہ جو برائی کا ارادہ رکھتا ہو اسے جیل بھیجا جائے یا دردناک عذاب دیا جائے۔ لیکن یہاں پر کہہ دیا کہ اگر یوسفؑ نے میری خواہش پوری نہ کی تو اسے جیل بھی ڈالا جائے گا اور خوار بھی کیا جائے گا۔ وہاں پر شوہر سے تقاضا کیا تھا لیکن یہاں پر کہا کہ میں خود یہ کام کروں گی۔ اس نے انہیں یہ سمجھا دیا کہ میرا اس قدر اپنے شوہر کے دل میں نفوذ ہے کہ میں جو بھی چاہوں اس سے وہی کام لے سکتی ہوں اور اسے آمادہ کر سکتی ہوں کہ جس طرح چاہوں اس کو سزا دلواؤں۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾

''یوسف نے کہا اے میرے رب میرے لیے قید خانہ بہتر ہے اس کام سے کہ جس کی طرف مجھے بلا رہی ہیں، اور اگر تو مجھ سے ان کا فریب دفع نہ کرے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا''۔

حضرت یوسفؑ کی مناجات

حضرت یوسفؑ نے اپنے رب سے مناجات کی اور کہا اے میرے رب میرے لیے قید خانہ بہتر ہے اس کام سے جس کی طرف وہ مجھے بلا رہی ہے اور ذرہ برابر بھی زلیخا کی طرف توجہ نہیں کی اور اُن عورتوں سے بھی کچھ نہیں کہا بلکہ پوری توجہ اپنے رب کی طرف موڑ دی۔ اپنے اوپر نفرین کرتے ہوئے نہیں بلکہ اپنی حالت رب تعالیٰ کے حضور پیش کر دی۔ کہا کہ اے میرے رب! جیل میں جانا میرے لئے محبوب تر ہے اس بات سے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں۔ حضرت یوسفؑ کہنا چاہتے تھے کہ اے میرے رب! تیری محبت میں جیل میں جانا میرے لئے محبوب ہے، معصیت کی لذت سے اور ان عورتوں کے ساتھ معاملہ کرنے سے اور یہ کہ تجھ سے دُور رہوں میں ترجیح دیتا ہوں جیل میں رہوں اور زمان حال سے کہا کہ اے میرے رب اگر تو ان کی سازشوں اور مکاریوں کو مجھ سے دُور نہیں کرے گا تو میں بھی ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلانہ عمل کا ارتکاب کر بیٹھوں گا، اگر تو اپنا فیضان میرے اوپر جاری نہ کرے گا تو میں بھی باقی جاہلوں کی مانند ہو جاؤں گا نفسانی خواہشات کے گڑھے میں جا گروں گا۔ اگر اب تک مقاومت کی ہے تو یہ اس علم کے نتیجے میں ہے جو تو نے مجھے دیا ہے۔

یہ اُس مومن کی خالصانہ دُعا ہے جو جانتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور اپنی عصمت پر مغرور بھی نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مزید توجہ چاہ رہا ہے اور مزید اللہ کی ولایت میں رہنے کا اظہار کر رہا ہے۔ پس یوسفؑ کے رب نے اس کی مناجات کو قبول کر لیا اور ان عورتوں کی مکاری اور سازش کو یوسفؑ سے دُور کر دیا، اللہ بتحقیق سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾

"پھر اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی پس ان کا فریب اس سے دُور کر دیا گیا، کیوں کہ وہی سننے والا جاننے والا ہے"۔

یوسفؑ کی دعا کی قبولیت

اللہ تعالیٰ نے یوسفؑ کی دعا قبول کی اور اُن عورتوں کی سازش کو یوسفؑ سے پھیر دیا۔ کچھ لوگوں نے خیال کیا کہ یہ جملہ یوسفؑ کی نفرین کی قبولیت ہے جس کے نتیجے میں یوسفؑ جیل چلے گئے۔ یہ بات درست نہیں بلکہ خداوند نے سوء، فحشا اور عورتوں کی مکاری اور سازش کو اُس سے دُور کیا۔ خدا اپنے بندوں کی دُعا کو سنتا ہے، وہ علیم ہے ان کے حالات سے آگاہ ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا کی طرح دُوسری عورتوں نے بھی یوسفؑ سے معاشقہ کرنا چاہا اور یوسفؑ سے رابطہ برقرار کرنے کے لیے بے تاب ہوئیں۔ لیکن یوسفؑ کی عصمت و استقامت نے اسے محفوظ رکھا۔ اور یہ ایک آن کے لئے اور ایک دفعہ کے لئے نہیں تھا بلکہ تدریجی عمل تھا اور یوسفؑ پر ہر لحظہ اس کا فیضان ہو رہا تھا اور وہ خدا کی پناہ میں تھے اور اللہ سے مدد مانگ رہے تھے۔ یوسفؑ کو دی گئی یہ الٰہی طاقت اور قوت ربانی، علوم اور معارف کی سنخ سے تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یوسفؑ نے عرض کیا خدایا اگر ان کی مکاری اور سازش کو مجھ سے دُور نہیں کیا تو میں جاہلوں سے قرار پاؤں گا جس طرح پہلے زلیخا سے کہا تھا کہ ظالم کامیاب نہیں ہوتے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

"ان لوگوں کو نشانیاں دیکھنے کے بعد یوں سمجھ میں آیا کہ اسے ایک مدت تک قید کر

دیں"۔

یوسفؑ کا زندان جانا

نشانیوں اور علامات سے مراد یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کی بے گناہی اور ان پر لگائی جانے والی تہمت سے ان کا بری ہونا واضح ہو گیا تھا۔ اس بچے کی گواہی کے مطابق یوسفؑ کے قمیض کے پیچھے سے پھٹنے سے بھی ان کی سچائی ثابت ہوئی تھی۔ ان عورتوں کا اپنے ہاتھ کو کاٹ دینا اور پھر یوسفؑ کا پاکدامن رہنا اور عصمت مآب رہنا اور زلیخا کا اعتراف کہ اس نے شخصاً یوسف سے چاہا کہ وہ اس کے قریب ہو، اور یوسفؑ کا انکار کرنا، یہ ساری نشانیاں سبب بنیں کہ عزیز مصر اور اس کی بیوی اور دربار کے خاص لوگ ہم پیمان ہوگئے کہ یوسفؑ کو کچھ عرصہ کے لئے جیل میں ڈال دیں تاکہ زلیخا اور یوسفؑ کا معاملہ ختم ہو جائے اور لوگ اس بات کو بھول جائیں اور اس طرح عزیز مصر کے دربار میں آنے والی رسوائی اور تہمت کو ختم کیا جا سکے۔ اسی طرح وہ چاہ رہے تھے کہ شہر کے امن وامان کی حفاظت کریں اور کسی اور کو اجازت نہ دیں کہ مصر کی عورتیں اس کے حسن و جمال کی فریفتہ ہوں اور شہر میں بلوے کی صورت نہ بن جائے۔

داستان یوسفؑ کے بقیہ حصے اور آخر میں زلیخا کے اعتراف سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسفؑ کے جیل جانے کے بعد زلیخا نے شوہر پر معاملے کو مشتبہ بنا دیا اور اُسے یوسفؑ کے بارے میں شک و شبہ میں ڈال دیا تھا۔ اس کا اپنے شوہر پر اتنا تسلط تھا کہ یوسفؑ کی بے گناہی پر تمام نشانیوں کے باوجود اس نے اپنے شوہر کو اس بات پر آمادہ کیا کہ یوسفؑ کو جیل میں ڈال دے تاکہ اس طرح یوسفؑ کو تنبیہ کی جائے اور اسے اپنی اطاعت پر مجبور کرے اور لوگوں کی طرف سے لگائی جانے والی تہمت کا بھی حل نکالا جائے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا ۚ وَ
قَالَ الۡاٰخَرُ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَحۡمِلُ فَوۡقَ رَاۡسِیۡ خُبۡزًا تَاۡكُلُ الطَّيۡرُ مِنۡهُ ؕ نَبِّئۡنَا
بِتَاۡوِيۡلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰٮكَ مِنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۳۶﴾

"اور اس کے ساتھ دو جوان قید خانہ میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ شراب نچوڑتا ہوں، اور دوسرے نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹی اٹھا رہا ہوں کہ اس میں سے جانور کھاتے ہیں، ہمیں اس کی تعبیر بتلا، ہم تجھے نیکوکار سمجھتے ہیں"۔

دو نوجوانوں کا خواب

مصر کے بادشاہ کے غلاموں میں سے دو نوجوان لڑکے یوسفؑ کے ساتھ جیل میں آئے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اُن دونوں نے ایک خواب دیکھا اور اُس کی تعبیر لینے کے لئے یوسفؑ کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں نے روٹیاں سر پر اٹھائی ہوئی ہیں اور پرندے کھا رہے ہیں۔ دونوں نے کہا اس کی تعبیر بتلائیں اور یہ بھی کہا ہم تو یقین رکھتے ہیں کہ آپ نیک شخص ہیں اور تمہارے چہرے سے نیکی اور اچھائی کے آثار ظاہر ہیں۔ نیک افراد ایسے امور کے بارے میں صحیح صورتحال بتا سکتے ہیں اور اُن کی بات صحیح اور ہدایت کے راستے پر ہوتی ہے۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

"کہا جو کھانا تمہیں دیا جاتا ہے وہ ابھی آنے نہ پائے گا کہ اس سے پہلے میں تمہیں اس کی تعبیر بتلا دوں گا، یہ ان چیزوں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں، بے شک میں نے اس قوم کا مذہب ترک کر دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتی اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں"۔

خواب کی تعبیر

جب یہ دو قیدی اپنے خواب کی تعبیر سننے کے لئے یوسفؑ کے پاس آئے اور انہیں محسن (نیکوکار) کی صفت سے پکارا تو حضرت نے مناسب موقع جانا اور اُن کو توحید کے راز بیان کر دیے اور اُنہیں اس خدا کی پرستش کے لئے آمادہ کیا جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ انہیں بتایا کہ خواب کی تعبیر کا علم اُسی رب تعالیٰ نے مجھے عطا کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ جیسے ہی تمہارا کھانا آئے گا تو میں اس کے بعد تمہارے خواب کی تعبیر بتادُوں گا اور یہ سارے راز اللہ تعالیٰ نے مجھے تعلیم دیے ہیں۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "بِتَاْوِيْلِهٖ" میں ضمیر کا مرجع، خواب ہو، اس بنا پر اس آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ ایسا ہو گا کہ قبل اس کے کہ کھانا لے آئیں میں تمہارے خواب کی تعبیر سے تمہیں آگاہ کروں گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کی حاجت جلد پوری ہو جائے گی۔ لیکن یہ معنی سیاق کلام سے دُور ہے کیونکہ آپ کی خواہش یہ تھی کہ ان کو توحید کی دعوت دیں اسی لئے کہا تھا کہ میرے پاس جو علم ہے یہ علم اکتسابی یا معمول کے اسباب سے حاصل کیا

ہوا نہیں ہے بلکہ یہ علم میرے رب نے مجھے عنایت کیا ہے۔ اس علم کو میرے رب نے اس لیے مجھے عطا کیا ہے کیونکہ میں نے شرک آمیز عقیدے کی پیروی نہیں کی ہے اور ان کے مذہب، آئین اور روش کو چھوڑا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

مشرکین اگرچہ اللہ پر عقیدہ رکھتے ہیں لیکن وہ دوسری چیزوں کو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں اور ان کو اپنے اور اللہ کے درمیان واسطہ قرار دیتے ہیں، اسی طرح وہ معاد کے بجائے تناسخ کے قائل ہیں لہٰذا خدا اور قیامت پر حقیقی ایمان نہیں رکھتے اسی لیے حضرت یوسفؑ نے صریحاً ان کو کافر کہا ہے۔

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

"اور میں اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب کا تابع ہو گیا ہوں، ہمیں یہ جائز نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک کریں، یہ ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ کا فضل ہے لیکن بہت لوگ شکر نہیں کرتے"۔

یوسفؑ کا اپنے آباء واجداد کا تذکرہ

یہ آیت حضرت یوسفؑ کی سابقہ آیت میں بیان شدہ گفتگو کا تسلسل ہے۔ آپؑ نے ان قیدیوں سے فرمایا میں تو اپنے آباء کے آئین کی پیروی کرتا ہوں، اس طرح اپنا حسب و نسب بھی بتا دیا اور فرمایا کہ ہم اہل البیت ذرہ برابر بھی اللہ کا شرک کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ خدا سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں شرک سے منع کیا ہے اور یہ شرک سے منع کرنا بھی خود اللہ کی طرف سے ہمارے اور باقی لوگوں کے حق میں عطاء اور فضل ہے لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر بجا

نہیں لاتے اور کفران نعمت کرتے ہیں۔ یہ فضل وہی نعمت ہدایت ہے یعنی توحید کی جانب ہدایت ملنا ہے۔ خداوند نے انبیاء بھیج کر سارے لوگوں کو ہدایت دی ہے اور یہ سب سے بڑا فضل اور عطیہ الٰہی ہے۔ پس لوگوں کو چاہیے کہ اپنی توانائی کے مطابق اہل حق کی طرف رخ کریں اور اُن کی پیروی کریں اور اُن کی روش پر آئیں تاکہ کامیاب ہوں۔ لیکن اکثر لوگ نبوت اور رسالت کا انکار کرتے ہیں، انبیاء کی پیروی نہیں کرتے اور اس طرح توحید کی نعمت کا کفران کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہیں جو کہ واحد و یکتا ہے، فرشتوں اور جن و انس کو اللہ کا شریک بناتے ہیں اور اللہ کے فضل سے منہ موڑتے ہیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾

”اے قید خانہ کے رفیقو! کیا کئی جدا جدا معبود بہتر ہیں یا اکیلا اللہ جو زبردست ہے“۔

زندان کے ساتھیوں کو دعوت توحید

حضرت یوسفؑ نے اُن دو زندانی ساتھیوں کو اللہ کی عبادت کی دعوت دی۔ ان کو دینی معارف اور دینی معلومات بیان کئے اور شرک کی بنیادوں اور طاغوت کی بنیادوں کو ویران اور متزلزل کیا تاکہ وہ دونوں اللہ کی وحدانیت کے قائل ہو جائیں۔ اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کو اس لیے ” ارباب متفرق “ کا نام دیا کیونکہ اُس دور کے لوگ فرشتوں کو اللہ کی صفات دیتے تھے اور انہیں ذات مقدس تعالیٰ کے لئے تعینات قرار دیتے تھے اور عالم کی خیر و سعادت کی نسبت فرشتوں میں سے کسی ایک فرشتے کی طرف دیتے تھے۔ مثلاً کہتے تھے الہ علم ایک فرشتہ ہے، ایک قدرت کا الہ ہے، ایک آسمان کا الہ ہے اور ایک زمین کا الہ ہے۔ اسی طرح وہ جنات کی پرستش کرتے اور اُنہیں عالم میں مبداء شر قرار دیتے تھے۔ اسی طرح بادشاہوں اور سلاطین کی پرستش کرتے، یہی امر معبود میں ان کے تفرقہ اور تعدد کا سبب بنا ہوا تھا۔

حضرت یوسفؑ نے اُن کو فطرت اور اللہ واحد کی طرف دعوت دی۔ اُن سے کہا کہ کئی خدا ماننا

بہتر ہے یا ایک ؟ اللہ، پروردگار یکتاء و قہار ہے اور وہ اپنی قہاریت اور اپنے غلبہ سے خیالی معبودوں کو باطل کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا موجود ہے جو عین حق ہے، اس میں بطلان نہیں ہے وہ محدود بھی نہیں ہے، کسی حد میں نہیں آتا، وہ موجود واجب ہے، غیر متناہی ہے اس کی صفات عین ذات ہیں اور وہ واحد ہے وحدت حقہ کے تحت، اس میں کثرت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وہ قہاریت اور یگانگت سے تمام تفرقوں پر غالب ہے۔ جو کچھ عالم میں رونما ہوتا ہے سب اسی کی قدرت مطلقہ الٰہی کے تحت انجام پاتا ہے اور وہ تمام افعال کا مبداء اور سرچشمہ ہے۔

حضرت یوسفؑ کی اس قطعی دلیل کے بعد مشرکین یہ اعتراض کر سکتے تھے کہ اتنی عظمت والا خدا جو ہماری عقلوں سے بالاتر ہے ہم میں اسے درک کرنے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کی طاقت نہیں ہے لہٰذا جب ہم اسے درک نہ کر سکیں تو اس کی پرستش بھی نہیں کر سکتے۔ پس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایسے معبود بنائیں جو اللہ کے ہاں ہماری سفارش کر سکیں اور ہمیں وہاں تک لے جائیں اور ہمارے اور اللہ کے درمیان واسطہ بن جائیں۔ اس شبہہ کا جواب آپ نے اگلے بیان میں دیا ہے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۰

”تم اس کے سوا کچھ نہیں پوجتے مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے مقرر کر لیے ہیں اللہ نے ان کے متعلق کوئی سند نہیں اتاری، حکومت سوائے اللہ کے کسی کی نہیں ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت

نہ کرو، یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے"۔

بے حیثیت خود ساختہ معبود

اس حصے میں حضرت یوسفؑ نے تمام مشرکین کو متوجہ کیا ہے اور کہا ہے کہ تم جن کی پوجا کرتے ہو وہ چند ناموں کے سوا کچھ نہیں۔ تم نے جن کو معبود بنا رکھا ہے اور کسی کو آسمان کا معبود کہتے ہو اور کسی کو خشکی کا معبود اور کسی کو دریاؤں کا معبود اور کسی کو درختوں کا معبود، یہ فقط تمہارے لکھے ہوئے نام ہیں، ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان ناموں کو مشرکین نے خود سے تراشا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کچھ نہیں بیان دیا اور ان اسماء پر کوئی دلیل نہیں بھیجی تاکہ یہ کہیں کہ ان اسماء کے پیچھے ان کے مسمّٰی ہیں یا اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی شفاعت اور وساطت ثابت ہے۔ کیونکہ سارے امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، تنہا حکم اللہ تعالیٰ کا ہے کسی اور کا نہیں ہے اور اسی کے تصرف میں سب کچھ ہے، خدا یگانہ اور یکتا ہے جو متصرف ہے اور پورے عالم کے امور کا مدبر ہے، بندگان کی تربیت اسی کے ہاتھ میں ہے اور فقط اسی کا حکم چلتا ہے۔ حکمرانوں اور بادشاہوں اور طاغوتوں کا حکم نہیں چلتا۔ حاکمیت، اللہ تعالیٰ کے لئے منحصر ہے۔ اور اسی کے لیے عبادت ہے کیونکہ وہی پوری ہستی کا معبود ہے، وہی تنہا حاکم ہے، اسی کا غلبہ ہے، اسی کا حکم ہے، اسی کی اطاعت ہے اور یہ سب اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ کوئی بھی ان امور میں اس کا شریک نہیں ہے اور کوئی بھی اس کے ساتھ مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ جو ایسے امور کا دعوی کرتے ہیں، وہ کافر ہیں۔ اور جو اس کو قبول کر لے تو گویا کہ اس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا ہے۔

لہٰذا یہی خدا جو صاحب حکم ہے، اسی نے دستور دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہیں کی جائے۔ یہ امر بڑا واضح ہے۔ خدا نے حکم نہیں دیا کہ واسطوں اور سفارشیوں کی عبادت کی جائے۔ یہ آئین انتہائی مضبوط اور استوار ہے، کلمہ قیم یعنی جو اپنے قیام میں

مضبوط ہو اور اپنی تدبیر میں قوی ہو اور اس کے امر میں کسی قسم کا تزلزل نہ ہو۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ دین توحید ہی ایسا دین ہے جو سوسائٹی کو چلانے پر قادر ہے اور سوسائٹی اور معاشرے کو سعادت کی منزل تک لے جاسکتا ہے اور یہ محکم دین ہے جس میں کوئی تزلزل نہیں ہے، کوئی کمزوری نہیں ہے، کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اس کے تمام معارف برحق ہیں اور اس میں بطلان نہیں ہے، اس میں گمراہی نہیں ہے بلکہ یہ ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت محسوسات سے اُنس و تعلق اور دُنیا کی زائل ہونے والی لذتوں میں غرق ہونے کی وجہ سے دل اور عقل کی سلامتی کھو بیٹھے ہیں اور اس معنی کو درک نہیں کرتے اور دنیاوی زندگی کے ظواہر پر اکتفاء کیا ہوا ہے اور آخرت سے روگرداں اور غافل ہیں۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (سورۂ روم، آیت: ۷)

ترجمہ: ''لوگ تو دنیا کی ظاہری زندگی کے بارے میں جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں''۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱

''اے قید خانہ کے رفیقو! تم دونوں میں سے ایک جو ہے وہ اپنے آقا کو شراب پلائے گا، جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا پھر اس کے سر میں سے پرندے کھائیں گے، اس کام کا فیصلہ ہو گیا ہے جس کی تم تحقیق چاہتے تھے''۔

قیدی ساتھیوں کے خواب کی تعبیر

آیت کا معنی روشن ہے، حضرت یوسفؑ نے پہلے تو انہیں توحید کا درس دیا، یگانہ پرستی

اور ایک خدا کی عبادت کی دعوت دی اور کہا کہ کسی کو اس کا شریک نہ بنایا جائے۔ حق کی جانب دعوت دینے کے بعد ان کے خواب کی تعبیر بتائی اور کہا کہ جس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ انگور سے شراب تیار کر رہا ہے تو وہ دوبارہ بادشاہ کا ساقی بنے گا اور جس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے سر پر روٹیاں ہیں اور پرندے وہاں سے کھا رہے ہیں؛ اس کے بارے بتایا کہ اسے پھانسی دی جائے گی اور پرندے اس کے سر کے مغز کو کھائیں گے۔

آخر میں یوسفؑ نے کہا کہ یہ امر طے شدہ ہے اور قطعی اور حتمی طور پر ایسا ہی ہونا ہے، اس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ بظاہر ان دو میں سے ایک نے کہا کہ میں نے ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا ہے، جو کچھ میں نے تم سے بیان کیا تھا وہ جھوٹ تھا۔ جب اس نے یہ بات کہی تو یوسفؑ نے جواب میں کہا کہ یہ امر طے شدہ ہے اور واقع ہو کر رہے گا۔ اس سے فرار کرنے کا امکان نہیں ہے۔

وَ قَالَ لِلَّذِیۡ ظَنَّ اَنَّہٗ نَاجٍ مِّنۡہُمَا اذۡکُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّکَ ۫ فَاَنۡسٰہُ الشَّیۡطٰنُ ذِکۡرَ رَبِّہٖ فَلَبِثَ فِی السِّجۡنِ بِضۡعَ سِنِیۡنَ ﴿۴۲﴾

"اور ان دونوں میں سے جسے یوسف نے بچنے والا سمجھا تھا کہہ دیا تو تو اپنے آقا سے میرا بھی ذکر کرنا، پھر شیطان نے اسے اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا، پھر قید میں کئی برس رہا"۔

بادشاہ کے پاس سفارش کی درخواست

اس آیت میں تین فعل ہیں "قَالَ" یوسفؑ نے کہا، "ظَنَّ" یوسفؑ نے خیال کیا، "لَبِثَ" یوسفؑ جیل میں رہا، ان سب میں جو ضمیر ہے ان کا مرجع یوسفؑ ہے۔ اور "فَاَنۡسٰہُ" اور "رَبِّہٖ" کی ضمیر نجات پانے والے یوسفؑ کے قیدی کے ساتھی کی طرف پلٹتی

ہے۔ یہاں ظن، یقین کے معنی میں ہے۔ "بِضْعَ" دس سے کم تر عدد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ "رب" اس جگہ سید و مولا کے معنی میں ہے، بندہ جس کی پیروی کر رہا ہوتا ہے اور اس کے حکم کے سامنے جھکا ہوتا ہے۔ یہ معنی اسلام میں ربوبیت کے اصطلاحی معنی پر بھی تاکید کرتا ہے۔

بہر حال آیت کا معنی روشن ہے، یوسفؑ نے اس آدمی سے کہا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ زندان سے نجات پالے گا کہ جب آپ اپنے آقا کے پاس جاؤ تو وہاں مجھے بھی یاد کر لینا، شاید اس کی مہربانی میرے شامل حال ہو اور مجھے جیل سے رہا کر دے۔ لیکن شیطان نے اسے یہ بھلا دیا اور وہ بادشاہ کے پاس یوسفؑ کا نام ذکر کرنا بھول گیا اور یوسفؑ مزید چند سال جیل میں رہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "فَاَنْسٰىهُ" اور "رَبِّهٖ" میں جو ضمیر ہے وہ بھی یوسفؑ کی جانب پلٹتی ہے۔ اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ شیطان سبب ہوا کہ یوسفؑ اپنے رب کو بھول گیا اور ظاہری اسباب سے توسل کیا اور یہ سبب بنا کہ وہ مزید چند سال جیل میں رہے۔ لیکن یہ معنی حضرت یوسفؑ کی عصمت کے مقام کے مخالف ہے، جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مخلص کا لقب دیا ہو یعنی اللہ کی محبت میں خالص شدہ۔ تو یہ اس کے خلاف اور منافی ہے کہ اس سے اس طرح کا کام سرزد ہوا ہو۔ یہ احتمال اسی سورہ کی بعد والی آیات کے بھی مخالف ہے، جیسا کہ سورۂ یوسفؑ کی آیت ۴۵ میں آیا ہے:

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

ترجمہ: "اور وہ بولا جو ان دونوں میں سے بچا تھا اور اسے مدت کے بعد یاد آگیا کہ میں تمہیں اس کی تعبیر بتلاؤں گا سو تم مجھے بھیج دو"۔

دوسرا بیان اس آیت کے بھی مخالف ہے۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ١ؕ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور بادشاہ نے کہا میں خواب دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں انہیں سات دبلی گائیں کھاتی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک۔ اے دربار والو! مجھے میرے خواب کی تعبیر بتلاؤ اگر تم خواب کی تعبیر دینے والے ہو''۔

بادشاہ کا خواب دیکھنا

مصر کے بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور درباریوں کو اپنا خواب سنایا اور ان سے کہا کہ اگر تم اس خواب کی تعبیر جانتے ہو یعنی اگر اس خواب کی تعبیر کا علم تمہارے پاس ہے تو بتاؤ کہ سات موٹی تازی گائیوں کو سات کمزور گائیں کھا رہی ہیں اور سات خشک خوشے ہیں اور سات سرسبز و شاداب خوشے ہیں، اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ١ۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

''انہوں نے کہا یہ خیالی خواب ہیں، اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے''۔

خواب کی تعبیر بارے درباریوں کا بیان

'' اَحْلَامٍ '' حلم کی جمع ہے اسے تصورات اور خیالات جو خواب کی حالت میں انسان کے ذھن میں آجاتے ہیں اور یہ تصورات ظاہری اسباب کے بغیر ذہن میں آتے ہیں۔ '' اَضْغَاثُ '' دستہ اور گروہ کے معنی میں ہے۔ بادشاہ کے درباریوں اور خواب کی تعبیر بیان کرنے والوں نے اس کے خواب کو پریشان کرنے والے خوابوں کا مجموعہ قرار دیا۔ اس کا مطلب

یہ تھا کہ بادشاہ نے جو خواب دیکھا ہے اس کی صورت درہم برہم ہے اور اس میں مختلف خواب ملے ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک کی تعبیر الگ ہے اور کیونکہ یہ آپس میں ملے ہوئے ہیں لہٰذا ان کی تعبیر مشکل ہے۔ اسی لئے انہوں نے کہا کہ ہم تو ایسے خوابوں کی تعبیر سے آگاہ نہیں ہیں اور ہم سارے خوابوں کی تعبیر کے عالم بھی نہیں ہیں۔ ہم تو صرف سچے خوابوں کی تعبیر جانتے ہیں۔

وَ قَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

"اور وہ بولا جو ان دونوں میں سے بچا تھا اور اسے مدت کے بعد یاد آگیا کہ میں تمہیں اس کی تعبیر بتلاؤں گا سو تم مجھے بھیج دو"۔

زندانی ساتھی کا اعلان

"اُمَّۃ" جماعت کے معنی میں ہے، یہاں پر اس سے چند سال یا ایک مدت مراد ہے، اس سے وہ سال جو جیل سے نجات پانے والے یوسفؑ کے ساتھی اور بادشاہ کے ساقی نے گزارے تھے اور وہ بادشاہ کے پاس یوسفؑ کا تذکرہ کرنا بھول گیا تھا، بادشاہ کا خواب سن کر اسے بھولا ہوا یوسفؑ یاد آگیا۔ اس نے درباریوں سے کہا میں تمہیں اس خواب کی تعبیر سے آگاہ کر دُوں گا، آپ فقط مجھے یوسفؑ کے پاس زندان بھیج دیں تاکہ میں اُس سے تمہارے خواب کی تعبیر لے کر آؤں۔

يُوسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۴۶

''اے یوسف اے سچے! ہمیں اس کی تعبیر بتلا کہ سات موٹی گایوں کو سات دبلی کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک، تاکہ میں لوگوں کے پاس لے جاؤں شاید وہ سمجھ جائیں''۔

یوسفؑ کے پاس اُن کے ساتھی کا آنا

بادشاہ کا ساقی اور یوسفؑ کا سابقہ ساتھی ان کے پاس جیل آیا اور کہا اے یوسفؑ صدیق ! بہت سچ بولنے والے، کیونکہ وہ اس سے پہلے اپنے اور اپنے ساتھی کے خواب کے بارے میں یوسفؑ کی سچائی جان چکا تھا۔ اب وہ بادشاہ کے خواب کے بارے میں معلومات لینے آیا تھا۔ اس نے بادشاہ کا پورا خواب یوسفؑ کو سنا دیا اور کہا کہ لوگ انتظار میں ہیں تاکہ میں واپس جاؤں اور اُن کو جا کر خواب کی تعبیر بتاؤں۔ قرآن کریم نے اس ماجرے کے کچھ حصے کو اختصار کی غرض سے حذف کر دیا ہے جس سے اس ماجرا کے بیان کرنے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ یوسفؑ کے ساتھی نے ابتداء میں کہا'' اَفْتِنَا'' ہمیں خواب کی تعبیر بتاؤ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے لئے خواب کی تعبیر نہیں چاہ رہا تھا بلکہ یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ میں دربار کے بڑوں کی طرف سے آیا ہوں۔ اس کی آخر میں کہی گئی بات ''اَرْجِعُ'' اس مطلب کو لے کر ان کے پاس واپس جاؤں گا، بھی اسی بات کی تاکید کر رہی ہے کہ میں خواب کی تعبیر کا قطعی حکم لے کر جاؤں گا اور اُنہیں جہالت کی حیرت سے نکالوں گا، کیونکہ لوگ بادشاہ کے خواب کے حوالے سے بہت پریشان ہیں اور اس خواب کو اہمیت دے رہے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ یقینی طور پر

بادشاہ کے خواب کا تعلق مملکت کے اہم امور سے ہے۔

قَالَ تَزۡرَعُوۡنَ سَبۡعَ سِنِیۡنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدۡتُّمۡ فَذَرُوۡهُ فِیۡ سُنۡۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّا تَاۡكُلُوۡنَ ﴿۴۷﴾

''کہا تم سات برس لگاتار کھیتی اُگاؤ گے، پھر جو کاٹو تو اسے اس کے خوشوں میں رہنے دو مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ (اسے استعمال کرو)''۔

بادشاہ مصر کے خواب کی تعبیر

''دَاَب'' کسی عمل اور روش کو جاری رکھنے کے معنی میں ہے۔ یہاں پر مضارع کا صیغہ، امر کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی ایسا کرنا ضروری ہے۔ یوسفؑ نے تاکید کی کہ سات سال تم مسلسل کاشت کرو اور جو کچھ فصل کاٹو اس سے اپنے اور اپنے مویشیوں کے کھانے کے لیے تھوڑی سی فصل رکھ لو اور باقی کو خوشوں کے ساتھ ذخیرہ کر لو تاکہ وہ خراب نہ ہوں، کیونکہ گندم جب خوشہ سے جدا کی جائے تو جلد خراب ہو جاتی ہے لیکن اگر خوشوں کے اندر ہی رہے تو زیادہ مدت تک خراب نہیں ہوتی ہے۔ گویا کہ ان کو سات سال تک گندم ذخیرہ کرنے کا طریقہ بھی بتایا کہ وہ کس طرح اسے انبار میں ذخیرہ کر لیں۔

ثُمَّ یَاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ سَبۡعٌ شِدَادٌ یَّاۡكُلۡنَ مَا قَدَّمۡتُمۡ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّمَّا تُحۡصِنُوۡنَ ﴿۴۸﴾

''پھر اس کے بعد سات برس سختی کے آئیں گے جو تم نے ان کے لیے رکھا تھا کھا جائیں گے مگر تھوڑا سا جو تم بیج کے واسطے روک رکھو گے''۔

آئندہ کی مشکلات کے لئے انتظام

"شِدَادٌ" شدید کی جمع ہے جو سختی، دشواری اور مشکل کے معنی میں ہے۔ "شدّ" حملہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اس کلام میں لطیف استعارہ ہے یعنی خشک سالی خونخوار درندے کی مانند لوگوں پر حملہ آور ہو گی اور اُنہیں تباہ کر دے گی، خشک سالی قحط کا سبب بنے گی۔ لیکن اگر لوگوں کے پاس ذخیرہ شدہ گندم موجود ہو گی تو وہ درندہ بن کر لوگوں کو کھانے کی بجائے ذخیرہ شدہ گندم کی جانب رخ کریں گے اور لوگ بھوکوں کے حملے سے بچ جائیں گے۔ یہاں پر بھی تاکید کی ہے کہ گندم کی کچھ مقدار ذخیرہ کی جائے اور، قحط کے سالوں میں لوگوں کے امور کی تدبیر کا خیال رکھا جائے۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿٤٩﴾

"پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا اس میں لوگوں پر مینہ برسے گا اس میں رس نچوڑیں گے"۔

قحط کے بعد نعمتوں کا نزول

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جب قحط کے سات سال گزر جائیں گے تو اس کے بعد ایک سال ایسا آئے گا جس میں بہت بارش ہو گی، لوگ نعمت میں غرق ہوں گے اور تیل والے دانے اور میوہ جات کا نچوڑ نکالیں گے، جانور موٹے تازے ہو جائیں گے، بہت دودھ دیں گے، لوگ اُن کے دودھ سے فائدہ اٹھائیں گے۔ یہ لوگوں کے لئے بڑی نعمت کا سال ہو گا جس میں اُن کے جانور بھی بہت زیادہ ہو جائیں گے۔

لوگ اپنی تدبیر اور چارہ اندیشی سے ان سختی اور مشکلات کے سالوں سے گزر جائیں گے۔

لہٰذا بادشاہ کا خواب دوسرے تعبیر کرنے والوں کے برعکس فقط قحط اور خشک سالی کو

بیان نہیں کر رہا تھا بلکہ قحط کے واقع ہونے سے پہلے در پیش مشکلات کے لیے عملی اقدامات کرنے کی جانب بھی اشارہ کر رہا تھا۔ بادشاہ نے اپنے فریضہ کو خواب میں واضح طور پر دیکھ لیا کہ اس نے قحط اور خشک سالی کے لئے کیا اقدامات کرنے ہیں۔ کیونکہ اس خواب کا مطلب یہ تھا کہ وہ سات موٹی تازی گائیوں کو سات کمزور گائیوں کے لیے تیار کر لے جو اُن پر حملہ کرنے والی ہیں۔ اور اپنی روز مرہ کی ضروریات کو پوری کرنے کے بعد باقی فصل کو خوشے کے ساتھ ذخیرہ کر لو۔ یوسفؑ نے اس تعبیر میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا صرف اتنی سی بات ہے کہ انہوں نے تاکید کی کہ اس امر نے واقع ہونا ہے لہٰذا تھوڑا کھاؤ اور باقی ذخیرہ کر لو۔ یہ ایک بدیہی اور واضح امر تھا۔

دوسرا مطلب آٹھویں سال کے بارے میں ہے کہ جس میں ہر شئے فراوان ہو گی۔ اصل خواب میں اس کے متعلق کوئی بات ذکر نہیں ہوئی ہے۔ اس میں فقط اتنا کہا گیا ہے کہ سات سال سختی اور مشکلات کے ہوں گے، ظاہر ہے جب سختی کے سات سال گزریں گے تو آٹھواں سال خوشحالی کا ہو گا، اس میں زمینیں سرسبز ہوں گی اور قحط نہیں ہو گا۔ اگر آٹھویں سال بھی قحط ہونا تھا تو پھر سختی کے آٹھ سال ہوتے سات سال نہ ہوتے۔ آٹھویں سال کی پیشگوئی دو امور سے کنایہ ہے:۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمیشہ سختی کے بعد آسانی آتی ہے، تنگی کے بعد آسانی آتی ہے۔ دوسری بات: جس سال غذائی اجناس زیادہ ہوں، زراعت زیادہ ہو تو لوگوں کو کھیتی باڑی، زراعت اور انہیں ذخیرہ کرنے کے لیے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی اور اس سال مملکت کے ذمہ دار لوگ پچھلے دستورات پر عمل کرنے کے بھی پابند نہیں ہوں گے۔ بلکہ لوگ خود اپنے لئے روزگار حاصل کر سکتے ہیں۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۞

''اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لے آؤ، پھر جب اس کے پاس قاصد پہنچا تو کہا اپنے آقا کے ہاں واپس جا اور اس سے پوچھ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے، بے شک میرا رب ان کے فریب سے خوب واقف ہے''۔

بادشاہ کا یوسفؑ کو بلانا

بادشاہ نے جب خواب کی تعبیر سنی تو اس امر کی عظمت سے متحیر ہوا لہٰذا اس نے چاہا کہ یوسفؑ کو زندان سے آزاد کر دے اور یوسفؑ کو اپنے پاس لے آئے۔ لیکن جب بادشاہ کا نمایندہ زندان میں یوسفؑ کے پاس پہنچا تو یوسفؑ نے بڑے ادب سے اسے کہا کہ اپنے صاحب کے پاس واپس جاؤ اور اسے کہو کہ وہ عورتیں جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ دیئے تھے ان کا ماجرا کیا ہے، ان کے بارے میں سوال کرو۔ حضرت یوسفؑ نے اپنی گفتگو میں زلیخا کے حوالے سے کوئی اشارہ نہیں دیا اور یہ بھی نہیں کہا کہ زلیخا نے اس کے بارے میں برائی کا ارادہ کیا تھا۔ حضرت یوسفؑ چاہتے تھے کہ ان کے اور عزیز مصر کی زوجہ کے درمیان عادلانہ فیصلہ ہو۔ اس لیے کلی طور پر مصر کی عورتوں کی طرف اشارہ کیا، البتہ اُن کے بارے میں بھی کسی برائی کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ اشارہ کیا کہ میرا پروردگار اُن کے مکر و فریب سے آگاہ ہے۔ حقیقت میں حضرت یوسفؑ نے اپنے اس کلام کے ذریعے توحید کی تبلیغ کی اور پروردگار یکتا کی طرف دعوت دی جیسا کہ اس سے پہلے بھی ان کو جب بھی مناسب موقع ملا تو توحید کی تبلیغ کرتے رہتے تھے لہٰذا انہوں نے مصر کے بادشاہ سے یہ سوال کیا کہ وہ پوچھے کہ مصر کی عورتوں نے کس وجہ

سے اپنے ہاتھ کاٹے تھے؟

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ٞ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۵۱﴾

''کہا تمہارا کیا واقعہ تھا جب تم نے یوسف کو پھسلایا تھا، انہوں نے کہا اللہ پاک ہے ہمیں اس میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوئی، عزیز کی عورت بولی کہ اب سچی بات ظاہر ہو گئی، میں نے ہی اسے پھسلانا چاہا تھا اور وہ سچا ہے''۔

مصر کی عورتوں کا بیان

بادشاہ نے جب مصر کے اشراف کی عورتوں کو اکٹھا کیا اور ان سے یوسفؑ کے ساتھ پیش آنے والے ماجرا کے متعلق پوچھا تو اُنھوں نے کہا اللہ تعالیٰ پاک ہے؛ ہم نے تو یوسفؑ سے ذرہ برابر بھی بدی نہیں دیکھی اور ہم اُن کی عفت و پاکدامنی کی گواہی دیتی ہیں۔ تب اس ماجرا اور فتنہ کی اصلی سبب عزیز مصر کی بیوی زلیخا بول اٹھی اور کہنے لگی کہ میں گناہگار ہوں، یوسفؑ بے گناہ ہے، اب حق آشکار اور واضح ہو گیا۔ میں نے یوسفؑ کے ساتھ معاشقہ کیا اور تعلق جوڑا اور اُن سے برائی چاہی، وہ سچ بولنے والوں میں سے ہے اور وہ ہر برائی سے پاک ہے اس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اب ماجرا واضح اور روشن ہو گیا ہے۔

ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ ﴿۵۲﴾

''یہ اس لیے کہا تاکہ عزیز معلوم کر لے کہ میں نے اس کی غائبانہ خیانت نہیں کی

تھی، اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔"۔

حضرت یوسفؑ کا بیان

حضرت یوسفؑ نے کہا میں نے مصر کی عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کے ماجرا کے بارے سوال کرنے کا اس لئے کہا تھا تاکہ حقیقت سے پردہ ہٹ جائے اور عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ اُن کی غیبت میں میں نے کوئی خیانت نہیں کی اور نہ ہی میں نے ان کی بیوی سے کوئی تعلق جوڑا ہے۔ اور وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ خیانت کاروں کے حیلے اور مکاریوں کو کامیاب ہونے نہیں دیتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جو تبدیل نہیں ہو سکتا کیونکہ خیانت باطل ہے اور باطل کو دوام نہیں ہے اور حق باطل پر غالب آکر رہتا ہے اور باطل کا بطلان واضح ہو کر رہتا ہے۔

اگر خیانت کاروں کی خیانت منزل مقصود تک پہنچ جاتی تو پھر مصر کی عورتیں جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے وہ رسواء نہ ہوتیں، زلیخا اپنے جرم کا اعتراف کرنے پر مجبور نہ ہوتی۔ اس کلام میں حضرت یوسفؑ نے اس بات کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ بادشاہ کو بھی معلوم ہو جائے کہ وہ امین ہے اور اُس نے خیانت نہیں کی ہے۔ ان کا یہ کلام ان کی بعد والی بات کے لیے مقدمہ تھا جس میں انہوں نے بادشاہ سے چاہا ہے کہ وہ اسے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دے۔ سورہ یوسف کی آیت ۵۵ میں ہے کہ:

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝۵۵

ترجمہ: "کہا مجھے ملکی خزانوں پر مامور کر دو، بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا اور جاننے والا ہوں"۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵۳﴾

''اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا، بے شک نفس تو برائی سکھاتا ہے مگر جس پر میرا رب مہربانی کرے، بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے''۔

یوسفؑ کے بیان کا تسلسل

حضرت یوسفؑ کی سابقہ بات سے استقلال اور انانیت کا شائبہ پیدا ہو سکتا تھا اس لیے انہوں نے اس شبہہ کو دور کرنے کے لیے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مجھ میں ذرہ برابر بھی استقلال اور انانیت نہیں ہے، تاکہ کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ آپ اللہ کی ذات سے مستقل ہیں، اس لیے آپ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر مجھ میں کوئی طاقت اور قدرت نہیں ہے، وہی ہے جو سب کچھ کا مالک ہے اور میں اس کے سوا کسی کے بارے میں سوچتا بھی نہیں ہوں۔ پھر فرمایا کہ میں اپنے آپ کو بری نہیں کرتا، کیونکہ انسان کی طبیعت ہی ایسی ہے کہ وہ شہوات کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس کی نفسانی خواہشات اس کو برائی اور فحاشی کا حکم دیتے ہیں، مگر جس پر رب رحم کردے۔ در حقیقت حضرت یوسفؑ یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر میں نے زلیخا اور باقی عورتوں کے سامنے مقاومت کی اور پاکدامن رہا اور عزیز مصر کی ناموس سے خیانت نہیں کی تو یہ میرے ذاتی کمال یا میرے وجود میں کسی خصوصیت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ یہ اس رحمت کی وجہ سے تھا جو رب تعالیٰ کی طرف سے مجھے عطا ہوئی۔ خداوند تبارک و تعالیٰ بہت معاف کرنے والا اور مہربان ہے، اس کی رحمت نے مجھے اس برائی سے بچایا اور اس شر سے محفوظ رکھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی بخشش اور مہربانی سے انسان کی کمزوریاں پر پردہ ڈالتا ہے اور اپنی مہربانی سے انسان کی اچھی اخلاقی صفات کو ظاہر کرتا ہے۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

''اور بادشاہ نے کہا کہ اسے میرے پاس لے آؤ تاکہ اسے خاص اپنے پاس رکھوں، پھر جب اس سے بات چیت کی تو کہا بے شک آج سے توں ہمارے ہاں بڑا معزز اور معتبر ہے''۔

بادشاہ کا فیصلہ

بادشاہ نے جب یوسفؑ کے سارے کمالات دیکھ لئے تو دستور دیا کہ انہیں میرے پاس لے آئیں۔ جب یوسفؑ آگئے اور بادشاہ نے ان کے مکارم اخلاق، برائی اور فحاشی سے دُوری، خیانت سے دُوری، ظلم سے دُوری؛ سب کا مشاہدہ کیا تو انہیں دربار کے مقربین میں سے قرار دیا اور کہا کہ آج کے بعد تم ہمارے پاس بڑی منزلت والے ہو اور میرے مورد اعتماد ہو اور میرے امین ہو، یعنی یوسفؑ کی وزارت و صدارت کا حکم جاری کر دیا۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

''کہا مجھے ملکی خزانوں پر مامور کردو، بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں''۔

یوسفؑ کی پیشکش

بادشاہ نے جب یہ بات کہی کہ یوسفؑ اُس کے قریبی ساتھیوں میں سے ہوگا اور اس کے دربار میں اُس کا بڑا مقام ہوگا تو یہاں پر یوسف نے ان سے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو مجھے وزارت مالیات (وزارت خزانہ) کے لئے مقرر کردو تاکہ میں مملکت کے مالی امور کو دیکھ

سکوں۔ وہ چاہتے تھے قحط والے سالوں میں وہ خود براہ راست تمام گندم اکٹھا کریں اور اسے ذخیرہ کریں اور پھر اُن ذخائر میں سے لوگوں کی ضرورت کے مطابق جس کی جتنی ضرورت ہو اتنی ان میں تقسیم کریں۔ اس حوالے سے اُن کو دو صفتیں بتائیں کہ جو بھی خزانہ دار ہو یا وزیر خزانہ ہو اس میں دو چیزیں ضروری ہیں:۔ پہلی چیز یہ ہے کہ وہ حفاظت کرنے والا اور نگہدار ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ علیم اور جاننے والا ہو یعنی اس میں اس کام کی مہارت ہو۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

"اور ہم نے اس طور پر یوسف کو اس ملک میں با اختیار بنا دیا کہ اس میں جہاں چاہے رہے، ہم جس پر چاہیں اپنی رحمت متوجہ کر دیں، اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے"۔

یوسفؑ پر اللہ کا انعام

"كَذٰلِكَ" کے ذریعے اس ساری داستان کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کے خلاف سازش کی، اسے کنوئیں میں ڈالا اور پھر وہاں سے کیسے غلام بن کر کاروان کے ساتھ مصر آیا اور بازار میں فروخت ہوا، اور کیسے عزیز مصر کے گھر میں آیا اور پھر جیل گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وزارت اور عزت کے اس مقام تک پہنچایا۔ یہ سب رحمت الٰہی کے واسطے سے ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اتنی بڑی منزلت، زندان میں عرصہ دراز گزارنے اور وہاں کی مشقت برداشت کرنے کے بعد عطا کر دیا۔ اب وہ جہاں جانا چاہیں اور جہاں سکونت اختیار کرنا چاہیں کر سکتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ روش اور سنت ہے کہ وہ جسے چاہے اپنی رحمت سے خاص کر دیتا ہے،

اس کی رحمت کے راستے میں کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ جیسا کہ داستان یوسفؑ میں ظاہری اسباب انہیں ذلیل و خوار کرنے کے تھے لیکن خدا نے اپنی بے انتہاء رحمت اور اپنی عظمت، مشیت اور ارادہ کے تحت اسے بلند مقام دیا، رفعت بخشی۔ کیونکہ یوسفؑ نیک اور مخلص تھا، اس نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے وقف کیا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، انہیں تباہ نہیں کرتا۔ لہٰذا سرزمین مصر کا اختیار حضرت یوسفؑ کو عطا ہونا ان کے حسن سیرت اور نیک عمل کا اجر تھا۔

وَ لَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾

''اور آخرت کا ثواب ان کے لیے بہتر ہے جو ایمان لائے اور پرہیزگاری میں رہے''۔

مومنین کے لیے آخرت کا بہترین صلہ

اللہ تعالیٰ نے اولیاء الٰہی کے لیے دُنیاوی اجر کے ساتھ اخروی اجر کا بھی وعدہ دیا ہے۔ اخروی اجر اللہ کے ان خالص بندوں کے لیے ہے جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور آخرت کا اجر بہت زیادہ ہے۔ یوسفؑ کیونکہ اولیاء اللہ میں سے ہے تو اس کا اجر دُنیا میں بھی اس انداز سے دیا اور آخرت میں بھی ان کو بڑا اجر و پاداش ملے گا۔ آخرت کا اجر تمام مومنین کے لئے نہیں ہے بلکہ اُن مومنین کے لئے ہے جو ایمان اور تقویٰ کی صفات پر قائم رہیں۔

وَ جَآءَ اِخۡوَةُ یُوۡسُفَ فَدَخَلُوۡا عَلَیۡهِ فَعَرَفَهُمۡ وَ هُمۡ لَهٗ مُنۡکِرُوۡنَ ﴿۵۸﴾

''اور یوسف کے بھائی آئے پھر اس کے ہاں داخل ہوئے تو اس نے انہیں پہچان لیا اور وہ نہیں پہچان سکے''۔

یوسفؑ کے بھائیوں کا مصر آنا

جب مصر کی حاکمیت اور وزارت خزانہ یوسفؑ کے اختیار میں آگئے تو برادران یوسفؑ

بھی اپنے خاندان کے لئے غذائی اجناس خریدنے کے لیے مصر آئے۔ حضرت یوسفؑ نے کئی سال گزرنے کے باوجود علم نبوت یا اپنی ذاتی استعداد اور قابلیت کی بنا پر اپنے بھائیوں کو پہچانا۔ لیکن ان کے بھائیوں نے انہیں نہیں پہچانا، کیونکہ یوسفؑ ان سے بچپن میں جدا ہوئے تھے دوسری بات یہ تھی کہ مصر کی محترم شخصیت تھے تو وہ خیال نہیں کرتے تھے کہ ایک عبرانی اور غیر قبطی آدمی مصر میں حکمرانی کے مقام پر پہنچا ہو۔

وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝۵۹

”اور جب انہیں ان کا سامان تیار کر دیا تو کہا کہ میرے پاس وہ بھائی بھی لے آنا جو تمہارے باپ کی طرف سے ہے، تم نہیں دیکھتے کہ میں ناپ پورا دیتا ہوں اور بڑا مہمان نواز ہوں“۔

بھائیوں سے یوسفؑ کی درخواست

حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کا خوب احترام کیا، انہیں گندم دی اور اُن کے بار بھر دیئے، پھر اُن سے کہا کہ جو تمہارا باپ کی جانب سے بھائی ہے اگلی دفعہ اُنہیں اپنے ساتھ لے آؤ۔ اس لیے کہ وہ متوجہ نہ ہوں کہ وہ یوسفؑ ہے اور ان کا ذہن اس مطلب سے منصرف کرے ان سے کہا کہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں نے تمہیں کم مال نہیں دیا اور تم پر ظلم نہیں کیا اور تمہاری اچھی مہمانداری کی ہے؟ اس بات سے ان کو شوق بھی دلانا تھا کہ وہ دوبارہ آئیں اور اپنے بھائی کو بھی ساتھ لے کر آئیں۔ وہ بھائی یوسفؑ کا مادری بھائی، بنیامین تھا۔

فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ۝۶۰

”پھر اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو نہ تمہیں میرے ہاں سے پیمانہ ملے گا اور نہ تم

میرے پاس آنا"۔

حضرت یوسفؑ کا فیصلہ

حضرت یوسفؑ نے اپنی گفتگو میں تاکید کر دی کہ حتماً بنیامین کو اپنے ساتھ لے آنا۔ اگر تم دوبارہ گندم لینے آؤ اور تمہارے بھائی تمہارے ساتھ نہ ہو گا تو میرے پاس نہ آنا، میں تمہیں اجناس نہیں دُوں گا بلکہ تم میری سرزمین میں بھی داخل نہ ہو سکو گے تاکہ یہاں آکر غذائی اجناس خرید سکو۔

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿٦١﴾

"انہوں نے کہا اس کے باپ سے خواہش کریں گے اور ہم یہ کر کے ہی رہیں گے"۔

بھائیوں کا جواب

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا ہم اپنے بابا کے پاس جائیں گے اور پوری کوشش کریں گے کہ ان کو راضی کریں تاکہ وہ اسے ہمارے ساتھ بھیج دے۔ ان کی اس بات میں یہ اشارہ ہے کہ انہوں نے پہلے یوسفؑ کے لئے اپنے باپ سے جو کچھ کہا تھا اس کی وجہ سے ان کے والد یوسفؑ کی جدائی برداشت نہیں کر پا رہے تھے اور گریہ وزاری میں مصروف رہتے تھے اور اب اس بھائی کی جدائی کیسے برداشت کریں گے۔ وہ تو اُنہیں اپنے آپ سے دُور نہیں کریں گے۔ یہ نہیں کہا کہ ہم اپنے بابا کو مجبور کریں گے بلکہ کہا اس کے باپ کو مجبور کریں گے اور کہا حتماً ان کو راضی کریں گے اور انہیں اپنے ساتھ لے آئیں گے۔

وَ قَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٢﴾

"اور اپنے خدمت گاروں سے کہہ دیا کہ ان کی پونجی ان کے اسباب میں رکھ دو تاکہ وہ اسے پہچانیں جب وہ لوٹ کر اپنے گھر جائیں شاید وہ پھر آ جائیں"۔

حضرت یوسفؑ کا اقدام

حضرت یوسفؑ نے اپنے کارندوں سے کہا کہ ان کے بھائیوں نے اجناس کی جو قیمت ادا کی ہے اسے ان کے اسباب میں رکھ دو تاکہ جب یہ گھر پہنچیں گے اور اپنا اسباب کھولیں گے تو اپنی پونجی کو پہچان لیں گے اور اس طرح پھر وہ ہمارے پاس واپس پلٹیں گے اور اپنے بھائی کو بھی ساتھ لے آئیں گے۔ ان کے اس عمل کا مقصد اُن کے دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرانا تھا اور اُنہیں یہ لالچ دلانا تھا کہ وہ واپس آئیں تاکہ وہ احسان، پذیرائی اور اکرام جو ہماری طرف سے انہیں پہلی دفعہ ملا تھا وہ دوبارہ مل جائے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

"پھر جب اپنے باپ کے ہاں پہنچے تو کہا اے باپ! ہمارا پیمانہ روک لیا گیا پس آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجیے کہ ہم پیمانہ لائیں اور بے شک ہم اس کے نگہبان ہیں"۔

والد سے یوسفؑ کے بھائیوں کی درخواست

"اکتیال" وزن کے ذریعے غذائی اجناس وصول کرنے کو کہتے ہیں۔ جب یوسفؑ کے بھائی واپس اپنے شہر آئے تو اپنے والد سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیں کیونکہ اگر ہمارے بھائی کو نہیں بھیجیں گے تو ہمیں غذائی اجناس نہیں ملیں گی۔ ہم ان کا

خیال رکھیں گے اور ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور اپنی مہربانی اور شفقت کا اظہار کیا تاکہ ان کے والد ان پر اعتماد کریں اور ان کے بھائی کو ان کے ہمراہ بھیج دیں۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٦٤﴾

''کہا میں تمہارا اس پر کیا اعتبار کروں مگر وہی جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی پر اعتبار کیا تھا، سو اللہ بہتر نگہبان ہے اور وہ سب مہربانوں سے مہربان ہے''۔

حضرت یعقوبؑ کا جواب

حضرت یعقوبؑ نے ان کی بات پر اعتراض کر دیا اور کہا کہ تم یہ توقع رکھتے ہو کہ میں تمہیں امین جانوں اور تمہارے اوپر اعتماد کروں جبکہ یوسفؑ کے بارے، میں نے تمہارے اوپر اعتماد کیا تھا اور تم نے اس کی حفاظت کا وعدہ دیا تھا لیکن تم اس کے بارے میں کچھ نہیں کر سکے اور تمہارا اطمینان دلانا کچھ فائدہ نہیں دیتا یہ بے ہودہ بات ہے۔ بہترین اعتماد اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ہے، اسی پر ہی اعتماد ہے، وہی بہترین محافظ ہے، وہی بہترین مہربان ہے۔ جو بھی اللہ پر توکل کرے ہرگز وہ اپنی رحمت دینے سے دریغ نہیں کرتا اور اللہ اس کے لئے کافی ہے اور اس کے امر کو انجام دیتا ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ (سورۂ طلاق، آیت: ۳)

ترجمہ: ''اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے پس اس کے لیے اللہ کافی ہے، اللہ اپنا (فیصلہ) حکم پورا کرنے والا ہے''۔

حضرت یعقوبؑ کی بات اس امر سے کنایہ تھی کہ اُس کے بھائیوں نے یوسفؑ پر رحم نہیں کیا اور اُس وقت اُن کے باپ نے ان پر اعتماد کیا لیکن اُنہوں نے اس اعتماد کو ٹھیس پہنچائی

اور یوسفؑ کے حق میں کوتاہی کی۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنے اس کلام سے اپنے بیٹوں کی درخواست کو رد کر دیا۔ جب انہوں نے اپنے سامان کو کھولا تو دیکھا کہ اُن کا سرمایہ واپس پلٹا دیا گیا ہے تو انہوں نے کہا کہ اب ہم اور کیا چاہتے ہیں، ہمارا سرمایہ ہی واپس لوٹا دیا گیا ہے، ہم اپنے خاندان کے لیے غذائی اجناس لے آئیں گے اور اپنے بھائی کی محافظت کریں گے اور اب جو سامان لے کر آئے ہیں اس سے زیادہ سامان لائیں گے۔

وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَیْهِمْ ؕ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِیْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا ۚ وَ نَمِیْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَیْلَ بَعِیْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَیْلٌ یَّسِیْرٌ ﴿۶۵﴾

''اور جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا تو انہوں نے اپنی پونجی پائی جو انہیں واپس کردی گئی تھی، کہا اے ہمارے باپ! ہمیں اور کیا چاہیے، یہ ہماری پونجی ہمیں واپس کردی گئی ہے، اور ہم اپنے گھر والوں کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بار اور زیادہ لائیں گے، اور یہ اضافی بار ملنا آسان ہے''۔

سرمایہ کی واپسی

''میرہ'' ان غذائی اجناس کو کہا جاتا ہے جنہیں ایک شہر سے دوسرے شہر لے جایا جاتا ہے۔ بہرحال یوسفؑ کے بھائیوں نے سامان کھولا تو دیکھا کہ اُن کا سرمایہ واپس پلٹا دیا گیا ہے۔ وہ خوشحال ہوئے اور اسے عزیز مصر کے اکرام اور مہمان نوازی کی نشانی قرار دی اور کہا کہ ہمارے لئے یہ غذائی اجناس مفت میں دے دی ہیں۔ پھر خوشحالی سے کہا بابا جان! اب ہم

ان سے اور کیا مانگیں گے؟ انہوں نے تو ہمارا سرمایہ ہی ہمیں واپس کر دیا ہے۔ لہٰذا بڑے آرام اور بڑے اطمینان سے ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دو تاکہ ہم جائیں اور وہاں سے اپنے گھر والوں کے لئے غذائی اجناس لے آئیں اور جیسا کہ ہم نے وعدہ دیا ہے، اس دفعہ ہم اپنے بھائی کا خیال رکھیں گے۔ یہ جو بھی غذائی اجناس لے آئے ہیں وہ تھوڑی ہیں۔ اس دفعہ زیادہ غذائی اجناس لے کر آئیں گے ہمیں چونکہ زیادہ اجناس کی ضرورت ہے۔ اگر ''یسیرا'' کو آسان کے معنی میں لیں تو اس کا معنی اس طرح ہوگا ہم اس دفعہ زیادہ وزن لے آئیں گے اور یہ زیادہ وزن لینا ہمارے لئے آسان اور سہل ہوگا۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٦٦﴾

''کہا اسے ہر گز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا یہاں تک کہ مجھے اللہ کا عہد دو کہ البتہ اسے میرے ہاں ضرور پہنچا دو گے مگر یہ کہ تم سب گھر (کہیں پھنس) جاؤ، پھر جب سب نے اسے عہد دیا تو کہا ہماری باتوں کا اللہ شاہد ہے''۔

یوسفؑ کے بھائیوں کا والد سے عہد

''مَوْثِقًا'' ایسا امر جس میں اعتماد ہو۔ ''مَوْثِقًا مِّنَ اللہ'' کا مطلب ہے ایسا امر جس پر اعتماد بھی ہو اور اس کا خدا کے ساتھ بھی ارتباط ہو جیسے عہد و قسم جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام کے احترام کی وجہ سے پورا ہونے کا سبب بنے۔ یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں اس وقت تک اپنے بیٹے کو تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک تم عہد و پیمان نہ باندھو، قسم اٹھاؤ کہ اس کے پابند رہو گے اور اسے واپس لے آؤ گے اور جب کسی مصیبت میں پھنس جاؤ تو خداوند تبارک و تعالیٰ اس گفتگو اور عہد و پیمان پر تمہارا ناظر و وکیل ہے جس کی تم پابندی کر

رہے ہو اس پر عمل کرنا، یہ وعدہ دے رہے ہو۔ جو خلاف کرے گا تو خدا اسے سزا دے گا۔

وَ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَ مَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَ عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا اور مختلف دروازوں سے داخل ہونا، اور میں تمہیں اللہ کی کسی بات سے بچا نہیں سکتا، اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں ہے، اسی پر میرا بھروسہ ہے، اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے''۔

یعقوبؑ کا بنیامین کو بھیجنے کے لیے راضی ہو جانا

حضرت یعقوبؑ بنیامین کو اس کے بھائیوں کے ساتھ بھیجنے کے لیے راضی ہو گئے اور جب وہ مصر جانے کے لئے آمادہ ہوئے تو، یعقوبؑ اپنے گیارہ بیٹوں کے بارے میں پریشان تھے اور ڈرتے تھے کہ لوگ ان کو اکٹھا دیکھ کر ان پر حسد نہ کریں اور نظر بد نہ لگائیں، ان کے خلاف سازش نہ کریں لہٰذا ان کو دستور دیا کہ شہر کے مختلف دروازوں سے الگ الگ جانا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ احتیاط اللہ کے اذن سے ہے اور اس کا بھی اللہ کے اذن کے بغیر کوئی فائدہ نہیں ہو گا لہٰذا کہا میں یہ جو فرمان دے رہا ہوں یہ اللہ سے توسل سے بے نیاز نہیں کرتا کیونکہ حکم فقط اللہ کا ہی چلتا ہے، اللہ کے حکم اور ارادے کے بغیر کوئی سبب تاثیر نہیں رکھتا، ظاہری اسباب اللہ کے اذن سے اور اللہ کی مشیت سے موثر ہوتے ہیں۔ شاید حضرت یعقوبؑ چاہتے تھے کہ یوسفؑ تنہائی میں اپنے بھائی سے کچھ بات کر لے، اسی لئے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ وہ شہر کے الگ الگ دروازے سے داخل ہوں۔ آخر میں اپنی اس بات کی وجہ بھی بیان کی کہ میں تو

تمہیں دستور دے رہا ہوں لیکن میرا توکل اللہ پر ہے، تمام عاقل اور رشید انسانوں کو چاہیے کہ وہ اللہ پر توکل کریں، اللہ کو اپنا وکیل بنائیں کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں، کسی کے لئے کوئی استقلال نہیں ہے۔ طبیعی اسباب مستقل نہیں ہیں، صاحب اختیار اور وکیل فقط اللہ کی ذات ہے جو تمام اسباب پر غالب ہے اور قدرت مطلقہ اللہ کی ہے، اسی کا حکم ہر جگہ نافذ اور جاری ہے۔

وَ لَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۟۶۸

''اور جب کہ اسی طرح داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے حکم دیا تھا انہیں اللہ کی کسی بات سے کچھ نہ بچا سکتا تھا مگر یعقوب کے دل میں ایک خواہش تھی جسے اس نے پورا کیا، اور وہ تو ہمارے سکھلانے سے علم والا تھا لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے''۔

یوسفؑ کے بھائیوں کا مصر میں داخلہ

یوسفؑ کے بھائی دوبارہ مصر میں آگئے۔ اپنے والد کے دیے ہوئے حکم پر عمل پیرا ہوئے اور سب ایک دروازے سے داخل نہیں ہوئے بلکہ مختلف دروازوں سے الگ الگ داخل ہوئے تاکہ اس مصیبت کو ٹال سکیں جس کا یعقوبؑ کو ڈر تھا۔ لیکن قضائے الٰہی کے مطابق جو ہونا ہوتا ہے اس کے علاوہ نہیں ہو سکتا، قضائے الٰہی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اس طرح عزیز مصر نے اپنے بھائی کو لے لیا۔ اور ان کا بڑا بھائی بھی مصر میں باقی رہ گیا کیونکہ اس میں یہ قدرت نہیں تھی کہ اپنے بابا کا آمنا سامنا کرے۔ حضرت یعقوبؑ کا یہ عمل بھی ان کے

اور ان کے بیٹوں کے درمیان فراق کو ٹال میں مانع نہیں ہوا۔ خدا نے یعقوبؑ کے منصوبے کو بے اثر کیا اور اپنا فیصلہ جاری کیا تاکہ اس طرح یعقوبؑ کی اس حاجت کو پورا کرے جو اس کے دل میں تھی یعنی یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسفؑ تک پہنچ جائے۔ پھر فرمایا کہ تعلیم الٰہی کے سبب یعقوبؑ کے پاس علم تھا اور یہ علم اللہ کی جانب سے اس کے لیے عطیہ ہوتا ہے جو توحید میں اخلاص رکھتا ہو۔ لیکن زیادہ تر لوگ اسے نہیں جانتے، یہ لوگ علم سے بے بہرہ ہیں لیکن اگر یہ علم اکتسابی ہو اور معمول کے طریقوں سے حاصل ہو تو سارے لوگ اس کو حاصل کر سکتے ہیں تو یہ جملہ یعقوبؑ کی تعریف میں بیان ہوا ہے۔ یعنی یہ علم حضرت یعقوبؑ کو اللہ کی طرف سے اسے عطیہ ملا۔

یعقوبؑ اپنے بیٹوں کے کسی مصیبت میں گرفتار ہونے کی پیش بینی کر رہے تھے اور یہی سبب بنا کہ انہوں نے یہ طریقہ انہیں بتایا لیکن ان کی اس سے مہم تر حاجت تھی وہ یوسفؑ تک پہنچنا تھا۔ خدا نے آخری جملہ میں یعقوبؑ کے توکل اور ان کے علم کی تعریف کی ہے اور اس جملے سے یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ نے ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے ان کی اندرونی حاجت پوری فرمائی۔

وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

''اور جب وہ یوسف کے پاس گئے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی، کہا کہ بے شک میں تیرا بھائی ہوں پس جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں اس پر غم نہ کر''۔

بنیامین سے یوسفؑ کی ملاقات

جب یوسفؑ کے بھائی اس کے پاس آگئے تو حضرت یوسفؑ نے بنیامین کو اپنے پاس

بلایا اور خاموشی سے اسے بتا دیا کہ میں یوسفؑ، تیرا بھائی ہوں، ہم ایک ماں باپ سے ہیں لہٰذا یہ بھائی تمہارے ساتھ جو بھی کریں ان کی ماں اور ہے اور انہوں نے ہمارے ساتھ جو ظلم اور حسد کیا ہے تم اس سے پریشان نہیں ہونا، افسردہ نہ ہونا۔ شاید یہ مطلب بھی ہو کہ میرے غلام جو کچھ انجام دیں اس سے بھی پریشان نہ ہونا کیونکہ یہ منصوبہ اور پروگرام ہے جس کے مطابق تجھے قید کیا جائے گا اور میں اس طرح تجھے اپنے پاس ٹھہرالوں گا۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾

''پھر جب یوسف نے اس کا سامان تیار کر دیا تو اپنے بھائی کے اسباب میں کٹورا رکھ دیا، پھر پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو! بے شک تم البتہ چور ہو''۔

بنیامین کو روکنے کا منصوبہ

''سِقَايَة'' پانی پینے کے برتن کو کہتے ہیں۔ ''رَحْل'' اس چیز کو کہتے ہیں جو اونٹ کی پشت پر سامان لادنے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ یہاں پر اس سے بادشاہ کے پانی پینے کا برتن مراد ہے جسے یوسفؑ نے بنیامین کو اپنے پاس رکھنے کے لیے ایک منصوبہ کے تحت اس کے سامان میں رکھ دیا تھا۔ پھر آواز دی اے قافلے والو! تم چور ہو؟ بادشاہ کا پانی پینے والا برتن تم نے نے اٹھالیا ہے۔ یوسفؑ کا بھائی بنیامین اس ماجرا سے آگاہ تھا کیونکہ یوسفؑ نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے ایک منصوبہ بنانے والا ہے۔ ان کو سارق یعنی چور کہنا حقیقی تہمت نہ تھی بلکہ ظاہری طور پر اور ایک مصلحت کے تحت تھا انہیں سارق پکارا گیا تھا جس کا ایک ضروری مصلحت اقتضاء کر رہی تھی۔

قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾

"اس کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے"۔

یعنی یوسفؑ کے بھائیوں نے پریشانی کے عالم میں یوسفؑ کے غلاموں سے پوچھا کس چیز کو ڈھونڈ رہے ہو کیا چیز تمہاری کوئی چیز گم ہوئی ہے؟

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾

"انہوں نے کہا ہمیں بادشاہ کا کٹورا نہیں مل رہا جو اسے لائے گا ایک اونٹ بھر کا غلہ پائے گا اور میں اس کا ضامن ہوں"۔

بادشاہ کے جام کے گم جانے کے اعلان

یوسفؑ کے غلاموں نے کہا بادشاہ کے پانی پینے کا برتن گم گیا ہے۔ یوسفؑ نے کہا جو بھی اسے ہمارے پاس لے آئے گا اسے اونٹ کا ایک بار وزن مفت دیا جائے گا اور میں اس کا ضامن بھی ہوں۔ انہوں نے یہ قرارداد آپس میں باندھی۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

"انہوں نے کہا اللہ کی قسم تمہیں معلوم ہے ہم اس ملک میں شرارت کرنے کے لیے نہیں آئے اور نہ ہم کبھی چور تھے"۔

یوسفؑ کے بھائیوں کا اظہار لاعلمی

ان کی اس بات کا مطلب یہ تھا کہ ہم پہلے بھی آپ کے ہاں آئے ہیں اور دربار کی طرف سے ہمارے بارے میں تحقیق و تفتیش کی گئی تھی کیونکہ یوسفؑ کا دستور تھا کہ جو بھی

مصر میں وارد ہو ان سب کی معلومات لی جائیں تا کہ ان میں کوئی جاسوس نہ ہو اور کوئی اجنبی نہ آجائے، کوئی غلط نیت سے نہ آیا ہو۔ اس لئے یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا آپ کو پتہ ہے ہم فسادی نہیں ہیں اور ہم ایسے خاندان سے ہیں کہ کبھی بھی یہ رذایل اور گھٹیا کام نہیں کرتے اور ایسا کام ہم سے صادر بھی نہیں ہو سکتا۔

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾

"انہوں نے کہا پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے نکلو"۔

یوسفؑ کے غلاموں نے یا یوسفؑ اور غلاموں نے کہا اگر تم نے چوری کی ہو تو تمہاری سزا کیا ہو گی؟

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

"انہوں نے کہا اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے پایا جائے پس وہی اس کے بدلہ میں جائے، ہم ظالموں کو یہی سزا دیتے ہیں"۔

چور کی سزا کا اعلان

یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا: ہم نے تو چوری نہیں کی ہے۔ یوسفؑ کے کارندوں نے کہا اگر چوری نکل آئی تو تمہاری کیا سزا ہو گی؟ انہوں نے کہا جس کے سامان سے جام نکلے گا تو وہی اس کی سزا بھگتے گا اور وہی جام کے مالک کا غلام بنے گا۔ بظاہر حضرت یعقوبؑ کی سنت میں یہی تھا کہ چور کو اس شخص کا غلام بننا پڑتا تھا جس کا اس نے مال چرایا ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جس کے سامان سے بادشاہ کا جام پکڑا گیا اسی کو غلام بنایا جائے، اس کے باقی ساتھی اس کے ذمہ دار نہیں ہوتے لہٰذا ان کو کچھ نہیں کہا جائے اور انہیں نہ روکا جائے۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

''پھر یوسف نے اپنے بھائی کے اسباب سے پہلے ان کے اسباب دیکھنے شروع کیے پھر وہ کٹورا اپنے بھائی کے اسباب سے نکالا، ہم نے یوسف کو ایسی تدبیر بتائی تھی، بادشاہ کے قانون سے تو وہ اپنے بھائی کو ہر گز نہ لے سکتا تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے، ہم جس کے چاہیں درجات بلند کرتے ہیں، اور ہر ایک دانا سے بڑھ کر دوسرا دانا ہے''۔

بادشاہ کے جام کی تلاش

اب یوسفؑ نے خود تلاشی لینا شروع کی، سب کا سامان دیکھتے آئے۔ پہلے دوسرے بھائیوں کا سامان دیکھا، جب اُنہوں نے دس اونٹوں کا سامان دیکھا تو گیارہویں نمبر پر بنیامین کے اونٹ کا سامان دیکھنا شروع کیا، دیکھا کہ جام بنیامین کے سامان میں موجود ہے، تو اسے گرفتار کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ یوسفؑ کا پلان تھا جو ہم نے اسے تعلیم دیا تھا تاکہ بھائیوں کی زبان ہی سے چور کی سزا کہلوائے اور بنیامین کو اپنے پاس رکھے وگرنہ مصر کے قوانین میں ایسا حکم نہیں تھا اور یوسفؑ مصر کے قوانین کے مطابق اپنے بھائی کو چوری کے جرم میں گرفتار کر کے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن خدا نے چاہا کہ اس کو اپنے ملک کے آئین کے مطابق سزا دی جائے۔ اگر سب سے پہلے بنیامین کے سامان کو دیکھنے جاتے تو شک پڑ جاتا کہ شاید سازش ہے لہٰذا پہلے اس کے سامان کو نہیں دیکھا، پہلے دوسرے بھائیوں کے سامان کو دیکھا اور آخر میں

بنیامین کے سامان کو دیکھا۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ یہ ساری منصوبہ بندی ہم نے یوسفؑ کو تعلیم دی تھی۔

اس آیت میں دین سے مراد وہ قانون ہے جو کسی معاشرے میں رائج ہوتا ہے، یہاں پر اس سے عقائد اور عبادات مراد نہیں۔ دین ایک نظام ہے جو زندگی کے تمام پہلو خواہ سیاسی ہوں یا اقتصادی یا اجتماعی یا جزائی سب میں زندگی کو حرکت دینے والا ہوتا ہے۔ دین ایسا نظام ہے جو تمام شہری قوانین، معاملات اور کاروبار میں انسانوں کے روابط کو شامل ہے۔ لہٰذا دین انسان کی دنیا اور آخرت کی سعادت کا ضامن ہے اور آسمان کی اور زمین کی برکات کے نازل ہونے کا سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ہم جس پر چاہیں احسان کرتے ہیں اور اس کے درجات کو بلند کر دیتے ہیں۔ علم ایسے امور میں سے ہے جو کسی ایک حد پر متوقف نہیں ہوتا اور نہ ہی علم کی کوئی انتہاء ہے، ہر علم کے بعد ایک اور علم حاصل ہوتا ہے جو اس سے زیادہ علم رکھتا ہے وہی بڑا عالم ہوتا ہے البتہ یہ علم اکتسابی کے بارے میں ہے جو عالم کی ذات پر عارض ہوتا ہے۔ علم الٰہی عین ذات ہے اور اس کے ماوراء کوئی اور موجود ہے ہی نہیں، اس کی ذات لامحدود ہے اس ذات کی کوئی حد اور نہایت نہیں ہے۔ شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ علم خدا تمام علماء کے علم سے برتر و بالاتر ہے۔

قَالُوۡۤا اِنۡ يَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ‌ۚ فَاَسَرَّهَا يُوۡسُفُ فِىۡ نَفۡسِهٖ وَلَمۡ يُبۡدِهَا لَهُمۡ‌ۚ قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّكَانًا‌ ۚ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا تَصِفُوۡنَ ۝۷۷

"انہوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی

چوری کی تھی، تب یوسف نے اپنے دل میں آہستہ سے کہا اور انہیں نہیں جتایا، کہا تم درجے میں بدتر ہو، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم بیان کرتے ہو"۔

بھائیوں کا بنیامین سے بیزاری کا اظہار

حضرت یوسفؑ کے بھائی دوسری ماؤں کے بطن سے تھے، اُنہوں نے کہا کہ اگر آج بنیامین نے چوری کی ہے تو تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس سے پہلے اُس کا بھائی یوسف بھی چوری کر چکا ہے۔ انہیں یہ دو صفات ان کی ماں کی طرف سے ملی ہیں اور ہم ماں کی طرف سے ان دونوں سے علیحدہ ہیں۔ اس طرح بنیامین سے اپنی بیزاری کا اعلان کر دے لیکن وہ اس بات کی طرف متوجہ نہ تھے کہ اُن کی یہ بات پہلے کہی گئی بات سے بالکل مختلف تھی جس میں اُنہوں نے اولاد یعقوبؑ سے چوری کی نفی کی تھی۔ ان دونوں باتوں میں تضاد تھا لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ کلام اُن کے اندرونی حسد کی بنا پر تھا جس کے ذریعے حقیقت میں وہ اپنے حسد اور یوسفؑ کے ماجرا کو فاش کر رہے تھے۔ ایک ضعیف روایت ہے کہ حضرت یوسفؑ نے بچپن میں اپنی پھوپھی کا کمربند چوری کیا تھا یا یہ کہ ان کی پھوپھی نے انہیں اپنے پاس رکھنے کے لیے ان پر چوری کی تہمت لگائی تھی۔ (اللہ العالم)

بہرصورت جب حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کی یہ تہمت سنی تو اُنہیں بہت تکلیف ہوئی لیکن اُنہوں نے اپنی اس بے چینی کو چھپالیا اور ان کے سامنے اس کا اظہار نہ کیا فقط اتنا کہا کہ تم اس سے بدتر ہو۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تمہاری گفتگو میں تضاد ہے اور یہ اس حسد پر دلالت کرتا ہے جو تمہارے دلوں میں موجود ہے۔ یا جو تم نے جرم کیا ہے اور عزیز مصر کے سامنے جھوٹ بول رہے ہو جبکہ اس نے اس قدر تمہارے لئے انعامات دیئے اور تم پر احسانات کئے ہیں۔ یا اس حوالے سے ہے کہ اگر بنیامین نے بادشاہ کے جام کو چوری کیا ہے تو تم نے یوسفؑ کو اس کے باپ سے چوری کیا ہے، تو تمہاری وضعیت اس سے بدتر ہے۔ یوسفؑ

نے کہا کہ خدا بہتر جانتا ہے کہ جو کچھ بیان کر رہے ہو کہ اس کے بھائی نے چوری کی تھی یا نہیں۔ یوسفؑ نے اسی اجمالی جواب پر اکتفاء کیا اور اُن کو جھٹلایا نہیں۔

قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

''انہوں نے کہا اے عزیز! بے شک اس کا باپ بوڑھا بڑی عمر کا ہے سو اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لو، ہم تم کو احسان کرنے والا دیکھتے ہیں''۔

یوسفؑ کے بھائیوں کی درخواست

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے بڑی منت و سماجت کے انداز میں کہا کہ اس کا باپ بوڑھا ہے اور وہ اس کے ساتھ بہت پیار و محبت کرتا ہے اور ہم اُن کے ساتھ بہت محکم اور بڑا عہد و پیمان باندھ کر آئے ہیں کہ اسے واپس باپ کے پاس لے جائیں گے، تم اسے غلامی میں نہ لو اور اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو لے لو اور اسے ہمارے ساتھ بھیج دو اور اس کو کچھ نہ کہو کیونکہ ہم تو تیرے اندر بڑائی، نیکی اور احسان کے آثار دیکھ رہے ہیں، ہمارے اوپر رحم کرو اور اپنا احسان ہمارے اوپر کر دو۔ ان کی اس گفتگو کا مقصد عزیز مصر کے احسان اور اُن کی رحمت اور مہربانی حاصل کرنا اور اُن کے اندرونی جذبات کو ابھارنا تھا۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

''کہا اللہ کی پناہ کہ ہم بجز اس کے جس کے پاس اپنا اسباب پایا کسی اور کو پکڑیں، تب تو ہم بڑے ظالم ہوں گے''۔

حضرت یوسفؑ کا جواب

حضرت یوسفؑ نے ان کی بات کو رد کر دیا اور کہا کہ اللہ کی پناہ! ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ جرم کوئی کرے اور اُس کی سزا کسی اور کو دی جائے۔ اگر ہم ایسا کریں گے اور جس نے جام چرایا ہے اس کی جگہ کسی اور کو رکھ لیں گے تو یہ ظلم ہو گا اور ظلم سے میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾

"پھر جب اس سے نااُمید ہوئے تو مشورہ کرنے کے لیے اکیلے ہو بیٹھے، ان میں سے بڑے نے کہا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے تم سے اللہ کا عہد لیا تھا اور پہلے جو یوسف کے حق میں قصور کر چکے ہو، سو میں تو اس ملک سے ہر گز نہیں جاؤں گا یہاں تک کہ میرا باپ مجھے حکم دے یا میرے لیے اللہ کوئی حکم فرمائے، اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"۔

یوسفؑ کے بھائیوں کی آپس میں گفتگو

جب یوسفؑ کے بھائیوں نے دیکھا کہ وہ بنیامین کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور ان کی مہربانی اور احسان سے نااُمید ہو گئے تو علیحدہ ہو کر آپس میں گفتگو کرنے لگے، ان میں سے سب سے بڑے بھائی نے کہا کہ کیا تمہیں پتہ نہیں کہ تم نے والد سے عہد و پیمان باندھا ہے کہ

بنیامین کے بغیر واپس نہیں آؤ گے اور اس سے پہلے بھی یوسفؑ کے مسئلے میں تم لوگوں نے ایسے ہی کیا تھا اور اسے کنوئیں میں پھینک دیا اور آکر کہا کہ اسے بھیڑیے کھا گئے جبکہ تم نے اپنے باپ سے یہ عہد و پیمان باندھا تھا کہ اسے صحیح و سالم واپس لے آؤ گے اور اس کی حفاظت کرو گے۔ میں تو ہرگز مصر کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ خود والد مجھے واپس آنے کی اجازت نہ دے اور یہ عہد و پیمان میری گردن سے اُٹھا لے اور خداوند خود میرے لئے کوئی نجات کا راستہ نہ نکالے، ایسا راستہ جس کے بارے میں میں نے سوچا ہی نہیں ہے۔ مجھے چھوڑ دو اور خدا خود میرے بارے فیصلہ دے گا، وہی بہترین فیصلہ دینے والا ہے۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾

"تم اپنے باپ کے پاس لوٹ جاؤ اور کہو اے ہمارے باپ! تیرے بیٹے نے چوری کی، اور ہم نے وہی کہا تھا جس کا ہمیں علم تھا اور ہمیں غیب کی خبر نہ تھی"۔

بڑے بھائی کا مکالمہ

بڑے بھائی نے دوسرے بھائیوں سے کہا کہ تم سب بابا کے پاس چلے جاؤ اور اُن سے کہو تیرے بیٹے نے چوری کی تھی۔ ہم چوری کی سزا کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے سوائے اس کے جو ہماری سنت تھی، لہٰذا ہم نے عزیز مصر کو اس کے متعلق بتا دیا، اگر ہمیں خبر ہوتی تو ہم ایسی گواہی نہ دیتے، ہم اُن سے یہ نہ کہتے کہ جس کے سامان سے چوری کا مال برآمد ہو اُسی کو اُس جرم میں پکڑنا ہو گا۔ ہمیں تو اس بارے ایسا کوئی گمان بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو گا۔

وَ سْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِىْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِىْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

''اور اس آبادی والوں سے پوچھ لیجیے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے بھی جس میں ہم آئے ہیں، اور بے شک ہم سچے ہیں''۔

اپنی بے گناہی کی گواہی

پچھلی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بڑے بھائی نے باقی بھائیوں سے کہا اپنے بابا سے جا کر کہیں اگر اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس سفر میں ہمارے ساتھ لوگوں سے پوچھ لیں تو ذرہ برابر بھی اس بارے شک نہیں رہے گا، ہم نے اپنے بھائی کے بارے کوئی کوتاہی نہیں کی، ہم سچے ہیں۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِىْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

''کہا بلکہ تم نے دل سے ایک بات بنالی ہے، اب صبر ہی بہتر ہے، اللہ سے امید ہے کہ شاید اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے، وہی جاننے والا حکمت والا ہے''۔

حضرت یعقوبؑ کا بیان

یہاں پر درمیان والی باتیں حذف کی گئی ہیں اور آخری بات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب یوسفؑ کے بھائی اپنے والد کے پاس پہنچ گئے اور انہیں سفر کا ماجرا سنایا اور بڑے بھائی کی بتائی گئی باتیں انہیں سنائیں تو یعقوبؑ نے ان کی ساری باتیں سنیں، سننے کے بعد اُن کے جواب میں کہا ایسا نہیں ہے! آپ کا مقصد ان کو جھٹلانا نہیں تھا کیونکہ قطعی قرائن اور علامت اُن کی سچائی

پر گواہ تھے۔ لیکن اُنہوں نے اللہ کی دی ہوئی فراست اور دانشمندی سے پیشگوئی کی تھی کہ یہ ماجرا ان کے نفسانی خواہشات اور میلانات کی وجہ سے پیش آیا ہے اور یہ واقعہ ان کی اس کوتاہی کے سبب پیش آیا ہے جو انہوں نے یوسفؑ کے بارے کی تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے اس حوالے سے کہا کہ یہ سارے تمہارے نفس کا کیا دھرا ہے۔ پھر اُمید واری کے انداز میں فرمایا: صبر اچھی بات ہے یعنی میں تو صبر کروں گا اور اس کا شکوہ ہرگز اللہ کے بندوں کے پاس نہیں کروں گا، میں اپنا معاملہ خداوند تبارک و تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں، جیسا کہ میں نے یوسفؑ کے متعلق کیا تھا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ خدا سب کو یعنی بنیامین اور اُن کے بڑے بھائی کو اکٹھا میرے پاس لے آئے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کس کا انتخاب کرے اور اپنی نعمت کس کو عطا کرے، وہ حکیم ہے اس کے سارے امور حکمت کے تحت منصوبہ بندی ہوتے ہیں۔ یہ کلام حضرت یعقوبؑ کی اللہ تعالیٰ پر پختہ اُمید پر دلالت کرتا ہے۔

وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

"اور اس نے ان سے منہ پھیر لیا اور کہا ہائے یوسف! اور غم سے اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں پس وہ سخت غمگین ہوا"۔

یعقوبؑ کا بیٹوں سے منہ پھیرنا

حضرت یعقوبؑ نے یہ ماجرا سن لیا تو بہت اندوہناک اور ناراض ہوئے، دل میں افسوس ہوا اور اپنے بیٹوں سے منہ موڑ لیا اور ایک طرف ہو گئے اور بڑی حسرت اور اشتیاق سے روئے اور کہا ہائے افسوس یوسفؑ پر۔ یوسفؑ کے فراق میں اس قدر غمزدہ ہوئے اور اتنا روئے کہ ان کی آنکھوں کا نور چلا گیا۔ لیکن وہ اس غم کا شکوہ زبان پر نہ لائے، اور اپنے بیٹوں

سے کچھ نہیں کہتے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

''انہوں نے کہا اللہ کی قسم توں یوسف کی یاد کو نہیں چھوڑے گا یہاں تک کہ بے کار ہو جائے یا ہلاک ہو جائے''۔

فرزندان یعقوبؑ کا والد سے مکالمہ

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اپنے بابا سے کہا کہ اللہ کی قسم توں ہمیشہ یوسفؑ کو یاد کرتا ہے۔ اس کو کئی سال گزر گئے ہیں اُس کی یاد کو نہیں بھلاتا، اس قدر اسے یاد کرتے ہو اور اس کے غم میں مبتلا ہو کہ ہلاکت کے قریب پہنچ گئے ہو، زیادہ دیر نہیں کہ اس محبت اور دلسوزی میں آپ مر جاؤ۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ حضرت یوسفؑ پر اتنی گریہ وزاری اور ہر وقت افسوس سے وہ تنگ آچکے تھے۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

''کہا میں تو اپنی پریشانی اور غم کا اظہار اللہ ہی کے سامنے کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

یعقوبؑ کا بیٹوں کو جواب

حضرت یعقوبؑ نے جب بیٹوں کی بات سنی تو ان سے کہا میں اپنے غم واندوہ کا شکوہ اللہ سے کرتا ہوں کیونکہ اگر اس کا شکوہ اللہ کے بندوں سے کروں گا تو یہ تکلیف آور اور بے فائدہ

ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے گریہ، میرے شکوہ اور میرے نالہ کو سننے سے ناتواں نہیں ہوتا اور نہ ہی تھکتا ہے، میں اللہ کی جانب سے کچھ ایسی باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو، میں اللہ کی کرامت سے مایوس نہیں ہوں اور اُس کی عنایت ضرور ملے گی۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۷

''اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کی تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو، بے شک اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں''۔

یعقوبؑ کی بیٹوں کو ہدایت

حضرت یعقوبؑ علم نبوت سے جانتے تھے کہ فَرَج قریب ہے لہٰذا اپنے بیٹوں سے کہا کہ جاؤ یوسفؑ اور اس کے بھائی کی تلاش کرو، جستجو کرو، ہو سکتا ہے ان دونوں کو پالو اور اللہ کی طرف سے گشائش آجائے اور شدت اور تکلیف سے نجات پالو، نااُمید نہ ہو، اللہ کی رحمت اور فَرَج سے کافر ہی نااُمید ہوتے ہیں۔ مومنین جانتے ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے اور وہ ہر غم کو زائل کر سکتا ہے، ہر مصیبت کو ٹال سکتا ہے لیکن کافر اس معنی پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اس کو نہیں سمجھتے، مومنین یقین کی منزل پر ہیں۔[1]

---

[1]۔ تاریخ میں آیا ہے کہ یعقوبؑ نے عزیز مصر کو خط لکھا۔ جب عزیز مصر یعنی یوسفؑ نے خط پڑھا تو اپنے چہرے سے نقاب اُتار دیا اور کہا میں یوسف ہوں، جاؤ باپ اور ماں کو لے کر آؤ۔ (مصحح)

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾

''پھر جب وہ ان کے پاس آئے تو کہا اے عزیز! ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو قحط کی وجہ سے بڑی تکلیف ہے اور کچھ نکمّی چیز لائے ہیں سو آپ پورا غلہ بھر دیجیے اور خیرات دیجیے، بے شک اللہ خیرات دینے والوں کو ثواب دیتا ہے''۔

برادران یوسفؑ کا مصر میں داخلہ

حضرت یوسفؑ کے بھائی مہربانی طلب کرتے ہوئے اور رحم کی اپیل اور بڑی منت سماجت کرتے ہوئے حضرت یوسفؑ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمارے پاس پیسے تھوڑے ہیں، ہمیں ان تھوڑے پیسوں کے بدلے زیادہ غذائی اجناس دیجئے۔ دوسرا یہ کہ ہمارا بھائی آپ کے پاس ہے، اسے آزاد کر دیجئے کیونکہ اس سے پہلے چوری کا مسئلہ سامنے آیا تھا۔ انہیں حاجت کے پوری ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی لیکن انہوں نے بڑا رقت آمیز کلام اور خضوع وانکساری اور عاجزی ظاہر کی تاکہ عزیز مصر کا دل نرم پڑ جائے اور اس کے اندرونی جذبات کو تحریک کریں۔ اس لیے سب سے پہلے تو اپنی بدحالی، بھوک اور خاندان کی پریشانی کو بیان کیا پھر اپنے سرمایہ کی کمی کا ذکر کیا لیکن اپنے بھائی کی آزادی کے لئے واضح طور پر کچھ نہیں کہا، فقط اشارے سے اتنا کہا کہ اُن پر مہربانی کرکے بخش دو کیونکہ اللہ تعالیٰ بخشنے والوں کو بڑا اچھا اجر دیتا ہے۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾

''کہا تمہیں یاد ہے جو کچھ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا تھا جب تمہیں

سمجھ نہ تھی"۔

یوسفؑ کا بھائیوں کو برے اعمال کی یاد دہانی

حضرت یوسفؑ نے اُن کے برے کام انہیں یاد دلائے۔ لیکن اس بات سے ان کا مقصد اُن کی سرزنش کرنا نہ تھا اور نہ ہی ان پر احسان چڑھانا چاہتے تھے۔ یہ بات اُن کی جوانمردی کی انتہاء ہے کہ جب کلمہ الٰہی اور وعدہ الٰہی محقق ہوا اور یوسفؑ رفعت اور بلندی کے مقام اور سلطنت کے تخت پر تھے اور اس کے بھائی ذلت اور کمزوری کی حالت میں تھے تو ان کے ساتھ اس طرح پیش آئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کو یاد دلائے اور انہیں پتہ ہو کہ وہ کس کے سامنے کھڑے ہیں اور اُنہیں تعلیم بھی دی کہ اُس کے جواب میں کون سا عذر گھڑیں اور کہا کہ یہ سب تمہاری جہالت، نادانی اور حسد کے سبب پیش آیا اور تم نے بھائی کے ساتھ ایسا کیا۔

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَآ اَخِيْ ٞ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

"کہا کیا تو ہی یوسف ہے، کہا میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، اللہ نے ہم پر احسان کیا، بے شک جو ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ بھی نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔

یوسفؑ کے بھائیوں کا تعجب کے ساتھ سوال

جب یوسفؑ کے بھائیوں نے یہ بات سنی تو اُن کو کچھ اندازہ ہو گیا کہ ایسا تو نہیں ہے کہ ہم خود یوسفؑ کے سامنے کھڑے ہیں۔ بڑے تعجب اور حیرت کے ساتھ کہنے لگے کہ

اے بادشاہ مصر ہمارے بھائی یوسفؑ تم ہی ہو؟ یوسفؑ نے جواب میں کہا: جی ہاں! ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر احسان کیا ہے، ہم ہی دو بھائی تھے جو تمہاری مکاری اور سازش اور حسد کا شکار ہوئے اور پھر اللہ کے اس احسان کا سبب بھی بیان کر دیا کہ جو تقویٰ اختیار کرے، صبر کرے نیکوکار ہو تو خدا نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ اس جملے سے انہیں بھی نیک عمل، احسان اور صبر کے ساتھ تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت دی۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾

''انہوں نے کہا اللہ کی قسم البتہ تحقیق اللہ نے تمہیں ہم پر بزرگی دی اور بے شک ہم غلط کار تھے''۔

یوسفؑ کے بھائیوں کا اعتراف

یوسفؑ کو پہچان کر ان کے بھائی شرمندہ بھی ہوئے اور اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا اور اقرار کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی قدرت ہے اور اس کے اپنے فیصلے ہیں کہ اُس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہیں ہمارے اوپر برتری عطا کی ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرکے معافی مانگنے لگے۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

''کہا آج تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تمہیں بخشے، اور وہ سب سے زیادہ مہربان ہے''۔

یوسفؑ کا بھائیوں کو درگزر کرنا

حضرت یوسفؑ اس لحاظ سے کہ عزیز مصر تھے اور ان کے پاس علم نبوت تھا اور حکم

چلانے کی قدرت بھی ان کے پاس تھی اور احادیث کا علم بھی تھا یعنی خوابوں کی تعبیر اور باقی گفتگو کی تاویل بھی جانتے تھے، یوسفؑ کے بھائی ذلت، خضوع و انکساری اور عاجزی سے اپنی خطاء کا اعتراف کر رہے تھے۔ کیونکہ انہوں نے بچپن میں جب یوسفؑ بچے تھے تو یہ بات کہی تھی کہ ہمارا بابا یوسفؑ سے زیادہ پیار کرتا ہے۔

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِۣ ۝ (سورۂ یوسف، آیت: ۸)

"جب انہوں نے کہا البتہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارا ہے جبکہ ہم طاقتور جماعت ہیں، بے شک ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے"۔

یہاں پر انہوں نے اعتراف کیا کہ خدا نے یوسفؑ کو ان پر برتری عطا کی ہے۔ اب یوسفؑ چاہ رہے تھے کہ انہیں عفو و در گزر کریں اور ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کریں لہٰذا اُن کی دلداری کے لیے اللہ سے دُعا کی کہ اُن کے گناہوں کو معاف کر دے۔ اگرچہ اس موقع پر سارے بھائی وہاں پر موجود نہ تھے، کچھ اپنے بابا کے پاس کنعان میں تھے۔ خدا ارحم الراحمین ہے اور رحمت بغیر مغفرت اور عیب پوشی کے محقق نہیں ہوتی۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَ اْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۹۳

"یہ کرتہ میرا لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے منہ پر ڈال دو کہ وہ بینا ہو جائے، اور میرے پاس اپنے سب کنبے کو لے آؤ"۔

کرتہ والد کی آنکھوں پر لگانے کا حکم

یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے آخری بات کہہ دی جو حضرت

یوسفؑ پر اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت تھی جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اب تک جس طرح اللہ تعالیٰ نے یوسفؑ کے حق میں سارے ظاہری اسباب معمول کے برعکس جاری کئے تھے اور ظاہری اسباب کا تقاضا یہ تھا کہ یوسفؑ ذلت و خواری میں مبتلا ہوں، لیکن وہی اسباب ان کی سربلندی اور عزت کا سبب بن گئے، جس طرح ان کا خون آلود کرتہ دیکھ کر ان کے والد ان کے فراق میں روتے اور حزن اور غم کی شدت سے نابینا ہو گئے پھر خداوند تبارک و تعالیٰ نے یوسفؑ کی قمیض کے وسیلہ سے ان کی بینائی واپس لوٹائی اور اُن کی آنکھوں کو شفاء مل گئی۔ اللہ نے اپنے امر کو غالب کیا۔ اللہ جیسے چاہے اور جس طرح ارادہ کرے ویسا ہی ہوتا ہے۔ آخر میں حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو حکم دیا کہ اپنے سب خاندان والوں کو کنعان سے مصر لے آؤ اور مصر میں میرے پاس آکر سکونت اختیار کرو۔

وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

''اور جب قافلہ روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا بے شک میں یوسف کی بو پاتا ہوں، اگر مجھے دیوانہ نہ بناؤ''۔

یعقوبؑ کا یوسفؑ کی خوشبو محسوس کرنا

جیسے ہی کاروان مصر سے چلا اور کنعان کا ارادہ کیا قبل اس کے کہ کنعان پہنچے، حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد سے کہا کہ تم میری رائے کو کمزور اور ناسمجھی قرار نہ دو تو میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ ایک غیبی حس سے میں جان رہا ہوں کہ یوسفؑ کا دیدار اور ملاقات قریب ہے لیکن تم میں یہ حس موجود نہیں ہے۔ جسے چھٹی حس کہتے ہیں اس کی بنا پر مجھے لگ رہا ہے کہ یوسفؑ سے ملاقات ہونے والی ہے۔ اگرچہ تم مجھے کہو

گے کہ میں غلطی پر ہوں اور مجھے نا سمجھ قرار دو گے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿٩٥﴾

''لوگوں نے کہا اللہ کی قسم بے شک تو البتہ اپنی پرانی گمراہی میں مبتلا ہے''۔

لوگوں کا ردعمل

جیسا کہ داستان کے ابتداء میں بیان ہوا یوسفؑ کے بھائیوں نے ان سے والد کی محبت کو گمراہی قرار دیا تھا اور کہا تھا: ''کہ ہمارے بابا کھلی گمراہی میں ہیں'' (سورہ یوسف، آیت: ۸)۔ اس گمراہی سے مراد یوسفؑ سے عشق و محبت میں حد سے بڑھ جانا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ والد کے پیار و محبت کے ہم زیادہ لائق ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس ضلالت اور گمراہی سے دین سے گمراہی مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد دو افراد میں سے ایک سے زیادہ محبت اور ایک سے کم محبت کرنا مراد ہے۔ جس سے کم محبت تھی وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح مجھ سے محبت ہونی چاہیے تھی اسی لئے وہ کہتا ہے کہ یہ گمراہ ہے۔ اگر وہ حضرت یعقوب پر دین کی گمراہی کی تہمت لگاتے تو پھر تو وہ کافر ہو جاتے، جبکہ وہ کافر نہیں تھے، مومن تھے اور اپنے بابا کے دین پر قائم تھے۔ جب خوشخبری دینے والا آن پہنچا اور یوسفؑ کی قمیض یعقوبؑ کے چہرے پر ڈال دی تو اسی وقت وہ بینا ہو گئے اور کہا کہ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے کچھ باتوں کو جانتا ہوں جسے تم نہیں جانتے ہو۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾

''پھر جب خوشخبری دینے والا آیا اس نے وہ کرتہ اس کے منہ پر ڈال دیا تو بینا ہو گیا، کہا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں

جانتے"۔

یوسفؑ کی قمیض سے یعقوبؑ کا بینا ہو جانا

جب خوشخبری لانے والا پہنچ گیا اور پیراہن یوسفؑ کو حضرت یعقوبؑ کے چہرے پر ڈال دی تو اللہ کے حکم سے یوسفؑ کی بات متحقق ہوئی اور وہ بینا ہو گئے۔ یعقوبؑ نے اپنی اولاد سے کہا کہ کیا میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے کچھ چیزوں کو جانتا ہوں جس سے تم جاہل ہو۔ حضرت یعقوبؑ کا یہ جملہ ان کی اولاد کی اس ملامت کی جانب اشارہ تھا کہ تم کس قدر یوسفؑ کو یاد کرتے ہو تو اس وقت انہوں نے فرمایا تھا:

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ (سورہ یوسف، آیت: ۸۶)

ترجمہ: "کہا میں تو اپنی پریشانی اور غم کا اظہار اللہ ہی کے سامنے کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾

"انہوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہمارے گناہ بخشوا دیجئے، بے شک ہم ہی غلط کار تھے"۔

والد سے برادران یوسفؑ کی درخواست

برادران یوسفؑ نے پریشانی کے عالم میں اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ جس طرح انہوں نے یوسفؑ اور اس کے بھائی سے عفو و درگزر کرنے کی درخواست کی تھی اور اپنے سابقہ اعمال پر پشیمان ہوئے تھے والد کے سامنے بھی اپنے کئے ہوئے پر نادم ہوئے اور اپنے بابا سے درخواست کی کہ وہ انہیں معاف کر دیں اور اللہ سے بھی اُن کے لئے گناہوں کی معافی طلب

کریں۔ اس بات سے اُن کی عاجزی کا اندازہ ہوتا ہے۔

قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّيۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۹۸﴾

"کہا عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے معافی مانگوں گا، بے شک وہ غفور رحیم ہے"۔

یعقوبؑ کا بیٹوں کے لیے استغفار کا وعدہ

حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کی درخواست پر ان کے لیے فوری استغفار تو نہیں کیا لیکن انہیں استغفار کا وعدہ دیا۔ یہ اس لئے تھا کہ یوسفؑ کے دیدار سے اللہ کی نعمت پوری ہو جائے اور دل مطمئن ہو جائے اور فراق کے سارے آثار ختم ہو جائیں تو تب ان کے لیے استغفار کریں گے۔ بعض مفسرین [1] نے کہا ہے اور بعض روایات [2] میں بھی آیا ہے آپ نے دُعا کو اس وقت تک کے لئے مؤخر کر دیا جو دُعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے یعنی گویا کہ آپ نے یہ کہا کہ میں دعا کی قبولیت کے وقت تمہارے لیے دعا مانگوں گا۔ [3]

فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰى يُوۡسُفَ اٰوٰۤى اِلَيۡهِ اَبَوَيۡهِ وَقَالَ ادۡخُلُوۡا مِصۡرَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ ؕ ﴿۹۹﴾

"پھر جب یوسف کے پاس آئے تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور

1۔ مجمع البیان جلد ۵، صفحہ ۲۶۳۔

2۔ من لا یحضرہ الفقیہ، جلد ۱، ص ۲۷۲، چاپ بیروت۔

3 ۔ من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۱ صفحہ ۲۷۲ میں امام صادق علیہ السلام سے روایت نقل ہوئی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ شب جمعہ یا سحری کے وقت تک استغفار کرنے کو مؤخر کیا۔

کہا مصر میں داخل ہو جاؤ اگر اللہ نے چاہا تو امن سے رہو گے"۔

خاندان یعقوبؑ کا مصر میں آنا

خاندان یعقوبؑ کنعان سے نکل پڑے، مصر کی جانب حرکت کی؛ جیسے ہی مصر پہنچے، یوسفؑ نے اپنے ماں باپ کا استقبال کیا اور انہیں اپنی بغل میں لیا اور کہا مصر میں داخل ہو جاؤ اللہ کے اذن سے امان میں رہو گے اور بڑے ادب کا انداز اپنایا اور پورے گھرانے کو امن کی نوید سنائی۔ بادشاہوں کی روایت کے مطابق حکم صادر کیا اور اپنے اس حکم کو اللہ کے اذن سے مشروط کر دیا تاکہ یہ سمجھا دیں کہ جتنے بھی معاملات ہیں وہ اللہ کے ارادے سے ہی انجام پاتے ہیں اور جب تک الٰہی ارادہ نہ ہو کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور یہی خالص توحید کا تقاضا ہے کیونکہ آپ توحید کی اعلیٰ منزل پر فائز تھے۔ باپ ماں کو تخت پر بٹھایا، سب کے سب سجدے میں گر گئے تو یوسفؑ نے کہا بابا جان! یہ میرے سابقہ خواب کی تعبیر ہے کہ پروردگار نے اس کو محقق کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے میرے حق میں احسان اور نیکی فرمائی ہے اور مجھے زندان سے باہر نکالا ہے اور شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان جدائی ڈالی تھی تو آپ کو اس بیابان سے اللہ تعالیٰ یہاں پر لے آیا ہے، سچ یہ ہے کہ میرا پروردگار جو ارادہ کرتا ہے اس کے بارے میں باریک بین ہے اور اس کا حکم نافذ ہے اور وہ دانا اور اس کا ہر فیصلہ صحیح ہوتا ہے۔

وَ رَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَ خَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ ۫ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّیۡ حَقًّا ؕ وَ قَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ وَ جَآءَ بِکُمۡ مِّنَ الۡبَدۡوِ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ

الشَّیۡطٰنُ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَ اِخۡوَتِیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۰۰﴾

''اور اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور اس کے آگے سب سجدہ میں گر پڑے، اور کہا اے بابا! میرے اس پہلے خواب کی یہ تعبیر ہے، اسے میرے رب نے سچ کر دکھایا، اور اس نے مجھ پر احسان کیا جب مجھے قید خانے سے نکالا اور تمہیں گاؤں سے یہاں پر لے آیا یہ سب اس کے بعد ہوا کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں میں جھگڑا ڈال چکا تھا، بے شک میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے مہربانی فرماتا ہے، بے شک وہی جاننے والا حکمت والا ہے۔'' (اپنے اور بھائیوں کے درمیان افتراق شیطان کی کارستانی قرار دی۔ بھائیوں نے جو سازش اس کے بارے تیار کی اور جس طرح اسے کنوئیں میں پھینکا اور بعد کے جن مراحل سے حضرت یوسفؑ کو گزرنا پڑا اور وہ مصر کی حاکمیت پر فائز ہوتے ہیں۔ اسی سب کو اللہ کا فضل و کرم وانعام قرار دیا)۔

یوسفؑ کے والدین تخت سلطنت پر

بظاہر یوسفؑ نے خدمت گاروں کو دستور دیا تھا کہ اُن کے ماں باپ کو تخت پر لے آئیں۔ جیسے ہی اُن کی نظر نورِ الٰہی پر پڑی جو یوسفؑ کے بے نظیر جمال کی صورت میں روشن تھا تو بے اختیار زمین پر گر پڑے اور سجدے ریز ہوئے۔ یہ سجدہ عبادت کا نہیں تھا بلکہ یوسفؑ کو اللہ کی آیت سمجھ کر اس کو قبلہ بنا کر خدا کی طرف توجہ کی جیسا کہ ہم کعبہ کو اپنا قبلہ بناتے ہیں اور اس کی طرف رخ کرکے سجدہ کرتے ہیں۔ ہماری مراد کعبہ کی عبادت نہیں ہوتی بلکہ ہم اللہ

کی عبادت کرتے ہیں۔ یوسفؑ نے جب یہ منظر دیکھا تو اس خواب کی یاد میں چلے گئے جو بچپن میں دیکھا تھا اور اپنے بابا سے کہا بابا جان! یہ وہ میرا خواب تھا جس کی تعبیر آج پوری ہوئی اور میرے پروردگار نے اس کو محقق کر دیا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا الٰہی بجالائے اور زندان سے رہائی کی طرف اشارہ کیا البتہ کنوئیں میں پھینکے جانے کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اپنے بھائیوں کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتے تھے جو اس موقع پر وہاں کھڑے تھے۔ بس ایک معمولی سا اشارہ کر دیا کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان جدائی ڈالی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس بڑی مصیبت کو ٹال دیا اور اسے احسان اور رحمت میں تبدیل کر دیا، مجھے رفعت اور عزت عطا کر دی اور تم سب کو صحراء نشینی سے سرزمین مصر لے آیا۔ اللہ لطیف اور مہربان ہے۔ اپنے لطف و کرم اور اپنی قدرت سے تمام طبیعی اسباب کو میری عزت اور نعمت کا وسیلہ قرار دے دیا۔ ''لطیف'' اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک صفاتی اسم ہے جو خداوند تبارک و تعالیٰ کے اشیاء کے باطن پر احاطہ اور حضور پر دلالت کرتا ہے اور اللہ کے علم اور قدرت کی فروعات میں سے شمار ہوتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ خداوند حکیم اور علیم ہے۔ وہ اپنی حکمت اور علم سے تمام امور کو صحیح طریقے سے جاری کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ان دو ناموں پر جو الف اور لام داخل ہوئے ہیں وہ الف و لام عہد ہیں یعنی اے بابا جان! یہ وہ امور ہیں جن کے بارے میں آپ نے پہلے دن سے ہی فرمایا تھا کہ تیرا رب علیم و حکیم ہے۔

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶

(سورۂ یوسف، آیت: ۶)

ترجمہ: ''اور اسی طرح تیرا رب تجھے برگزیدہ کرے گا اور تجھے خواب کی تعبیر سکھائے گا اور اپنی نعمتیں تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر پوری کرے گا جس طرح کہ اس سے

پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق پر پوری کر چکا ہے، بے شک تیرا رب جاننے والا حکمت والا ہے۔"

رَبِّ قَدۡ اٰتَيۡتَنِىۡ مِنَ الۡمُلۡكِ وَ عَلَّمۡتَنِىۡ مِنۡ تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ‌ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَنۡتَ وَلِىّٖ فِى الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةِ‌ۚ تَوَفَّنِىۡ مُسۡلِمًا وَّ اَلۡحِقۡنِىۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ ﴿۱۰۱﴾

"اے میرے رب! تو نے مجھے زمین پر حکمرانی دی ہے اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم بھی سکھلایا ہے، اے آسمانوں اور زمین کے بنانے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارساز ہے، تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے نیک بختوں میں شامل کر دے"۔

حضرت یوسفؑ کی دُعا

اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اپنے رب تعالیٰ سے دُعا اور مناجات کی، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بجالائے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جو نعمات عطا کی تھیں ان پر اللہ کی حمد و ثنا بجالائے، خود کو حمد میں غرق کیا اور سب کچھ کو بھلا کر اللہ کی یاد میں گم ہو گئے۔ اپنے رب تعالیٰ سے گفتگو اور مناجات کرتے ہوئے کہتے ہیں اے اللہ! تو ہی تھا جس نے مجھے یہ سلطنت دی، اقتدار دیا، خوابوں کی تعبیر کا علم دیا، گفتگو سے مطلب اخذ کرنے کی صلاحیت عطاء کی اور درپردہ باتیں جو ہو رہی ہوتی ہیں ان کی درپردہ جو بات ہوتی ہیں اس سے آگاہی تو نے دی۔ توں دُنیا و آخرت میں میرا ولی اور سرپرست ہے، میں تیری مکمل ولایت میں ہوں اور ذات، صفات اور افعال میں میرا کوئی استقلال نہیں ہے۔ میں اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں، اپنی موت و حیات کا مالک نہیں ہوں، حشر و نشر کا مالک نہیں ہوں۔ اس ولایت کا تقاضا یہ ہے کہ مجھے

مسلمان مارنا اور میری کمال بندگی یہ ہے کہ اپنے مولا کے تمام اوامر کا فرمانبردار رہوں اور اس کے سامنے تسلیم رہوں۔

یہ درخواست ایمان کے مراتب کے کمال کی درخواست ہے۔ پھر فرمایا: مجھے صالحین کے ساتھ ملحق کر دے یعنی اپنے رب سے چاہ رہے ہیں کہ انہیں صالحین کے گروہ سے قرار دے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو صاحب اختیار خلق کیا ہے، حضرت یوسفؑ اللہ سے چاہ رہا ہیں کہ ان کے اختیاری اعمال کا انتخاب اللہ کی رضا کے مطابق ہو۔ صالحین وہ افراد ہیں جن کی رضا اللہ کی رضا ہے، حضرت یوسفؑ کی یہ دُعا وہی ہے جو ان کے جد حضرت ابراہیمؑ کی دعا تھی کہ خداوند تبارک و تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ مجھے صالحین سے قرار دے اور صالحین سے مراد پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کے اہل البیت اطہار علیہم السلام ہیں۔

وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ (سورۂ بقرہ، آیت: ۱۳۰)

ترجمہ: ''اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہوگا۔''

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

''(اے محمدؐ) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیرے ہاں بھیجتے ہیں، اور توں تو ان کے پاس موجود نہیں تھا جب کہ انہوں نے اپنا ارادہ پکا کرلیا اور وہ تدبیریں کر رہے تھے''۔

پیغمبر اکرمؐ کو خطاب

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرم ﷺ کو بتایا کہ یوسفؑ کا قصہ غیب کی خبر ہے۔ اسے وحی کے ذریعہ ہم نے آپ کو بتا دیا ہے۔ اے ہمارے رسول! جب یوسفؑ کے بھائی یوسفؑ کے

خلاف اکٹھے ہوئے اور اس کے بارے میں سازشیں تیار کیں تو آپ تو وہاں پر موجود نہیں تھے، یہ غیبی خبریں خداوند تبارک و تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آپ کو بتا دی ہیں تاکہ اس طرح تیری نبوت کی تائید ہو۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

"اور اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں خواہ توں کتنا ہی چاہے"۔

لوگوں کی اکثریت کا بے ایمان ہونا

حضرت یوسفؑ کے ماجرا کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ ایمان کامل اور توحید خالص ایک ایسی فضیلت ہے جو لوگوں میں سے بہت تھوڑوں کو نصیب ہوتی ہے۔ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو دُنیا کی بوسیدہ لاش سے دلبستگی کی خاطر اور دُنیا کی رنگینیوں میں غرق ہونے کی وجہ سے فطری صلاحیتوں کو بھول جاتے ہیں اور فطری امانتوں کو یاد نہیں رکھتے جیسے اللہ کے بارے میں آگاہی، اللہ کی آیات کا علم۔ اے میرے رسول ﷺ آپ کے بہت زیادہ زور لگانے کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، تیرے چاہنے پر یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں ایک حقیقت کو اپنے حبیبؐ کے لئے بیان کر رہا ہے۔ اللہ کی مشیت سے ہی ایمان لائیں اور وہ وہی ہوں گے جو اپنی فطرت کا پاس کریں گے اور عارضی دُنیاوی لذات میں خوف غرضی نہ کریں گے، اپنے خالق رازق مالک رب کی جانب توجہ کریں گے؛ وہ لوگ کم ہی ہیں۔

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

"جبکہ آپ اس پر ان سے کوئی مزدوری بھی تو نہیں مانگتے، یہ تو صرف تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے"۔

لوگوں سے اجر رسالت نہ مانگنا

اس آیت میں جو واؤ ہے وہ واؤ حالیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنے رسول سے فرمارہا ہے کہ اے میرے رسول! تم ہمارا پیغام پہنچانے کے بدلے ان سے کوئی مالی تعاون بھی نہیں مانگتے اس کے باوجود وہ تم پر ایمان نہیں لاتے۔ قرآن حقیقتاً ایسا تذکر اور یاددہانی ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنی امانت کو انسان کی فطرت اور دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ لوگ اللہ کی معرفت حاصل کر لیتے اور اللہ کی آیات کو تسلیم کرتے لیکن اکثر لوگ ایسا نہیں کرتے، دُنیا کی رنگینیوں میں غرق رہتے ہیں غفلت میں چلے جاتے ہیں اور اپنے منعم و محسن کو بھول جاتے ہیں۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

”اور آسمانوں اور زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں اور ان سے منہ پھیر لیتے ہیں“۔

اللہ کی نشانیاں

اس آیت میں انسان کے مزاج اور طبیعت کو بتایا جارہا ہے کہ انسان کی زندگی میں آسمانی آیات، زمینی آیات بہت زیادہ ہیں۔ یہ حیرت انگیز نظام اور انسان کے ارد گرد بہت سارے موجودات سب اپنے رب کی توحید پر دلالت کر رہے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ ان نشانیوں سے فائدہ نہیں اُٹھاتے بلکہ ان کو دیکھ کر گزر جاتے ہیں اور ان کو دیکھنے سے متوجہ نہیں ہوتے، ایمان نہیں لاتے، دعوت حق سے رُخ موڑ لیتے ہیں۔ زمین کی حرکت اور زمین کے مختلف موسموں کا موجود ہونا، دن اور رات، آسمانی سیاروں پر غور و فکر کرنے سے جن کا دل،

آنکھ اور کان بیدار ہوں اور سننے والے اور سوچنے والے ہوں تو وہ اللہ پر ایمان لے آئیں گے۔

"بتحقیق بلاشک اس میں ذکرہ ہے یاددہانی ہےان کے لئے جس کا دل ہو اور جس کیلئے کان ہوں اور وہ گواہ ہو" (سورہ ق، آیت: ۳۷)

وَمَا يُؤۡمِنُ اَكۡثَرُهُمۡ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمۡ مُّشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾

"اور ان میں سے اکثر ایسے بھی ہیں جو اللہ کو مانتے بھی ہیں اور شرک بھی کرتے ہیں"۔

مومنوں کا شرک

اس آیت میں اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ اکثر ایمان لانے والے لوگ شرک میں مبتلا ہو ہوتے ہیں اور ان کے ایمان کے ساتھ شرک ملا ہوا ہوتا ہے حالانکہ شرک اور اللہ پر ایمان دو متضاد چیزیں ہیں لیکن یہ دو امر نسبی ہیں اور دونوں نسبی طور پر لوگوں میں ہوتے ہیں۔ کبھی ایک جانب کے زیادہ قریب ہوتا ہے اور کبھی دوسری سے قریب ہوتا ہے پہلی سے دُور۔ یعنی اُن کے اعمال میں زیادہ تر میلان توحیدی ہے لیکن وہ بعض اعمال میں غیر اللہ کی طرف توجہ کرتے ہیں تو اس طرح شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایمان کے مرتبہ کی نہایت یہ ہے کہ انسان غیر اللہ کے حوالے سے تمام اسباب سے خود کو کاٹ دے اور اس کی توجہ خالص اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ دوسری طرف شرک کی انتہاء یہ ہے کہ انسان مکمل طور پر دنیاوی زندگی سے وابسطہ ہو جائے اور اپنا تعلق دنیا کی زندگی سے بنائے، اس لئے دنیا کی زینتوں سے وابستہ ہو جو کہ باطل اور فانی ہیں اور حق اور حقیقت کو بھول جائے۔ ایمان اور شرک دو انتہاؤں کا نام ہے۔ ان کے درمیان ایمان کے بہت سارے مراتب ہیں۔ اس کی دلیل نفس کا ان چیزوں کی مخالف کرنا ہے جن کو وہ حق سمجھتا ہے یا باطل سمجھتا ہے۔ بہت سارے ایسے انسان ہیں جو ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن جیسے ہی کوئی

تھوڑی سی مشکل پیش آجائے، تھوڑی سی مصیبت آجائے تو نالاں اور متزلزل ہوتے ہیں، ان کے پاؤں پھسل جاتے ہیں جبکہ زبان سے تو کہتے ہیں "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کہ کوئی قدرت وطاقت نہیں سوائے اللہ کے۔

تمام عزت اور کرامت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے لیکن اس کے باوجود وہ غیر خدا سے عزت اور مقام مانگتا ہے۔ روزی کمانے کے لئے ہر دروازے کو کھٹکھٹاتا رہتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے روزی کی ضمانت دے رکھی ہے، خدا کی معصیت کرتا ہے اور بالکل حیا نہیں کرتا، جانتا ہے کہ اللہ نفوس کے باطن کا عالم ہے اور تمام باتوں کو سنتا ہے، بصیر ہے، آگاہ ہے، اُن کے عمل سے آگاہ ہے، کوئی چیز آسمانوں اور زمین میں اس سے مخفی نہیں ہے، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کے بھی مراتب ہیں جس طرح ایمان مراتب ہیں، لہٰذا یہ دونوں اکھٹے ہو سکتے ہیں۔ اصطلاح میں اسے شرک خفی، چھپا ہوا شرک کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مشرکین مکہ یا منافقین مراد ہیں لیکن یہ نظریہ ٹھیک نہیں ہے۔

اَفَاَمِنُوۡۤا اَنۡ تَاۡتِيَهُمۡ غَاشِيَةٌ مِّنۡ عَذَابِ اللّٰهِ اَوۡ تَاۡتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ۝١٠٧

"کیا اس سے بے خوف ہو چکے ہیں کہ انہیں اللہ کے عذاب کی ایک آفت آ پہنچے یا اچانک قیامت ان پر آ جائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو"۔

اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچ سکتا

لوگوں کی اکثریت کافر ہے اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا ایمان بھی شرک کے ساتھ ملا ہوا ہے تو کیا یہ لوگ اللہ کے عذاب سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں؟ کہ اچانک اللہ کا عذاب آئے یا اچانک قیامت آجائے۔ کیونکہ قیامت کے آنے سے پہلے کوئی نشانی یا علامت نہیں

بتائے گی کہ اب قیامت آنے والی ہے۔ بلکہ قیامت اچانک آئے گی۔ اس آیت میں جو استفہام ہے وہ استفہام تعجبی ہے، یعنی ان لوگوں کے بارے میں تعجب ہے کہ وہ اس قدر اللہ تعالیٰ اور اس کی طرف سے آنے والے عذاب یا قیامت کے بارے میں غافل ہیں اور ان سب کو جاننے کے باوجود اس طرح کے اعمال انجام دیتے ہیں!

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٨﴾

"کہہ دو یہ راستہ ہے کہ میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہا ہوں، بصیرت کے ساتھ میرا اور میرے تابعداروں کا، اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں"۔

حضور پاکؐ کا اعلان

یہاں پر اللہ تعالیٰ اپنے پیارے حبیب مصطفیٰ ﷺ سے کہہ رہا ہے کہ لوگوں کو خالص توحید اور واضح حق کی جانب بلاؤ جس پر آسمانی اور زمینی آیات دلالت کرتی ہیں، اور یہ گوہر نایاب ہے۔ اس کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت دو جس میں شرک کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ البتہ یہ دعوت فقط رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ جو لوگ رسول اکرم ﷺ کے پیروکار ہونے کا دعوی کرتے ہیں اُن کی بھی ذمہ داری ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی تقدیس کو بیان کیا ہے، خدا منزہ ہے ہر اس بات سے جو لوگ اس کی طرف نسبت دیتے ہیں اور جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ اس کے بعد دوبارہ تاکید کی خاطر فرمایا کہ اللہ کی طرف میری دعوت خالص توحید کی بنیاد پر ہے اس میں کوئی شرک کا شائبہ نہیں ہے، فرمایا میں مشرکین میں سے نہیں ہوں کیونکہ مشرک وہ ہے جو اپنے

رب سے غافل ہو اور اپنے رب کی تدبیر سے خود کو محفوظ سمجھے اور اللہ کی آیات سے روگرداں ہو، کس طرح ممکن ہے کہ وہ جو اللہ کی طرف دعوت دینے والا ہے اس میں یہ کمزوریاں ہوں۔ یہ اوصاف ہدایت اور ارشاد کے ساتھ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰى ؕ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾

"اور تجھ سے پہلے ہم نے جتنے پیغمبر بھیجے وہ سب بستیوں کے رہنے والے مرد ہی تھے ہم ان کی طرف وحی بھیجتے تھے، پھر وہ زمین میں سیر کر کے کیوں نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے تھے، اور البتہ آخرت کا گھر پرہیز کرنے والوں کے لیے بہتر ہے، پھر تم کیوں نہیں سمجھتے"۔

رسولوں کا بھیجا جانا

اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ اے ہمارے رسول! تم پہلے پیغمبر نہیں ہو بلکہ الٰہی سنت مسلسل یہی ہے کہ لوگوں کو توحیدی دین کی طرف دعوت دینے کے لئے یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ اللہ کی طرف سے نمائندے اور انبیاء آتے رہے ہیں جو انسانوں ہی میں سے تھے اور انہی لوگوں سے مبعوث ہوئے۔ خداوند نے ان کو وحی کی کہ لوگوں کی جو خیر اور بھلائی ہے اس کی طرف انہیں دعوت دیں اور یہ کہ وہ تقویٰ اپنائیں، اللہ سے ڈریں تاکہ کامیاب ہوں۔ دائمی سعادت آخرت میں ہے۔ یہ وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت ہے۔

اس آیت میں لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ کیوں زمین پر سیر و سیاحت نہیں کرتے تاکہ وہ اپنے سے پہلے گزرنے والوں کا انجام دیکھ سکیں؟ کفر اور ہٹ دھرمی اور جھوٹ بولنے

کے نتیجے میں اُنہوں نے اپنے اعمال کا مزہ چکھا، اللہ کے عذاب سے دوچار ہوئے اور تباہ ہو گئے، جیسے ثمود، عاد، قوم نوح، قوم لوط، قوم شعیب وغیرہ تباہ ہوئے تھے۔ جب اللہ کا عذاب ان پر آیا تو کوئی غیر خدا ان کی مددگار اور یاوری کے لیے نہ پہنچا۔ الٰہی غضب اُترا تو سب ہلاک ہوئے اور سابقہ اُمتوں نے اپنی سرکشیوں کا نتیجہ بھگتا۔ تو مومنوں کو چاہیے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں، خدا سے ڈریں، تقویٰ کامیابی کا زینہ ہے، کامیابی کا وسیلہ ہے، آخرت باقی رہنے والا گھر ہے، آخری کو متقی حاصل کر سکتا ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا جَآءَہُمۡ نَصۡرُنَا فَنُجِّیَ مَنۡ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۱۰﴾

"یہاں تک کہ جب رسول نا اُمید ہونے لگے اور خیال کیا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا تب ان کیلئے ہماری مدد پہنچ گئی، پھر جنہیں ہم نے چاہا بچا لیا، اور ہمارے عذاب کو نافرمانوں سے کوئی بھی روک نہیں سکتا"۔

مومنین کی نجات کا وعدہ

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ شہروں اور آبادیوں میں پیغمبر آئے، انہوں نے آکر دعوت دی اور بہت سارے لوگ ایمان نہیں لائے اور جب پیغمبر ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے اور لوگ خیال کرتے تھے کہ پیغمبروں نے جو عذاب کا وعدہ دیا ہے شاید جھوٹ ہے، تو اس صورت میں پیغمبروں کے لئے ہماری مدد پہنچ گئی اور ہمارا عذاب آگیا۔[1]

1۔ "وَ کَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۷﴾" (سورۂ روم، آیت: ۴۷) ترجمہ: "ہمارے اوپر لازم تھا کہ ہم مومنین کی مدد کریں"۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے اہل ایمان میں سے جس کو چاہا اسے نجات دی اور مجرمین اللہ کے عذاب میں مبتلا ہوئے۔ جب اللہ کسی گروہ کی نابودی کا ارادہ کرلیتا ہے تو پھر کوئی بھی اس کو نہیں بچاسکتا اور کوئی چیز اللہ کے ارادے کے سامنے حائل نہیں ہو سکتی اور خدا کے سوا کوئی یاور ومددگار نہیں ہے۔

" وَ اِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾ " (سورۂ رعد، آیت ۱۱)

ترجمہ: "اور جب اللہ ارادہ کرلیتا ہے کہ کسی قوم کے بارے میں کہ اسے عذاب دے تو ان کیلئے کوئی چھٹکارا نہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے"۔

لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

"البتہ ان لوگوں کے حالات میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے، یہ کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اس کلام کے موافق ہے جو اس سے پہلے آیا ہے اور ہر چیز کا بیان اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں"۔

ماضی کے واقعات بیان کرنے کا مقصد

اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ماضی کے قصے بے مقصد بیان نہیں کئے جاتے بلکہ ان کے پیچھے ایک ہدف ہے اور یہ حقائق ہیں۔ اس میں صاحبان فہم، صاحبان ادراک اور سمجھ دار لوگوں کے لئے عبرت ہے۔ انبیاء کے ساتھ جو ہوا اور پھر ان انبیاء میں حسین و جمیل پیغمبر حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے معاملات صاحبان عقل کے لئے عبرت

کا سرمایہ ہیں۔ ان کی داستان ایک ہدف اور غرض کے تحت بیان ہوئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ عقیدتی، عبادتی اور کاروباری لحاظ سے فائدہ اٹھائیں۔ صاحب عقل و فہم لوگ وہ ہیں جو اس قسم کے واقعات سے اثر لیتے ہیں اور ان کی گہرائی کو سمجھتے ہیں اور مطلب کی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں۔ یہ داستان افتراء اور من گھڑت نہیں ہے، وقت گزارنے کے لئے کوئی خیالی قصہ نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے نازل ہونے والی آسمانی کتاب یعنی تورات کی تصدیق ہے۔ اصولی طور پر کون ہے جو اللہ سے زیادہ سچا ہو۔ "وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ﴿۱۲۲﴾" (سورہ نساء، آیت: ۱۲۲) ترجمہ: "اور بھلا اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہو سکتا ہے؟"

خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے علم سے یوسفؑ کی داستان کو اپنے رسول امین مصطفیٰ محمدؐ کے لیے وحی فرمائی ہے۔ قرآن، حق و باطل میں جدائی کا ذریعہ ہے، اس میں ان مطالب کی وضاحت بیان کی گئی ہے جو ان کے دینی امور کے فائدہ میں ہیں اور جس کی بنیاد پر اُن کی دُنیا و آخرت کی سعادت کی عمارت کھڑی ہے اور جس کی اُنہیں ضرورت ہے۔ قرآن، سعادت اور کامیابی کی جانب ہدایت کرنے والی کتاب ہے۔ قرآن کے ذریعہ اہل ایمان صراط مستقیم کی جانب ہدایت پاتے ہیں۔

سورۂ رعد

(مدنی۔ کل آیات 43)

اس سورت کے مطالب

قرآن کی حقیقت کا بیان، قرآن کا معجزہ اور پیغمبری کی نشانی ہونا، قرآنی دعوت ٹھکرانے والوں کی رَد، توحید کا بیان، ماضی کے لوگوں کی خبریں اور اُن کے اعمال، آثار اور کفر اور گناہ کے

نتیجہ میں ان کا مواخذہ اور گرفت۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱﴾

''ال م ر، یہ کتاب کی آیات ہیں، اور جو کچھ تجھ پر تیرے رب سے اترا سو حق ہے اور لیکن اکثر آدمی ایمان نہیں لاتے۔''

قرآنی آیات کے بارے

''ال م ر'' سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات ہیں اور اُن معارف کو شامل ہیں جو سورہ میں موجود ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو سورتیں حروف مقطعات سے شروع ہوئی ہیں اُن کے مطالب بھی ایک دوسرے کے ساتھ شباہت رکھتے ہیں۔ بہرحال یہ حروف قرآنی رموز ہیں، اللہ کے اسماء بھی ہیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کے درمیان اسرار اور اشارے ہیں۔

اس جگہ آیات سے عالم ہستی کے موجودات مراد ہیں۔ پورے نظام عالم میں موجود یہ اشیاء حق تعالیٰ کی قدرت کے آگے مسخر اور تسلیم ہیں۔ کتاب سے پورا عالم وجود یا لوح محفوظ مراد ہے یا پھر مجازی طور پر اور ایک خصوصی لحاظ سے قرآن مراد ہے کیونکہ قرآن، وجود کونی آیات پر مشتمل ہے۔ پھر فرمایا کہ قرآن حق ہے جو تیرے رب کی جانب سے تیرے اوپر اُتار گیا ہے؛ اس میں باطل کی کوئی گنجائش نہیں لیکن بہت سارے لوگ ان غیبی نشانیوں کو نہیں مانتے اور نہ ہی قرآن برحق پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کلام کے لحن میں اس کتاب کو نہ ماننے والوں کی سرزنش کی گئی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّکُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ﴿۲﴾

" اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو ستونوں کے بغیر بلند کیا جنہیں تم دیکھ رہے ہو، پھر عرش پر قائم ہوا، اور سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا، ہر ایک اپنے وقتِ معین پر چل رہا ہے، وہ ہر ایک کام کا انتظام کرتا ہے نشانیاں کھول کر بتاتا ہے تاکہ تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کر لو"۔

معاد پر ایمان

اللہ تعالیٰ نے آسمان کو زمین سے جدا کیا اور اُن دو کے درمیان فاصلہ رکھا تاکہ زمین کے اوپر آسمان کا تسلط ہو اور نورانی شعاعیں زمین پر چمکیں اور بارش آئے اور وہاں سے بجلی کی کڑک بھیجے۔ آسمانوں کو قدرت حق نے کھڑا کیا ہے اور اس کے لیے محسوس ستون نہیں ہیں کہ جس کے سہارے پر کھڑے ہوں، جس طرح خود زمین اپنے مدار میں بغیر ستون کے ٹھہری ہوئی ہے۔ اس نظام کا استقرار آسمانوں اور افلاک میں قوت جاذبہ کے واسطے سے ہے جسے خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان آسمانی اجرام اور افلاک میں رکھ دیا ہے۔ یہ سارے موجودات تمام حالات میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ یہ سب الٰہی آیات و معجزات ہیں کہ جسے انسان کی آنکھ نے دیکھنے کی عادت کر رکھی ہے جس کی وجہ سے ان غیر معمولی موجودات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود اسے حیرت نہیں ہوتی و گرنہ انسان اپنی فطرت کے حکم کے تحت جس موجود کو بھی دیکھتا ہے تو وہ اس کی وجہ ڈھونڈتا ہے کہ یہ کیسے وجود ہمیں آگیا؟ اگر اس عمومی قانون اور کلی قانون کو توڑنے والا کوئی امر دیکھے تو یقینی طور پر اس کی علت اور وجہ کے متعلق جستجو کرتا ہے کہ ان

عادی اور طبیعی اور جاری امور کے پیچھے قاہر اور قادر علت موجود ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ اللہ اپنی قدرت کے عرش پر مستقر ہوا، اپنے اقتدار اعلیٰ پر براجمان ہوا۔ یہ عرش وہی اللہ کا مقام قدرت ہے اور الٰہی غلبہ ہے جس نے عالم کی تمام اشیاء کو مسخر کر رکھا ہے اور اس کی نسبت تمام عالم کی مخلوقات کے حوالے سے یکساں ہے۔

عالم مادیات میں جب کوئی چیز کسی دوسری چیز کے قریب ہوتی ہے تو قاعدہ یہ ہے کہ اُس شئے کے غیر سے دُور ہو رہی ہوتی ہے، لیکن خداوند تبارک و تعالیٰ عین دُوری میں اور یہ کہ اسے دیکھا نہیں جا سکتا، اُس چیز کے نزدیک ہے۔ وہ آہستہ بولی جانے والی اور سرگوشی کی آوازوں کو بھی سنتا ہے۔[1] ''وہ انسان کی شہ رگ سے نزدیک تر ہے''۔[2] اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد الٰہی ہے: ترجمہ: ''پس مخلوق کے لئے کوئی چیز اس کے خالق سے نزدیک تر نہیں ہے اور وہ اللہ ہر چیز پر محیط ہے، آسمان اور زمین کا پروردگار ہے'' (سورہ زخرف، آیت: ۸۴) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وہی اللہ ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں بھی وہی معبود ہے''۔ ''وہی اللہ ہے جہاں بھی تم ہو تمہارے ہمراہ ہے''۔ (سورہ حدید، آیت: ۴)۔ ''قادر ہے کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے وہی اللہ ہے جس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے۔

اسی طرح جو کچھ زمین میں ہے اسے انسان کے تسخیر اور کنٹرول میں دے دیا ہے۔ سورج اپنی نور افشانی کو زمین پر بھیجنے سے روکتا نہیں ہے اور چاند کے لئے جو منزلیں مقرر کی گئی ہیں اُس سے آگے نہیں بڑھتا اور اُن کی حرکت ایک محکم نظام کا جزو ہے جو پورے عالم میں جاری ہے۔ باقی ہستی کے نظامات کو کامل کیا ہے اور سب ایک معین مدت میں جاری ہیں،

---

[1] ۔ جیسا کہ (دعائے افتتاح) میں آیا ہے: ''الذی بعد فلا یریٰ و قرب فشھد النجویٰ'' ''وہ چونکہ دور ہے تو دیکھا نہیں جا سکتا قریب ہے کہ اس نے سرگوشی تک کو دیکھ لیا ہے''۔

[2] ۔ (سورۂ ق، آیت: ۱۶) وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾

چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے، زمین، چاند اور منظومہ شمسی کے باقی اجرام فلکی سورج کے گرد حرکت میں ہیں۔ یہ سب ایک کہکشاں کی شکل میں حرکت میں ہیں اور جاری وساری ہیں۔ ان کی یہ حرکت تقدیس و تسبیح ہے لیکن انسان ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتا، اُن کی یہ سیر ان کی یہ حرکت تسبیح ہے۔

سورہ انبیاء، آیت: ۳۳ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ترجمہ: ''سب اپنے فلکوں میں تیر رہے ہیں لیکن تم اُن کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو''۔ سب اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں اور اس کی وحدانیت کو بیان کر رہے ہیں۔ سارے امور کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تدبیر سے مراد ایک چیز کو دوسری چیز کے پیچھے لے آنا یعنی اشیاء کی ترتیب اور ان کا نظم اس طرح سے قرار دینا کہ غرض مطلوب حاصل ہو اور ٹکراؤ اور اختلال اور خلل واقع نہ ہو۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے پورے عالم کے اجزاء کو بہترین اور محکم ترین نظم میں ترتیب دیا ہے اس طرح کہ ان کی حرکت سے غرض مطلوب حاصل ہو جاتی ہے۔ ہر شئے اسی کی طرف حرکت میں ہے اور ان سب کا مجموعہ ایک عالم کلی کی جو غایت ہے اس طرف رواں دواں ہے۔ ان سب کی غرض و غایت اللہ کی طرف پلٹنا ہے۔ خدا سبحانہ و تعالیٰ نے ان کائناتی آیات کی تفصیل بیان کی ہے اور سب کو جدا جدا بنایا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کیا ہے، ہر ایک شئے کی ذات کے اندر پوشیدہ خصوصیات کو باہر لایا تاکہ نور کو ظلمت سے اور حق کو باطل سے اور صالح کو مفسد اور ناصالح سے جدا کرے تاکہ لوگ روز جزاء اور اپنے رب سے ملاقات پر ایمان لے آئیں کیونکہ وہ دن جدائی کا دن ہے۔ وہ تمام مخلوقات کے میقات کا دن ہے۔ اور یہ کہ فرمایا ''ربکم'' یہ اللہ کی ربوبیت میں اصرار اور تاکید کے لحاظ سے ہے تاکہ اس امر کو سمجھائے کہ وہ ذات جس نے پورے عالم کو خلق کیا ہے اس کی تدبیر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہی تمہارا رب ہے اور تمہارا امر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ قیامت یقینی طور پر آئے گی، اس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس دن سب

اپنی قبروں سے اُٹھیں گے اور عدل الٰہی کے سامنے حضور پائیں گے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًاؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳

"اور اسی نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے، اور زمین میں ہر ایک پھل دو قسم کا بنایا، دن کو رات سے چھپا دیتا ہے، بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں"۔

اشیاء عالم اللہ کی نشانیاں

اللہ تعالیٰ نے زمین کو حیوانات اور انسانوں کی معیشت کا ذریعہ بنایا ہے، اس پر نباتات اگائے، پہاڑوں کو زمین کی استقرار کا وسیلہ بنایا اور زمین سے چشمے نکالے ہیں، نہریں جاری کی ہیں، دریا بنائے ہیں جس سے حیوانات، نباتات اور کھیت سیر اب ہوتے ہیں اور ہر قسم کے میوے پیدا کئے ہیں۔ موسم گرما اور موسم سرما کے پھل پید کئے ہیں۔ یہ میوہ جات میٹھے اور کھٹے، خشک اور تر ہیں، جنسیت کے لحاظ سے پھلوں کو جوڑا جوڑا بنایا ہے یعنی ہر قسم کے پھل میں نر اور مادہ ہیں۔ لیکن زیادہ تر درختوں میں نر اور مادہ اکٹھے اُسی بوٹے میں یا اسی درخت میں ہی ہوتے ہیں اور بعض درخت جیسے کھجور کا نر الگ اور مادہ الگ ہوتی ہے اور پھر نر اور مادہ کو آپس میں ملایا جاتا ہے۔ نر کا بُور مادہ کے خوشوں میں ڈالا جاتا ہے جس سے کھجور میں نکھار اور بڑھاوا ہوتا ہے۔

پھر فرمایا کہ اللہ ہی ہے جس نے شب کی تاریکی کے وسیلہ سے دن کی روشنی کو چھپا دیا، یہ سب کائناتی آیات اور نشانیاں ان کے لیے دلائل ہیں جو اس نظام کے کمال اور اس کی

عجیب و غریب سند میں فکر کرتے ہیں اور اس سے سمجھ جاتے ہیں کہ پورے عالم اور ان کے تمام اجزاء ایک غرض کی جانب حرکت کر رہے ہیں۔ یہ سب اس امر سے حکایت کرتے ہیں کہ ان سب کا مرجع و مدبر یگانہ ہے اور ان سب نے اس کی جانب پلٹ کر جانا ہے۔ اور ان سب کا رب واحد ہے اور اس کی ربوبیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اور اس کے علم میں بالکل جہل کا شائبہ تک نہیں ہے، وہ قادر ہے اور اس کی قدرت کبھی مغلوب نہیں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت سے عالم امکان کے سارے موجودات خصوصاً انسان ابدی سعادت کی جانب رواں دواں ہیں۔

وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾

"اور زمین میں ٹکڑے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور انگور کے باغ ہیں اور کھیتیاں اور کھجوریں ہیں ایک کی جڑ ملی ہوئی بعض بن ملی انہیں پانی بھی ایک ہی دیا جاتا ہے، اور ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فضیلت دیتے ہیں، بے شک اس میں عقل مندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں"۔

نظام عالم میں اللہ کی نشانیاں

اس آیت میں کائنات میں جاری نظام کو عقل مندوں کے لیے اللہ کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ زمین خاک کے اعتبار سے یکساں اور مشابہ ہے لیکن اس سے گوناگوں اور قسم قسم کے پھل، نباتات اور کھیت اُگتے ہیں۔ زمین ایک ہی ہے اور نباتات کو دیا جانے والا پانی بھی ایک ہی ہے لیکن زمین سے اگنے والے نباتات کی خصوصیات، اُن کے رنگ، اُن کی صفات میں فرق

ہے اور بعض میوے بعض دوسروں پر برتری رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان یہ اختلاف اللہ تعالیٰ کے ارادے سے وجود میں آیا ہے۔ اُن کے متعلق اللہ کا ارادہ تھا کہ خارجی عوامل یا ذاتی اسباب ان کی صفات کی بنیاد پر اُن کو ایک دوسرے پر برتری اور امتیاز دیں۔ اس آیت میں نباتات میں جینٹک علم کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ساری آیات آشکار دلائل کے نمونے ہیں جو عقلی مقدمات پر مبنی ہیں، ان پر غور و فکر کر کے اہل عقل و خرد ہی اپنے اور ان سب کے خالق اور مدبر کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ۬ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۵

"اگر تو عجیب بات چاہے تو ان کا یہ کہنا عجب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو گئے تو کیا نئے سرے سے بنائے جائیں گے، یہی وہ ہیں جو اپنے رب سے منکر ہو گئے، اور انہیں کی گردنوں میں طوق ہوں گے، اور یہی دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

معاد پر شک و تردید باعث تعجب ہے

"تَعَجَّبْ" کسی نامعلوم امر کے پیش آنے اور اسے حیرت زدہ ہونے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اے ہمارے رسول! اگر تجھے کسی بات پر تعجب ہے تو سب سے زیادہ تعجب کافروں کی اس بات پر ہونا چاہیے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مرنے کے بعد جب خاک ہو جائیں گے تو کیسے دوبارہ زندہ کئے جائیں گے! ان کے اس خیال کا باطل اور فاسد ہونا اس قدر واضح اور آشکار ہے کہ کوئی بھی عقل مند انسان اس کے متعلق شک و تردید نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ کس طرح مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے بارے تعجب کرتے ہیں جبکہ یہی

انسان پہلے جب زندہ تھا تو کس چیز سے خلق ہوا تھا؟ کیا انہیں زمینی اور خاکی مواد اور نطفہ اور جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے نہیں بنایا گیا تھا؟ ان ہی مراحل سے گزرنے کے بعد انسان ایسے خوبصورت بدن میں تبدیل ہوا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ سورہ حج آیت: ۵ میں ارشاد فرماتا ہے: ترجمہ: ''اے انسانو! اگر تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے میں شک ہے تو جان لو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے خلق کیا ہے پھر تمہارا نطفہ بنا پھر وہ جما ہوا خون بنا اور لوتھڑا بنا، گوشت بنا، اس طرح بدن میں رُوح ڈالی گئی''۔

لہٰذا انسان کا خاک سے وجود میں آنا باعث تعجب نہیں ہے (یعنی مرنے کے بعد جب انسان کا جسم چھوٹے ذروں کی شکل میں بکھر جائے گا تو اس کو دوبارہ بدن کی شکل میں جمع کرنا باعث تعجب نہیں ہے) اگر کسی چیز پر تعجب کیا جانا چاہیے تو ایک چیز کو عدم محض سے وجود میں لانے کے بارے میں تعجب کیا جانا چاہیے۔ کفار کا یہ خیال ہے کہ مرنے کے ساتھ انسان کی ذات معدوم ہو جاتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ انسان کی حقیقت اس کا مادی بدن نہیں ہے بلکہ انسان کی حقیقت نفس اور رُوح علوی ہے جو موت کے وقت بدن سے جدا ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس روح کو دوبارہ خاک میں بوسیدہ بدن میں پلٹا دے گا تاکہ اپنے رب کے سامنے فیصلے کے لئے آ کھڑا ہو۔

لہٰذا انسان ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لیے خلق ہوا ہے اور اس کی زندگی دُنیا کی فانی اور چند روزہ زندگی تک محدود نہیں ہے۔ انسان کی ہمیشہ رہنے والی زندگی میں وہی چیز اسے فائدہ دے گی جسے اس نے دنیاوی زندگی میں انجام دیا ہے، جیسے اللہ پر ایمان لایا ہو، اعمال صالح بجا لائے ہوں۔ اسی طرح اس زندگی میں نقصان دینے والی چیزیں بھی وہی ہوں گی جنہیں اس نے دنیا میں انجام دیا ہے جیسے اگر اس نے دنیا میں کفر کیا، دنیا سے وابستہ رہا، غلط کام کئے تو پھر آخرت میں وہ خسارہ اور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ انسان کی حیات جاوید کی کیفیت اس کے دنیوی اعمال کے مطابق معلوم ہو جائے گی، یا تو ہمیشہ بہشت میں

خوش و خرم اور نعمتوں میں ہو گا یا جہنم میں ہو گا اسے بد بختی اور تکلیف کے علاوہ کچھ نہ ملے گا۔
خداوند تبارک و تعالیٰ نے بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ کافر ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ کلام فقط دھمکی نہیں ہے بلکہ اُن کی گفتار کا لازمہ یہی ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جب انسان مر گیا اور خاک ہو گیا تو اس کی انسانیت ختم ہو جائے گی۔ ان کے نزدیک گویا انسان کی حقیقت مادی ہے اور اُس کا تعلق مادی بدن کے ساتھ ہے اور موت کے بعد کوئی حیات نہیں ہو گی۔ کفار کی یہ بات حقیقت میں عالم ربوبی کا انکار ہے کیونکہ ایسے رب کا عقیدہ رکھنا جس کے نزدیک معاد کا تصور نہ ہو ایک بے معنی بات ہے۔

کفار کے اس عقیدے کا لازمہ یہ ہے کہ انسان کی پوری ہمت دُنیاوی مقاصد اور مادی اغراض پر ہی منحصر ہو اور اس کا فہم ابدی حیات اور ہمیشہ رہنے والی نعمات الٰہی کے درک سے محروم ہو اور اللہ تعالیٰ سے تقرب کی کوشش نہ کرے اور اپنے کل کے لئے توشہ اکٹھا نہ کرے۔ لازمی طور پر یہ انتہائی شقاوت، بد بختی اور دائمی عذاب کا سبب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری صلاحیتیں انسان کو اس لیے دی تھیں تاکہ وہ ان کے ذریعے قرب الٰہی اور دائمی سعادت حاصل کرے لیکن اس نے ان سب کو فانی مقاصد کے حصول کی خاطر ضائع کر دیا۔ دنیا میں مادی وابستگیوں اور اس کی نفسانی خواہشات کی پیروی کی وجہ سے وہ جہالت کی زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر رہ گئے ہیں اور آخرت میں اپنے لیے عذاب اور آتش جہنم کا سامان مہیا کیا ہے۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۶

''اور تجھ سے بھلائی سے پہلے برائی کو جلد مانگتے ہیں اور ان سے پہلے بہت سے

عذاب سے گزر چکے ہیں، اور بے شک تیرا رب لوگوں کو باوجود ان کے ظلم کے معاف بھی کرتا ہے، اور تیرے رب کا عذاب بھی سخت ہے"۔

عذاب الٰہی پر جلدی کرنے پر تعجب!

کفارقریش بجائے اس کے کہ اللہ سے رحمت اورعافیت طلب کریں، پیغمبرؐ کا استہزاء کرتے ہوئے ان سے عذاب الٰہی کے جلد نازل ہونے کی درخواست کرتے تھے۔ جبکہ انہیں گذشتہ اُمتوں کے جھٹلانے اور کفر کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہونے کے بارے میں علم تھا۔ یہ عبارت تعجب کے مقام میں ہے، یعنی اُنہیں سابقہ اُمتوں کے اوپر آنے والے عذاب کا علم ہونے کے باوجود عذاب الٰہی کے نزول کی جلدی کرنے پر تعجب ہے۔ پھر اللہ تعالٰی تعجب کے انداز میں فرمارہا ہے: تیراپروردگار تو وسیع رحمت والا ہے اور اس کی رحمت حتی بندوں کی ستمگاری کی حالت میں بھی ان کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔ جس طرح وہ شدید غضب والا بھی ہے۔ لیکن اللہ تعالی کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے۔ ان کو کیا ہوا ہے کہ یہ اللہ کی رحمت واسعہ سے منہ موڑتے ہیں اور اس کے سخت ترین عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں!

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۟

"اور کافر کہتے ہیں اس کے رب سے اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتری، تم تو محض ڈرانے والے ہو، اور ہر قوم کے لیے ایک رہبر ہوتا آیا ہے"۔

قرآن کے علاوہ دوسرے معجزہ کی طلب

کفار، رسول خدا ﷺ سے قرآن کے علاوہ کسی دوسرے معجزے کی درخواست کرتے تھے۔ اس امر سے ان کا مقصد قرآن سے بے اعتنائی اور اس کی تحقیر کرنا تھا۔ وہ یہ بات

اشارے میں کہہ رہے تھے۔ درحقیقت وہ قرآن سے بے اعتنائی اور بے توجہی برت رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ سے دوسرے معجزات طلب کر رہے ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ یہاں پر معجزہ اور آیت سے مراد وہ معجزات نہیں ہیں جو پیغمبروں کی نفرین کے ساتھ محقق ہوتے تھے اور پیغمبروں اور ان کی قوم کے درمیان فیصلہ کن ہوا کرتے تھے اور حق و باطل کو جدا کرتے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا معنی وہی ہوگا جو پچھلی آیت میں "سیئۃ" کے بارے میں ذکر ہوا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ، رسول خدا ﷺ کو بتا رہے ہیں کہ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تم فقط ڈرانے والے ہو اور تمہارے پاس قدرت غیبی مطلق نہیں ہے کہ جو چاہو انجام دو، آپ ان ہی کی طرح بشر ہیں۔ تم میں اور ان میں اتنا فرق ہے کہ تم پر وحی ہوتی ہے۔ خدا نے تمہیں اس بات پر مامور کیا ہے کہ تم لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤ اور اُنہیں اللہ کی عبادت سے تکبر کرنے اور زمین پر فساد پھیلانے سے چوکنا کرو۔ معجزات کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ اس نے کبھی بھی زمین کو اپنے ایسے نمائندے سے خالی نہیں کیا ہے جو اس کی جانب لوگوں کو ہدایت دے، جو یا تو پیغمبر ہوا کرتا ہے یا امام، جو امر الٰہی سے لوگوں کی ہدایت کرے تاکہ الٰہی سنتیں اور اللہ کے قوانین جاری ہوں۔ کیونکہ اللہ ہی ہر چیز کو اس کے کمال مطلوب کی راہنمائی دیتا ہے۔[1]

اس آیت میں کافروں کے بجائے پیغمبرؐ اکرم کو مخاطب قرار دے کر اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ کافر جو عظیم ترین معجزہ قرآن کی قدر نہیں کرتے اور اس بڑے معجزے کو درک نہیں کرتے یہ اس لائق نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مورد خطاب قرار دے

---

[1] ۔اس آیت میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ زمین ہر گز حجت خدا سے خالی نہیں ہوتی۔ "اصول کافی" میں حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں ڈرانے والا ہوں اور علی علیہ السلام ہادی ہیں"۔ (مترجم)

اور ان کا نام لے۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝۸

"اللہ کو معلوم ہے کہ جو کچھ ہر مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوئے ہے اور جو کچھ پیٹ میں سکڑتا اور بڑھتا ہے، اور اس کے ہاں ہر چیز کی پیمائش ہے"۔

اللہ کے ہاں ہر شئے کی معین مقدار

اس آیت میں علم الٰہی کے حوالے سے تین باتیں بتائی گئی ہیں:۔

ا۔ مادہ کے رحم میں موجود جنین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم ہے اور وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔

۲۔ ایام حیض میں جو خون عورت کے رحم میں گرتا رہتا ہے اور حمل کے ایام میں جنین کی غذا اسی خون سے بن رہی ہوتی ہے۔

۳۔ جو خون عورتوں کے رحم سے خارج ہوتا ہے جیسے خون نفاس یا ایام حمل میں دیکھا جانے والا خون۔ روایات کی رو سے بھی ان تین موارد کی تائید ہوئی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ کے ہاں ہر شئے کی معین مقدار ہے۔ "مِقْدَارٍ" ہر چیز کی حد کو کہتے ہیں جو اس کے لئے متعین ہوئی ہو اور جس سے وہ اپنے غیر سے متمایز اور جدا ہوتی ہے۔ ہر موجود چیز اپنے غیر سے متمایز ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے جس سے وہ بڑھتی نہیں ہے یعنی اس کی حدود متعین ہوتی ہیں۔ اور اس کی حد اللہ کے ہاں معلوم ہے اور اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے۔ لہٰذا محال ہے کہ کوئی چیز حق تعالیٰ کے علم کے دائرے سے باہر ہو۔ وہی ربوبیت کے لیے شائستہ ترین اور لائق ترین معبود ہے۔ اس معنی کی دوسری آیات سے بھی

تائید ہوتی ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝۹

”پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے سب سے بڑا بلند مرتبہ ہے“۔

اللہ ظاہر و پوشیدہ سے آگاہ ہے

غیب اور شہادۃ، نسبی امور ہیں، اس معنی میں کہ ایک چیز ممکن ہے کہ ایک چیز کے حوالے سے غیب ہو اور وہی چیز دوسری چیز کے حوالے سے شہادت (ظاہر) ہو کیونکہ موجودات حدود سے خالی نہیں ہیں اور ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور جو چیز محدود ہے اور کسی دوسری چیز کے احاطے میں ہے تو وہ اس کے لیے ظاہر ہوتی ہے اور اس کے ادراک میں ہوتی ہے یعنی محیط کو جس چیز پر احاطہ ہے اس کا ادراک اور شہود اسے ہوتا ہے۔ اور ہر وہ چیز جو کسی شئے کے حدود سے باہر ہو تو وہ اس کے لیے غیب شمار ہوتی ہے کیونکہ وہ شئے اس کے ادراک اور شہود میں نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا وجود مطلق ہے، کسی حد کے ساتھ محدود نہیں ہے، حتیٰ کہ ذہن کے اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی حد نہیں ہے اس لیے وہ ہر چیز پر محیط ہے اور اللہ تعالیٰ کا سب چیزوں پر احاطہ ہے۔ لہٰذا اس کا علم غیب اور شہادت دونوں کو شامل ہے، اصولی طور پر کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے تاکہ وہ اس کے لیے غیب شمار ہو لہٰذا وہ کبیر ہے، ہر صاحب کمال کے کمالات اس میں موجود ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ متعال ہے یعنی برتری کی انتہاء کے درجے پر ہے۔ ہر چیز پر اس کی سلطنت ہے اور اس کی شان عالی اور بلند ہے اور وہ ہر بلند سے بلند تر ہے اور چیز پر ہر لحاظ سے اس کا تسلط ہے۔ اسی لحاظ سے وہ عالم الغیب والشادۃ ہے اور کوئی بھی شئے اس کے علم کے دایرے سے خارج نہیں ہے۔

سَوَآءٌ مِّنۡکُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَ مَنۡ جَہَرَ بِہٖ وَ مَنۡ ہُوَ مُسۡتَخۡفٍۭ بِالَّیۡلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّہَارِ ﴿۱۰﴾

''تم میں سے جو شخص کوئی بات چپکے سے کہے یا پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چھپ جائے یا دن میں چلے پھرے یہ سب برابر ہیں''۔

علم الٰہی میں سب برابر ہیں

اللہ تعالیٰ کے علم کے دائرے سے کوئی بھی باہر نہیں ہے، کوئی بھی شئے اس سے مخفی نہیں ہے۔ جو آہستہ بولتا ہے اور جو بلند آواز سے بات کرتا ہے اور جو رات کی تاریکی میں چھپ جاتا ہے یا جو دن کی روشنی میں چلتا پھرتا ہے، سب کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور سب اللہ کے علم میں ہیں، یہ آیت، آیت نمبر ۹ کا نتیجہ ہے۔

لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ خَلۡفِہٖ یَحۡفَظُوۡنَہٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَہٗ ۚ وَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

''ہر شخص کی حفاظت کے لیے کچھ فرشتے ہیں اس کے آگے اور پیچھے اللہ کے حکم سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں، بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے، اور جب اللہ کسی قوم کی برائی چاہتا ہے پھر اسے کوئی نہیں روک سکتا، اور اس کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا''۔

انسان کے محافظین

اس آیت میں آدمی کی زندگی کے دورانیہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی حفاظت پر مقرر فرشتوں کے حوالے سے بات ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اس کے آگے پیچھے اُس کے نگران ہیں اور امر الٰہی سے اُس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ آدمی ایسا موجود ہے جو نفس اور بدن سے ترکیب پایا ہے، اس کے مادی بدن کے پیچھے شعور اور ارادہ حاکم ہے، اسی وجہ سے اس کو امر و نہی ہوتی ہے، وہ ثواب اور عقاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ انسان کی زندگی میں تمام مادی اجسام اور نفسانی امور نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہے، اگر اللہ کی جانب سے اس کی حفاظت پر مامور فرشتے موجود نہ ہوتے تو یقینی طور پر وہ تیزی سے ہلاکت اور فنا کی طرف جاتا۔ کیونکہ انسان کی کسی بھی روحی حالت یا عمل میں ثبات نہیں ہے سوائے اللہ کے حکم کے۔ اس کے تمام امور اللہ کی جانب سے ہیں اور سارے امور اللہ کی طرف پلٹیں گے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کی حفاظت کے لیے اپنے واسطوں کو مامور کیا ہے تاکہ وہ اللہ کے امر اور اذن سے اس کی حفاظت کریں ور اُسے ہلاکت سے بچائیں اور اُس کی وضعیت کی تبدیلی سے اسے دور رکھیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنی روحانی اور نفسانی حالت نہیں بدلتے، جیسے اگر شاکر تھے تو کافر ہو گئے یا مطیع تھے تو نافرمان ہو گئے یا اگر ایمان پر تھے تو شرک کی طرف چلے گئے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ بھی نعمت کو نقمت میں، ہدایت کو گمراہی میں، سعادت کو شقاوت و بدبختی میں بدل دیتا ہے۔ یہ اللہ کا حتمی فیصلہ ہے اور اللہ کی نعمتوں اور انسان کے نفسانی حالات کے درمیان اس کا تعلق ہے۔ (سورہ شوریٰ، آیت: ۳۰) ترجمہ: ”جو بھی تم کو مصیبت پہنچی ہے تو یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی حاصل کردہ ہے اور وہ تو بہت سارا معاف کر دیتا ہے“

اگر انسان کے نفسانی حالات فطرت کے مطابق ہوں تو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں، آسمانی اور زمینی برکتیں، دُنیا و آخرت کی برکات سب جاری رہتی ہیں۔ (سورہ الاعراف، آیت: ۹۶)
ترجمہ: ''اگر آبادیوں والے ایمان لے آئیں تقویٰ اختیار کریں تو ہم اُن پر آسمان سے اور زمین سے برکتوں کے دروازے ان پر کھول دیں''۔ جب تک اُن کے دلوں کے حالات ٹھیک رہیں تو اللہ کی طرف سے برکتیں بھی جاری رہتی ہیں۔ جس وقت وہ فطرت کے راستے کو چھوڑ دیں اور اپنی وضعیت کو بدل دیں تو خداوند تبارک و تعالیٰ، نعمات کو زائل کر دیتا ہے اور نعمت، نقمت میں بدل جاتی ہے۔ انسان جب بھی فطرت کے طریقے کو چھوڑے گا اور اپنی وضعیت کو بدلے گا تو خداوند بھی نعمات کو زائل کر دے گا اور نعمت کو نقمت میں بدل دے گا۔

لہٰذا انسان کو ملنے والی نعمات کا دارومدار اس کے نفسانی حالات پر ہے۔ شاید اس سے مراد عام تر ہو یعنی خارجی حالات چاہے اچھے ہوں یا برے ان کا انسان کے اندرونی حالات کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اگر انسان بدبختی میں پھنستا ہے لیکن خود کو تبدیل کرتا ہے اور اپنے نفسانی حالات کو ٹھیک کر لیتا ہے اور کفر کی حالت سے ایمان کی حالت کی جانب آجاتا ہے، ناسپاسی سے شکر کی حالت میں آجاتا ہے، بے تقوای سے تقویٰ میں چلا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو ظاہری اور باطنی نعمات سے نوازتا ہے۔ لیکن آیت کا سیاق پہلے معنی سے زیادہ مناسب ہے یعنی نعمت، نقمت میں بدل جاتی ہے، اس کے برعکس نہیں ہے۔ خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ نے بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اگر خداوند لوگوں کے نفسانی حالات اور فطرت سے اُن کا گریز کرنے کی بنیاد پر ان کے لیے شر اور برائی کا ارادہ کر لے تو اس کے ارادہ کے سامنے کوئی امر مانع اور رکاوٹ نہیں بن سکتا کیونکہ اللہ کے حکم سے کوئی گریز نہیں ہے۔ اس صورت میں اللہ کے سوا ان کا کوئی سرپرست اور ان کے امور کا متولی نہیں ہوگا جو ان سے برائی کو دُور کر دے۔

هُوَ الَّذِىۡ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَّيُنۡشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۚ‏ ﴿۱۲﴾

"وہی ہے جو تمہیں خوف یا اُمید دلانے کے لیے بجلی دکھاتا اور بھاری بادلوں کو اُٹھاتا ہے"۔

بادلوں کی چمک دمک

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بادلوں کی گرج چمک کو بیان کیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے تمہاری آنکھوں کے سامنے بجلی کو آشکار کیا تاکہ تمہارے اندر خوف اور اُمید کی صفت پیدا ہو جائے۔ کشتی پر سوار مسافر آسمانی بجلی کی کڑک سے ڈرتے ہیں جبکہ خشکی میں رہنے والے اس سے بارش کی اُمید باندھتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے جو بادلوں کو ہوا کے دوش پر چلاتا ہے جو پانی کا وزن لیے پھر رہے ہوتے ہیں جن سے بارش برساتا ہے۔

وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ؕ﴿۱۳﴾

"اور رعد اس کی پاکی کے ساتھ اس کی تعریف کرتا ہے اور سب فرشتے اس کے ڈر سے، اور بجلیاں بھیجتا ہے پھر انہیں جس پر چاہتا ہے گرا دیتا ہے اور یہ تو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، حالانکہ وہ بڑی قوت والا ہے"۔

کائنات کی ہر شئے کا اللہ کی حمد و تسبیح بجالانا

"صَوَاعِقَ" صاعقہ کی جمع ہے جو گرج چمکنے کے معنی میں ہے۔ "مجادلہ" گفتگو و جدل اور بحث و مباحثہ کرنے کو کہتے ہیں۔ "مِحَالِ" مماحلہ کے مصدر سے ہے جس کا معنی ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے خلاف مکر اور سازش کرے تاکہ ظاہر ہو کہ ان میں سے کون

زیادہ طاقت ور ہے، یعنی مد مقابل کی برائیوں اور اُس کے عیبوں کو ظاہر کرنے کے لئے بحث و مباحثہ کرنا۔ آیت کا معنی یہ ہے (البتہ اللہ دانا تر ہے) رعد یعنی یہ کڑک اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے، فرشتے اللہ کی عظمت کو دیکھ کر اور اس کے خوف سے تسبیح کر رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے آسمانی بجلی گراتا ہے اور اللہ کے حکم کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ان سارے واضح دلائل کے باوجود بت پرست اللہ کی ربوبیت کے بارے میں بحث و مباحثہ کرتے ہیں اور بتوں کی پرستش کے لیے اپنے اباء واجداد کی پیروی کرنے جیسی دلیل پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ اس بات سے غافل ہیں کہ اللہ شدید المحال ہے یعنی اس کی پکڑ بڑی سخت ہے اور وہ ان کے عیبوں کو ظاہر کرنے اور انہیں رسوا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

لَهٗ دَعۡوَةُ الۡحَقِّ ؕ وَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ لَا يَسۡتَجِيۡبُوۡنَ لَهُمۡ بِشَىۡءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيۡهِ اِلَى الۡمَآءِ لِيَبۡلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

''اسی کو پکارنا بجا ہے، اور اس کے سوا جن لوگوں کو پکارتے ہیں وہ ان کے کچھ بھی کام نہیں آتے مگر جیسے کوئی پانی کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے کہ اس کے منہ میں آجائے حالانکہ وہ اس کے منہ تک نہیں پہنچتا، اور کافروں کی جتنی پکار ہے سب گمراہی ہے''۔

کافروں کی حقیقت

دُعا اس وقت حقیقت کا روپ دھارتی ہے جب جس کو پکارا گیا ہے اُس کی توجہ اور نگاہ دعا کرنے والے پر ہو اور وہ دُعا کرنے والے کی بات سنے اور پھر اس کو پورا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو اور دُعا کی قبولیت سے عاجز نہ ہو۔ اس بنا پر ایسے موجود سے دعا مانگنا جس میں

شعور نہیں ہے، سمجھ نہیں ہے اور اس میں دُعا کی قبولیت کی قدرت نہیں ہے تو ایسی دُعا حقیقی نہیں ہے، اگرچہ اس کی شکل دُعا کی ہے۔ حقیقی دُعا فقط وہی ہے جو خدا سے کی جائے۔ مشرکین نے جن کو معبود بنا رکھا ہے اور ان کی درگاہ میں دعا کرتے ہیں وہ نہ تو شعور رکھتے ہیں اور نہ ہی ان میں دعا قبول کرنے کی قدرت ہے تاکہ وہ ان کی دعا کی قبولیت کے لئے اقدام کریں۔ لہٰذا وہ کسی بھی طرح انہیں بے نیاز نہیں کر سکتے اس بنا پر ان سے دُعا کرنا اور ان سے کچھ مانگنا باطل امر ہے۔ دعا فقط حق اللہ تعالیٰ سے کی جانی چاہیے۔

مطلب کی توضیح کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کہ بتوں سے مانگنے والوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جو بہت پیاسا ہے اور پانی پینا چاہتا ہے لیکن پیاس بجھانے کے مقدمات اور اسباب فراہم کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتا۔ وہ پانی سے دُور کھڑا ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول کر منہ کے قریب لے آتا ہے۔ یقینی امر ہے کہ ایسے شخص کے منہ میں پانی نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ اس شخص نے صرف پانی پینے کی شکل بنائی ہے، حقیقت میں وہ پانی نہیں پی رہا۔ بتوں اور خیالی شرکاء کی پرستش کرنے والے بھی اسی پیاسے شخص کی مانند ہیں جس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں اور پانی پینے کے لیے انہیں منہ کے قریب لے جاتا ہے، کیونکہ وہ جن سے مانگتے ہیں ان میں دعا قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا جو غیر خدا سے مانگے اسے کچھ نہیں ملتا اور وہ اپنے مطلوب تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ دعا کی قبولیت اس کی قدرت سے خارج ہے۔ وہ دعا کا راستہ گم کر بیٹھا ہے اور یہی گمراہی ہے اور صحیح راستے سے نکلنا ہے۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۩ ﴿١٥﴾

''اور چار و ناچار اللہ ہی کو آسمان والے اور زمین والے سجدہ کرتے ہیں اور ان کے

سائے بھی صبح اور شام"۔

تمام موجودات کا اللہ کو سجدہ کرنا

سب موجودات اور صاحبان عقول پروردگار عالم کے حضور خضوع و خشوع اور عاجزی کرتے ہیں۔ یہ تواضع و انکساری اُن کی ذات کا حصہ ہے اور کوئی بھی موجود اس سے جدا نہیں ہوتا، چاہے مرضی سے ہو یا اکراہ اور ناپسندی کی حالت میں۔ البتہ سارے موجودات رغبت اور اپنی مرضی سے اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہیں، ان کے سجدہ کرنے میں کوئی جبر نہیں ہے لیکن موجودات میں سے کچھ ایسے ہیں جیسے انسان اور جنات جن کا اللہ کے حضور سجدہ کرنا اکراہ اور ناپسندی کی حالت میں ہوتا ہے، کیونکہ بعض حالات ان کی طبیعت کے مخالف ہوتے ہیں جیسے موت، خرابی، اثرات کا باطل ہونا، آفات، امراض اور اسی طرح کی چیزیں۔ ان حالات میں ان کا سجدہ کرنا اللہ کے حضور عاجزی کے اظہار کے لیے نہیں ہوتا کیونکہ یہ چیزیں ان کی طبیعت کے موافق نہیں ہیں۔ ان کی طبیعت اور مزاج حیات اور بقاء کی متلاشی ہے۔ ہدف کو پانے کی فکر میں ہیں، کمال اور کامیابی کو چاہتی ہے، فرشتوں کے برعکس کیونکہ وہ اپنی ساری زندگی کے حالات میں رغبت اور مرضی سے اپنے رب کے اوامر کی اطاعت کرتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ ان کے سائے بھی خدا کا سجدہ کرتے ہیں۔ وزنی اجسام کے سائے اللہ تعالیٰ کو سجدے کرنے میں ان اجسام کی پیروی کر رہے ہوتے ہیں اور ان کے سائے بھی اُس کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ حالانکہ سایہ ایک عدمی امر ہے جو نور نہ پہنچنے یا منبع نور اور اس جسم کے مقابلے میں کسی چیز کے حائل ہونے کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ لیکن اُس کے بھی خارجی امور کی طرح وجودی آثار ہیں مثلاً اُس کا کم یا زیادہ ہونا یا شکل بدلنا۔

اگرچہ ان کا سجدہ دائمی ہوتا ہے اس کے باوجود سجدہ کو صبح اور شام کے ساتھ مختص کرنے کا مقصد شاید یہ ہو کہ ان اوقات میں سایہ کم یا زیادہ ہوتا ہے یا ان اوقات میں دیکھنے

والے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ سایہ زمین پر گر رہا ہوتا ہے اور سجدے اور ذلت کی حالت مجسم ہوتی ہے جبکہ دوسرے اوقات میں یہ حالت زیاد محسوس نہیں ہوتی۔ اجسام کے سایہ کی طرف سجدے کی نسبت دینے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس حالت میں تواضع اور ذلت مجسم ہوتی ہے۔اس سے تمام آثار اور احوال میں سائے کی تکوینی اطاعت مراد ہے۔

یہ انسان کے وہم و خیال سے برتر حقائق ہیں، کوئی خیالی تصویر یا شاعرانہ تصور نہیں ہے۔ذاتی سجدے کے معنی کو سمجھانے کے لیے جو اشیاء کی ذوات میں ہے ایک تشبیہ دے کر ممثل (پیش) کیا گیا ہے تاکہ آدمی کی حس اسے درک کر سکے اور سجدے کے ذاتی معنی کو سمجھے۔ اس میں صاحبان عقل و خرد کے لئے تذکر اور یاد دہانی ہے۔ سجدہ انکساری اور عاجزی اور سجدہ کرنے والے کی ذلت اور بے وقعتی کی نشانی ہے۔ سب اللہ کے حضور سجدہ ریز ہیں اللہ کے سامنے سب کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ۚ۬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۱۶

"کہو! آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے کہہ دو! اللہ، کہو پھر کیا تم نے اللہ کے سوا ان چیزوں کو معبود نہیں بنا رکھا جو اپنے نفسوں کے نفع اور نقصان کے بھی مالک نہیں، کہو! کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتا ہے، یا کہیں اندھیرا اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں، کیا جنہیں انہوں نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے انہوں نے بھی اللہ کی مخلوق

جیسی کوئی مخلوق بنائی ہے کہ پھر مخلوق ان کی نظر میں مشتبہ ہو گئی ہے، پیدا کرنے والا اللہ ہے اور وہ اکیلا اور زبردست ہے"۔

اللہ کی وحدانیت پر دلیل

یہ آیت سابقہ آیات اور رسول اللہ ﷺ کا مشرکین کے سامنے اللہ کی وحدانیت کی دلیل کا خلاصہ ہے۔ پیغمبرؐ کو بتایا گیا ہے کہ مشرکین سے کہیں کہ آسمانوں اور زمین کا مدبر اور مالک کون ہے؟ پھر حکم ہوا کہ خود ہی اُن کا جواب دو اور کہو کہ وہ اللہ ہے۔ کیونکہ ہٹ دھرم اور ضدی مشرکین توحید کا اقرار کرنے پر تیار نہیں تھے۔ لہٰذا اشارے سے اُن کو سمجھایا گیا کہ یہ اہل دلیل نہیں ہیں اور استدلال کو نہیں سمجھتے اور عقلی اور منطقی بات کی تصدیق بھی نہیں کرتے۔ پھر اس کی مدد سے دوسرا نتیجہ لیا ہے کہ خدا کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ خدا تمام نفع اور نقصانات کا مالک ہے پس اُس کے علاوہ جو بھی ہے وہ نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے، جب وہ اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے تو وہ دوسرے کو نفع و نقصان کیسے دے سکتا ہے؟ لہٰذا اللہ کے علاوہ کسی اور کو رب بنانا اور اسے لوگوں کے اولیاء قرار دینا نامعقول امر ہے۔ فرضی معبودوں کے پاس کسی کی ولایت کیسے ہو سکتی ہے جبکہ وہ اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کی بات میں تضاد ہے اور اُن کی ایک بات دوسری بات کو جھٹلا رہی ہے۔ اس بنا پر اولیاء حقیقت میں اولیاء نہیں ہیں۔

پھر فرمایا کہ بتاؤ کیا اندھا اور بینا برابر ہوتے ہیں؟ تم حجت حق کا انکار کر رہے ہو بتاؤ حق کا انکار کرنے والا اور حق پر یقین رکھنے والا کیا برابر ہیں؟ کیا اندھیرا اور روشنی برابر ہیں؟ حق کا انکار کرنے والا اور حق پر ایمان لانے والا کیا برابر ہیں؟ ظاہر ہے برابر نہیں ہیں! پس تم مشرکین اگر عقل سلیم رکھتے ہو تو تمہارے اوپر لازم ہے کہ تم حق کے آگے تسلیم ہو جاؤ اور باطل کو چھوڑ دو۔ یہاں پر گفتگو کا رُخ غایب سے تبدیل کرکے فقط رسول اللہ ﷺ کی طرف

کر دیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ نہیں بتایا کہ مشرکین سے یہ بات کہہ دیں۔ پھر جملہ اول کے احتمالی جواب میں دوبارہ رسول خدا ﷺ سے کہہ دیا کہ ان کو جواب دو۔ اس طرح رسول خدا ﷺ کو سمجھایا گیا ہے کہ مشرکین کے سوال کے بغیر ابتدائی طور پر ان کو توحید خالقیت کے متعلق بتا دیں۔ مشرکین ایک ہی خالق کے قائل تھے، خلق اور ایجاد میں توحید کے قائل تھے۔ (سورہ زمر، آیت: ۳۸)۔ اگر رسول مشرکین سے توحید خالقیت کے بارے سوال کرتے تو وہ صحیح جواب دیتے۔ لہٰذا مشرکین کو توحید خالقیت کے بارے بتانے کی کوئی جہت باقی نہ رہتی۔ مشرکین توحید ربوبیت میں اسلام کے عقیدے کے مخالفت تھے۔ وہ توحید خالقیت میں اسلام کے عقیدے کے مخالف نہیں تھے۔

توحید خالقیت کے عقیدے سے ربوبیت میں شرک کا عقیدہ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خلق اور ایجاد میں توحید کا لازمہ یہ ہے کہ وجود، علم اور قدرت میں غیر خدا سے استقلال کی نفی کر دی جائے اور جب غیر خدا میں یہ صفات کمالیہ نہیں ہوں گی تو وہاں ربوبیت کا معنی ہی نہیں رہتا۔ لہٰذا مشرکین کے پاس غیر اللہ کی ربوبیت کو قبول کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ توحید ربوبی کے انکار کی صورت میں خالق کی توحید کا انکار کرنا پڑے گا اور انہیں یہ بھی عقیدہ رکھنا پڑے گا کہ ان کے فرضی معبود بھی ایجاد اور خلق میں حصہ دار ہیں۔ حالانکہ وہ توحید خالقیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا پیغمبر ﷺ سے کہا گیا ہے کہ ان سے کہو کہ اللہ ہی ہر شئے کا خالق ہے، تاکہ ان کا باطل احتمال کلی طور پر ختم ہو جائے۔ توحید خالقیت اور ایجاد کی دلیل یہ ہے کہ خداوند ایسی وحدت رکھتا ہے کہ جو ہر کثرت اور عدد پر غالب ہے اور ان دو صفات ''وحدت اور قاہریت'' کا نتیجہ احدیت ہے۔

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ

مِّثْلُهٗ ؕ کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ؕ کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾

''اس نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے اپنی مقدار میں نالے بہنے لگے پھر وہ سیلاب پھولا ہوا جھاگ اوپر لایا، اور جس چیز کو آگ میں زیور یا کسی اور اسباب بنانے کے لیے پگھلاتے ہیں اس پر بھی ویسا ہی جھاگ ہوتا ہے، اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے، پھر جو جھاگ ہے وہ یونہی جاتا رہتا ہے، اور جو لوگوں کو فائدہ دے وہ زمین میں ٹھہر جاتا ہے، اسی طرح اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے۔''

حق اور باطل کی مثالیں

آیت کا ظاہری معنی واضح ہے خدا ہی وہی ذات ہے جو آسمان سے پانی اُتارتا ہے اور ہر وادی اور درے کی ظرفیت کے مطابق اس میں پانی جاری ہوتا ہے، پھر سیلاب آ جاتا ہے، سیلاب کے اوپر جھاگ ہوتی ہے اور یہ جھاگ اس چیز کی مانند ہوتی ہے جو زینت کے آلات کو گرم کرتے وقت پیدا ہونے والی آگ کے اوپر مشاہدہ کی جاتی ہے۔ حق و باطل بھی اسی طرح ہیں۔ حق پائیدار ہے باطل نابود ہوتا ہے۔ جس طرح سیلاب کے اوپر جو جھاگ ہوتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے لیکن پانی لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح خارجی حوادث کی مثالیں دیتا ہے تاکہ وہ چیز جو اُن کی معاش اور معاد کے لئے مفید ہے وہ آشکار ہو جائے۔

یہ آیت قرآن کی برجستہ آیات میں سے ہے جو حق و باطل کی طبیعت کے بارے میں بحث کر رہی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح سیلاب کے اوپر جو جھاگ ہوتی ہے آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے، باطل بھی اگرچہ بڑی مدت کے لئے بڑا ہنگامہ ہی کیوں نہ کرے اور

اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیوں نہ کرے لیکن آخرکار وہ نابود اور ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن حق اُس پانی کی مانند ہے جو باقی رہ جاتا ہے اور انسان اُسے اپنی زندگی کے مصارف کے لئے استعمال میں لاتا ہے اور لوگ اُس سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اس آیت سے چند نکات سمجھے جاتے ہیں:۔

ا۔ جو وجود اللہ کی جانب سے ممکنات کو افاضہ اور عطا ہوتا ہے، حقیقت میں آسمان سے اترنے والے بارش کے پانی کی طرح ہوتا ہے، جو اصل میں ہر شکل اور محدودیت سے عاری ہے۔ موجودات کی محدودیت اور ان کا تشخص ان کی اپنی جانب سے ہے۔ ہر ایک اپنی گنجائش کے مطابق وجود کے فیض سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

۲۔ آسمان سے نازل ہونے والی رحمت جب عالم ہستی میں جاری ہوتی ہے تو اس میں اضافے اور کثافتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ فضولات اور اضافی چیزیں باطل اور نابود ہو جاتی ہیں اور اصل رحمت باقی رہ جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اصل رحمت اللہ کی طرف سے ہے لیکن اضافی چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف نہیں دی جا سکتی۔ اگرچہ وہ بھی اللہ کے اذن سے وجود میں آتی ہیں۔

۳۔ کوئی بھی حق دوسرے حق کے لیے مزاحم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے ٹکرا رہا ہوتا ہے۔ اگرچہ موجودات کے درمیان شکل اور صورت کے اعتبار سے تزاحم پایا جاتا ہے لیکن الٰہی اغراض کے حصول کے لئے وہ سب ایک ہی راستے پر ہیں اور ان میں کوئی تزاحم نہیں پایا جاتا بلکہ وہ الٰہی مقصد تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں۔ جیسے آری اور لکڑی کے درمیان بظاہر تزاحم پایا جاتا ہے لیکن دونوں ایک مقصد کے لئے بنے ہیں۔ لکڑی کے وسائل بنانا جو نجار کی خدمت میں ہوں، باطل ہمیشہ حق کی غرض کے معارض ہوتا ہے اور اس کا ہدف فساد کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

۴۔ مذکورہ مثال جس طرح امور محسوسہ اور خارجی حقائق پر صدق کرتی ہے اسی

طرح علوم، اعتقاد پر بھی صدق کرتی ہے۔ مثلاً حق کا عقیدہ مومن کے دل میں بارش کے پانی کی مانند ہے جو آسمان سے اُترتا ہے اور سیلاب کی طرح جاری ہوتا ہے اور جس میں جتنی گنجائش ہوتی ہے اتنا ہی اس میں پانی جاری ہوتا ہے، اسی طرح ایمان بھی مومنین کی ظرفیت کے مطابق ان کے دلوں میں جاری ہوتا ہے اور کوئی اتنی ہی مقدار میں ایمان سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس کے بر عکس باطل عقیدہ، کافروں کے دلوں میں سیلاب کے اوپر جھاگ کی مانند ہے جس نے آخرکار محو اور ختم ہو جانا ہے۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَا فْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۬ۙ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾

"جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا ان کے واسطے بھلائی ہے، اور جنہوں نے اس کا حکم نہ مانا اگر ان کے پاس سارا ہو جو کچھ زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تو سب جرمانہ میں دینا قبول کریں گے، ان لوگوں کے لیے برا حساب ہے اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور وہ برا ٹھکانہ ہے"۔

دعوت الٰہی پر لبیک کہنے والوں کا اچھا انجام

جنہوں نے اپنے رب کی دعوت حقہ کو قبول کیا اور معارف الٰہی پر ایمان لائے، تو ان کے لیے اچھا انجام ہے۔ جنہوں نے اپنے رب کی دعوت کو قبول نہیں کیا تو برا انجام ان کے انتظار میں ہے۔ اب فرض کرلیں کہ جو کچھ زمین میں ہے اس کے دو برابر ہو جائے اور وہ سب ان کافروں کی ملکیت ہو اور سب کو تاوان میں دے دیں تاکہ اخروی نعمتیں جو اُن کے ہاتھ سے چلی گئیں، کہ اُنہوں نے اللہ کی دعوت کو انکار کیا تھا کہ وہ حاصل کر سکیں تو وہ بالکل حاصل

نہیں کر سکتے اور وہ نعمات اُن کو نہیں مل سکتیں۔ امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: ''جو کچھ اُن کے سر پر آپڑے گا اُس کی توصیف نہیں کی جا سکتی اور برا انجام ان کے انتظار میں ہے اور ان کا حساب ان کے اعمال کا نتیجہ اُن کے لئے مسرت کا سبب نہیں ہو گا بلکہ انہیں پریشان ہی کرے گا اور انہیں جہنم پہنچائے گا اور جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے جو ان کے لئے تیار ہوا ہے وہاں جا کر وہ ٹھہریں گے''۔

اَفَمَنۡ يَّعۡلَمُ اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ الۡحَـقُّ كَمَنۡ هُوَ اَعۡمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۙ‏ ﴿۱۹﴾

''بھلا جو شخص جانتا ہے کہ تیرے رب سے تجھ پر جو کچھ اترا ہے حق ہے اس کے برابر ہو سکتا ہے جو اندھا ہے، سمجھتے تو عقل والے ہی ہیں''۔

اہل حق اور اندھے برابر نہیں

وہ افراد جنہوں نے رب تعالیٰ کی دعوت کو قبول کیا، حق ان کے دلوں میں مستقر ہو گیا اور ان کے ''اولوالالباب'' صاحبان دن حقیقی دل؛ جن پر آثار اور برکات مترتب ہوتے ہیں۔ ان آثار میں سے ایک اثر ان کے دلوں کا ذکر الٰہی سے متذکر ہونا اور عہد الٰہی کے وفادار رہنا ہے۔ یہ لوگ عہد الٰہی کو توڑتے نہیں ہیں اور خداوند تبارک نے جن کو جوڑ کر رکھنے کا حکم دیا ہے اس کو جوڑ کر رکھتے ہیں، ہمیشہ صلہ رحمی کرتے ہیں، مصائب پر صبر کرتے ہیں، اصلاح کی خاطر انفاق اور خرچ کرتے ہیں، فساد نہیں پھیلاتے، اپنی نیکیوں کے ذریعے معمولی برائیاں جو ان سے صادر ہوئی ہیں ان کو محو کر دیتے ہیں۔ یہی لوگ نیک انجام اور اچھی عاقبت والے ہوں گے۔

خداوند تبارک و تعالیٰ استفہام انکاری کے ذریعے فرما رہا ہے کہ کیا وہ لوگ جو اللہ

تعالیٰ کی طرف سے تجھ پر نازل ہونے والے معارف کو حق سمجھتے ہیں، اُن کی مانند ہیں جن میں نگاہ بصیرت نہیں ہے اور جو حق کو سمجھنے میں نابینا ہیں؟ یقینی طور پر یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ صاحبان علم و خرد میں ایک قسم کی سمجھ ہے اور بیداری ہے جو نابینا اور اندھے لوگوں میں نہیں ہے اور وہ معارف الٰہی سے تذکر نہیں لیتے (یہ تعجب انگیز بات ہے کہ بعض لوگ خود کو مسلمان تو کہلاتے ہیں لیکن اپنی زندگی میں ان افراد کی روش پر چل رہے ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نابینا کہا ہے۔ آدمی کے لیے یہی سب سے بڑی شقاوت و بدبختی ہے کہ وہ اپنے رویوں میں جاہلوں جیسا عمل کرے)۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۟﴿۲۰﴾

''وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس عہد کو نہیں توڑتے''۔

عہد الٰہی کو پورا کرنا ایمان کی نشانی

اس آیت اور بعد والی آیت میں اس میثاق کی بات ہو رہی ہے جو اللہ سے باندھا گیا ہے۔ اس عہد و پیمان سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جسے مخلوقات نے زبان فطرت سے اپنے پروردگار کے ساتھ باندھ لیا ہے۔ سب نے اللہ تعالیٰ سے عہد باندھ لیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی خالقیت اور مالکیت کا اقرار کریں گے۔ اپنی فردی اور اجتماعی زندگی میں توحید کی بنیاد پر عمل کریں گے۔ یہ عہد و میثاق جو انبیاء کے وسیلے سے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے انسان سے لیا گیا ہے، فطری میثاق کی فروعات میں سے ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۟﴿۲۱﴾

''اور وہ لوگ جو ملاتے اور جوڑتے ہیں جس کے ملانے اور جوڑنے کا اللہ نے فرمایا ہے

اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا خوف رکھتے ہیں"۔

بظاہر "سُوْٓءَ الْحِسَابِ" کے قرینہ سے یہاں پر امر سے امر تشریعی مراد ہے۔ کیونکہ احتساب اور مواخذہ، شریعت میں اُتارنے گئے احکام کے تحت ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے دئے گئے احکام کے مطابق عمل نہیں کریں گے، اللہ نے جس کے جوڑنے کا کہا ہے اس کو نہیں جوڑیں گے اور جس کو توڑنے کا کہا ہے اس کو نہیں توڑیں گے تو ایسے افراد کو برے حساب سے ڈرنا چاہیے۔ اگر ہم نے اللہ کے کہے ہوئے پر عمل نہ کیا تو ہمیں برے انجام اور سوء الحساب سے ڈرنا چاہیے اور اس امر سے تشریعی امر مراد ہے۔

یہ احکام فطری احکام کی تائید کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ یہ احکام فقط فطری احکام پر مبتنی ہوں۔ کیونکہ حجت الٰہی فقط فطرت سے تمام نہیں ہوتی بلکہ فطرت کے ساتھ وحی کو بھی ملانا ضروری ہے۔ اگرچہ بہت سارے احکام کا حُسن اور قُبح فطری طور پر واضح اور آشکار ہے جیسے ظلم کا برا ہونا اور عدل کا اچھا ہونا، یہ سب قانون فطرت سے واضح وآشکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کے معروف ترین مصادیق میں سے ایک مصداق صلہ رحمی ہے۔ اس کو ترک کرنا امر خدا کی مخالفت کرنے کے مترادف ہے۔ "خشیت" شر کے واقع ہونے کے احتمال سے دل کے متاثر ہونے کو کہتے ہیں۔ "خوف" ڈرنے کے مقام پر انسان کا عملی تاثر خوف کہلاتا ہے۔ ایسے لوگ ہی اپنے رب سے خشیت رکھتے ہیں اور انہیں اپنے اعمال کے برے حساب کا خوف رہتا ہے۔ کیونکہ انسان کے سارے اعمال اس کے نامہ اعمال میں درج ہوتے ہیں۔ ظاہری سی بات ہے کہ جس کا عمل بد اور ناپسندیدہ ہوگا اس کی عاقبت بری ہے اور برا انجام اس کے انتظار میں ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ صَبَرُوا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِمۡ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً وَّ یَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ عُقۡبَی الدَّارِ ﴿۲۲﴾

"وہ جنہوں نے اپنے رب کی رضامندی کے لیے صبر کیا اور نماز قائم کی اور ہمارے دیے ہوئے میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کیا اور برائی کے مقابلے میں بھلائی کرتے ہیں ان ہی کے لیے آخرت کا گھر ہے"۔

مومنین کے اوصاف

"اولوا الباب" کے اوصاف کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے اس آیت میں ان کے کچھ اور اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ اولوا الباب اپنے رب کی رضا کے لئے صبر کرتے ہیں۔ صبر کو اس لئے مطلق لایا گیا ہے تاکہ صبر کی ساری قسموں پر دلالت کرے جن میں اطاعت کرنے میں صبر، مصیبت پر صبر اور معصیت چھوڑنے پر صبر شامل ہیں۔ "وَجۡهِ رَبِّهِم" یعنی ان کے عمل میں الٰہی جہت ہوتی ہے یا ان کا عمل قربۃً الی اللہ کی نیت سے ہوتا ہے۔

"اولوا الباب" کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، وہ نماز نہیں چھوڑتے اور نماز کو اس کی تمام شرائط اور آداب کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور اسے معمولی امر قرار نہیں دیتے کیونکہ نماز کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ "اولوا الباب" وہ ہیں جو چھپ کر اور ظاہر کر کے انفاق کرتے ہیں۔ اس جگہ انفاق سے عام انفاق مراد ہے انفاق واجب اور غیر واجب۔ ان کے ان اعمال کا مقصد اللہ کے بندوں کی اصلاح کرنا ہے۔ انفاق چھپ کر ان موارد میں کیا جاتا ہے جہاں اشخاص کی آبرو کی حفاظت کرنا ہو۔ اور آشکار انفاق وہاں ہوتا ہے جہاں دوسروں کو انفاق کا شوق دلانا مقصود ہو جیسے مالی واجبات ادا کرنا یا تہمت

کو دُور کرنے کے لیے آشکارا طور پر خرچ کرنا۔ " اولوا الباب" کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ برائی کو نیکی سے دُور کرتے ہیں اگر انہوں نے غلطی یا بھولے سے کوئی برا عمل انجام دیا ہو تو اس برے عمل کو اپنے نیک اعمال کے ذریعے ختم کر دیتے ہیں، اس بارے (سورہ ھود، آیت: ۱۱۴) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ ترجمہ: "بتحقیق نیکیاں برائیوں کو زائل کر دیتی ہیں"۔ یا اگر دوسروں نے ان کے ساتھ برا سلوک کیا ہے تو ان کو عفو کرکے اور ان کے ساتھ احسان اور حسن خلق سے ان کی تلافی کرتے ہیں تاکہ اس طرح برائی کو جڑ سے اکھیڑ پھینک دیں اور شیطانی وسوسوں کا خاتمہ کریں۔

ان کے ان اعمال کے سبب آخرت کے گھر میں اُن کے لیے بہترین عاقبت اور مقام ہے۔ جی ہاں! اس عالم میں ہر چیز اُس فطرت کے تحت جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے اسے خلق کیا ہے اپنی سعادت کا سرمایہ مہیا کرتی ہے اور اسی کے تحت سعادت تک پہنچتی ہے۔ اور ہر چیز کو اسی کے مناسب سعادت ملے گی۔ برا انجام حقیقت میں عاقبت کا باطل ہونا ہے اور بے عاقبت ہونا ہے۔ اسی لیے اس آیہ شریفہ میں بطور مطلق فرمایا کہ انجام ان ہی لوگوں کے لیے ہے۔ اگر انجام دو طرح کا ہوتا ایک اچھا انجام اور دوسرا برا انجام تو اس طرح فرماتے کہ نیک انجام ان لوگوں کے لیے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس انجام سے مراد وہی انجام محمود اور قابل تعریف انجام مراد ہے۔ اسی لئے جن آیات میں کافروں کا حال بیان کیا گیا ہے وہاں پر "سوء الدار" کے تعبیر استعمال ہوئی ہے یعنی ان کے لئے برا گھر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گھر سے اسی دُنیا کا گھر مراد ہے اور دارِ دُنیا سے اسی دُنیا کی زندگی مقصود ہے اور عقبہ الدار، دُنیا کی زندگی کے سر انجام کے معنی میں ہے۔

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَ اَزۡوَاجِهِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِهِمۡ وَ الۡمَلٰٓئِکَةُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ کُلِّ بَابٍ ۚ﴿۲۳﴾

''ہمیشہ رہنے کے باغ جن میں وہ خود بھی رہیں گے اور ان کے باپ دادا اور بیویوں اور اولاد میں سے بھی جو نیکوکار ہیں، اور ان کے پاس فرشتے ہر دروازے سے آئیں گے''۔

''اُولوالالباب'' کیلئے بہشتِ جاوید

وہ افراد جن کے اوصاف سابقہ آیات میں بیان کئے گئے وہ بہشت جاوید میں داخل ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں نوید دی ہے کہ اُن کے نیک رشتہ دار جن میں ان کے ماں، باپ، اولاد، بھائی، بہنیں اور بیویاں شامل ہیں ان کے ساتھ ملحق ہوں گے۔ اگرچہ یہاں پر ماؤں کا نام نہیں لیا گیا لیکن آیت میں ازواج کا ذکر ہوا ہے اور ان کی مائیں کیونکہ ان کے والد کی ازواج ہیں تو ازدواج کا لفظ ان کو بھی شامل ہے۔ یہ آیت چچا، ماموں، بہن اور بھائیوں کو بھی شامل ہے کیونکہ یہ سارے آباء کی ذریت سے ہیں، اس آیت میں بہت ہی لطیف اختصار استعمال کیا گیا ہے۔

سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

''کہیں گے تم پر سلامتی ہو تمہارے صبر کرنے کی وجہ سے، پھر آخرت کا گھر کیا ہی اچھا ہے''۔

نیک لوگوں کے لیے سلامتی

یہ جملہ فرشتوں کا ہے جو اولوالالباب سے مخاطب ہوئے ہیں۔ فرشتے اس میں اولوالالباب کو امن ، سلامتی اور ہمیشہ کی اچھی زندگی کی بشارت دیتے ہیں یہ ایسی جگہ ہے جہاں کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ ان کی پوری زندگی زندگی میں انجام دیے گئے نیک اعمال کا نتیجہ ہے جس پر وہ اپنی پوری زندگی کے مراحل میں ثابت قدم رہے۔ جب دوسرے لوگ منحرف

ہو رہے تھے تو یہ سیدھے راستے پر ثابت قدم رہے اور انہوں نے صبر کیا، معصیت سے دور رہے تھے اور مصائب کو برداشت کیا۔ وہ ہمیشہ صبر کے ساتھ خوف اور خشیت رکھتے تھے۔ انہیں ڈر بھی تھا اور امید بھی تھی، دل میں کھٹکا بھی تھا کہیں پکڑے نہ جائیں لیکن نیک اعمال بھی جاری تھے، نماز قائم کرتے تھے، انفاق کرتے تھے اور ساتھ صبر بھی کرتے تھے۔ ان کے لئے یہ اچھا انجام ہے جس کی نوید فرشتے ان کو دیں گے کہ آپ پر سلامتی، خیر اور امنیت ہو۔

وَ الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِهٖ وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۙ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

''اور جو لوگ اللہ کا عہد مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو توڑتے ہیں جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم فرمایا اور ملک میں فساد کرتے ہیں، ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے''۔

عہد الٰہی کو توڑنے والوں کا انجام

اس آیت میں بے ایمان لوگوں کی حالت بیان کی گئی ہے۔ کافر وہ ہیں جنہوں نے فطرت سلیم کا عہد توڑ دیا جس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ توحید کا اقرار کرتے، لیکن انہوں نے اس عہد کو توڑ دیا اور اللہ کے احکام جو انسان کی سعادت کے ضامن تھے انہیں پامال اور تبدیل کیا اور اللہ تعالیٰ نے جن کے جوڑنے کا حکم دیا تھا ان کو توڑا، معاشرہ میں فساد برپا کیا اور اسے بدبختی میں کھینچ کر لے گئے، زمین میں بدامنی قائم کی۔ چیزوں کو جن فرائض اور وظایف کے لئے خلق کیا گیا تھا انہیں تبدیل کر دیا اور انہیں حد اعتدال سے خارج کیا اور انہیں ان امور کو انجام

دینے نہ دیا جن کے لیے وہ خلق ہوئے تھے۔ یہ لوگ اپنے ان اعمال کے نتیجے میں رحمت الٰہی سے دُور ہوئے اور انہیں کرامت الٰہی سے دھتکار دیا گیا کیونکہ اُنہوں نے حق سے اعراض کیا اور باطل میں گھس گئے۔ باطل کا انجام نابودی اور ہلاکت اور بری عاقبت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

''اللہ ہی جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ اور تنگ کرتا ہے، اور دنیا کی زندگی پر خوش ہیں، اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں کچھ نہیں مگر تھوڑا سا اسباب''۔

دُنیا و آخرت کا تقابل

ان دو گروہوں کا حصہ ''اولوالالباب'' کے لیے نیک انجام اور اچھی عاقبت اور کافروں اور عہد الٰہی توڑنے والوں کے لیے برا انجام اور عاقبت بد ایک طرح کی روزی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے جیسی روزی دینا چاہے دے دیتا ہے، اچھی روزی یا بری روزی۔ لیکن لوگوں کی اکثریت دُنیا سے دل لگا بیٹھی ہے اور وہ اس بات سے غافل ہیں کہ حقیقی رزق اور روزی آخرت کی روزی ہے۔ دُنیا بالذات مقصود نہیں ہے بلکہ یہ متاع ہے اور وسیلہ ہے دوسری زندگی کے لیے۔

در حقیقت دُنیا آخرت کی کھیتی ہے اور ایسی جگہ ہے جہاں پر آخرت کی روزی کمائی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر دُنیا کا آخرت سے مقابلہ کیا جائے تو دُنیاوی زندگی اُس وقت حق ہے جب اسے آخرت کے مقدمہ اور وسیلہ کے عنوان سے دیکھا جائے، اگر خود دنیا کو مقصود قرار دیں اور اس کو مستقل نگاہ سے دیکھیں تو یہ باطل کے مصادیق میں سے ہو گی اور اس کی مثال اس

جھاگ کی ہو گی جو سیلاب کے اوپر ہوتی ہے جس نے نابود ہونا ہے۔ اس بارے (سورہ عنکبوت، آیت: ٦٤) میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد ہے: ترجمہ: ”یہ دُنیا کی زندگی سوائے بازیچہ اور سرگرمی اور کھیل تماشہ کے کچھ نہیں بتحقیق بلاشک آخرت کی جو سرائے ہے وہی اصل زندگی ہے اگر وہ سمجھیں تو“۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿٢٧﴾

”اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری، کہہ دو اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے اپنے تک پہنچنے کا راستہ دکھاتا ہے“۔

قرآن کے علاوہ دوسرے معجزے کی طلب

کفار قرآن کو معجزہ اور اللہ کی نشانی قرار نہیں دیتے تھے لہٰذا وہ آکر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتے تھے کہ کوئی اور معجزہ کیوں نہیں لاتے تاکہ ہم اس کے ذریعے ہدایت پائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو دستور دے رہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ہدایت معجزہ سے نہیں ہوتی تاکہ معجزہ تمہاری ہدایت کا سبب بن جائے بلکہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے بھی چاہے ہدایت دیتا ہے جسے چاہے گمراہ کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ اور اس کی مشیت بغیر حساب وکتاب کے اور بے ہودہ نہیں ہے۔ بلکہ خدا اس کی ہدایت کرتا ہے جو اپنی زندگی کے راستے میں خدا کی طرف پلٹنے کا ارادہ کرے۔ اور خدا اسے گمراہ کرتا ہے جو زندگی کے راستے میں خدا کی طرف رجوع نہ کرے اور خدا سے رُوگردانی کرے۔ یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے اور اسی پر محکم، مضبوط اور خلل ناپذیر نظام کھڑا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ؕ ﴿۲۸﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے تسکین ہوتی ہے، خبردار! اللہ کی یاد ہی سے دل تسکین پاتے ہیں''۔

ذکر الٰہی باعث اطمینان قلوب

یہ آیت اُن لوگوں کی حالت بیان کررہی ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لے آئے ہیں اور اُن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں اور ان کو سکون ملتا ہے۔ اُن میں ہدایت الٰہی کا عطیہ وصول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ جس طرح فسق، گناہ اور حق سے منہ موڑنا، گمراہی کے موارد میں سے ہے اور ضلالت اور گمراہی کا مقدمہ ہے۔ اس کے بعد ایک عمومی قاعدہ اور قانون بیان کردیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی یاد سے ہی دلوں کو سکون اور اطمینان ملتا ہے۔ اس جگہ ذکر، اس کی تمام اقسام کو شامل ہے چاہے لفظی ذکر ہو یا غیر لفظی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی میں سعادت، سکون اور آرام تک پہنچنے کے علاوہ اس کا اور کوئی ہدف نہیں ہے۔ وہ اپنی زندگی میں نامناسب حالات کے پیش آنے اور نعمات کے چھن جانے سے ڈرتا ہے۔ یہ سارے امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور اسی کی طرف پلٹتے ہیں۔ پس اس کی یاد ہر ایک کے دل کو خوش و خرم کرتی ہے اور اسے آرام دیتی ہے اور کوئی بھی نفس اللہ کی یاد کے بغیر آرام نہیں پکڑتا۔ سوائے ان لوگوں کے جو حقیقت حال سے غافل ہیں اور بصیرت ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں اور رشد ان میں نہیں ہے اور وہ حق سے گریزاں ہیں، ایسا نفس اطمینان کی نعمت سے بے بہرہ ہوتا اور سکون سے محروم ہوتا ہے۔ دلوں کا اطمینان فقط ذکر الٰہی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سورہ توبہ، آیت ۶۷) ترجمہ:

''وہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے ان کو بھلا دیا''۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کے لیے خوشخبری اور اچھا ٹھکانا ہے''۔

نیک مومنین کے لیے خوشخبری

یہ وہی لوگ ہیں جن کے دل مطمئن ہیں اور اللہ کی نعمات نے انہیں اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ انہوں نے حقیقتاً ایسے ستون پر اعتماد کیا ہے کہ جو کبھی منہدم نہیں ہوگا۔ وہ اس اعتماد کے سائے میں اسی کی ولایت میں مستقر ہوئے ہیں۔ ان کے پروردگار نے ان کی طرف توجہ کی ہے جو ان کی سعادت کا سبب ہے۔ اگر ان کا پروردگار انہیں کوئی چیز عطا کرتا ہے تو اس میں اُن کی خیر ہوتی ہے اور اگر انہیں کوئی چیز نہیں ملتی تو اس میں بھی ان کی خیر ہوتی ہے، پس نیکوترین اور اچھی زندگی انہی کی ہے اور بہترین عاقبت اور انجام بھی اُنہی کے واسطے ہے۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

''اسی طرح ہم نے تجھے ایک اُمت میں بھیجا ہے کہ اس سے پہلے کئی اُمتیں گزر چکی ہیں تاکہ تو انہیں سنا دے جو ہم نے تیری طرف حکم بھیجا ہے اور وہ تو رحمان کے منکر ہیں، کہہ دو وہی میرا رب ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے''۔

رسول خداؐ کی رسالت

اللہ تعالیٰ اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ سے فرمارہا ہے کہ اس اُمت میں تجھے بھیجا جانا اللہ کی اس سنت کے تحت ہے جس کے مطابق وہ اُمتوں کو توحید کی جانب دعوت دیتا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ یہ سب ایک نظام کے تحت ہے کہ جو بھی اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اللہ پر ایمان لاتا ہے تو اسے سکون قلب عطا ہوتا ہے۔ تجھے اس اُمت میں اس لئے بھیجا گیا ہے تاکہ تم معارف الٰہی کی کتاب کو ان تک پہنچاؤ، حالانکہ اُنہوں نے رحمان کا کفر کیا ہے۔ اس صفت کو اس لیے ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس بات کو سمجھا دیں کہ کفار نے رحمت عام الٰہی کا کفران کیا ہے اگر وہ اس رحمت کو قبول کرتے تو دُنیا و آخرت کی سعادت انہیں مل جاتی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا واضح طور پر ان تک توحید کا پیغام پہنچا دو اور ان سے کہہ دو کہ میرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، میں اپنے تمام امور اسی کے سپرد کرتا ہوں اور اسی کے حضور اپنی ساری حاجات پیش کرتا ہوں، اسی سے مانگتا ہو اور اسی کی طرف میری بازگشت ہے۔ درحقیقت اللہ پر توکل اس کی ربوبیت کے آثار اور نتائج میں سے ہے۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۭ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۭ اَفَلَمْ يَايْـــــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿٣١﴾

”اور اگر تحقیق کوئی ایسا قرآن نازل ہوتا جس سے پہاڑ چلتے یا اس سے زمین کے

ٹکڑے ہو جاتے یا اس سے مردے بول اٹھتے (تب بھی نہ مانتے)، بلکہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں، پھر کیا ایمان والے اس بات سے ناامید ہو گئے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو سب آدمیوں کو ہدایت کر دیتا، اور کافروں پر تو ہمیشہ ان کی بداعمالی سے کوئی نہ کوئی مصیبت آتی رہے گی یا وہ بلا ان کے گھر کے قریب نازل ہو گی یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو، بے شک اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا"۔

قرآن کی خصوصیت

اگر قرآن کے ذریعہ پہاڑ اکھڑ جاتے، زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی، مردے باتیں کرتے اور معاد کی حقانیت پر گواہی دیتے اور موت کے بعد پیش آنے والے حالات کی وضاحت کرتے تو پھر بھی اگر خدا نہیں چاہتا تو یہ لوگ ہدایت نہیں پاتے۔ کیونکہ ہدایت کا امر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ معنی سورہ انعام کی آیت ۱۱۱ کی مانند ہے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ہم اگر ان پر فرشتے اتارتے اور مردے ان کے ساتھ باتیں کرتے اور گروہ گروہ ان کے ہاں اکٹھے لے آتے پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر وہ لاتے جن کے بارے میں خدا چاہتا"۔

اس کے بعد فرمایا کیا مومنین ان لوگوں کے ایمان لانے سے مایوس نہیں ہوئے ہیں؟ اور یہ نہیں جانتے کہ خدا چاہتا تو سب کو ہدایت دیتا اور کیا یہ نہیں جانتے کہ ان پر آنے والی ساری ہلا دینے والی مصیبتیں ان کے دعوت حقہ کو قبول نہ کرنے اور ان کے اعمال اور کفر کی وجہ سے آتی ہیں۔ یہاں کافروں سے صدر اسلام کے کافر مراد ہیں۔ اطراف مکہ میں رہنے والوں کے لئے ہلا دینے والی مصیبتوں مراد رگڑا دینے والی جنگ اور قتل و غارت مراد ہے جن سے وہ دچار تھے۔ اور اہل مکہ کے لیے ہلا دینے والی مصیبتوں سے ان کو پیش آنے والے حادثات اور ان کے برے اثرات، وحشت اور غم مراد ہیں۔ یہ ساری چیزیں ان کے لئے ہوئیں۔ وہ عذاب جس کا وعدہ دیا گیا ہے اس سے تلوار کا عذاب مراد ہے جس سے وہ جنگ

بدر اور باقی غزوات میں دوچار ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا برحق وعدہ ہے اور خداوند تبارک و تعالیٰ کبھی بھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ جب اس کے وعدے کا وقت آ جاتا ہے تو نہ ایک لمحہ آگے ہوتا ہے اور نہ ایک لمحہ پیچھے ہوتا ہے۔

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

"اور تجھ سے پہلے کئی رسولوں سے ہنسی کی گئی ہے پھر میں نے کافروں کو مہلت دی پھر انہیں پکڑ لیا، پھر ہمارا عذاب کیسا تھا"۔

رسولوں کا مذاق اڑانے والوں کی سزا

یہ آیت پچھلی آیت میں بیان شدہ وعید کی تاکید ہے جس میں کفار کو دھمکی دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرما رہا ہے کہ اے پیغمبر! اگر کفار قریش تیرا مذاق اڑاتے ہیں اور اور تجھ پر ایمان نہیں لاتے ہیں تو تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تم سے پہلے والی امتوں نے بھی اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا، ہم نے کفر کرنے والوں کو تھوڑی بہت مہلت دی اور پھر ہم نے ان کی گرفت کی اور کون جانتا ہے کہ ہماری گرفت اور سزا کس طرح تھی؟ کیا یہ صرف دھمکی ہے یا ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے یہ فرار کر سکتے ہیں؟ یا ایسی چیز ہے کہ جس کو برداشت کر سکتے ہیں یا اُسے اپنے آپ سے دُور کر سکتے ہیں؟ جبکہ گذشتہ اُمتوں پر نازل ہونے والے عذاب کے بارے میں انہیں علم ہے۔ ان کو پتہ ہونا چاہیے کہ میرا عذاب حتمی ہے لہٰذا انہیں ان اعمال سے پرہیز کرنا چاہیے جو سابقہ اُمتوں عذاب کا سبب بنے۔

اَفَمَنۡ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفۡسٍ ۭ بِمَا كَسَبَتۡ ۚ وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلۡ سَمُّوۡهُمۡ ؕ اَمۡ تُنَـبِّـئُوۡنَهٗ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِى الۡاَرۡضِ اَمۡ بِظَاهِرٍ مِّنَ الۡقَوۡلِ ؕ بَلۡ زُيِّنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مَكۡرُهُمۡ وَصُدُّوۡا عَنِ السَّبِيۡلِ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ﴿۳۳﴾

''بھلا جو (خدا) ہر کسی کے سر پر کھڑا ہے (اور جانتا ہے) جو اس نے کیا ہے، اور انہوں نے تو اللہ کے لیے شریک بنا رکھے ہیں کہہ دو ان کے نام بتلاؤ، کیا اللہ کو وہ بات بتاتے ہو جسے وہ زمین میں نہیں جانتا یا اوپر ہی کی باتیں کرتے ہو، بلکہ کافروں کے فریب انہیں بھلے معلوم کرائے گئے ہیں اور وہ راستہ سے روکے گئے ہیں، اور جسے اللہ گمراہ کرے پھر اسے کوئی بھی ہدایت دینے والا نہیں ہے''۔

اللہ کا شریک گھڑنا کھلی گمراہی

خداوند تبارک و تعالیٰ ہر شخص کے اوپر ناظر ہے اور اس کے اعمال کو دیکھ رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کی ذات پر محیط اور اس پر غالب ہے اور اس پر شاہد ہے اور ہر آدمی کے اعمال کے امر کا مدبر ہے اور ہر عمل کو قوت اور صلاحیت کے مرحلے سے فعل کی شکل میں لاتا ہے۔ سارے اعمال کو اعمال کے صحیفوں میں درج کرتا ہے اور اُنہیں عذاب یا ثواب کی صورت تبدیل کرتا ہے۔ کیا ایسا خدا جو جسے چاہے ہدایت کرتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور اسے سزا دیتا ہے اور سارے امور اسی کے ہاتھ میں ہیں کیا کوئی الوھیت اور معبودیت میں اس کا شریک ہو سکتا ہے؟ ہر گز نہیں! ایسا نہیں ہے۔ ایسا پروردگار شرک سے پاک و منزہ ہے۔

اس کے بعد اللہ اپنے پیغمبر کو عجیب اور بے سابقہ دستور دیتا ہے اور فرما رہا ہے کہ کفار سے کہہ دو کہ اپنے شرکاء کا نام لے لو اور ان کی وصف بیان کرو۔ کیونکہ اشیاء کو ان کی صفات متعین کرتی ہیں۔ اگر اللہ کا کوئی شریک ہو تو ضروری ہے کہ مشرکین جن کو اللہ کا شریک بناتے ہیں ان میں وہ صفات ہونی چاہئیں جو اس مقام اور منزلت کے لائق ہوں۔ تمہارے شرک کا معنی یہ ہے کہ تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دے رہے ہو جس سے اللہ تعالیٰ بے خبر ہے، حالانکہ خدا تو ہر نفس پر محیط ہے اور اس کے اعمال پر ناظر ہے اور وہ تو دانا مطلق ہے۔ اسے ایسے شرکاء کی خبر نہیں ہے لہٰذا تمہاری بات سرے سے ہی باطل ہے۔ کیونکہ اگر اللہ کے شرکاء ہوتے تو یقینی طور پر خدا ان سے واقف ہوتا اور اُن کی تاثیر اور اُن کا وجود اُس سے مخفی نہ ہوتا۔ لہٰذا تمہاری بات حقیقت سے عاری ہے۔ مشرکین کی باتوں میں درج ذیل تین میں سے ایک اشکال وارد ہے:۔

پہلا: بغیر ثبوت کے اللہ کے شرکاء کے قائل ہوں۔

دوسرا: اللہ کے شرکاء کے لئے ایسے اوصاف بیان کریں جن اوصاف کا اللہ کو علم نہیں ہے۔

تیسرا: ان کی اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ فقط ان کا خیال ہے، اس کے پیچھے حقیقت نہیں ہے۔

آخر میں حضور پاک ﷺ سے خطاب میں فرمایا کہ یہ دلائل بے بنیاد ہیں، ان دلائل کو چھوڑو کیونکہ ان کا اللہ کا شریک قرار دینے کی وجہ یہ باتیں نہیں ہیں بلکہ شیطان نے شرک کو اُن کی نظروں میں جلوہ گر کیا ہے اور اُس کے ذریعے، شیطان نے ان کو خدا کے راستے سے روکا ہے اور دُنیاوی مال و متاع اور زینت میں انہیں مصروف کیا ہے جس کے نتیجے میں خدا نے بھی انہیں ہدایت کی نعمت سے محروم کر دیا ہے اور انہیں گمراہ کر دیا ہے اور جسے خدا گمراہ کرے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

''ان کے لیے دنیا کی زندگی میں عذاب ہے، اور البتہ آخرت کا عذاب تو بہت ہی سخت ہے، اور انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا''۔

مشرکین کے لیے عذاب الٰہی

اس آیت میں اس عذاب کو بیان کیا گیا ہے جسے اجمالی طور پر سابقہ آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کے پیمان کو توڑنے والے کفار اور مشرکین کے لیے دُنیا میں بھی عذاب ہے اور آخرت میں بھی عذاب ہے، لیکن آخرت کا عذاب شدید تر اور سخت تر ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش کرنے والا اور انہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

''اس جنت کا حال جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے، اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس کے میوے اور سائے ہمیشہ رہیں گے، یہ پرہیزگاروں کا انجام ہے اور کافروں کا انجام آگ ہے''۔

متقین اور کفار کے انجام کا تقابل

اس آیت میں سابقہ آیات میں مومنوں کو دیے گئے وعدہ جمیل (اچھا وعدہ) کی وصف بیان کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ پرہیزگار اور متقی ایسی بہشت میں ہوں گے جس کی نعمتیں دائمی ہیں، وہ نعمتیں کم نہیں ہوں گی کیونکہ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہیں۔

اہل تقویٰ اور مومنین جو دنیا میں عمل صالح کرتے تھے ان کے اعمال ایک عمل کے حکم میں ہیں، کیونکہ انہوں نے ہمیشہ تقویٰ کے راستے میں زندگی گزاری ہے۔ اُن کا انجام اور اختتام بہشت ہے۔ جن کافروں نے ساری عمر کفر کے راستے میں گزاری اور اللہ کی آیات کو جھٹلانے پر لگے رہے ہیں اُن کا انجام دوزخ کی آگ ہے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے اپنی ساری زندگی تقویٰ یا کفر کی بنیاد پر نہیں گزاری بلکہ کچھ عرصہ ایمان کے راستے پر رہے اور کچھ عرصہ کفر کی وادی میں گزرار ہو تو یہ آیات ان کو شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ مومنین بھی اس آیت سے خارج ہیں جن کا عقیدہ درست تھا لیکن عمل صالح انجام نہیں دیا، خدا پر ایمان تھا لیکن اس کی آیات کے کافر تھے۔ یہ کفر عمل کے مرتبہ میں ہے، عقیدہ کے مرحلہ میں نہیں ہے۔ بہر حال یہ آیت سابقہ آیات میں بیان شدہ کافروں اور مومنوں کے متعلق بحث کا خلاصہ اور اس کا خاتمہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝۳۶

''اور وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے اس سے خوش ہوتے ہیں جو تجھ پر نازل ہوا، اور جماعتوں میں سے کچھ لوگ اس کی بعض بات نہیں مانتے، کہہ دو مجھے تو یہی حکم ہوا ہے کہ اللہ کی بندگی کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروں، اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا ٹھکانا ہے''۔

یہود و نصاریٰ کے بارے

اس آیت میں اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ بعض اقوال کی بناء پر اہل

کتاب سے یہود و نصاریٰ اور مجوسی (زرتشتی) مراد ہیں۔ ان کا قرآن کے نزول سے خوش حال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بعثت کے شروع میں یہودی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے عناد و دشمنی نہیں رکھتے تھے، حتیٰ کہ آپ کی نبوت کی گواہی بھی دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ وہی پیغمبر ہے جس کے بارے میں توریت اور انجیل میں بشارت دی گئی ہے۔ لیکن ہجرت کے بعد پیش آنے والے حادثات و واقعات کے بعد ان کی دشمنی شدت پکڑ گئی۔ نصاریٰ بھی اسی طرح تھے، ان ایک گروہ دین حق پر تھا اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے نبی مانتے تھے اور قرآن کے نزول سے خوشحال تھے۔ لیکن ان کا دوسرا گروہ جو تثلیث کے قائل تھے وہ توحیدی معارف اور احکام اور اصولوں کا انکار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرم ﷺ کو دستور دیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ مجھے تو یہ حکم ملا ہے کہ میں اللہ کی بندگی کروں، کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤں، لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دُوں۔ میری بازگشت اللہ کی جانب ہے اور میں اپنے تمام معاملات میں سے کسی بھی معاملے میں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ آخری جملے میں شاید معاد کے مسئلہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَ لَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

"اور اسی طرح ہم نے یہ کلام اتارا عربی زبان میں، اور اگر تو ان کی خواہش کے مطابق چلے بعد اس علم کے جو تجھے پہنچ چکا ہے تو تیرا اللہ سے کوئی حمایتی اور بچانے والا نہ ہوگا"۔

رسول اللہؐ کے لیے فرمان

"کَذٰلِکَ" سے ان آسمانی کتابوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو گذشتہ انبیاء پر اُتری۔

"حُکْم" سے مقصود فیصلہ و فرمان ہے۔ لہٰذا کتاب حقیقت میں حکم الٰہی ہے کیونکہ یہ لوگوں کے درمیان فیصلہ دینے والی ہے۔ "عَرَبِیًّا" حکم کی صفت ہے، اس سے اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کو عربی زبان میں اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے تحت نازل کیا گیا ہے جس کے تحت ہر پیغمبر کو اس کی اپنی قوم کی زبان ہی سے بھیجا جاتا ہے۔ اس بارے (سورہ ابراہیم، آیت: ۴) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه" ترجمہ: "اور ہم نے تمام رسولوں کو ان کی قوم کی زبان والا ہی بھیجا"۔

اس آیت میں پیغمبر ﷺ سے کہا گیا ہے کہ اہل کتاب کی خواہشات پر نہ چلیں کیونکہ اہل کتاب احکام کے نسخ ہونے کو محال جانتے ہیں اور وہ اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ اُن کے احکام کے مطابق فیصلہ دیں۔ یا وہ چاہتے تھے کہ پیغمبر اکرم ﷺ قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا معجزہ لے آئیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے پیغمبرؐ کو خبردار کیا کہ وہ اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ اگر تم یقین اور علم کے آنے کے بعد اُن کی خواہشات کی پیروی کروگے تو تجھے بھی سزا ملے گی اور پھر اللہ کے سوا کوئی تیرا پرسان حال نہ ہوگا اور نہ ہی اللہ کی سزا سے تمہیں کوئی بچا سکے گا۔ یہ بڑی سخت تنبیہ ہے، یعنی جب اللہ کے نبی کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی خواہشات کے مطابق احکام میں تبدیلی لے آئے تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی اور ایسا کرے؟

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

"اور (یہ بات ایسے ہی ہے) کہ بتحقیق ہم نے تجھ سے پہلے کئی رسول بھیجے اور ہم نے انہیں بیویاں اور اولاد بھی دی تھی، اور کسی رسول کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ اللہ کے حکم کے سوا کوئی معجزہ لاتا، ہر زمانے کے مناسب احکام ہوتے ہیں"۔

معجزہ رسول کے اختیار میں نہیں

اس آیت میں پیغمبرؐ اکرم کو ایک حقیقت کی یاد دہانی کروائی گئی ہے کہ جھٹلانے والے افراد کبھی بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ وہ حقیقت سنت الٰہی ہے کہ پیغمبرؐ انسان کی اپنی جنس اور نوع سے ہوں اور وہ بھی اُنہی کی طرح زندگی گزاریں اور انہی کی طرح شادیاں کریں، انہی کی طرح بچے پیدا کریں اور باقی افراد کی طرح اُن کا کوئی اپنا اختیار نہ ہو۔ خدا اگر چاہے تو آیت اور معجزہ بھیج دیتا ہے نہ چاہے تو نہیں بھیجتا، اس کا آیت اور معجزہ بھیجنا مصلحت اور حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ ''لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَاب'' ''ہر مدت کے لئے ایک کتاب ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر زمانے کے لئے ایک مخصوص حکم ہے۔ جو مقدر اور حتمی ہے، اللہ نے اس کتاب میں طے کیا ہے۔ اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس کا اللہ نے ارادہ کیا ہے یا وقت معلوم میں اُس کا ارادہ کرے گا، سب کچھ اس کتاب میں لکھا گیا ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿٣٩﴾

''اللہ جو چاہے موقوف کر دیتا ہے اور باقی رکھتا ہے، اور جو چاہتا ہے اسے اسی کے پاس اصل کتاب ہے''۔

لوح محو و اثبات

''محو'' کسی چیز کے آثار کو ختم کرنے کو کہتے ہیں۔ ''اثبات'' کسی چیز کو اپنی جگہ پر قائم رکھنے کے معنی میں ہے کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے بلکہ محکم و مضبوط ہو۔ خدا سبحانہ و تعالیٰ اس کی ہمیشہ ایک کتاب ہے جو ثابت ہے اور ایک کتاب ہے جو محو ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہم کتاب کی تحریر کو عبارت جانیں تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مسلسل ایک آیت کو مٹاتا ہے اور اس کی جگہ دوسری آیت رکھتا ہے، یہ عمل جاری ہے۔ اس حوالے

سے (سورۂ بقرہ، آیت: ۱۰۶) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ...

ترجمہ: ''ہم کوئی بھی آیت نسخ نہیں کرتے ہیں مگر یہ کہ اسی جیسی آیت لاتے ہیں یا اس سے بھی بہتر آیت لاتے ہیں...''۔

پھر فرمایا اُم الکتاب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یعنی اصل کتاب جو ہر کتاب کی بنیاد ہے وہ اللہ کے پاس ہے۔ کتاب کی وضعیت اور اس کا محو و اثبات اور احکام کا تبدیل ہونے سے آدمی ذہن میں یہ شبہہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ کے ہاں عالم کے امور اور مسائل میں ثبات نہیں ہے اور اللہ کا احکام خارجی اسباب اور عوامل کے تابع ہیں، اللہ کے احکام بے ہودہ نہیں ہیں، ان کا تعین ذات اور خارج کے اعتبار سے نہیں ہوتا۔ اس وہم اور شبہے کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کتابوں کی بنیاد اور اصل خدا کے پاس ہے۔ اس آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا سبحانہ و تعالیٰ کا ہر زمانے میں مخصوص حکم ہوتا ہے، مخصوص کتاب ہوتی ہے، مخصوص فیصلہ ہوتا ہے اور اللہ جس حکم کو چاہے مٹائے اور جس کو چاہے باقی رکھے۔ لیکن ساتھ ہی ہمیشہ ایک قضاء لاتتغیر بھی ہے جس میں سب کچھ ثابت ہے۔ یہ سب کی اصل ہے اور باقی سارے مسائل اس کی فرع اور شاخیں ہیں۔ ان کا محو و اثبات بھی اُسی تغیر ناپذیر قضاء اور فیصلے کے تحت ہے۔ اس آیت سے تین نکتے استفادہ ہوتے ہیں:۔

پہلا نکتہ: محو و اثبات کا حکم عمومی ہے جو تمام حوادث اور موجودات کو شامل ہوتا ہے۔

دوسرا نکتہ: ہر چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی ایک قضاء اور قدر ثابت ہے، طے شدہ ہے جو قابل تغییر نہیں ہے۔

تیسرا نکتہ: قضاء دو طرح کی ہیں، ایک قابل تغییر ہے جسے لَوح محو و اثبات کہتے ہیں دوسری قابل تغیر نہیں ہے جسے اُم الکتاب یا لَوح محفوظ کہتے ہیں۔

وَ اِنۡ مَّا نُرِیَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَیۡكَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ ﴿۴۰﴾

"اور اگر ہم تجھے کوئی وعدہ دکھا دیں جو ہم نے ان سے کیا ہے یا تجھے اٹھا لیں، سو تیرے ذمہ تو پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمہ حساب لینا ہے"۔

رسول اللہؐ کی ذمہ داریاں

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ آخرت میں بندوں کا حساب لے گا اسی طرح دنیا میں بھی ان کا حساب لیتا ہے۔ پیغمبر کا کام انذار اور لوگوں کو ڈرانا اور ان تک اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ پیغمبر کو چاہیے کہ وہ کفار کے معجزہ طلب کرنے یا عذاب کے نزول کی باتوں پر توجہ نہ دیں کیونکہ ہر صورت میں عذاب اور خدا کی طرف سے گرفت حتمی ہے۔ لیکن یہ کب ہوگا؟ پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی میں یا آپ کی رحلت کے بعد؟ پیغمبر کا کام تبلیغ کرنا ہے، کفار کے جلد عذاب آنے یا معجزہ کے طلب کی پرواہ نہ کی جائے حتیٰ کہ پیغمبر اپنی تبلیغ کے اثرات کی جانب بھی توجہ نہ دیں۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا ؕ وَ اللّٰهُ یَحۡكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكۡمِهٖ ؕ وَ هُوَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۴۱﴾

"کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں، اور اللہ حکم کرتا ہے کوئی اس کے حکم کو ہٹا نہیں سکتا، اور وہ جلد حساب لینے والا ہے"۔

زمین کے کناروں کا گھٹنا

زمین کے اطراف اور اس کے کناروں کا کم ہونا اہل زمین کی ہلاکت سے کنایہ ہے۔

اس آیت کا مضمون، سورہ انبیاء کی آیت ۴۴ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: "ہم نے انہیں اور اُن کے آباء واجداد کو بہرہ مند کیا تاکہ اُن کی عمر طولانی ہوئی اور ابھی بھی نہیں دیکھتے کہ ہم زمین میں مصروف ہیں اور اس کے اطراف کو کم کر رہے ہیں کیا پھر بھی وہ سمجھتے ہیں کہ وہ غالب ہیں؟" پھر فرمایا کہ خدا حکم کرتا ہے اور اللہ کے حکم کے مقابلے میں کسی اور کے حکم کا نفوذ نہیں ہے اور کوئی اللہ کے حکم کے آگے رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکتا۔ ہر انجام پانے والے عمل کا حساب لیا جاتا ہے کوئی اُس کے حساب میں تصرف نہیں کر سکتا یا اس میں خلل ڈال نہیں سکتا۔ ہر صورت حساب لینا اللہ کا کام ہے اور یہ غلبہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے کوئی اللہ پر غالب نہیں آسکتا۔

وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَ سَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾

"اور ان سے پہلے لوگ بھی تدبیریں کر چکے ہیں سو اصل تدبیر تو اللہ ہی کی ہے، جو کچھ کوئی کرتا ہے اسے سب خبر رہتی ہے، اور ابھی کافروں کو معلوم ہو جائے گا کہ نیک انجام کس کا ہے"۔

کافروں کی سازشیں اور اللہ کا ان کو جواب

اگر آپ کو جھٹلانے والے آج آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ان سے پہلے بھی انبیاء کو جھٹلاتے رہے اور ان کے خلاف سازشیں کرتے رہے لیکن ان کی سازشوں اور منصوبہ بندی نے اُن کو کوئی فائدہ نہ دیا اور وہ امر خدا کے آگے رکاوٹ نہ بن سکے۔ وہ خداوند تبارک و تعالیٰ کو زمین کے اطراف کو کم کرنے اور اہل زمین کو ہلاک کرنے سے نہ روک سکے۔ خدا ہی منصوبہ بندی کا مالک ہے۔ کوئی اللہ کے منصوبے کے سامنے پلان

پیش نہیں کر سکتا اور نہ ہی سازش کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہر آدمی کے اعمال کو جانتا ہے اور جب تدبیر محقق ہو جائے تو جس نے سازش کی ہے وہ اپنی سازش کے منصوبے سے غافل ہو گا لیکن جس وقت وہ جانے کہ درمیان میں کیا معاملہ ہے تو اس کی مکاری باطل ہو جاتی ہے۔

آخر میں کافروں پر اتمام حجت کیا اور فرمایا ہے کہ تمام امور کا اپنے انجام اور عاقبت پر ختم ہونا بدیہی اور واضح امر ہے، اس سے تخلف ممکن نہیں ہے۔ بہت جلد کافر دیکھیں گے کہ نیک عمل کا انجام کیا ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے ہم لمبی بحث کریں اور اُس کے لئے کوئی دلیل دیں، یہ بڑی واضح سی بات ہے کہ جو جو کر رہا ہے اسی کا اثر اور نتیجہ اسے ملنا ہے۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿٤٣﴾

''اور کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے، کہہ دو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ کافی ہے اور وہ شخص جس کے پاس کتاب کا علم ہے''۔

رسول اللہؐ کی تکذیب کرنے والوں کو جواب

جب کافر قرآن کے علاوہ دوسرے کسی معجزے کے آنے سے مایوس ہوئے تو اُنہوں نے اصل رسالت کا انکار کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہنے لگے: تو رسول ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ ان کے جواب میں کہہ دو خداوند اور جس کے پاس کتاب کا علم ہے وہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی دینے کے لیے کافی ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ یہ جملہ خداوند تبارک و تعالیٰ کو گواہ بنانے کے مترادف ہے جو امر رسالت کا ولی ہے اور یہاں پر شہادت سے مراد گواہی دینا ہے نہ کہ گواہی کی ذمہ داری لینا ہے۔ یعنی خداوند تبارک و تعالیٰ

اس بات کو جانتا ہے۔ جیسا کہ سورہ یٰسین کی آیت 2 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "بتحقیق تو پیغمبروں میں سے ہے اور مستقیم راستے پر ہے"۔

بعض نے کہا کہ اس سے لوح محفوظ مراد ہے۔ اس صورت میں اس جملہ کا مصداق خود اللہ تعالیٰ ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ کتاب سے تورات اور انجیل مراد ہے، یعنی خدا اور یہود و نصاریٰ کے علماء گواہی دینے کے لئے کافی ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ کتاب سے قرآن مجید مراد ہے۔ ہر وہ جس کے پاس قرآن کا علم ہے وہ اس آیت میں مراد لیا گیا ہے۔ اس بنا پر اس سے وہ مراد ہے جو پیغمبرؐ پر ایمان لایا اور قرآن کریم کا علم اس کے پاس ہے۔

صحیح روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت شریفہ حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی۔ اصولی طور پر یہ عبارت اگر کسی شخصیت پر صادق آتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پیروکاروں میں سے ہیں تو ان سب سے اہم شخصیت حضرت علی علیہ السلام کی ہے۔

صحیح روایات کے مطابق تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ فضل والے، علم والے اور اللہ کی کتاب سے سب سے زیادہ آگاہ حضرت علی علیہ السلام تھے۔ اگر حدیث ثقلین کے علاوہ کوئی اور روایت نہ بھی ہو تو اہل سنت کی طرف سے اور اہل تشیع کی طرف سے یہ ایک حدیث اس مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اللہ کی کتاب اور میری عترت اہل البیتؑ، یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے کہ یہاں تک حوض کوثر پر میرے پاس آئیں گے اگر تم نے ان سے تمسک کیا تو ہر گز گمراہ نہیں ہو گے"۔

سورۃ ابراہیم
(مکی۔ کل آیات 52)

اس سورت کے مطالب

قرآن کا رسول اللہ ﷺ کے لئے معجزہ ہونے کا اثبات، دعوت اسلامی کو قبول کرنے کا وجوب اور وعدو وعید الٰہی کا تذکرہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ﴿۱﴾

"ال ر، یہ ایک کتاب ہے ہم نے اسے تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ تو لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے، ان کے رب کے حکم سے ایسے راستہ کی طرف جو غالب قابل تعریف ہے"۔

کتاب اُتارنے کا سبب

جیسا کہ بتایا گیا "الف، راء" حروف مقطعات اور قرآنی رموز ہیں البتہ بعض دفعہ یہ اللہ کے اسماء پر بھی دلالت کر رہے ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان کے ذریعے اللہ کی نعمات کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے اور بعض دفعہ یہ حروف کفار کو خاموش کرنے کے لئے ہوتے ہیں جب کفار قرآن کی تلاوت کے موقع پر شور کرتے اور کہتے تھے اس قرآن کو نہ سنو اور اس پر توجہ نہ دو تو حروف تہجی کے ساتھ قرآن کی سورہ کو شروع کرکے رکھیں اس کلام کی طرف ان کی توجہ دلانا ہے۔

"کتاب" سے قرآن مراد ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا خطاب خود رسول اللہ ﷺ کو ہے کہ اے محمد ﷺ! ہم نے لوگوں کو گمراہی، خرافات، اندھی تقلید، نفسانی خواہشات اور لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین کی تاریکیوں سے نکال کر حق کی نورانیت کی طرف لانے اور انہیں ہدایت کی روشنائی دینے کے لیے یہ قرآن تمہارے اوپر نازل کیا ہے۔ اس آیت میں ظلمات کو جمع اور نور کو مفرد لاکر اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نور اور ہدایت حق کے مصادیق میں سے ہیں اور حق ایک ہے اور اس کے مصادیق میں کوئی اختلاف نہیں ہے جبکہ ظلمت اور گمراہی نفسانی خواہشات سے وجود میں آتے ہیں اور ان کا آپس میں اختلاف ہے اور اس کے مصادیق بھی مختلف ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ہدایت کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب ہیں (حقیقی ہادی اللہ تعالیٰ ہے) کیونکہ لوگوں کا ایمان بلا واسطہ یا بالواسطہ آپؐ کی ذات گرامی پر جاکر منتہی ہوتا ہے۔

"بِإِذْنِ رَبِّهِمْ" اپنے رب کی اجازت سے؛ اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ حقیقی ہادی اللہ تعالیٰ ہے جو سارے انسانوں کا رب ہے، اگرچہ مشرکین نے اُس ذات

کے لئے شریک بنا لیا ہے۔ نور اور ہدایت کا راستہ وہی مقتدر اور حمید اور لائق تعریف اللہ کا راستہ ہے، ایسا عزیز جسے کوئی مغلوب نہیں کر سکتا، وہ ہر چیز پر مسلط ہے اور تمام موجودات پر اس کا غلبہ ہے، اسی وجہ سے عزت اُسی کی ذات میں منحصر ہے اور اگر غیر خدا کی کوئی عزت ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت ہے۔ اس بارے سورۂ فاطر، آیت : ۱۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا"

ترجمہ " بتحقیق عزت سب کی سب اللہ کے لئے ہے"۔

وہ ایسا حمید ہے جس کی مسلسل تعریف کی جاتی ہے اس کے ان اعمال کے کمال کی وجہ سے جو جمیل ہیں اور اختیار سے صادر ہوتے ہیں۔ساری تعریفیں اسی کے لئے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورۂ الحمد، آیت : ۲)

اللہ تعالیٰ ربوبیت اور عزت میں یگانہ ہے اور اس نے اپنے بندوں پر انعام کیا ہے۔اس کی ان صفات کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بندے اس کی عزت مطلقہ سے ڈریں اور اس کی نعمات کا شکر بجا لائیں۔ اگر وہ اس کی عزت مطلقہ سے ڈریں اور اس کی نعمات کا شکر بجالائیں تو وہ اُنہیں بہشت میں داخل کرے گا اور اگر وہ ان اعمال کو انجام نہ دیں تو اُن کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ لہٰذا انسانوں کو چاہیے کہ اپنے رب کا خوف رکھیں کیونکہ عزت اور غلبہ اُسی کی ذات کے لئے ہے اور کوئی چیز اس کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ وہ حمید ہے یعنی مومنوں کو جزاء اور کافروں کو عذاب دینے اور نعمات میں وسعت دینے پر اس کی مذمت نہیں کی جا سکتی۔ اس کی ہر وقت تعریف ہی ہونی ہے۔ لہٰذا قرآن ایسا نور ہے جو حق کو باطل سے، خیر کو شر سے اور سعادت کو شقاوت سے الگ کرتا ہے اور دوسرے مرحلے میں قرآن ایسا واضح راستہ ہے جو اس پر چلنے والوں کو محفوظ رکھتا ہے اور اُنہیں ادھر اُدھر کے انحراف سے بچاتا ہے اور انہیں خدائے عزیز و حمید کی طرف

لے جاتا ہے اور جس راستہ کی طرف اللہ نے اذن سے رسول اللہ ﷺ کو دعوت دے رہے ہیں وہ راستہ بھی عزیز و حمید ہے اسی راستہ کیلئے غلبہ ہے اور وہی راستہ ہی قابل عزت و قابل تعریف ہے۔

اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ وَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ ۙ﴿۲﴾

"اللہ وہ جس کے لیے وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور کافروں پر افسوس کہ انہیں سخت عذاب ہونا ہے"۔

آسمان اور زمین اللہ کی ملکیت

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ملک ہے، اللہ عزیز اور غالب ہے، جیسے چاہے جس میں چاہے جو چاہے تصرف کرسکتا ہے، اس کا تصرف کرنا پسندیدہ اور محمود ہے کیونکہ تصرف اس وقت ناپسندیدہ ہوتا ہے جب تصرف کرنے والا اس کا مالک نہ ہو اور عقل، شرع یا عرف اس کو تصرف کی اجازت نہ دے جبکہ خداوند تبارک و تعالیٰ ایسا تصرف کرنے والا ہے جو پوری کائنات کا حقیقی مالک ہے اور وہ ایسا حمید ہے جس کے سارے افعال پسندیدہ اور محمود ہیں۔اس کی عزت کا تقاضا ہے کہ جو بھی اس کی دعوت کو ٹھکرائے اور اس کی نعمت کا کفران کرے اسے عذاب دے اور اس پر قہر ٹوٹے اور وائے و پھٹکار ہے کافروں کے لئے کہ سخت ترین اور شدید ترین عذاب ان کے واسطے ہے۔

الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۳﴾

"جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں پسند کرتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں، وہ دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔

کافروں کے اوصاف

اس آیت میں کافروں کے اوصاف بیان ہوئے ہیں کہ وہ دُنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور ان کا ہدف دُنیا ہی ہوتی ہے، وہ اسی کو اپنا مقصد نہایی بناتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ آخرت کی بالکل نفی کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر آخرت ثابت ہو جائے تو پھر اُس کا غرض نہائی ہونا بھی ثابت ہو جائے گا اور اگر اس کا غرض نہائی ہونا منتفی ہو جائے تو آخرت کا عقیدہ بھی منتفی ہو جائے گا۔ انسان کی زندگی کا ہدف سوائے سعادت تک پہنچنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس کی حیات باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہے اور بدن کی موت سے حیات ختم نہیں ہوتی بلکہ موت، رُوح کا بدن سے جدا ہونا ہے، ابدی اور باقی رہنے والی حیات آخرت میں ہے۔انسان کی آخروی سعادت اور شقاوت کا دارو مدار اس کی دُنیوی سعادت اور شقاوت اور ان اعمال پر ہے جنہیں وہ دنیا میں انجام دیتا ہے۔ دنیا میں انسان کے اعمال یا حسنہ اور نیک ہیں جنہیں اللہ کی کتاب میں دین اور سبیل کا نام دیا گیا ہے۔ یا نیک نہیں ہیں اور ان قوانین کے مطابق ہیں جنہیں انسانی معاشروں نے از خود وضع کئے ہیں اور اللہ نے اُن کی تائید کے لیے کوئی ثبوت نہیں بھیجا۔ وہ لوگ جو دُنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور آخرت سے منہ موڑ لیتے ہیں، معاد کا انکار کرتے ہیں؛ وہ اس انکار اور اعراض کے نتیجے میں توحید اور نبوت کا بھی انکار کرتے ہیں۔

کافروں کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں

یعنی جہاں وہ خود دین دار نہیں ہیں اور دین الٰہی کو قبول نہیں کرتے وہی دوسروں کو بھی دین الٰہی قبول کرنے اور اللہ اور روز جزاء پر ایمان لانے اور دین خدا پر چلنے سے روکتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے راستے کو ٹیڑھا اور منحرف بتاتے ہیں، ان کا انسانی معاشروں کے از خود وضع کئے ہوئے احکام اور قوانین پر عمل پیرا ہونا، دین فطری کے راستے سے منحرف ہونے کے مترادف ہے اور یہی بڑی گمراہی ہے کیونکہ انہوں نے دین حق اور حقیقی ہدایت کے راستے کو گما دیا ہے۔

وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِہٖ لِیُبَیِّنَ لَہُمۡ ؕ فَیُضِلُّ اللّٰہُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۴﴾

"اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ انہیں سمجھا سکے، پھر اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور وہ غالب حکمت والا ہے"۔

ہر قوم کیلئے اسی قوم کا اہل زبان نبی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے جب بھی کوئی پیغمبر بھیجا تو اسی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ اپنی قوم سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کرے، اور انہی کی زبان میں الٰہی قوانین اور احکام بیان کر سکے اور ہدایت کو گمراہی سے اور حق کو باطل سے الگ کرے اور ان کے لئے توضیح دے۔ اللہ تعالیٰ ہر انکار کرنے اور خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے والے کو سزا دیتا ہے اور اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو خود بخود اور بغیر دلیل کے گمراہ نہیں کرتا، گمراہی کے اسباب انسان خود ہی فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ حق کی پیروی کرنے والے کو ہدایت دیتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ

کے سارے کام بے حساب اور بیہودہ نہیں ہیں، بلکہ اس کے سارے کام حکمت کی بنیاد پر ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا مقتدر اور عزیز ہے جسے گمراہوں کی گمراہی کوئی نقصان نہیں دے سکتی اور وہ ایسا حکیم ہے جس کا کوئی عمل بے ہودہ اور بے مقصد نہیں ہے بلکہ اس کا ہر کام حکمت اور ایک مضبوط نظام کے تحت ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵

''اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال اور انہیں اللہ کے دن یاد دلا، بے شک اس میں ہر ایک صبر شکر کرنے والے کے لیے بڑی نشانیاں ہیں''۔

موسیٰؑ کا معجزات کیساتھ مبعوث ہونا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان عزت الٰہی اور غلبہ الٰہی کے ظہور کے واضح ترین مصادیق میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرما رہا ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو معجزات دے کر بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ اپنی قوم کو گمراہی کی ظلمتوں اور تاریکیوں سے نکال کر نور ہدایت کی طرف لے آئیں، انبیاء کی رسالت کا ہدف یہی امر ہے اور یہ کہ اُنہیں ایام اللہ کا تذکر دیں۔[1] ایام اللہ سے وہ دن مراد ہیں

[1]۔کتاب خصال میں امام صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی شیخ صدوق کی روایت کے مطابق ایام اللہ سے تین دن مراد ہیں: ۔

۱۔ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کا دن۔

۲۔ آئمہ طاہرین علیہم السلام کی رجعت اور واپسی کا دن جس میں وہ واپس آکر اسی زمین پر حکومت کریں گے۔

۳۔ قیامت کا دن۔

جن میں اللہ تعالیٰ کا امر ظاہر ہوتا ہے اور سارے دُنیاوی اسباب کا اثر ختم ہو جاتا ہے جیسے موت کا دن، قیامت کا دن یا وہ ایام جن میں عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے یا وہ ایام جن میں اللہ کی نعمات ظہور کرتی ہیں۔ حضرت امام مہدی عج کے ظہور اور آئمہ اہل البیتؑ کی رجعت کا دن، اللہ تعالیٰ کی نعمات کے ظہور کا دن ہو گا، اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھی مومنین کی کشتی کا سلامتی کے ساتھ خشکی پر اُتر جانا، ابراہیم علیہ السلام کا آتش نمرود سے نجات پانا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑھیوں سے آب زم زم کا نکل آنا بھی بڑے دن تھے۔ ایسے دن ہیں جن کی غیر خدا سے کوئی نسبت نہیں، بلکہ یہ دن حق تعالیٰ سے منسوب ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ ان ایام میں صابر اور شاکر لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ صبور اس شخص کو کہتے ہیں جو نامناسب حالات میں بہت زیادہ صبر کرنے والا اور برداشت کرنے والا ہو۔ شکور ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اللہ کی نعمات کے مقابلے میں بہت زیادہ شکر بجا لانے والا ہو۔ اللہ کی نعمات کو اس طرح استعمال کرے جیسے ان نعمات کو استعمال ہونا چاہیے۔

وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهِ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ اَنۡجٰىكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَ يَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ؕ وَ فِيۡ ذٰلِكُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ۚ﴿۶﴾

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تمہیں فرعون کی قوم سے چھڑایا وہ تمہیں برا عذاب چکھاتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے، اور

اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی"۔

موسیٰؑ کا اپنی قوم سے خطاب

اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنے رسول سے فرمارہا ہے کہ اے ہمارے رسول ! اس دن کو یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے کہا: اے بنی اسرائیل ! اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو جب اس نے تمہیں فرعونیوں اور قبطیوں سے نجات دی جو تمہیں سخت عذاب دیتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو اپنی خدمت اور شہوت رانی کے لئے زندہ رکھتے تھے۔ یہ واقعات اور حادثات تمہارے لئے اللہ کی طرف سے امتحان تھے تاکہ ظالم کے ظلم کے خلاف قیام کرنے والے، ظلم کے سامنے تسلیم ہونے والوں سے متمایز ہو جائیں۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝

"اور جب تمہارے رب نے سنا دیا تھا کہ البتہ اگر تم شکر گزاری کرو گے تو اور زیادہ دُوں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بھی سخت ہے"۔

شکر نعمت اور کفران نعمت

یہ آیہ شریفہ مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرم ﷺ سے فرمارہا ہے کہ اُس وقت کو یاد کرو جب تیرے رب نے یہ اعلان فرمایا کہ شکر نعمت، نعمت کے بڑھنے کا وسیلہ ہے اور کفران نعمت، سخت عذاب اُترنے کا ذریعہ ہے۔ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت کو اُس جہت اور سمت میں استعمال کیا جائے جس کا منعم نے اُس نعمت سے ارادہ کیا ہے اور یہ امر منعم کے احسان کے ظہور کا سبب ہو گا۔ شکر نعمت کی بازگشت

ایمان اور تقویٰ کی جانب ہے، ہر مومن اور متقی فرد حق تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر گذار ہو گا اور شکر نعمت، نعمت میں اضافے کا سبب بنے گا۔ کفران نعمت باطنی کفر کے لوازمات میں سے ہے، کفران نعمت کرنے والے عذاب الٰہی کے منتظر رہیں۔ اس آیت میں خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنی کریمانہ روش کے تحت انعام دینے اور اُس کو مزید بڑھانے کے حوالے سے بہت واضح بیان دیا ہے اور تاکید کے ساتھ وعدہ دیا ہے، جبکہ کفران نعمت کرنے والوں کو عذاب دینے کو صراحت کے ساتھ بیان نہیں فرمایا بلکہ کنایہ اور اشارہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اور وعید آخرت کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ دُنیا کو بھی شامل ہے۔

وَ قَالَ مُوْسٰی اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۸﴾

"اور موسیٰ نے کہا اگر تم اور جو لوگ زمین میں ہیں سارے کفر کروگے تو اللہ بے پروا تعریف کیا ہوا ہے"۔

حضرت موسیٰؑ کی گفتگو

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو مثال کے طور پر لایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ خداوند کا ہر چیز سے بے نیاز ہونا ذاتی ہے، اسے بندوں کے شکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی بندوں کے شکر کا اسے کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی بندوں کے کفر کی وجہ سے اسے کوئی نقصان ہوتا ہے۔ بلکہ شکر کا فائدہ اور کفر کا نقصان خود انسانوں کو ہوتا ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ تمام مخلوقات سے بے نیاز ہے، وہ حمید ہے کیونکہ حمد یہ ہے کہ حمد کرنے والا منعم کے فعل میں خوبصورتی دیکھ کر

اس کے فعل کی تعریف کرے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور اس کا جمال واضح اور آشکار ہے جسے کوئی بھی چیز چھپا نہیں سکتی۔ لہٰذا وہ ہر حال میں حمید ہے اس کی تعریف کی جاتی ہے، چاہے کوئی حمد کرنے والا زبان سے اس کی حمد اور تعریف کرے یا نہ کرے۔ ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں چاہے حمد کرنے والے اپنے حمد سے اس کا ارادہ کریں یا اس کے غیر کا ارادہ کرے۔ جیسا کہ درج ذیل آیات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: سورہ حمد آیت ۲ ''الحمد للہ رب العالمین'' ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور سورۂ اسراء آیت ۴۴ ''وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ'' ہر چیز اللہ کی تسبیح اور حمد بجالاتی ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۬ۛ وَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فِيْۤ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۹﴾

''کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے تھے نوح کی قوم اور عاد اور ثمود، اور جو ان کے بعد ہوئے، اللہ کے سوا جنہیں کوئی نہیں جانتا، ان کے پاس ان کے رسول نشانیاں لے کر آئے پھر انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے موںہوں میں لوٹائے (انہوں نے انبیاء کے ہاتھوں کو ان کے چہروں پر پلٹا دیا) اور کہا ہم نہیں مانتے جو تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے اور جس دین کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ہمیں تو اس میں بڑا شک ہے''۔

پیغمبروں کو جھٹلانے پر گذشتہ اقوام کی ہلاکت

یہ آیت بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا تسلسل ہے جس میں آپ نے اپنی قوم کو گذشتہ اقوام کی ہلاکت کے بارے میں بتایا اور کہا: اے بنی اسرائیل ! کیا تمہیں گذشتہ اقوام کی ہلاکت کی خبر نہیں ؟اس کے بعد مثال کے طور پر حضرت نوحؑ، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی اقوام کو ذکر کیا، جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اُن کے بارے میں معلوم نہ ہونے کا مطلب ان کے حالات کی حقیقت اور اُن کی تاریخ کی جزئیات کا علم نہ ہونا ہے۔ لیکن اللہ کے نبیوں کو جھٹلانے کی وجہ سے ان پر آنے والے عذاب کی خبریں بنی اسرائیل کے پاس پہنچی ہوئی تھیں۔

اس کے بعد اجمالی طور پر بتایا گیا ہے کہ جو پیغمبر ان کے پاس آئے تھے وہ واضح دلائل کے ساتھ آئے تھے اور ان کے پاس حق کا ثبوت موجود تھا اور ان دلائل میں کوئی ابہام بھی نہیں تھا لیکن لوگ ان کے انکاری ہوئے اور کلمۂ حق کو قبول نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اپنے زمانے کے رسول کی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے اور انبیاء کو حق بات کہنے نہ دیا اور وہ انبیاء کا ہاتھ پکڑ کر ان کے منہ پر رکھ دیتے تھے تاکہ وہ بول نہ سکیں! وہ اس طرح ہٹ دھرمی کرتے تھے ہوئے انبیاء الٰہی سے کہتے تھے کہ ہم تو تمہاری رسالت اور شریعت کو نہیں مانتے اور تمہارے لائے ہوئے معجزات اور دلائل کو ہم قبول نہیں کرتے اور جس چیز کی تم دعوت دے رہے ہو کہ توحید اور ربوبیت ؛ اس کے بارے میں بھی ہمیں شک و تردید ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو گذشتہ اقوام کی کیفیت اس لئے بتائی تھی کہ بنی اسرائیل آپ کی دعوت کو قبول کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو رسول پاک ﷺ کے لئے بیان کرکے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ کفار قریش بھی انہی کی

طرح انکاری ہیں، لہٰذا جس طرح گذشتہ اقوام کے اوپر جو عذاب آئے تھے انہیں بھی اُن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان میں سے بعض اقوام کے آثار ان کے سامنے ہیں جیسے حضرت لوطؑ کی بستی کی ویرانی کے آثار مکہ سے شام کے راستے میں موجود تھے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَدْعُوْكُمْ لِیَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۰﴾

"ان کے رسولوں نے کہا کیا تمہیں اللہ (کی ذات) میں شک ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے، وہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہارے کچھ گناہ بخشے اور تمہیں ایک مقررہ وقت تک مہلت دے، انہوں نے کہا تم بھی تو ہمارے جیسے انسان ہو، تم چاہتے ہو کہ ہمیں ان چیزوں سے روک دو جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے رہے سو کوئی کھلا ہوا معجزہ لاؤ"۔

پیغمبروں کو جھٹلانے کا رویہ

اس آیہ شریفہ میں توحید اور ربوبیت کی دلیل پیش کی گئی ہے۔ گذشتہ اقوام کے پاس آنے والے پیغمبر، رسالت اور توحید ربوبی کا انکار کرنے والوں سے کہتے تھے کہ کیا تمہیں آسمانوں اور زمین کو ایجاد کرنے والے اللہ کے بارے میں شک ہے؟ "فاطر" کا معنی کھولنے والا۔ خداوند سبحانہ و تعالیٰ کو اس لئے فاطر کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے موجودات کو عدم کے سیاہ سمندر سے نکالا ہے۔ کیونکہ موجودات میں سے کوئی بھی

موجود بذاتہ قائم نہیں ہے، بلکہ سارے موجودات ممکن الوجود ہیں اور اُنہیں تغیر و تبدل اور نابودی کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔اس لیے ان میں سے ہر ایک بذاتہ اپنے خالق کی وحدانیت پر دلالت کرتا ہے اور اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ ان کے خالق کی کوئی حد نہیں ہے اور وہ مطلق اور ایسا واحد ہے جس میں کوئی کثرت نہیں ہے۔ جس طرح اس نے تمام مخلوقات کو ایجاد کیا ہے، ان کی تدبیر بھی کرتا ہے اور اس امر میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

اس بنا پر پہلی عبارت ربوبیت میں توحید کی دلیل اور برھان ہے۔ دوسرے مرحلے میں نبوت پر برھان قائم کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ سنت الٰہی رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اُس کے مطلوبہ کمال کی ہدایت عطا کرتا ہے اور یہ امر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک لوگوں کی ہدایت کے لیے رسول نہ بھیجے جائیں جو اُنہیں ایمان اور عمل صالح کی دعوت دیں۔ انبیاء کی دعوت کا مقصد مخلوق کو ابدی سعادت تک پہنچانا ہے۔ انبیاء کی دعوت کی دنیاوی غایت یہ ہے کہ لوگ ایک معین مدت تک زندگی گزاریں لیکن اُن کا دائمی گھر اور اصلی مقصود آخرت ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ انہیں سزا دینے اور ہلاک کرنے میں جلدی نہیں کرتا اور انہیں مدت معین تک زندگی گزارنے کی مہلت دیتا ہے تاکہ ایمان اور عمل صالح اور انبیاء کی دعوت قبول کرکے اللہ کی مغفرت اور دارِ آخرت اور ابدی سعادت حاصل کرسکیں۔

لیکن ان رسولوں کی قوم اُن پر ایمان لانے کی بجائے کہتے تھے تم تو ہماری طرح کے انسان ہو، ہم اپنے آباء واجداد کے آئین اور روش سے ہاتھ اٹھانے والے نہیں ہیں، اگر تم سچ کہتے ہو تو اپنی نبوت پر کوئی قطعی دلیل لے کر آؤ، کوئی ثبوت پیش کرو۔ ان کے کلام کا معنی یہ تھا کہ اگر ہم فرض بھی کرلیں کہ عنایت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنی مغفرت اور رحمت کی جانب دعوت دے تو یہ امر فقط نبوت

عامہ (عمومی نبوت) کو ثابت کرتا ہے، اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ نبی ہونا چاہیے لیکن کہاں سے معلوم کہ وہ نبی تم ہو؟ کیونکہ تم بھی تو ایک عام انسان ہو، اگر نبوت کے دعوے میں سچے ہو تو کوئی غیر معمولی نشانی اور کوئی قطعی معجزہ لے آؤ اور اپنی نبوت خاصہ (خصوصی نبوت) کو ثابت کرو۔ وہ اپنی قومی اور خاندانی روایات اور دُنیاوی مفادات کی خاطر الٰہی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے، ان کے لئے ان چیزوں کو چھوڑنا بہت مشکل تھا لہٰذا وہ انبیاء کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

"ان سے ان کے رسولوں نے کہا ضرور ہم بھی تمہارے جیسے ہی آدمی ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے، اور ہمارا کام نہیں کہ ہم اللہ کی اجازت کے سوا تمہیں کوئی معجزہ لا کر دکھائیں، اور ایمان والوں کا بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہیے"۔

پیغمبروں کا اپنی قوم کو جواب

انبیاء الٰہی اپنی قوم کے کفار کے جواب میں کہتے: انسان ہونے کے ناطے ہم بھی تمہاری طرح ہیں لیکن سارے انسان ظاہری اور معنوی صفات کمالیہ میں ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ افراد کی قابلیت کی بنیاد پر اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس پر احسان کرتا ہے اور اس پر اپنی وحی بھیج دیتا ہے۔ البتہ کسی پیغمبر کے پاس غیبی طاقت مطلقہ نہیں ہے کہ جب چاہے معجزہ اور برھان لے آئے بلکہ معجزہ کا تعلق اللہ کے اذن

سے ہے۔ یہاں تک کافروں کو پیغمبروں کا جواب تھا۔آیت کے آخر میں مومنوں کے لئے ایک اور دلیل دی ہے اور وہ یہ ہے کہ مومنوں کا اللہ پر ایمان رکھنااس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ معجزہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ معجزہ بھیجنا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ساری طاقت خدا کی طرف منسوب ہے، اللہ کے اذن کے بغیر کسی کے پاس کوئی قدرت نہیں ہے۔ لہٰذا مومنین تمام امور میں اللہ تعالیٰ کو اپنا وکیل بنائیں اور یہ ذہن میں رکھیں کہ معجزہ کی نسبت فقط خدا تعالیٰ کی طرف ہے، کسی اور کی طرف نہیں ہے۔

وَ مَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

"اور ہم کیوں اللہ پر بھروسہ نہ کریں حالانکہ اسی نے ہمیں (سیدھے) راستوں کی راہ نمائی کی ہے، اور ہم ضرور صبر کریں گے اس ایذا پر جو تم ہمیں دیتے ہو، اور توکل کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے"۔

مومنین کا بیان

اس آیت میں استفہام انکاری کے ذریعے مومنین کی زبانی کہا گیا ہے کہ ہم کیوں نہ اللہ پر توکل کریں؟ جبکہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے انبیاء الٰہی کی شریعتوں کے ذریعے ہمیں ہدایت فرمائی ہے اور اس عظیم نعمت اور بڑی سعادت میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ ہی نے یہ ساری اچھائیاں ہمیں عطا فرمائی ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ہم اپنے تمام امور میں اللہ پر توکل کریں۔ یہ خدا پر توکل کرنے کی ضرورت کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل پچھلی آیت میں آئی ہے، وہ دلیل لمی ہے جس میں موثر

کے وجود کو اس کے اثر کے توسط سے ثابت کیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری دلیل "اِنی" ہے جس میں کسی چیز کے وجود سے اُس کے لازمہ کو ثابت کیا جاتا ہے۔

پھر اُمت کی جانب سے پہنچنے والی تکالیف کو اللہ پر توکل کی فرع کہتے ہوئے بیان فرمایا ہے کہ اب جب کہ اللہ پر توکل کرنا اور اس پر ایمان رکھنا ہم پر لازم ہے اور اس نے ہمیں ہدایت کے راستوں کی راہنمائی دی ہے تو ہمارے لئے یہی زیادہ مناسب ہے کہ ہم الٰہی دعوت کے راستے میں تمہاری طرف سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر کریں تاکہ خود اللہ جو چاہے فیصلہ دے۔ اصولی طور پر جو بھی اللہ پر توکل کرتا ہے اسے ایسا ہی ہونا چاہیے، اسے نامناسب حالات میں متزلزل، سست اور ضعیف نہیں ہونا چاہی۔ اس لحاظ سے مومن اور غیر مومن میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ اصولی طور پر اللہ کے سوا کوئی راہنما اور فریادرس نہیں ہے۔ چونکہ مومن اس بات پر عقیدہ رکھتا ہے کہ سارے امور اللہ کے ہاتھ میں ہے تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ الٰہی احکام کی پابندی کرے اور یہ وہی بات ہے جسے ہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن غیر مومن حقیقی معنوں میں اللہ پر توکل کرنے والا نہیں بن سکتا۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾

"اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے یا ہمارے دین میں لوٹ آؤ، تب انہیں ان کے رب نے حکم بھیجا کہ ہم ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے"۔

رسولوں کے بارے کافروں کا بیان

جب کفار، انبیاء کے واضح دلائل کا جواب نہ دے سکے تو اُنھوں نے پیغمبروں سے کہا کہ ہم تمھیں اور تمہارے پیروکاروں کو اس سرزمین سے باہر نکال دیں گے یا تم ہمارے دین اور آئین میں آجاؤ۔ اس آیت میں ''عود'' سے مراد واپسی نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء پہلے کافر تھے اور اس کے بعد وہ ایمان لائے اور اب دوبارہ اس حالت کی جانب پلٹ رہے ہوں، بلکہ ''عود'' یہاں پر ''صار'' ہو جانا کے معنی میں ہے، یعنی تم کافر ہو جاؤ اور ہمارے آئین اور دین کو ماننے والے بن جاؤ۔ لہٰذا جاہلیت کا معاشرہ کبھی بھی مسلمانوں کے ساتھ نرمی اور سستی والا رویہ نہیں برتتا اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کا رویہ اچھا نہیں ہوتا تھا مگر اس وقت جب مسلمان اُن کے جاہلانہ حساب وکتاب کے مطابق ان کے فائدے کا کام کریں۔ ہر غیر مسلم معاشرہ جاہلی معاشرہ ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے پیغمبروں کو وحی فرما دی کہ ہم ستمگاروں کو ضرور ہلاک کر دیں گے۔ یہاں پر کفار کے بجائے ظالمین کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے تاکہ ان کی ہلاکت کے سبب کی جانب اشارہ کیا جائے جو کہ ظلم ہے، وہ اللہ کا شریک بنا کر سب سے بڑے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں اور یہی اُن پر عذاب آنے کا سبب ہے۔

وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَ خَافَ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾

''اور ان کے بعد اس زمین میں تمھیں آباد کر دیں گے، یہ اس کے لیے ہے جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور جس نے میرے عذاب سے خوف کھایا''۔

اللہ کا پیغمبروں سے خطاب

اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے کہا کہ تم اور تمہارے پیروکار پریشان نہ ہوں، جب ہم ان ستمگاروں کو ہلاک کر دیں گے تو اُن کی زمینیں تمہارے حوالے کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی اس عنایت کی وجہ تمہارے اندر دو صفات کا ہونا ہے: ایک مقام پروردگار کا خوف ہونا اور دوسری صفت اللہ کے عذاب کے وعدہ سے ڈرنا۔ خدا کے مقام سے ڈرنا اس حوالے سے ہے کہ سارے بندوں کے امور اُسی کے ساتھ وابستہ ہیں اور اللہ کے وعید سے ڈرنا اس حوالے سے ہے کہ اللہ کی طرف سے مخالفت کرنے والوں کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے کہ انسان ڈرتا ہے کہ مجھ سے بھی مخالفت نہ ہو جائے اور میرے اوپر بھی اللہ کا عذاب نہ آجائے۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿١٥﴾

"اور انہوں نے فیصلہ چاہا اور ہر ایک سرکش ضدی نامراد ہوا"۔

پیغمبروں کی دُعا

جب انبیاء الٰہی ہر طرف سے نااُمید ہو گئے اور ظالموں کا ظلم اور اُن کا جھٹلانے کا عمل انتہا کو پہنچا تو انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور اللہ سے فتح و کامیابی کی درخواست کر دی۔ شاید مومنوں کے ساتھ کفار بھی اللہ سے فتح اور کامرانی چاہ رہے تھے تاکہ انبیاء اور مومنوں کے ساتھ اُن کی وضعیت واضح ہو جائے جیسا کہ دوسری آیات میں کافروں کا قول ہے "متیٰ ھذا الوعد" یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟ لیکن آخرکار ہٹ دھرم کفار کو نااُمیدی، دُنیاوی عذاب اور ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا اور مومنین کو اللہ کے اذن سے نجات ملی۔

مِّنۡ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَ يُسۡقٰى مِنۡ مَّآءٍ صَدِيۡدٍ ۙ﴿۱۶﴾

''اور اس کے پیچھے دوزخ ہے اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا''۔

دُنیاوی عذاب کے بعد دوزخ کا عذاب

کفار کے لیے دُنیا میں تو ہلاکت ہے ہی اور جب دُنیا میں اُن کا صفایا ہو جائے گا تو آخرت کا عذاب دُنیا کے عذاب سے بہت سخت ہے اور کافروں کو اس عذاب کا انتظار کرنا چاہیے اور یہ جہنم کی بھڑکتی آگ اور اس کے شعلے ہیں جن کے ذریعے ان کو عذاب دیا جائے گا اور جب ان کو پیاس لگے گی تو انہیں گند، پیپ اور خون سے بھرے جام پلائے جائیں گے۔

يَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا يَكَادُ يُسِيۡغُهٗ وَ يَاۡتِيۡهِ الۡمَوۡتُ مِنۡ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ‌ ؕ وَمِنۡ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيۡظٌ ﴿۱۷﴾

''جسے گھونٹ گھونٹ پیے گا اور اسے گلے سے نہ اتار سکے گا اور اس پر ہر طرف سے موت آئے گی اور وہ نہیں مرے گا، اور اس کے پیچھے سخت عذاب ہوگا''۔

عذاب کی کیفیت

اس آیت کا معنی واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ وہ گند، پیپ اور خون ملا پانی گھونٹ گھونٹ کرکے پئیں گے اور مشکل سے نگلیں گے۔ وہ خوشی اور اپنی مرضی سے اسے نہیں پئیں گے بلکہ انہیں اسے پینے پر مجبور کیا جائے اور اسے پینے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں ہو گا۔ ان پر عذاب اس قدر شدید اور سخت ہو گا کہ انہیں موت

کی حد تک لے جائے گا لیکن وہاں موت ہے ہی نہیں۔ جب ایک عذاب سے رہائی پائے گا تو دوسرا عذاب اُس کے لئے آمادہ ہوگا۔ ایک عذاب کے بعد دوسرا عذاب اور دوسرے کے بعد اگلا عذاب اس کے انتظار میں ہوگا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾

"ان کی مثال جنہوں نے اپنے رب سے انکار کیا، ایسی ہے کہ ان کے اعمال گویا راکھ ہیں جسے آندھی کے دن ہوا اڑا کر لے گئی ہو، جو کچھ انہوں نے کمایا تھا اس میں کچھ بھی ان کے ہاتھ میں نہ رہا ہو، یہ بھی بڑی دور کی گمراہی ہے"۔

کافروں کے اعمال کا نتیجہ

کافروں کے اعمال کا نتیجہ اس خاکستر جیسا ہے جس کا تند و تیز طوفانی ہواؤں کے چلنے کے دن کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ جس طرح تیز ہواوں کے چلنے کے موقع پر خاکستر کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا سب کچھ ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔ اسی طرح کفار کے اعمال بھی باطل ہیں اور ان کا کوئی اثر باقی نہیں رہے گا اور اُن کے اعمال کا انہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا اور یہی بڑی گمراہی ہے۔ اس بارے (سورۂ فرقان، آیت ۲۳) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾

ترجمہ: " اور جو کچھ انہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو

ان کو اڑتی ہوئی خاک کی طرح پراگندہ کر دیں گے"۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ وَ یَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿ۙ۱۹﴾

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر بنایا، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے"۔

اللہ کی قدرت

اس آیت میں رؤیت سے قطعی اور یقینی علم مراد ہے۔ آیت کا ظاہری مخاطب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں لیکن اس کا مقصد لوگوں کو خدا شناسی کا مسئلہ یاد دلانا ہے۔ عمل حق وہ کام ہوتا ہے جس کو انجام دینے والا کا جو نتیجہ مد نظر ہوتا ہے یہ فعل خود بخود اس نتیجے کی طرف جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سارے موجودات پیدائش کے آغاز ہی سے ایک غایت اور غرض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس تک پہنچنے کے سوا ان کا کوئی اور ہدف نہیں ہوتا ہے، نیز ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اُن میں سے بعض، دوسرے بعض کی غرض ہوتے ہیں جیسا کہ گھاس، نباتات اور کھیت زمینی عناصر سے بہرہ مند ہوتے ہیں، حیوانات ان نباتات اور گھاس اور بوٹیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں جبکہ حیوانات سے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بنابراایں ہمیشہ عالم کی خلقت ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلے اور ایک ہدف سے دوسرے ہدف کی جانب رواں دواں ہے۔ دوسرا ہدف پہلے سے برتر اور اعلیٰ تر ہوتا ہے اور پھر ایسے ہدف تک پہنچتا ہے جس کے اوپر کوئی اور ہدف نہیں ہوتا اور وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف بازگشت ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا فعل اور عالم کی خلقت اس لحاظ

سے حق ہے کہ اُس کے ماوراء اور اس فعل کے زوال کے بعد اس کا اثر اور نشان باقی رہتا ہے جو اس کا ہدف ہے۔ اگر اس کے علاوہ ہوتا تو خلقت عالم باطل ہوتی۔

اس بارے سورۂ دخان، آیت :۳۸ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝۳۸

ترجمہ "اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو بے ہودہ (کھیل تماشا کیلئے) خلق نہیں کیا"۔

اس کے بعد تمام انسانوں یا خصوصی طور پر اُمت پیغمبرؐ کو مخاطب قرار دیتے ہوئے فرمایا: اب جبکہ ہم نے پورے عالم کو خاص مقصد اور غرض کی خاطر خلق کیا ہے اور آسمانوں اور زمین کی ملکیت ہماری ہے تو ہم جب بھی ارادہ کریں تمہیں نابود کرکے تمہاری جگہ ایک اور مخلوق کو خلق کر سکتے ہیں، اگر تم نے خلقت کے ہدف کو پورا نہیں کیا اور الٰہی راستے پر چلنے سے انحراف کیا تو یقیناً ہم اس بات پر قادر ہیں کہ تمہیں ختم کردیں اور تمہاری جگہ دوسری مخلوق کو ایجاد کریں جو ہمارے راستے پر حرکت کرے اور خلقت کے ہدف کو پورا کرے۔

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ۝۲۰

"اور یہ اللہ پر کچھ مشکل نہیں ہے"۔

اللہ کا امر

کیونکہ خداوند تبارک و تعالیٰ غنی بالذات ہے اس لیے کبھی بھی اس کی ذات مخلوقات کے واسطے سے تکمیل نہیں ہوتی (اس کے برعکس انسان جو بھی چیز بناتا ہے اس کا محتاج ہوتا ہے) اللہ تبارک و تعالیٰ نے مخلوقات کو خلق کیا ہے تو وہ اپنی مخلوق کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو خاص مقصد اور غرض کے لیے خلق کیا ہے اور ان کی خلقت کا مقصد اور غرض خود ان مخلوقات کی سعادت اور ہدایت ہے۔ پورے

عالم کی خلقت لہو و لعب اور کھیل تماشہ کے لئے نہیں ہے۔ وگرنہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ تمہیں ختم کرے اور تمہاری جگہ نئی مخلوق لے آئے۔[1]

وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْؕ سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ۠ ﴿۲۱﴾

”اور یہ سب اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے تب کمزور متکبروں سے کہیں گے کہ ہم تو تمہارے تابع تھے سو ہمیں اللہ کے عذاب سے کچھ بچاؤ گے، وہ کہیں گے اگر ہمیں اللہ ہدایت کرتا تو ہم تمہیں ہدایت کرتے، اب ہمارے لیے برابر ہے کہ ہم چیخیں چلائیں یا صبر کریں ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں“۔

مستکبرین اور مستضعفین کی گفتگو

قیامت کا دن ہو گا، ساری مخلوقات اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوں گی، قسم قسم کی مخلوقات ہوں گی، اللہ اور ان مخلوقات کے درمیان کوئی حجاب نہ ہو گا،

---

[1] ۔ **من نکردم خلق تا سودی کنم بلکہ تا بر بندگان جودی کنم**
”میں نے مخلوق کو فائدہ اٹھانے کے لیے خلق نہیں کیا ہے، بلکہ اس لئے خلق کیا ہے تا کہ اپنے بندوں پر سخاوت کروں“۔

البتہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اور مخلوقات کے درمیان کوئی حجاب نہ تھا، لوگ خیال کرتے تھے کہ خدا ان سے غائب ہے۔ ممکن ہے کہ یہ جملہ اس بات سے کنایہ ہو کہ اس دن بندے اعمال کے حساب کے لیے خالص کیئے جائیں گے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُس دن مستضعفین، مستکبروں سے کہیں گے کہ ہم تو دُنیا میں عقیدے اور عمل میں تمہاری اطاعت کرتے تھے، ہمارا تو کوئی استقلال ہی نہیں تھا، دنیا میں تم ہمارے ولی اور سرپرست تھے اور تمہاری عزت اور قدرت تھی تو کیا آج تم ہماری کوئی مدد کر سکتے ہو؟ تم دنیا میں اللہ پر ایمان نہیں لائے اور اللہ کی آیات کا تکبر کرتے تھے اور اُن سے ناک بھوں چڑھاتے تھے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے دُور کرتے تھے، آج کچھ عذاب الٰہی ہم سے دُور کر سکتے ہو؟

مستضعفین نے دنیا میں بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے مستکبرین کی اطاعت کی تھی اور خود کو عقیدہ اور ایمان کی آزادی سے نیچے گرایا ہوا تھا۔ مستکبرین کا یہ چھوٹا سا گروہ ان مستضعفین کی خواہش اور مدد کے بغیر کبھی بھی اس بات پر قادر نہ تھا کہ وہ سب ان کے پیروکار ہو جائیں، لہٰذا مستضعفین خود خشوع و انکساری کے ساتھ ان کے سامنے جھکے رہے اور انہوں نے ہی مستکبرین کو طاقت عطا کی، حالانکہ عزت، طاقت، قدرت اور اقتدار فقط اللہ، اللہ کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔ کسی بندے کے لیے یہ شایستہ نہیں ہے کہ وہ خود کو دوسرے بندے کے سامنے ذلیل و خوار کرے اور اس کا غلام بن جائے۔ اگر مستکبرین کسی فرد کے جسم کے مالک ہو بھی جائیں تو وہ اس کی روح اور عقل کے مالک نہیں ہو سکتے سوائے اس کے کہ وہ خود کو ان کے حوالے کر دیں۔ لہٰذا مستضعفین کا یہ بہانہ قابل قبول نہیں ہو گا بلکہ خود یہ عمل جرم ہے جس کی انہیں سزا ملے گی۔ بہرحال مستکبرین، مستضعفین کو جواب دیں گے کہ اگر ہم جانتے کہ کس طرح عذاب سے رہائی ملتی ہے تو ہم تمہیں بھی نجات دیتے اور خود بھی

نجات پاتے یا اگر دُنیا میں خدا نے ہمیں ہدایت دی ہوتی تو ہم بھی تمہیں دین حق کی ہدایت دیتے۔ اب جبکہ ہم سب عذاب الٰہی میں مبتلا ہوئے ہیں تو شور مچانا اور صبر کرنا دونوں ہمارے لیے برابر ہے اور اس سے فرار بھی ممکن نہیں ہے۔[1]

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

"اور جب فیصلہ ہو چکے گا تو شیطان کہے گا بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا پھر میں نے وعدہ خلافی کی، اور میرا تم پر اس کے سوا کوئی زور نہ تھا کہ میں نے تمہیں بلایا پھر تم نے میری بات کو مان لیا، پھر مجھے الزام نہ دو اور اپنے آپ کو الزام دو، نہ میں تمہارا فریاد رس ہوں اور نہ تم میرے فریاد رس ہو، میں خود تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں کہ تم اس سے پہلے مجھے شریک بناتے تھے، بے شک

---

[1] ۔ جس طرح وہ دُنیا میں انبیاء الٰہی سے کہا کرتے تھے ہمیں حق کی دعوت دو یا نہ دو کوئی فرق نہیں کرتا، ہم کسی بھی صورت میں تم پر ایمان نہیں لائیں گے، آخرت میں خود سے کہیں گے کہ اب ہم صبر کریں یا نہ کریں اور شور مچائیں کوئی فرق نہیں پڑے گا، اب تو ہمیں اس عذاب کو بھگتنا ہی پڑے گا۔ (مترجم)

ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے”۔

شیطان کا بیان

شیطان، شریر کے معنی میں ہے۔اس آیت میں شیطان سے ابلیس مراد ہے جو ساری نسل انسانی کی گمراہی کا سبب ہے۔ قیامت کے دن جب امر الٰہی اور الٰہی فیصلہ جاری ہو جائے گا اور ہر تابع اپنے متبوع سے بیزاری کااظہار کرے گااور مجرمین اپنے جرم اور گناہ کا اعتراف کریں گے اور کفر کے پیشوا اُن کی بات کو قبول نہیں کریں گےتو اس وقت ابلیس ظالموں سے کہے گا کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے تم بنی آدم کو وعدہ دیا تھا کہ مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے اور جزا اور سزا دیے جاؤ گے، آج وہ وعدہ پورا ہوا اور تم اپنی آنکھوں سے اس وعدے کی حقانیت کو دیکھ رہے ہو۔ میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ جھوٹا تھا، میں نے تم سے کہا تھا کہ کوئی حساب و کتاب نہیں ہے، مرنے کے بعد آخرت نہیں ہے، لیکن میرا وعدہ جھوٹا تھا، آج اُس وعدے کا جھوٹا ہونا آشکار ہو چکا ہے۔ میں نے دنیامیں ایمان اور شرک کے متعلق جو وعدے تمہیں دیے تھے وہ سب کے سب باطل تھے۔ لیکن میرا تمہارے اوپر غلبہ اور تسلط نہیں تھا، میں تمہیں زبردستی معصیت پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی میرے پاس شرک پر کوئی دلیل تھی۔ اب حجت تمہارے خلاف مکمل ہوئی۔ میں تو صرف تمہیں گناہوں کی دعوت دیتا تھا اور تمہارے لیے گناہ کی آرائش اور نمائش کرتا تھا، میں تمہیں گناہ کے ارتکاب پر مجبور کرنے پر قادر نہیں تھا بلکہ خود تم تھے جو میری بات کو قبول کرتے تھے اور معصیت کے مرتکب ہوتے تھے۔ پس تم اب میری سرزنش نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو سرزنش کرو کیونکہ میرا تمہارے اوپر کوئی تسلط نہیں تھا تم خود اپنے اعمال اور معصیتوں پر مسلط تھے۔آج میں تمہاری فریاد کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی تمہارا سفارشی

ہو سکتا اور نہ تم میری شفاعت کر سکتے ہو اور نہ مجھے نجات دے سکتے ہو، تم دُنیا میں مختلف امور میں میری دخالت کے قائل تھے اور مجھے امر الٰہی میں شریک قرار دیتے تھے، اب میں اس سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے تم ستمگر اور ظالم تھے اور تمہارا ظلم خود تمہاری جانب سے تھا لٰہذا دردناک عذاب بھی تمہارے لئے ہے۔

وَ اُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

"اور جو لوگ ایمان لائے تھے اور نیک کام کیے تھے وہ باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے، آپس میں دعائے خیر ان کی سلام ہو گی"۔

مومنین کی حالت

اس آیت میں مومنین کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ وہ ایسے باغات میں ہوں گے جن کی کیفیت بڑی دل کو بھانے والی ہو گی، درخت ہوں گےاور درختوں کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی وہ بڑے بڑے تکیوں پر براجمان ہوں گے، میوہ جات درختوں پر لٹک رہے ہوں گے۔ بہشتی ایک دوسرے کو سلام اور تحیت کر رہے ہوں گے اور کوئی غلط بات نہیں ہو رہی ہو گی، خوش و خرم ہوں گے یہ اہل بہشت کی سعادت ہے۔ ان کے برعکس جہنمی کفار ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہوں گے ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کر رہے ہوں گے جبکہ مومنین ایک دوسرے پر سلام بھیج رہے ہوں گے۔

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُهَا فِى السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ پاک کی ایک مثال بیان کی ہے گویا وہ ایک پاکیزہ درخت ہے کہ جس کی جڑ مضبوط اور اس کی شاخ آسمان میں ہے "۔

کلمہ طیبہ

آیت کے مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں۔ مفسرین نے کلمہ کے معنی میں اختلاف کیا ہے، بعض نے کلمہ سے توحید کی گواہی مراد لیا ہے، بعض کے نزدیک اس سے قرآن مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر اچھی بات مراد ہے اور کچھ نے کہا ہے کہ یہ تمام اطاعتوں کو شامل ہے۔ اسی طرح مفسرین نے شجرہ طیبہ کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے کہ اس سے کھجور کا درخت مراد ہے یا اخروٹ کا درخت یا انجیر یا انار یا ہر وہ درخت جس کا میوہ مفید ہے۔

بہر حال کلمہ سے صرف لفظ مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد عقائد حقہ اور وہ پختہ عزم وارادہ مراد ہے جس پر وہ کلمہ مشتمل ہوتا ہے۔ یہ عقائد انسان کی زندگی کا قوام اور اس کی بنیاد ہیں، اس کا کوئی بھی عمل ان عقائد سے منحرف نہ ہو۔ اس کلمہ کے متعلق بعد والی چند آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ مومن کو دُنیا و آخرت میں اس کلمہ پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں کلمہ سے، کلمہ توحید، کلمہ شہادت و وحدانیت رب تعالیٰ مراد ہے۔ یہ عقیدہ اور اس پر استقامت وہ حق بات ہے جس کی اصل اور بنیاد ثابت ہے اور ہر تغیر اور زوال اور بطلان سے محفوظ ہے اور وہ اصل

خداوند متعال ہے۔ یا ایسے حقایق کے زینے اور مقدمات ہیں جن کی شاخیں بغیر کسی مانع، حائل اور رکاوٹ کے اس جڑ سے اوپر نکلتی جا رہی ہیں اور آسمانوں کو چھو رہی ہوتی ہیں۔ یہ شاخیں معارف حقہ، پسندیدہ اخلاق اور اعمال صالح ہیں جن کے ذریعے مومن اپنی حیات طیبہ گزار رہا ہوتا ہے۔ یہ عقائد و اعمال عالم کے وجودی نظام کی رفتار کے ساتھ مکمل طور پر موافق ہیں۔

تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

"وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل لاتا ہے اور اللہ لوگوں کے واسطے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ سمجھیں"۔

اللہ تعالیٰ کی مثالیں

"اُكُلَ" سے میوہ اور مفید و نفع بخش نتیجہ مراد ہے۔ "حِيْنٍ" وقت کے ایک حصہ کو کہتے ہیں، بعض کے نزدیک اس سے دو مہینے، بعض کے نزدیک چھ ماہ، اور بعض نے ایک سال یا ایک صبح و شام مراد لیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے تمام اوقات مراد ہیں۔ "بِاِذْنِ رَبِّهَا" اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ہر خیر کے نزول کا سبب اللہ تعالیٰ کا اذن ہے، اللہ کے اذن کے بغیر اس کی تاثیر نہیں ہوتی۔ یہ آیت بھی سابقہ آیت کا تسلسل ہے اور جو کچھ وہاں پر کہا گیا یہاں بھی وہی جاری ہے۔ لہٰذا کلمہ توحید اس درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں ثابت ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور اُن کی جڑیں عقائد حقہ اور اعمال صالح ہیں جو پورے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے مفید نتائج اللہ تبارک و تعالیٰ کے اذن سے ہر وقت جاری و ساری ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ یہ مثالیں اس لیے دیتا ہے تاکہ لوگوں کے لیے یاد دہانی ہو جائے کہ سعادت تک پہنچنے کے لیے کلمہ توحید کا اقرار کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔

وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

"اور ناپاک کلمہ کی مثال ایک ناپاک درخت کی سی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے اسے کچھ ٹھہراؤ نہیں ہے"۔

کلمہ خبیثہ

وہ تمام اختلافات جو کلمہ طیبہ اور شجرہ طیبہ کی تفسیر کے متعلق تھے، کلمہ خبیثہ کے بارے میں بھی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے وہاں پر کہا کہ کلمہ طیبہ، توحید، پسندیدہ اخلاق اور اعمال صالح ہیں، یہاں پر کلمہ خبیثہ سے شرک مراد ہے جسے ایسے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے جو جڑ سے اکھڑا ہوا ہے جس کے نتیجے میں اسے ثبات اور قرار نہیں ہے۔ کیونکہ خبیث و پلید ہے اس لیے اس کا سوائے شر اور ضرر کے کوئی اور اثر اور نتیجہ نہیں ہے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙۛ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

"اللہ ایمان والوں کو دنیا اور آخرت کی زندگی میں سچی بات پر ثابت قدم رکھتا ہے، اور ظالموں کو گمراہ کرتا ہے، اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔

دنیا و آخرت میں مومنین کا ثبات و قرار

یہ آیت دنیا و آخرت میں اہل ایمان کے ثبات و قرار کو بیان کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ جو ایمان پر پکے ہیں اور استقامت دکھاتے ہیں تو خداوند بھی انہیں دنیا و آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔ لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ نہ ہو تو وہ خود اپنے آپ کو ثابت قدم نہیں رکھ سکتے، کیونکہ سارے امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں خواہ ہدایت ہو یا ضلالت اور گمراہی۔[1] البتہ یہ بات ہے کہ ہدایت کا دروازہ بندے کے لیے شروع میں اللہ کی جانب سے کھلتا ہے اور اللہ تعالیٰ بندے کے ہاتھ کو پکڑتا ہے اور شرک کی تاریکی سے توحید کے نور کی طرف لے آتا ہے۔ جس کے نتیجے میں بندہ ہدایت پاتا ہے۔ لیکن گمراہی اور ضلالت کی ابتداء خود بندے کی طرف سے ہے اور خداوند تبارک و تعالیٰ بندے کے ظلم اور برے اعمال کے نتیجے میں اسے گمراہ کر دیتا ہے اور اس کی گمراہی کو بڑھاتا ہے۔

جس کے متعلق (سورۂ صف، آیت: ۵) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا زَاغُوٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ

ترجمہ: "جب انہوں نے منہ موڑ لیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کو (حق سے) موڑ دیا"۔

اس مطلب کی وضاحت اس طرح ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے انسان کو توحید کی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ نیک و بد اور اچھے برے کی تمیز اس کی فطرت میں ودیعت کر دی ہے اور پھر انبیاء کی دعوت کے ذریعے اس فطرت کی تائید کی ہے اور

1۔ "کل الامور طرّا بیدہ والکل مستمدۃ من مددہ" (مصحح)

ہدایت کے سارے لوازمات انسان کے لئے مہیا کئے ہیں، انسان اگر اپنی فطرت کے مطابق آگے بڑھے تو خداوند تبارک و تعالیٰ اسے ہدایت دیتا ہے اور اسے مطلوب کمال تک پہنچاتا ہے۔ لیکن اگر انسان اس روش سے منحرف ہو جائے اور دُنیا سے دل لگا لے اور دُنیا کی رنگینیوں میں گم ہو جائے تو خداوند تبارک و تعالیٰ سزا کے طور پر اس سے نیکی اور ہدایت کی توفیق چھین لیتا ہے اور اس سے اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور اس کے لئے حتمی گمراہی قرار دیتا ہے۔

اللہ جو چاہے کرتا ہے۔ اس کی مشیت جس امر سے تعلق پکڑتی ہے اسے انجام دیتا ہے۔ کوئی بھی اس کی مشیت کے سامنے مانع اور رکاوٹ نہیں بن سکتا اور نہ ہی کوئی اس کے فیصلے کو ٹال سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہرگز بے ہودہ اور بغیر حساب کتاب کے نہیں ہوتی بلکہ اس کی مشیت حکمت کے تحت ہوتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾

”کیا تو نے انہیں نہیں دیکھا کہ جنھوں نے اللہ کی نعمت کے بدلے میں ناشکری کی اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتارا“۔

اللہ کی نعمت کو بدلنے والوں کا انجام

اس آیت اور بعد والی چند آیات میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب قرار دے کر فرما رہا ہے: کیا تم نے کفر اور ضلالت کے پیشواوں کی حالت نہیں دیکھی ہے؟ جنھوں نے ظلم کیا، نعمت کا کفران کیا ہے۔ اُنہیں الٰہی نعمات نے ہر طرف سے گھیرا

ہوا تھا لیکن اُنہوں نے شکرگذاری نہیں کی، درگاہ پروردگار میں ایمان نہیں لائے، نعمت کا کفران کیا اور خود اور اپنی قوم کو ہلاکت میں لے گئے، شقاوت اور بد بختی اور آتش جہنم میں وارد ہوئے، کیونکہ اُن کی قوم بھی اُنہی کی پیروکار تھی۔ جس طرح قرآن کریم میں فرعون کے بارے میں آیا ہے:

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾ (سورہ ھود، آیت :۹۸)

ترجمہ: ''وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہو گا اور انہیں آتش جہنم میں جا ڈالے گا۔''

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾

'''جو دوزخ ہے اس میں داخل ہوں گے، اور وہ برا ٹھکانا ہے''۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿٣٠﴾

''اور لوگوں نے اللہ کی راہ سے بہکانے کے لیے شریک بنا رکھے ہیں، کہہ دو نفع اٹھا لو پھر تمہیں آگ کی طرف لوٹنا ہے''۔

مشرکین کیلیے واضح اعلان

''دَارَ الْبَوَارِ' سے ہلاکت کا گھر جہنم مراد ہے جو بہت بری جگہ ہے جہاں پر شقاوت اور بد بختی کی آگ کفار اور ظالموں کو جلائے گی۔ مشرکین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ فرشتوں، جنوں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا کر عالم کے امور کی تدبیر اُن کی طرف نسبت دیتے ہیں اور اُن کے ضرر اور نقصان سے بچنے اور ان کے نفع سے بہرور

ہونے کے لیے اُن کی عبادت کرتے تھے۔ اس طرح وہ لوگوں کو بھی اللہ کی راہ اور فطرت کے راستے سے منحرف کرتے اور اُن کی بندگی کی طرف کھینچ کر لے جاتے تھے۔ وہ جان بوجھ کر اُن اعمال کے مرتکب ہوئے تھے تاکہ لوگوں پر مسلط ہوں اور اُن کے اموال ہتھیالیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے پیغمبر سے فرمارہاہے کہ اُن سے کہہ دو کہ تم دُنیاوی زندگی سے فائدہ اٹھالو کہ یہ نہایت مختصر مدت کے لیے ہے اور برے اعمال میں لگے رہو لیکن سرانجام تمہاری بازگشت آتش جہنم ہے ، جہاں پر اللہ کے سواء کوئی مرجع اور پناہ گاہ نہیں ہوگا ۔ اس کلام کے ذریعے شرک سے ان کے فاسد مقصد اور غرض کی جانب اشارہ کیاگیاہے جو کہ دُنیاوی نعمات اور مادی فوائد کا حصول تھا۔ درحقیقت اُن سے کہاگیا ہے کہ تم دنیا میں مادی فوائد اٹھالو لیکن بالآخر تمہارا انجام آتش جہنم ہے اور وہ سب سے برا ٹھکانہ ہے جو تمہاری نصیب میں ہوگا۔

قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

''میرے بندوں کو کہہ دو جو ایمان لائے ہیں کہ نماز قائم رکھیں اور ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کریں اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہے نہ دوستی'' ۔

ایمان والوں کیلئے پیغام

پچھلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا کہ جو کافر اللہ کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اس کی وجہ سے قیامت کا دن ان کے لئے سخت عذاب ہوگا۔ اب اسی

رسول اللہ ﷺ کے وسیلے سے اہل ایمان کو خبر دی گئی ہے کہ وہ خدا کو نہ چھوڑیں اور اسی کے راستے پر قائم رہیں قبل اس کے کہ قیامت کا دن آ پہنچے جس دن خیر و سعادت حاصل کرنے کی فرصت نہ ہو گی اور نہ ہی وہاں پر کوئی عمل دوسرے عمل کا بدلہ بن سکے گااور نہ ہی کسی کی محبت اور دوستی کے ذریعے ہاتھ سے گئی ہوئی چیزوں کی تلافی کی جاسکے گی یا کسی دوست سے شفاعت مانگ سکیں گے کیونکہ وہ دن فقط حساب اور جزاء کا دن ہوگا۔اس دن سارے اسباب اللہ تعالیٰ کے اذن سے بے کار ہو جائیں گے اور اپنا اثر چھوڑ بیٹھیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں راہ خدا میں پابند رہنے کے لئے فرمایا ہے کہ نماز قائم کرو یعنی اللہ سے اپنا رابطہ مضبوط رکھو، انفاق کرو اور اس طرح اپنے اوپر معاشرے کا حق ادا کرو۔ ان کا انفاق کرنا جہاں مخفی اور پوشیدہ بہتر ہو (جیسے جس فرد پر انفاق کیا جارہا ہے اس کی عزت کا معاملہ ہو تو) وہاں پر پنہانی ہوتا ہے اور جہاں پر آشکار اور ظاہری طور پر انفاق کرنا بہتر ہو (مثلاً دوسروں کو تشویق کرنی ہے یا اپنے اوپر لگنے والی کسی تہمت کو دور کرنا ہو تو) وہاں پر وہ آشکارا انفاق کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ﴿۳۲﴾

”اللہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی نازل کیا پھر اس سے تمہارے کھانے کو پھل نکالے، اور کشتیاں تمہارے تابع کر دیں تاکہ دریا میں اس کے حکم سے چلتی رہیں، اور نہریں تمہارے تابع کر دیں

"۔

انسان کے لیے مخلوقات الٰہی کی آفرینش

اس آیت اور بعد والی دو آیات میں توحید ربوبی پر استدلال کیا گیا ہے۔ اجمالی طور پر سارے موجودات کا ایک نظام خلقت کے تحت ہونا، ان کی عمومی تدبیر جیسے آسمان سے بارش بھیجنا، زمین سے روزی کا اخراج، سمندروں اور دریاؤں کی تسخیر اور دریاؤں اور سمندروں پر کشتیوں کا چلنا یہ سب ان کے رب کے ایک اور واحد ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ پس ان سب موجودات کا رب ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ لہٰذا ان سب موجودات کی ربوبیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے نہ ان شرکاء کے لیے جنہیں مشرکین نے اللہ کا شریک بنایا ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے خلقت کا یہ دقیق نظام بنایا ہے، آسمان سے بارش اُتارتا ہے تاکہ زمین سے نباتات اُگیں اور اس سے انسانوں اور حیوانات کے لئے پاکیزہ روزی فراہم ہو، سمندر پر کشتیاں چلیں اور اجسام پانی پر تیریں؛ (یعنی دریا اور سمندر پر تیرنے کے قانون اور کشتی بنانے کے لوازمات کو اللہ تعالیٰ نے انسان کو الہام کیا ہے) تاکہ اللہ کے اذن سے انسان اس راستے میں اور اس وسیلہ سے اپنے مقاصد کے لیے فائدہ اٹھا سکے اور اللہ تعالیٰ نے ندیوں، نہروں اور نالوں کو جاری کیا ہے تاکہ پینے، دھونے، نہانے، زمینوں کی آبیاری اور حیوانات کو سیراب کرنے کے کام آسکیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر دلیل ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ﴿۳۳﴾

"اور سورج اور چاند کو تمہارے تابع کر دیا جو ہمیشہ چلنے والے ہیں اور تمہارے لیے رات اور دن کو تابع کیا"۔

شب و روز توحید ربوبی کی دلیل

یہ آیت بھی پچھلی آیت کا تسلسل ہے اور اس میں بھی خلقت کے نظام کے چند دیگر موارد کے ذریعے توحید ربوبی پر استدلال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے سورج اور چاند کو جو ہمیشہ حرکت میں ہیں ایک مضبوط اور مستحکم نظام کے تحت انسان کی خدمت میں قرار دیا ہے۔اسی اللہ نے ان کی حرکت سے شب و روز پیدا کر کے انہیں بھی انسان کے لیے مسخر کیا ہے۔ کیونکہ سورج اور چاند کی حرکت زمین کی سطح میں اعتدال کا باعث ہے، اسی طرح یہ عبادات کے اوقات وضع کرنے کا ذریعہ ہے۔ سورج کا نور سطح زمین پر تمام موجودات کی حیات کا وسیلہ ہے اور چاند کا وجود دنوں کے گننے اور مہینوں کے حساب کرنے، شب و روز کے وجود میں آنے اور انسان کی زندگی کے نظام کی تنظیم کے لئے ہے تاکہ اس کے ذریعے دن روزگار کا وسیلہ بنے اور رات، سکون اور آرام کا ذریعہ بنے۔ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سارے مستحکم نظامات، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے وجود میں آئے ہیں اور اللہ ہی ہے جس نے ان تمام نظامات کو انسان کی زندگی کی خدمت میں قرار دیا ہے۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

”اور جو چیز تم نے اس سے مانگی اس نے تمہیں دی، اور اگر اللہ کی نعمتیں شمار کرنے لگو تو انہیں شمار نہ کر سکو گے، بے شک انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے“۔

اللہ کی ان گنت نعمتیں

اللہ تبارک و تعالیٰ ہر موجود کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ کوئی بھی موجود اپنی ذات اور اپنی بقاء میں مستقل نہیں ہے۔ جو کچھ اس میں ہے وہ اللہ کا جود و کرم ہے اور اللہ اس کی ظاہری اور باطنی ضروریات اور حاجات سے آگاہ ہے۔ ہر سائل اپنی ساری حاجات اللہ سے چاہتا ہے اور خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی حکمت کے تقاضے کے تحت اُن کی حاجات کو پوری کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ تمام موجودات کی ذاتی دُعا اور فطری سوال کا جواب دیتا ہے اور اُن کی ساری حاجات یا ان میں سے کچھ کو پوری کرتا ہے۔ اگر انسان اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہیں تو وہ کبھی بھی انہیں گن نہیں سکتے۔ کیونکہ عالم وجود اپنے تمام حالات، اوصاف اور اجزاء کے ساتھ جو کہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں؛ سب اللہ کی نعمتیں ہیں۔[1] لیکن انسان کی طبیعت اور مزاج ایسا ہے کہ وہ نعمات الٰہی کا کفران کرتا ہے اور وہ ناشکرا ہے اور اس طرح وہ اپنے لئے ہلاکت اور نقصان کے اسباب فراہم کر بیٹھتا ہے اور اپنے اعمال سے اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔

---

[1] ۔ بقول سعدی :

از دست وزبان کہ برآید　　کز عہدۂ شکرش بہ در آید

ترجمہ: ''ہاتھ اور زبان سے اس کا شکر بجا لانا چاہیے۔ کیونکہ صرف انسان کے سانس کی مثال دی جائے تو اس میں دو نعمتیں ہیں اس لیے کہ جو سانس اندر جاتا ہے وہ زندگی کا مددگار ہے اور جو باہر آتا ہے وہ ذات کے لئے فرح بخش ہے، بنابرایں ہر سانس میں دو نعمتیں ہیں، اور ہر نعمت کے لئے شکر واجب ہے'' ۔

وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِیۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجۡنُبۡنِیۡ وَ بَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ﴿۳۵﴾

''اور جس وقت ابراہیم نے کہا اے میرے رب !اس شہر کو امن والا کر دے اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا''۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا ذکر ہوئی ہے جس میں آپ نے شہر مکہ کے لئے دعا کی ہے۔ آپؑ کی خواہش تھی کہ مکہ کا احترام روز بروز بڑھتا رہے۔ شہر مکہ کو امن عطا کرنے سے آپ کی مراد تشریعی لحاظ کی اس کو امن فراہم کرنا تھا، نہ کہ تکوینی اعتبار سے۔ مقصود یہ تھا کہ قانونی طور پر یہ شہر امن کا گہوارہ بنے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی دعا قبول کی اور مکہ کو حرم امن الٰہی قرار دیا۔ پھر آپؑ نے اللہ سے درخواست کی کہ آپؑ اور آپؑ کی اولاد کو بتوں کی پرستش سے دُور رکھے، اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت اور رحمت واسعہ سے اُنہیں بتوں کی عبادت سے دُور رکھے۔

البتہ ہدایت الٰہی فقط ان لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے جن میں ہدایت قبول کرنے کی قابلیت موجود ہو۔ سرکش، معاند اور ہٹ دھرم لوگ اللہ کی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔حضرت ابراہیم کی دعا اسحاقؑ اور اسماعیلؑ اور ان کی ساری اولاد کے لیے ہے ۔مگر یہ کہ قرینے سے سمجھا جائے کہ آپؑ کی دعا صرف اسماعیلؑ کی اولاد کو شامل ہے جو مکہ میں رہائش پذیر تھے اور آپ کی دعا اسحاقؑ کی اولاد کو شامل نہیں تھی۔

'' اصنام'' سے فقط بت مراد نہیں ہیں بلکہ یہ سارے طاغوتوں، مستکبرین، ہٹ دھرموں، جابروں کا عنوان ہے جو بتوں کے نام پر لوگوں کو اپنی بندگی اور عبادت کے

لیے آمادہ کرتے ہیں ان بتوں کے پیچھے چھپے حکمران، کاہن اور ان کے خدمت گار بھی اصنام ہیں۔ اگر پتھر اور لکڑی کا بنا ہوا بت نابود بھی ہو جائے تو وہ افراد جنہوں نے اپنے آپ کو ان بتوں کے پیچھے خود کو چھپایا ہے وہ باقی رہتے ہیں اور ہر زمانے اور ہر جگہ ایک خاص شکل میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٦﴾

"اے میرے رب !انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے، پس جس نے میری پیروی کی وہ تو میرا ہے، اور جس نے نافرمانی کی پس تحقیق تو بخشنے والا مہربان ہے"۔

بتوں سے دُوری اختیار کرنے کا سبب

حضرت ابراہیمؑ نے اس آیت میں اپنی دعا کی وجہ بیان کی ہے اور اللہ کی رحمت کو جلب کرنے کے لئے رب کے لفظ کا تکرار کیا ہے اور کہا ہے اے میرے رب ! اگر میں نے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے بتوں کی عبادت سے دُور رہنے کی دعا کی ہے تو اس وجہ سے ہے کہ ان بتوں نے بہت سارے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔آپؑ نے گمراہی کی نسبت بتوں کو دی ہے جبکہ بتوں میں شعور ہی نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی گمراہی اور بتوں کے آپس میں تعلق ہے، اگرچہ یہ تعلق اور ارتباط شعوری نہیں ہے۔

اس کے بعد اپنی دعا کے نتیجے میں فرمایا اے میرے پروردگار! جو شخص اپنے سلوک، عمل اور عقیدہ میں میری پیروی کرے تو وہ مجھ سے ہے، میری مانگی گئی دُعا

اس کو بھی شامل ہے اور تو اپنی رحمت سے اُنہیں بھی بتوں کی پرستش سے بچا لے۔ ''اتباع ابراہیمؑ'' کا مطلب، ابراہیمی طریقے پر قائم رہنا ہے اللہ کی وحدانیت پر عقیدہ رکھنا تاکہ اس طرح انسان اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کے سایے میں قرار دے اور بتوں کی عبادت سے دُور ہو جائے۔

پھر فرمایا جس نے میری نافرمانی کی خواہ بعض امور میں ہو یا میری پوری طریقت اور روش میں وہ میری اولاد سے ہوں یا غیر اولاد سے ہوں، اُن کو مجھ سے ملحق نہ کر، میری دعا ان کے لئے نہیں ہے۔ میں اُنہیں تیری رحمت ومغفرت کے حوالے کرتا ہوں۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے اس دعا میں فرزندان سے اپنے پیروکار مراد لئے ہیں اور اپنے حقیقی فرزندان کو پیروان کے ساتھ خاص کیا ہے اور اپنی نافرمانی کرنے والوں کو اپنی فرزندی سے نکالا ہے جیسا کہ (سورۂ آل عمران، آیت: ۶۸) میں ہے:

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

ترجمہ: ''یقینی طور پر ابراہیمؑ کے قریب ترین لوگ وہ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں، اور یہ نبی اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے''۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝۳۷

''اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد ایسے میدان میں بسائی ہے جہاں کھیتی نہیں تیرے عزت والے گھر کے پاس، اے رب ہمارے! تاکہ وہ نماز

کو قائم رکھیں پھر کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں میوؤں کی روزی دے تاکہ وہ شکر کریں۔"

اپنی اولاد کے لیے ابراہیمؑ کی دعا

یہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا بقیہ حصہ ہے جس میں آپؑ نے اپنی ذریت یعنی اسماعیلؑ اور ان کی اولاد کے لیے دعا مانگی ہے۔آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی اے میرے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو تیرے حرم امن کے قریب ایسی سرزمین میں سکونت دی ہے جو کھیتی کے قابل نہیں ہے۔ میرے پروردگار ان کو یہاں ٹھہرانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ یہاں نماز قائم کریں، خدایا! لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے کہ وہ یہاں آکر ٹھہریں، حج انجام دیں اور کاروبار کریں، تجارت کریں ، سامان لے جائیں اور ان کو میوہ جات سے بہرہ مند کر، پاکیزہ روزی عطا کر کہ تجارت کے لیے مکہ آئیں تاکہ اہل مکہ اس تجارت سے فائدہ اٹھائیں، کیونکہ مکہ ایسی سرزمین ہے جہاں کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی، پانی بھی نہیں ہے، گھاس بھی نہیں ہے یہ سرزمین خشک ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس خشک سر زمین کو اپنی اولاد کے لئے اس لیے انتخاب کیا تاکہ وہ اللہ کی خالص عبادت کریں اور اُن کے دل دُنیاوی امور میں مشغول نہ ہوں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے شکر گذار ہوں۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِىۡ وَمَا نُعۡلِنُ ؕ وَمَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

"اے رب ہمارے ! بے شک تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اور اللہ پر کوئی چیز زمین اور آسمان میں پوشیدہ نہیں"۔

اللہ آشکار و پنہان سے آگاہ ہے

اس آیت کا معنی واضح ہے۔ یہ آیت حضرت ابراہیمؑ کی مناجات کا بقیہ حصہ ہے جس میں آپ خدا کے مطلق اور وسیع علم کی ستائش کرتے ہوئے کہتے ہیں اے میرے پروردگار! تو ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے، آسمان و زمین میں کوئی چیز تجھ سے مخفی نہیں ہے۔ شاید زمین سے وہ امور مراد ہیں جو انسان کے لیے محسوس ہیں اور آسمان سے وہ امور مراد ہیں جو انسان کی حس سے غائب ہیں جو محسوسات میں نہیں آتے۔ ان سب کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے ہم تیرے محتاج ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

"اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اتنی بڑی عمر میں اسماعیل اور اسحاق بخشے، بے شک میرا رب دعاؤں کا سننے والا ہے"۔

فرزند عطا کرنے پر حمد الٰہی

یہ جملہ حضرت ابراہیمؑ کی مناجات کے درمیان آیا ہے جس میں آپؑ نے بڑھاپے میں عادی اور معمولی اسباب سے ہٹ کر عطا ہونے والی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت یعنی دو صالح بیٹے اسماعیلؑ اور اسحاقؑ عطا کرنے پر اس کی حمد اور ستائش کی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی کہ اس نے ابراہیمؑ کی دُعا قبول کی تھی جس وجہ سے ابراہیمؑ اللہ کی حمد بجا لائے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نعمت پر شکر کرنے والوں کی نعمت کو اور بڑھا دیتا ہے۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖۗ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

”اے رب ! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا دے، اے ہمارے رب !اور میری دعا قبول فرما“۔

نماز پڑھنے کی تاکید

نماز قائم کرنے کی دُعا اور بتوں کی عبادت سے آپ اور آپؑ کے پیروکاروں کی دُوری کی دعا اس لحاظ سے ہے کہ ہر عمل کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے، کیونکہ کسی بھی عمل کے انجام پانے کے لئے اللہ کے اذن اور مشیت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہر عمل اپنے عامل اور انجام دینے والے سے بھی نسبت رکھتا ہے۔ بہرحال حضرت ابراہیمؑ نے اس دعا میں بھی پہلے اپنے آپ کو مستقل ذکر کیا ہے اور اس کے بعد اپنی اولاد کے حق میں بھی دُعا کی ہے اور خدا سے چاہا ہے کہ انہیں اس کے ساتھ ملحق کرے۔اس کے بعد دعا میں اصرار اور گڑگڑاہٹ اور اللہ کی رحمت کو جلب کرنے کے لیے دوبارہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کی ہے اور فرمایا ہے کہ اے میرے پروردگار! میری دعا کو قبول کرلے۔ اللہ تعالیٰ کا حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو قبول کرنے میں اس بات کا اشارہ بھی موجود ہے کہ قیامت تک زمین آپؑ کی ذریت سے خالی نہ ہوگی۔

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾

”اے ہمارے رب ! مجھے اور میرے ماں باپ کو اور ایمانداروں کو حساب قائم ہونے کے دن بخش دے“۔

والدین اور مومنین کیلئے دعا

اس جملہ میں حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے تیسری درخواست کی ہے جس میں آپؑ نے اپنے ماں باپ اور سارے مومنین کے لئے طلب مغفرت کی ہے۔ یہ

آیت حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا آخری حصہ ہے۔ یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ابراہیمؑ، آذر مشرک کے فرزند نہیں تھے کیونکہ آپؑ نے اس آیت میں اپنے والد کے لئے اس وقت طلب مغفرت کی ہے جب آپؑ بڑھاپے میں تھے جبکہ آپؑ نے آذر مشرک سے بیزاری اور برأت کا اعلان اپنی جوانی میں کیا تھا۔ پیغمبر خلیل اللہؑ ہرگز مشرکین کے لئے استغفار نہیں کرتے لہٰذا آذر آپ کے چچا تھے، آپ کے والد نہیں تھے۔ عربی زبان میں اب کا لفظ چچا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

آیات میں لطیف اشارے

ان آیات میں لطیف اشارے موجود ہیں کہ جہاں پر کسی عمومی نعمت کی بنا پر خداوند تبارک و تعالیٰ کی حمد اور ستائش کی ہے جو خود کو اور دوسروں کو شامل ہے تو وہاں ربنا کہا ہے، اے ہمارے رب! اور جہاں پر خاص نعمت پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کی ہے تو وہاں ربی کہا ہے اے میرے رب۔ بہرحال حضرت ابراہیمؑ کے یہ دعائیہ جملے بہت ہی عمدہ ہیں، انسان ان جملوں کو اللہ کے حضور ذکر کرکے دعا مانگ سکتا ہے۔ یہ قرآنی دعاؤں میں سے بہت ہی عمدہ دعائیں ہیں جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب تعالیٰ سے کی ہیں اور ہمیں اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی روش سکھائی ہے۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ﴿۴۲﴾

"تو ہرگز خیال نہ کر کہ اللہ ان کاموں سے بے خبر ہے جو ظالم کرتے ہیں، انہیں صرف اس دن تک مہلت دے رکھی ہے جس میں نگاہیں پھٹی رہ جائیں گی"۔

اللہ تعالیٰ، ظالموں کے کاموں سے بے خبر نہیں

اس آیت میں پیغمبرؐ کو بتایا گیا ہے کہ یہ خیال نہ کرو کہ ظالمین بڑے آرام سے ہیں اور مزے کر رہے ہیں اور مادی امور اور فساد میں غرق ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل ہے! ہرگز ایسا نہیں ہے، بلکہ اللہ نے ان کو مہلت دے رکھی ہے اور ان کا عذاب مؤخر کر رکھا ہے تاکہ قیامت کے دن انہیں ہولناک عذاب دے دے۔ جس سے ان کی آنکھیں چندھیا جائیں گی اور آنکھیں پتھرا جائیں گی اور خوف کے مارے ایک جگہ رک جائیں گی۔ اس آیت میں ظالموں کو ڈرایا گیا ہے اور دوسرے لوگوں کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے دل مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دینی ہے اور ان کے لئے معافی نہیں ہے۔

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾

"وہ سر اٹھائے ہوئے دوڑتے چلے جا رہے ہوں گے کہ ان کی نظر ان کی طرف ہٹ کر نہیں آئے گی، اور ان کے دل اڑ گئے ہوں گے"۔

قیامت میں ظالمین کی حالت

قیامت میں ظالمین کی یہ حالت ہو گی ان کے سر اوپر اٹھے ہونگے اور ان کی نگاہیں پتھرا جائیں گی، خوف اور ڈر کے مارے آنکھ نہیں جھپکا سکیں گے، ان کے دل وحشت زدہ ہوں گے، عقل اور شعور سے عاری ہو چکے ہوں گے، ان کے پاس کوئی حیلہ اور چارہ نہیں ہو گا، وہ بے حال ہوں گے، ہر شخص اپنی فکر میں ہو گا کسی کو کسی کی کوئی خبر نہیں ہو گی اور پریشانی اور ہو کا عالم ہو گا۔ یہ آیت بھی ستمگاروں کے

لیے دھمکی اور مومنین کے لئے تسلی ہے کہ ظالموں کو سزا ملنی ہے۔

وَ اَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍۙ﴿۴۴﴾

''اور لوگوں کو اس دن سے ڈرائے کہ ان پر عذاب آئے گا تب ظالم کہیں گے اے رب ہمارے! ہمیں تھوڑی مدت تک مہلت دے کہ ہم تیرا بلانا قبول کر لیں اور رسولوں کی پیروی کر لیں، کیا تم نے پہلے قسم نہیں کھائی تھی کہ تمہیں کہیں جانا ہی نہیں ہے''۔

ظالمین کے لیے دُنیاوی عذاب

پچھلی آیت میں ذکر شدہ عذاب کے برعکس جو آخروی عذاب تھا، اس آیت میں دُنیاوی عذاب کا تذکرہ ہوا ہے جس کے ذریعے ظالموں کی نسل کا خاتمہ ہو جائے گا اور زمین شرک و ظلم کی نجاست سے پاک ہو جائے گی اور خدا پرستوں کے سواء کوئی نہیں بچے گا۔ جب عذاب آپہنچے گا تو ظالمین کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہمیں کچھ اور مہلت دے دے تاکہ ہم تیری دعوت کو قبول کریں اور تجھ پر ایمان لے آئیں اور اپنی زندگی کی روش تیرے پیغمبروں کی مانند بنا لیں۔ اُن کے جواب میں انہیں چپ کرانے کے لئے ڈانٹے ہوئے ان سے کہا جائے گا: مگر تم نہیں تھے جو قسمیں اُٹھاتے اور کہتے تھے کہ ہمارے اندر اتنی دفاعی طاقت اور ہماری اتنی شان و شوکت ہے کہ ہم کبھی بھی نابود نہیں ہوں گے، کوئی بھی حادثہ ہمیں نابود نہیں کرسکتا ہم ہر برے حادثے سے خود نجات پا جائیں گے؟ اب تم کس طرح التماس کر رہے ہو اور مہلت مانگ رہے

ہو؟

قسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی بات کو ایک محترم اور شریف چیز کے ساتھ جوڑے تاکہ اس طرح اپنی گفتار کی سچائی کو ثابت کرے۔ اگر قسم کھانے والا اپنی گفتگو میں جھوٹا ہو تو اس نے اس امر کی شرافت اور حرمت کی توہین کی ہے، کیونکہ کسی میں اس امر کی توہین کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، سننے والا یقین کر لیتا ہے کہ اس کی بات سچی ہو گی۔ شاید یہاں پر ان کے قسم کھانے کا مقصد یہ ہو کہ اس امر کے واقع ہونے میں کوئی شک و تردید نہیں ہے اور یہ امر یقینی طور پر واقع ہوگا۔

وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۝۴۵

"اور تم انہیں لوگوں کی بستیوں میں آباد تھے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور تمہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا اور ہم نے تمہیں سب قصے بتلائے تھے"۔

سابقہ ظالموں کا تذکرہ

یہ آیت پچھلی آیت میں بیان شدہ جملہ اَقْسَمْتُمْ (تم نے قسم اٹھائی) کے محل پر عطف ہے۔ آیت کا معنی اس طرح ہے کہ کیا تم ان لوگوں کے گھروں اور شہروں میں نہیں ٹھہرے جو تم سے پہلے گزرے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو ہم نے ان کو نیست و نابود کیا یہاں تک کہ اُن کا نام تک نہیں رہا، تم نے نہیں دیکھا کہ کس طرح ہمارے عذاب نے ان کو گھیرے میں لیا۔ اگر ایسا ہے تو تم کس طرح قسمیں اُٹھا کر دعویٰ کرتے ہو کہ تمہیں زوال نہیں آئے گا؟ لہٰذا دو لحاظ سے دعوت الٰہی کی سچائی ان کے لیے

ثابت اور آشکار ہوئی جس کی نافرمانی، عذاب الٰہی کا سبب بنے گی:۔ پہلا راستہ مشاہدہ ہے جس کے ذریعے الٰہی دعوت کی سچائی ان کے لیے ثابت ہوئی اور دوسرا راستہ بیان ہے جس میں خداوند تبارک و تعالیٰ نے مثالیں دے کر سابقہ اقوام کی وضعیت اور صورتحال ان کے لیے بیان کرکے ان پر حجت تمام کر دی ہے۔

وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ۖ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

''اور ان لوگوں نے اپنی تدبیریں کی تھیں اور ان کی تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں، اگرچہ ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں''۔

کفار کی سازشیں

یہ آیت'' فَعَلْنَا '' یا'' بِهِمْ'' میں موجود ضمیر کے لیے حال ہے یا دونوں ضمیروں کے لیے حال ہے۔ اور یہ سب ضمیریں ''الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا'' کی جانب پلٹتی ہیں۔ آیت کا معنی یوں ہو جائے گا کہ اب جبکہ ان ستمگاروں اور ظالموں نے بڑی ذہانت سے سازشیں تیار کیں، منصوبے بنائے لیکن اُن کی تمام سازشیں اللہ تبارک و تعالیٰ کا علم مطلق سے باہر نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کا علم ان سب پر محیط تھا۔ جیسا کہ کہا گیا سازش اس وقت کارگر ہوتی ہے جب وہ شخص جس کے خلاف سازش کی جا رہی ہے وہ اس سے بے خبر ہو، اگر وہ بے خبر نہ ہو اور اس کا اس سازش پر پورا احاطہ ہو اور سارے امور اس کے زیر نظر چل رہے ہوں تو ایسی صورت میں اس کے خلاف ہونے والی سازش کارگر نہیں ہو گی، بلکہ وہ خود سازش کرنے والے کے خلاف ہو جاتی ہے کیونکہ وہ تو اس سازش سے اپنے مخالف کو نیچا دکھانا چاہتا تھا لیکن جس کے خلاف وہ سازش کررہا

تھا اسے سازش کار کے سارے پلان کا پتہ تھا لہٰذا وہ اسے نقصان نہیں دے سکتا۔ اس بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا يَمْكُرُونَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ " (سورۃ انعام، آیت: ۱۲۳)

ترجمہ: "وہ سازش نہیں کرتے مگر خود اپنے لئے، لیکن اس کو وہ سمجھتے نہیں"۔

بہر صورت ان لوگوں کی سازشوں اور مکاریوں کی اللہ تعالیٰ پر کوئی تاثیر نہیں ہے کیونکہ اللہ ان کی تمام سازشوں سے آگاہ ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی سازشوں کو دُور کرنے پر قادر بھی ہے، اگرچہ اُن کی سازشیں اتنی طاقت ور کیوں نہ ہوں جن سے پہاڑ بھی ہل جائیں۔ یعنی کافروں کی سازشیں بہت بڑی تھیں لیکن وہ اس لئے اپنی سازشوں میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی تمام سازشوں سے آگاہ تھا اور ان کے اوپر حاوی اور قادر ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے خلاف کوئی بھی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ سازش کرنے والے خود بے خبر ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ اپنے ہی خلاف کر رہے ہیں، اللہ کو اس سے کوئی نقصان نہیں دے سکتے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾

"پس اللہ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنے والا خیال نہ کریں، بے شک اللہ زبردست بدلہ لینے والا ہے"۔

اللہ کا وعدہ ضرور پورا ہو گا

اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنے رسولؐ سے فرما رہا ہے کہ ہر گز یہ گمان مت کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں سے کئے گئے نصرت اور مدد کے وعدے کو پورا نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ضرور ستمگاروں کا مؤاخذہ کرے گا اس نے اگر ستمگاروں کو قیامت تک مہلت

دی ہے تو وہ ایک حکمت کے تحت ہے۔ وگرنہ اللہ تعالیٰ عزیز، غالب اور مقتدر ہے اور اگر اس نے اپنے رسولوں کو نصرت کا وعدہ دیا ہے تو اسے ضرور پورا کرے گا۔ اسی طرح اگر اس نے اپنے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو عذاب اور سزا کا وعدہ دیا ہے تو اسے بھی ضرور پورا کرے گا۔ کیونکہ وہ عزت مطلق کا مالک ہے۔

وعدہ پورا نہ کرنے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وعدہ کرنے والے میں اپنے وعدے کو پورا کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وعدہ کرنے والا کسی وضعیت اور حالت سے متاثر ہو کر وعدے کی خلاف ورزی کرے اور وعدے کو پورا کرنے کے ارادے سے پھر جائے۔ اللہ تعالیٰ نہ تو عاجز ہے اور نہ ہی کسی چیز سے متاثر ہو کر اپنی بات بدل دیتا ہے، وہ عزیز، غالب اور قادر مطلق ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ انتقام لینے والا بھی ہے اور اپنے مخالفین سے انتقام لیتا ہے اور یہ اس کے غالب اور عزیز ہونے کی لازمی صفت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حق کے مقابلے میں تکبر کرنے والوں اور ظالم سے مظلوم کا بدلہ لیتا ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

"جس دن اس زمین میں سے اور زمین بدلی جائے گی اور آسمان بدلے جائیں گے، اور سب کے سب ایک زبردست اللہ کے روبرو پیش ہوں گے"۔

قیامت کے دن زمین کا بدل جانا

قیامت کے دن کی خصوصیت میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے تمام مخالفین سے انتقام لینا ہے اور اس دن اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہو گا۔ اُس دن کی دوسری خصوصیت یہ ہو گی کہ زمین دوسری زمین میں بدل جائے گی اور

زمین میں جاری موجودہ نظام نہیں رہے گا۔ اس دن زمین سورج کے نور کے بجائے اپنے رب کے نور سے روشن ہو جائے گی۔ جیساکہ (سورۂ زمر، آیت ٦٩) میں آیا ہے:

وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا . . .

ترجمہ: ”زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہو گی“۔

اس دن آسمانوں میں بھی تبدیلی آجائے گی اور اس فانی اور زائل ہونے والی حالت سے باقی رہنے والی اور جاودانی حالت میں تبدیل ہوجائیں گے۔ اس دن تمام علل و اسباب جنہیں لوگ مستقل خیال کرتے تھے اپنی حیثیت کھو بیٹھیں گے، ساری مخلوقات خداوند تبارک و تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گی۔ وہاں پر صرف خدا ہی ساری مخلوقات کا سرپرست ہو گا اور وہ مستقل سبب ہے اور وہی موئثر ہے، اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کے لئے کوئی تاثیر نہیں ہے۔ وہ ایسا دن ہو گا جس دن لوگ نہ اپنے ظاہر سے اور نہ اپنے باطن سے کسی طرف توجہ نہیں دیں گے۔ ان کی اپنی گذشتہ حالات پر بھی کوئی توجہ نہیں رہے گی وہ ہر طرف سے لاتعلق ہو کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ اس دن اللہ تعالیٰ ان پر شاہد، محیط اور مسلط ہو گا۔ خدا واحد، قہار اور ایسی ذات ہے جس کی وجہ سے ہر چیز قائم ہے، ہر موئثر اپنے غیر کو ختم کر دے گا کسی کی تاثیر اللہ کے اذن کے بغیر ہے ہی نہیں۔ اللہ اور اللہ کی مخلوق کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی، سب خدا کے سامنے حاضر ہوں گے اور کوئی درمیان میں نہیں آسکتا۔

وَ تَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿٤٩﴾

”اور تو اس دن گناہگاروں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھے گا“۔

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّ تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿٥٠﴾

”کرتے ان کے گندھک کے ہوں گے اور ان کے چہروں پر آگ لپٹی ہو گی

"۔

قیامت میں مجرموں کی حالت

قیامت کے دن سارے گناہگار ایک جگہ اکٹھے ہوں گے۔ان کے ہاتھ زنجیروں میں جکڑے پس گردن بندھے ہوئے ہونگے۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ہوں گی۔ان کی گردنیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ پورا جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا گا ان کے بدن پر سیاہ اور بدبودار تارکول لپٹی ہو گی، اس کی بدبو آ رہی ہو گی اور یہی ان کے جسم کا لباس ہوگا جو گرم لوہے کی مانند ہوگا۔ ان کے چہروں پر آگ بھڑک رہی ہو گی یہ حالت ہو گی کافروں کی۔ کوئی کسی سے بات تک نہیں کرسکے گا ہر شخص اپنے اپنے عذاب میں غرق ہو گا اور ان کے گناہ آگ کی شکل میں ان پر مسلط ہوں گے۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٥١﴾

"تاکہ اللہ ہر شخص کو اس کے کیے کی سزا دے، بے شک اللہ بڑی تیزی سے حساب لینے والا ہے"۔

قیامت، عمل کا نتیجہ ملنے کا دن

انسان نے دُنیا میں جو بھی عمل انجام دیا ہے خواہ اچھا ہو یا برا، قیامت کے دن اسے اس کا بدلہ اور جزا ملے گی۔ اچھائی کا انجام اچھائی اور برائی کا انجام برائی۔ مجرم کا عمل بعینہ اس کے سامنے ہو گا اور اس کی جانب پلٹایا جائے گا۔ قیامت کا عذاب اُس کے دُنیاوی اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ مجرم کو ملنے والا عذاب اس لحاظ سے نہیں ہے کہ خدا اس سے انتقام لے کر اپنا دل ٹھنڈا کر رہا ہو، بلکہ یہ اس لحاظ سے ہے کہ ہر شخص اپنے بوئے ہوئے کو کاٹ رہا ہوگا اور اسے اپنے کئے کا ثمر ملے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نظام عدل میں لوگوں

کے اعمال کا حساب کتاب بڑی تیزی سے انجام پاتا ہے اور جزاء بلافاصلہ دی جاتی ہے، البتہ اس کا تحقق اور ظہور قیامت کے دن ہوگا۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل کے انجام دینے کے ساتھ ہی اس کی جزا کا فیصلہ کر دیتا ہے لیکن اس کا تحقق اور ظہور قیامت میں ہو گا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ بہت دقیق اور سریع اور تیز حساب لینے والا ہے، کسی کے حساب میں ذرہ برابر فرق نہیں ہو گا، ہر ایک کا عمل اس کے سامنے ہو گا اور اسی عمل کے مطابق اس کا حساب ہو رہا ہو گا۔ اس کے عمل سے کچھ بھی فروگذاشت نہ ہو گا کے پورا پورا حساب ہو گا۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

"یہ قرآن لوگوں کے لیے اعلان ہے اور تاکہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو ڈرایا جائے اور تاکہ وہ معلوم کرلیں کہ وہی ایک معبود ہے اور تاکہ عقلمند نصیحت حاصل کریں"۔

قرآن، لوگوں کے لیے اللہ کا اعلان

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ جو کچھ اس سورہ میں ذکر ہوا ہے یہ لوگوں کو سمجھانے کے واسطے کافی ہے۔ اگرچہ ان آیات کے بلند اور عالی مفاہیم ان کی فہم سے بالاتر ہیں لیکن یہ اُن کو ڈرانے کے لیے کافی ہیں۔ وہ ان آیات کے ذریعے اللہ کی وحدانیت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اور مومنین اور صاحبان عقل و خرد ان آیات سے تذکر حاصل کر کے جہل کی تاریکیوں سے نکل کر ہدایت کے نور تک پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ آیتیں عام لوگوں کے لئے توحید کی جانب ہدایت پانے کے لیے انذار اور مومنوں اور اہل عقل و خرد کے لئے تذکر و یاددھانی ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی اس علم کے مطابق گزاریں اور حکم اور قانون الٰہی کے پابند ہوں۔ لہٰذا یہ آیتیں عقائد حقہ کا کامل مجموعہ ہیں جن میں اللہ

کی وحدانیت اور الوھیت، انبیاء کی رسالت اور ان کے لیے اللہ کی نصرت اور مدد، ظالموں سے اللہ کے انتقام، قیامت میں ظالمین اور گنہگاروں کے حالات کی دلیل اور حجت نبوت کے طور بیان ہوئی ہیں تاکہ یہ سارا کچھ جان کر انسان اپنے فرائض انجام دے اور آیات الٰہی سے خوف کھائے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق نہ اڑائے، اللہ تعالیٰ کی آیات کو نہ جھٹلائے، اللہ کے پیغمبروں کو نہ جھٹلائے بلکہ ان پر ایمان لے آئے اور ایمان کے مطابق عمل کرے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور یہ در حقیقت اللہ کی جانب سے انسانوں کے لئے اعلان بھی ہے کہ اللہ انسانوں سے کیا چاہتا ہے اور انسانوں کے کمال و ترقی کیلئے کون سے قوانین و احکام قرار دیے ہیں۔

سورۂ حجر

(مکی ۔ کل آیات 99)

اس سورت کے مطالب

رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کا تذکرہ، قرآن کو جھٹلانے والوں کا ذکر، رسول اللہ ﷺ کو صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے اور لوگوں کو

بشارت دینے اور انہیں ڈرانے کا دستور۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱﴾

''ال ر، یہ آیتیں کتاب کی ہیں اور قرآن واضح کی''۔

قرآن کتاب مبین

الف لام میم، قرآنی اسرار اور رموز ہیں۔ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ ان حروف میں سورہ کے مضامین کی طرف اشارہ ہوا ہے۔قرآن کی جانب ''تِلۡکَ'' کے ذریعے اشارہ کیاگیاہے جو کہ دُور کے اشارہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور قرآن کو نکرہ لایا گیا ہے تاکہ الٰہی کتاب کی عظمت پر دلالت کرے۔کتاب سے قرآن یا لوح محفوظ مراد ہے۔ بہرحال اس آیت میں بتایا جارہاہے کہ کافروں کے تصور کے برعکس جو آنحضرت کو (نعوذ باللہ) دیوانہ کہتے ہیں اور قرآن کا مذاق اڑاتے ہیں، یہ بلند مرتبہ اور عظیم الشان آیات، الٰہی کتاب کی آیات ہیں جو حق اور باطل میں جدائی ڈالنے والی ہیں۔ بعض آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ قرآن لوح محفوظ میں ہے اور وہیں سے اُترا ہے۔ جیساکہ سورۂ واقعہ، آیت :۷۷،۷۸میں اللہ تعالیٰ کا ارشادہے: اِنَّہٗ لَقُرۡاٰنٌ کَرِیۡمٌ ﴿ۙ۷۷﴾ فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ ﴿ۙ۷۸﴾ترجمہ یہ کتاب پڑھنے کےلئے ہے جو گرانقدر ہے اور پوشیدہ کتاب میں ہے۔'' یا (سورۂ بروج، آیت :۲۱،۲۲) میں بیان ہوا ہے: ترجمہ: ''بلکہ وہ قرآن مجید ہے عظیم الشان جو کہ لوح محفوظ میں موجود ہے''

رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۲﴾

''کافر بڑی حسرت کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہو جاتے''۔

ایمان نہ لانے پر کافروں کی پشیمانی

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کفار بہت جلد اپنے کفر سے مایوس اور پشیمان ہو کر کہیں گے کہ کاش دُنیا میں ہم اللہ کے آگے تسلیم ہوئے ہوتے اور پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان لے آئے ہوتے۔ اُن کی یہ خواہش اور چاہت اس وقت ہو گی جب دُنیاوی زندگی کی بساط لپٹی جائے گی اور اس وقت اُن کا خواہش کرنا اُن کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں لائے گا اور وہ جگہ ایسی ہو گی جہاں اسلام اور ایمان کے لئے کوئی راستہ نہیں ہو گا اور ان کی یہ آرزو پوری ہوئے بغیر رہ جائے گی، صرف ایک خواہش ہی ہو گی۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۳

"انہیں چھوڑ دو کھا لیں اور فائدہ اٹھا لیں اور انہیں آرزو بھلائے رکھے، سو آئندہ معلوم کر لیں گے۔"

کافروں کے متعلق رسول اللہؐ کو دستور

اللہ تعالیٰ اس آیت میں رسول خدا ﷺ کو حکم دے رہا ہے کہ کافروں سے توجہ ہٹا لو اور انہیں اسی باطل میں سرگرم رہنے دو اور ان کے ساتھ جھگڑو مت، انہیں مادی اور دُنیاوی لذات اور نفسانی خواہشات میں گھرے رہنے دیں کیونکہ یہ سوائے حیوانات کے کوئی اور منطق و دلیل نہیں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے انسانیت کو اس قدر گھٹایا ہے کہ اُن کے نزدیک انسانیت خواہشات نفسانی اور شہوت پرستی میں خلاصہ ہوتی ہے۔ اب جب ان کی یہ حالت ہے تو ان میں یہ لیاقت ہی نہیں ہے کہ وہ اسلام لے آئیں لہٰذا ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو تاکہ انہی مسائل میں سرگرم رہیں، ان سے بحث اور گفتگو

کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ آخرکار حق آشکار ہو گا اور اس وقت یہ لوگ خود بخود حق کو دیکھیں گے اور موت یا اُخروی عذاب کے بعد حق کے آگے تسلیم ہوں گے، لیکن اس دن حق کے سامنے تسلیم ہونا انہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿٤﴾

"اور ہم نے جتنی بستیاں ہلاک کی ہیں ان سب کے لیے ایک مقرر وقت لکھا ہوا تھا"۔

بستیوں کی ہلاکت کا سبب

جب بھی کسی آبادی اور بستی کو ہلاک کیا گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس آبادی والوں نے پیغمبروں کی دعوت کو ٹھکرایا اور حق کا انکار کیا اور اللہ کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کی۔ جب کسی بھی بستی والوں نے اللہ کے پیغام کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے معین وقت کے بعد اُن کو ہلاک کر دیا۔ جس طرح ہر فرد کی موت کا وقت مقرر ہے اسی طرح اقوام کے لئے بھی باقاعدہ ایک وقت معین ہے اور اس معین وقت تک ان کو مہلت ملتی ہے، جب ان کی مہلت ختم ہو جاتی ہے تو پھر اُن کی ہلاکت کا وقت آجاتا ہے۔ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب بھی جو لوگ اللہ کے پیغام کا انکار کریں گے، تو ان کا انجام بھی سابقہ اُمتوں جیسا ہی ہوگا۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿٥﴾

"کوئی قوم اپنے وقت مقرر سے نہ پہلے ہلاک ہوئی ہے نہ پیچھے رہی ہے"۔

طے شدہ مدت پر اُمتوں کی ہلاکت

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ جب ہم نے کسی اُمت کے لیے ایک مدت معین کر

دی اور وہ معین مدت آجائے تو پھر اس مدت سے نہ تو ایک لمحہ آگے ہوتا ہے اور نہ پیچھے۔ ان کی سرنوشت اور ان کے انجام کا علم اللہ تعالیٰ کے ہاں معلوم اور طے شدہ ہے، اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، جو کچھ وہاں درج ہے اس کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝٦

"اور انہوں نے کہا اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے بے شک توں مجنون ہے"۔

رسول اللہؐ پر دیوانگی کا الزام

اس آیت میں کافروں کی بات کا تذکرہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی توہین کرتے تھے اور آپ پر طنز کرتے ہوئے آپ پر دیوانگی کا الزام لگاتے اور آپ کا نام یا اللہ تعالیٰ کا نام لیے بغیر کہتے تھے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ تمہارا خدا کہاں ہے اور ہمارا اس پر عقیدہ بھی نہیں ہے اور توں جو دعویٰ کر رہا ہے وہ بھی جھوٹا ہے اور تیرا اپنے اوپر ذکر نازل ہونے کا دعوای بھی حقیقت میں تیری دیوانگی ہے۔ کفار اس طرح آپ کی اہانت کرتے اور آپ پر تہمت لگاتے اور آپ کو جھٹلاتے تھے۔

لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٧

"اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے"۔

فرشتے لانے کا تقاضا

کفار رسول اکرم ﷺ سے کہتے تھے اگر تم سچ کہتے ہو کہ اللہ کی طرف سے تجھ پر ذکر نازل ہوا ہے تو اپنے ہمراہ فرشتوں کو لے آؤ تاکہ وہ تیری سچائی کی گواہی دیں اور

لوگوں کو انذار کرنے اور انہیں ڈرانے میں تمہاری مدد کریں جیسا کہ سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۷ میں آیا ہے :

لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًاۙ

ترجمہ'' کیوں اس پر فرشتہ نازل نہیں ہوتا تاکہ اس کے ہمراہ انذار کرتا اور لوگوں کو ڈراتا''۔

وہ انسان کو ایک مادی اور شہوت اور آلودگیوں میں غرق موجود سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ انسان کا آسمانی اور روحانی عالم سے رابطہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی بشر ایسا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا عالم روحانیت سے رابطہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ آسمانی اور روحانی عالم والوں کو اپنے ساتھ لے آئے اور وہ اس کی دعوت کی تصدیق کریں اور اس کی مدد کریں۔ اس کے علاوہ کفار فرشتوں کو معبود مانتے تھے اور کہتے تھے خداوند اس بات سے بالاتر ہے کہ ہم اس کے ساتھ رابطہ برقرار کر سکیں لہٰذا وہ فرشتوں کو اپنے اور اللہ کے درمیان شفیع مانتے تھے جبکہ انبیاء کی دعوت کا لازمہ یہ تھا کہ فرشتے معبود نہیں ہیں۔ اس بنا پر وہ کہتے تھے کہ فرشتے خود آئیں اور اعتراف کریں کہ ہم معبود نہیں ہیں اور انبیاء کی دعوت کی تصدیق کریں اور کہیں کہ وہ سچ بولتے ہیں۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ ۝۸

''ہم فرشتہ تو فیصلہ ہی کے لیے بھیجا کرتے ہیں اور اس وقت انہیں مہلت نہیں ملے گی''۔

کافروں کی درخواست کا جواب

جب کافروں نے رسول خدا ﷺ سے اپنے ساتھ فرشتے لانے کا تقاضا کیا اور کہا کہ کیوں فرشتے آکر تمہاری تائید اور مدد نہیں کرتے اور آپ کی سچائی کی گواہی نہیں

دیتے؟ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ سنت الٰہی ہے کہ فرشتے انسان کی آنکھ سے پوشیدہ ہیں اور پردہ غیب میں مستور ہیں، فرشتوں کا آنا معجزہ ہو گا جو معمولی اسباب کو توڑ کر آئے گا اور معجزے کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر لوگ درخواست کئے گئے معجزے کے آنے کے بعد بھی ایمان نہ لائیں تو پھر ہلاک ہوں گے اور ان کا وجود ہی مٹ جائے گا۔ کیونکہ انہوں نے ہٹ دھرمی اور دشمنی کی بنیاد پر کفر اختیار کیا ہوا ہے اس لیے وہ بالکل ایمان نہیں لائیں گے اور نتیجہ میں فرشتوں کے نزول کے بعد ان کے اوپر عذاب حتمی ہو گا اور پھر انہیں مہلت بھی نہیں دی جائے گی۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾ [1]

''ہم نے یہ نصیحت اُتار دی ہے اور بے شک ہم اس کے نگہبان ہیں''۔

قرآن کی حفاظت کا وعدہ

یہ آیت حقیقت میں پچھلی آیات میں ذکر شدہ مشرکین کی درخواست کا جواب ہے۔ مشرکین کا کہنا تھا کہ اے رسولؐ ہم تمہاری بات کو نہیں مانتے، یہ قرآن تم نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے! ان کا مقصد تھا اس قرآن کو باطل کر دیں، وہ کہنا چاہتے تھے کہ تم اس کی حفاظت نہیں کر سکو گے اور یہ قرآن بھی فرشتوں کی طرف سے نازل نہیں ہوا تاکہ تجھے فرشتوں کی ضرورت ہو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے جواب میں فرما رہا ہے کہ ہم نے یہ قرآن تدریجی اور تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ ہم اس کے ذکر ہونے کے وصف کی بھی حفاظت کریں گے،

---

[1] ۔اس مختصر آیت میں قرآن کریم کی حفاظت کے بارے چھ تاکیدیں بیان ہوئی ہیں:۔ ''اِنَّا''، ''جملہ اسمیہ''، ''نَزَّلۡنَا''، ''لَحٰفِظُوۡنَ'' سب تاکید کے لئے ہیں۔ (مصحح)

اس طرح حفاظت کریں گے کہ اس میں کوئی کمی بیشی یا تبدیلی واقع نہ ہو گی۔

"ذکر" پر "ال" عہد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فقط قرآن کریم ہی ہر قسم کی تحریف اور کمی اور بیشی سے محفوظ رہے گا نہ کہ باقی آسمانی کتابیں۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن کریم ہر قسم کی تحریف لفظی سے محفوظ رہے گا۔ جو کچھ اللہ کی طرف سے اُتارا گیا ہے وہی موجود ہے، اس میں سے نہ کچھ کم ہوا ہے اور نہ کچھ زیادہ ہوا ہے ۔ قرآن کریم کا بغیر کم و زیادہ کے موجود ہونا اس آیت کی صداقت کی نشانی ہے۔ صدیاں گزرنے کے بعد قرآن اپنی اصل شکل میں موجود ہے اور طے ہے کہ جو قرآن کی لفظی تحریف کا قائل ہے وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ جو روایات قرآن کی تحریف کے بارے میں اہل سنت اور شیعہ منابع میں ہیں وہ روایات غیر صحیح ہیں اور قرآن کے مقابلے میں اُن روایات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ قرآن میں تحریف کے متعلق نقل شدہ تمام روایات کو قرآن کی آیات جھٹلاتی ہیں۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۰

"اور تجھ سے پہلے ہم پہلی قوموں میں بھی رسول بھیج چکے ہیں"۔

رسول اللہؐ کی حوصلہ افزائی

اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے مخاطب ہو کے فرمارہا ہے کہ اے ہمارے حبیب! کفار کے انکار اور ان کے آزار و اذیت سے پریشان نہ ہوں، اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلا رہے ہیں تو اس سے پہلے بھی اسی قسم کے بہت سارے لوگ گزرے ہیں جو آیات الٰہی کے مقابلے میں تکبر کرتے تھے اور پیغمبروں کی رسالت کو جھٹلاتے تھے، خدا کا احترام نہیں کرتے تھے، پیغمبروں کا مذاق اڑاتے تھے لہٰذا ان کے رویوں سے پیغمبروں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝١١

''اور وہ بھی جب کوئی رسول ان کے پاس آتا ہے تو وہ اس سے ٹھٹھا مذاق ہی کرتے تھے''۔

رسولوں کے ساتھ کفار کا رویہ

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اکثر لوگوں کی عادت یہ ہے کہ وہ رسولوں کی دعوت پر اُن کا مذاق اڑاتے ہیں، اُن کی تائید نہیں کرتے۔ تو اے پیغمبر ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ آسودہ خاطر رہیں اور جان لیں کہ آپ پر نازل ہونے والے قرآن کی ہم خود حفاظت کریں گے، اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ اگر کفار آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ ان کا ایسا رویہ پہلی بار نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانے کے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ لیکن ان کی باتوں سے آپ پریشان نہ ہوں کیونکہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

كَذَٰلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۝١٢

''اسی طرح ہم ان کا یہ ٹھٹھا مذاق کرنا خود ان مجرموں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں''۔

قرآن کا نفوذ

اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح مجرمین، گناہگاروں اور اللہ کے پیغام کا انکار کرنے والوں اور اس کا مذاق اڑانے والوں نے آپ کے پیغام کو ٹھکرایا ہے، اللہ تعالیٰ نے طے کیا ہے کہ ان کے دلوں میں قرآن رسوخ کرے گا تاکہ ان پر حجت تمام ہو اور ان کے پاس انکار کے لئے کوئی دلیل نہ رہے اور ان کا انکار ان کے خلاف ہو گا اور ان

کے لیے سزا کا موجب بنے گا۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾

"یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے، اور یہ پہلوں کا دستور چلا آیا ہے۔"

کفار قرآن پر ایمان لانے والے نہیں

آپ کو معلوم رہنا چاہیے آج کے کفار بھی گذشتہ زمانوں کے کفار کی مانند ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ یہ انہی کی روش پر چل رہے ہیں، جس طرح وہ اللہ کی آیات کو ٹھکراتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے یہ بھی آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ لیکن ان کا ایمان نہ لانا آپ کو کوئی نقصان نہیں دیتا اور نہ ہی قرآن کو کوئی نقصان دیتا ہے۔ آپ کی پیغام رسانی سے ان پر حجت تمام ہو جائے گی اور ان کو انکار کی سزا ملے گی۔

وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾

"اور اگر ہم ان پر آسمان سے دروازہ کھول دیں پھر اس میں سے چڑھ جائیں۔"

کفار کبھی ایمان نہیں لائیں گے

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر ہم ان کفار کے لئے آسمانوں کے دروازے کھول بھی دیں اور یہ وہاں جائیں اور فرشتوں کے پاس جا کر ٹھہریں اور دعوت حقہ سے آگاہی پائیں تو پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ (یعنی اُن کا خیال تھا کہ آسمان ایک مادی چھت ہے اور اس کے بھی دروازے ہونے چاہئیں جو کچھ لوگوں کے لیے کھولے جاتے ہیں اور کچھ کے لیے بند کئے جاتے ہیں، ان کے اس خیال کے مطابق اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر ان کے لیے آسمانوں کے دروازے کھول دیے جائیں اور یہ وہاں پہنچ

جائیں تب بھی یہ لوگ دعوت حق کو قبول نہیں کریں گے، کوینکہ یہ ہٹ دھرم اور ضدی ہیں اور کسی بھی صورت میں دعوت حقہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ یہ سب ایمان نہ لانے کے لیے ان کے بہانے ہیں کہ فرشتے ساتھ آجائیں اور وہ آکر آپ کی تائید کریں تو جب ہم آپ پر ایمان لائیں گے یہ سب جھوٹ کہہ رہے ہیں۔

لَقَالُوٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

"البتہ وہ یہ کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی تھی بلکہ ہم پر جادو کیا گیا ہے"۔

یہ آیت پچھلی آیت میں بیان شدہ بحث کا تسلسل ہے اور کہا جارہا ہے کہ اگر کفار آسمان پر بھی جائیں اور فرشتوں کو دیکھ بھی لیں تو پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس صورت میں وہ یہ کہیں گے کہ یہ جادو کی بات ہے اور ہمارے اوپر جادو کر دیا گیا ہے۔ جبکہ آسمان کے دروازوں کا کھلنا اور آسمان کی جانب جانا ان کے معارف حقہ سے آشنا ہونے اور ان پر ایمان لانے کا سبب ہونا چاہیے تھا، لیکن ان کی باطنی بیماریاں ہیں اور پلیدی ان کے ایمان لانے کی راہ میں رکاوٹ ہے اسی لیے وہ ان معجزات کو دیکھنے کے باوجود اپنے کفر اور ہٹ دھرمی پر باقی رہیں گے اور ان معجزات کو آنکھ کی خطاء کہیں گے اور ایمان لانے کی بجائے پیغمبرؐ پر جادو گر ہونے اور چشم بندی کرنے کی تہمت لگائیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں غیر حقیقی چیزیں دکھائی گئی ہیں اور ہمارے اوپر جادو کر دیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾

"اور البتہ تحقیق ہم نے آسمان پر برج بنائے ہیں اور دیکھنے والوں کی نظر میں اسے رونق دی ہے"

بروج، آسمان کی زینت

"بروج" برج کی جمع ہے اور برج، سورج، چاند اور ستاروں کی منزلوں کو کہتے ہیں ۔ لغت میں برج بلندی، محل اور ٹھکانہ اور اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے آسمان میں بروج قرار دیے ہیں اور انہیں دیکھنے والوں کے لئے آراستہ کیا ہے، وہ بڑے خوبصورت لگتے ہیں۔ ستاروں کی زینت سے وہ خوشی اور حسن و جمال مراد ہے جو ان بروج کو دیکھنے سے لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، ان چمکتے دمکتے ستاروں کو دیکھ کر انسان بڑا خوش ہوتا ہے، عقلیں حیران ہو جاتی ہیں۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ . . . (سورۂ حمٓ سجدہ، آیت : ۱۲)

ترجمہ: "اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے زینت بخشی ہے..."

اسی طرح سورہ صٓفّٰت، آیت :۶ میں ارشاد خداوند ہے:

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ ۙ﴿۶﴾

ترجمہ: " اور ہم نے آسمان دنیا کو کواکب اور ستاروں سے زینت بخشی ہے"۔

یہ خوبصورتی اس نظم کا حصہ ہے جسے اللہ نے قرار دیا ہے۔

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ﴿۱۷﴾

"اور ہم نے انہیں ہر شیطان مردود سے محفوظ رکھا"۔

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ہم نے آسمان کو اللہ کی رحمت سے دھتکارے گئے ہر شیطان کے داخل ہونے سے محفوظ بنادیا ہے تاکہ وہ ملکوت کے اسرار سے آگاہ نہ ہو سکیں۔

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

"مگر جس نے چوری سے سن لیا تو اس کے پیچھے چمکتا ہوا انگارہ آن پڑا"۔

آسمان کا شیاطین سے محفوظ ہونا

پچھلی آیت کے تسلسل میں ارشاد ہو رہا ہے کہ جو شیطان آسمان کی جانب بڑھے اور چوری چھپے فرشتوں سے غیبی امور کے بارے میں سننے اور آنے والے حالات کے بارے آگاہی حاصل کرنا چاہیں تو جیسے ہی یہ شیاطین قریب ہوتے ہیں تو شہاب (تیز روشنی والا ستارہ) آگے بڑھتا ہے اور ان کا پیچھا کرتا ہے اور ان کو دھتکار دیتا ہے اور ان کو وہاں سے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ اس بارے سورہ صافات میں مزید بحث ہو گی۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾

"اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس پر پہاڑ رکھ دیے اوراس میں ہر چیز اندازے سے اگائی"۔

زمین کے حوالے سے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے زمین کو پھیلا دیا ہے اور زمین کے ٹھہراؤ کے لیے اس پر پہاڑ قرار دئے ہیں، اس میں ہر چیز ہم آہنگ ہے اور زمین میں زراعت کی صلاحیت رکھی ہے۔ ہر چیز حکمت اور مصلحت کے تحت قرار دی گئی ہے۔ اجسام کی آپس کی ترتیب بھی بڑی مناسب ہے اور اس میں کوئی چیز کم یا اضافہ نہیں ہے ۔ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق قرار دیا ہے۔ زمین پر پہاڑوں کے ستون کھڑے کر دیے ہیں جو اس کے آرام اور سکون کا ذریعہ ہیں۔ انسانوں اور حیوانات کی غذائی اجناس اور ضرورت کی چیزیں اسی زمین سے اگتی ہیں۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿٢٠﴾

"اور اس میں تمہارے لیے روزی کے اسباب بنا دیے اور ان کے لیے بھی جنہیں تم روزی دینے والے نہیں ہو"۔

زمین، انسان کے روزگار کا وسیلہ

معیشت، معایش کا مفرد ہے اور معایش ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو جانداروں کی زندگی کا وسیلہ ہیں اور جن پر ان کی زندگی اور بقاء استوار ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے زمین پر ایسی چیزیں قرار دی ہیں جو بنی آدم کی زندگی اور معیشت کے اسباب ہیں اور جو تمہارے علاوہ دوسرے جانداروں کی روزی اور معیشت کا وسیلہ ہیں۔[1]

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ﴿٢١﴾

"اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں، اور ہم صرف اسے معین مقدار پر نازل کرتے ہیں"۔

ہر شئے کے خزانے اللہ کے پاس ہیں

خزانہ ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں مال جمع کرکے رکھا جاتا ہے اور ذخیرہ کیا جاتا ہے اور جہاں اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ قدر، مقدار کو کہتے ہیں۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چیز جو اس عالم میں اُترتی ہے اور دنیا میں آتی ہے وہ دُنیا میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں موجود ہوتی ہے اور اس کی حد اور مقدار بھی متعین ہوتی ہے

---

[1] ۔ کمال مصطفیٰ شاکر نے "مَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿٢٠﴾" کو غلاموں اور پالتو جانوروں کے معنی میں لیا ہے جبکہ علامہ طباطبائی کی نظر میں اس کا عام معنی مراد ہے۔

کہ کتنی مقدار میں اس نے اترنا ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ بارش بھیجتا ہے جس سے نباتات اُگتی ہے اور پھر انسانوں کی معیشت اور روزگار اور حیوانات کی غذا بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کی مقدار معین ہے اور اللہ کی حکمت کے تحت ہی یہ سارا کچھ انجام پاتا ہے۔

''نزول'' یہاں پر خلقت کے معنی میں ہے اور ''قدر'' سے ہر موجود کی کیفیت مراد ہے۔ ''قدر'' معلوم کا مطلب یہ ہے کہ ہر موجو دجب نازل ہوتا ہے اور وجود میں آتا ہے تو اس کی مقدار اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوتی ہے اور ہر موجود وجود میں آنے سے پہلے بھی اس کی مقدار اللہ کو معلوم ہوتی ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے ہی ہر چیز کی حدبندی کر رکھی ہے اور اس حد بندی سے آگے نہیں بڑھتی۔ اسی میں اس نے رہنا ہے۔ اس بنا پر ہر چیز کی کمیت اور مقدار اس کے وجود میں آنے سے اللہ تعالیٰ کے علم اور مشیت میں معلوم ہوتی ہے، البتہ وجودی اعتبار سے وہ اسی کے ساتھ مقارن اور ملی ہوئی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر شئے ہر لحاظ سے الٰہی خزانے میں موجود ہوتی ہے اور وہاں سے تدریجاً اسے اترنا ہوتا ہے اور مرحلہ وار وہ نازل ہوتی ہے یہاں تک کہ آخری مرحلے میں اسی عالم دُنیا میں پہنچتی ہے۔ یہ خزائن سب کے سب حس اور عالم مشہود سے مافوق ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق ''عندنا'' کہا ہے۔ ''خزائن الٰہی'' ثابت اور طے شدہ امور ہیں جن میں زوال، تغییر اور تبدیلی نہیں ہے۔

وَ اَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَ مَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

''اور ہم نے بادل اٹھانے والی ہوائیں بھیجیں پھر ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا پھر وہ تمہیں پلایا، اور تمہارے پاس اس کا خزانہ نہیں ہے''۔

ہواؤں کا کام

اس آیت میں ہواؤں کو اس لیے "لواقح" کہا گیا ہے کیونکہ جب ہوائیں چلتی ہیں تو نر پودے سے ذرات اٹھا کر مادہ پودے تک پہنچاتی ہیں اور اس طرح پودے بار آور ہوتے ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے یہاں پر اس مسئلہ کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے ۔ اس کے بعد فرمایا ہے کہ ہم آسمان سے تمہارے لئے اور سارے جانداروں کے لئے بارش برساتے ہیں جس کے پانی سے تم سب سیراب ہوتے ہو۔ جیسا کہ آج کے سائنسی علوم سے یہ چیز ثابت ہو چکی ہے کہ کرۂ ارض میں موجود تمام پانی آسمان سے بارش کے ذریعہ اُترا ہے۔ اسی طرح پچھلی آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ جاذبہ اور وزن نباتات کے اُگنے میں موثر ہیں۔ ان دقیق سائنسی معلومات کو قرآن کریم نے چودہ صدیوں پہلے بیان کر دیا ہے۔ یہ اسرار اور راز کی باتیں بعینہٖ معجزہ ہیں۔

وَ اِنَّا لَنَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ نَحۡنُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿۲۳﴾

"اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور اخیر مالک بھی ہم ہی ہیں"۔

تمام اُمور کی تدبیر اللہ کے اختیار میں ہے

اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ عالم ہستی کے تمام امور کی تدبیر اللہ کے اختیار میں ہے۔ جہان ایک کامل اور مکمل نظام اور حکیمانہ نظم کے ساتھ جاری ہے لہٰذا حیات و موت مطلق طور پر اللہ کے اختیار میں ہے ۔ جب تمام خلائق کی حیات و موت اللہ کے اختیار میں ہے تو ان کا اختتام بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور ان کا حشر بھی اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ خداوند سب چیزوں کے فناء کے بعد باقی ہے جبکہ باقی مخلوقات جو

زندگی کی نعمت سے بہرہ ور ہو رہے ہیں وہ اپنی عمر پوری کرنے کے بعد ختم ہو جائیں گے لیکن خدا ہمیشہ باقی رہے گا۔ خدا تمام موجودات کے امور کا مدبر ہے، تمام امور پر خدا ہی کا احاطہ ہے۔ خداوند ازلی اور ابدی ہے سب سے پہلے تھا اور سب کے ساتھ ہے اور سب کے بعد ہو گا۔ ''كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ'' ہر چیز نے نابود ہو جانا ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔

وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

''اور ہمیں تمہارے اگلے اور پچھلے سب معلوم ہیں''۔

اگلے اور پچھلوں کا علم اللہ کے پاس ہے

اللہ تعالیٰ اپنی نعمات بیان کرنے کے بعد اس آیت میں خلقت کے امر کے متعلق اپنی تدبیر کے ایک ہونے کو بتا رہا ہے۔ حیات اور موت کا مسئلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، کس نے پہلے آنا ہے کس نے بعد میں آنا ہے، کس کی موت نے کب آنا ہے اور کس کی زندگی کب شروع ہونی ہے یہ سب اللہ کے علم میں ہے۔ تقدم اور تاخر کا اختیار بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، کوئی اپنی مرضی سے پہلے نہیں آسکتا اور کوئی اپنی مرضی سے زیادہ دیر رک نہیں سکتا۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

''اور بے شک تیرا رب ہی انہیں جمع کرے گا، بے شک وہ حکمت والا خبردار ہے''۔

سب کو محشور کرنے والا رب کائنات

رب کائنات اللہ ہی ہے اور اسی کے حضور تمام لوگوں نے محشور ہونا ہے۔ اللہ

حکیم ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ تمام اعمال کا جائزہ لے اور وہ علیم ہے اور اس کے علم کا تقاضا ہے جو کہ لامحدود ہے، نیک اور برے اعمال کو جانے اور گناہگاروں کو ان کے گناہ کی مناسب سزا دے اور نیکوکاروں کو ان کے عمل کا مناسب بدلہ دے۔

جو اوپر بیان ہوا ہے وہ سورہ قصص کی آیت ۸۸ ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

"اور البتہ تحقیق ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے تھی پیدا کیا"۔

کھنکتی ہوئی مٹی سے انسان کی خلقت

"صَلْصَالٍ" اس آوز کو کہتے ہیں جو کسی خشک چیز کے کھٹکھٹانے سے سنائی دیتی ہے۔"حَمَاٍ" سیاہ مٹی کو کہتے ہیں "مَّسْنُوْنٍ" بھینکی ہوئی اور تبدیل شدہ۔ اس آیت میں بتایا جارہاہے کہ انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے ہوا ہے۔ خدا نے مٹی کو گارا بنایا اور گارے کو بدبودار بنایا اور اس بدبودار گارے کو خشک کیا اور اس خشک شدہ مٹی سے آدم کو خلق کیا۔ اور پھر اسی سے نوع بشر کی نسل کو وجود میں لے آیا، یہ انسان کی خلقت ہے۔

وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

"اور ہم نے اس سے پہلے جنوں کو آگ کے شعلے سے بنایا تھا"۔

آگ کے شعلے سے جنات کی خلقت

"جن" کا معنی چھپا ہوا ہے۔ یہ موجودات کا ایسا گروہ ہے جو انسانی حواس سے

پوشیدہ اور مخفی ہے۔ان میں بھی انسان کی طرح شعور و ارادہ ہے اور یہ بھی انسان کی طرح مکلّف ہیں اور ان کے لئے بھی حشر و نشر اور حساب و کتاب ہے۔ جن اور جانّ ایک ہی چیز ہیں، شاید جان تمام جنات کا باپ ہو۔ بہرحال یہ آیت بتا رہی ہے کہ جنات کو ہم نے انسان سے پہلے آگ سے خلق کیا لہٰذا جنات کی خلقت کی ابتداء زہریلی آگ سے ہوئی البتہ جنات کی نسل بھی اُسی زہریلی آگ سے جاری رہی یا ان کی نسل توالد اور تناسل کے ذریعے جاری رہی جیسا کہ نوع بشر میں ہے،اس بارے میں اس آیت میں کچھ نہیں بتایا گیا ہے لیکن دوسری آیات جن میں جنات کی اولاد کو شیطان کی طرف نسبت دی ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں بھی توالد اور تناسل کا سلسلہ برقرار ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

”اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہوں کھنکتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی ہوگی“۔

انسان کی خلقت کا اعلان

”بَشَرٍ“ چمڑی کے ظاہر کو کہتے ہیں۔ انسان کی چمڑی اور جلد کے ظاہر ہونے کے اعتبار سے اسے بشر کہتے ہیں کیونکہ باقی حیوانات کا بدن بال یا اون سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ قرآن نے جہاں پر بھی انسان کے ظاہر اور بدن کی بات کی ہے تو اسے بشر کہا ہے۔ اس آیہ شریفہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے مکرم فرشتوں سے کہا کہ میں نے گیلی اور بدبودار مٹی کو خشک کرکے بشر خلق کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔

فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَ نَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ ۝۲۹

''پھر جب میں اسے ٹھیک بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا''۔

فرشتوں کو انسان کیلئے سجدہ کرنے کا حکم

''تسویہ'' کسی چیز کو اس طرح معتدل، صحیح اور متوازن بنا لینا کہ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے اور اس کا ہر عضو مناسب جگہ پر قرار پائے۔ اس آیت سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ پہلا انسان حضرت آدم کے بدن کی خلقت بتدریج انجام پائی، سب سے پہلے ان کے بدن کے اجزاء جمع کئے گئے پھر اُن اجزاء کو نظم اور ترتیب دی گئی اور ہر حصے کو ایک مناسب جگہ پر رکھا گیا اور پھر امر الٰہی سے اس میں رُوح پھونکی گئی۔ ''نفخ'' کسی جسم میں ہوا ڈالنا یا پھونک مارنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ کسی چیز میں اثر چھوڑنے یا غیر محسوس امر کو کسی چیز میں ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ''نفخ روح'' یہاں پر آدمی کے اندر رُوح کو ایجاد کرنے کے معنی میں ہے بدن اور رُوح کے درمیان ارتباط اور تعلق ایجاد کرنا۔ رُوح کی نسبت اللہ کی طرف دینے کا مقصد اس مخلوق کو شرفت بخشنا اور اسے محترم بنانا ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ جب انسان کی خلقت مکمل ہو جائے اور اس میں رُوح ڈال دی جائے تو سب اس کے لئے سجدہ کرلو۔ اس تاکید سے فرشتوں کا انسان کے سامنے خضوع اور تواضع کرنا استفادہ ہوتا ہے۔

فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ۝۳۰

''پھر سب کے سب فرشتوں نے سجدہ کیا''۔

فرشتوں کا آدمؑ کے لیے سجدہ کرنا

فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی، جیسے ہی انسان کا ڈھانچہ اور اس کا بدن بنا اور اس میں رُوح ڈالی گئی اور اس میں حرکت آگئی تو سارے فرشتے فوراً سجدے میں گر گئے، ایک بھی پیچھے نہ رہا۔ یہ امر الٰہی تھا اور انہوں نے امر الٰہی کی اتباع کی کیونکہ فرشتے اللہ کے امر کے سامنے تسلیم محض ہیں، ان میں نافرمانی کا تصور بھی نہیں ہے۔[1]

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝۳۱

"مگر ابلیس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو"۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝۳۲

"فرمایا اے ابلیس ! تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا۔"

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝۳۳

"کہا میں ایسا نہ تھا کہ ایک ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے پیدا کیا ہے کھنکتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے کی تھی"۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝۳۴ۙ

"کہا تو آسمان سے نکل جا بے شک تو مردود ہو گیا"۔

---

[1] ۔ یہ سجدہ روح کے لیے تھا جو عالم امر سے نازل ہوئی ہے اور دوبارہ اسی کی طرف پلٹے گی۔ (مصحح)

وَّ اِنَّ عَلَيۡكَ اللَّعۡنَةَ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ ﴿۳۵﴾

''اور بے شک تجھ پر قیامت کے دن تک لعنت رہے گی''۔

ابلیس کا آدمؑ کو سجدہ نہ کرنا

سارے فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ ابلیس کو فرشتوں کی جنس سے نہ ہونے کے باوجود اس لیے ان سے استثناء کیا گیا ہے کیونکہ آدم کو سجدہ کرنے کے حکم میں وہ بھی شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے پوچھا کہ تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ نہیں کیا اور باقی فرشتوں کے ہمراہ نہیں رہا؟ ابلیس نے کہا میں کیوں ایسے کو سجدہ کروں جس کو تو نے خشک، بدبودار مٹی سے پیدا کیا ہے۔ میری ذات کا تقاضا یہ ہے کہ میں ایسے بشر کا سجدہ نہ کروں۔ یہ اس بات کی جانب اشارہ تھا کہ آدم کو گیلی مٹی سے خلق کیا ہے اور ابلیس آگ کی جنس سے ہے اس لئے وہ خود کو بشر سے بالاتر جان رہا تھا۔ سورۂ صٓ، آیت :۷۶ میں ابلیس کی اس بات کو خود اس کی زبان سے اس طرح نقل کیا ہے:

قَالَ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ ؕ خَلَقۡتَنِىۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ ﴿۷۶﴾

ترجمہ: ''میں اس سے برتر ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے''۔

لیکن ابلیس یہ بات بھول گیا کہ آدم کے لیے سجدے کا حکم اس کی ذاتی کرامت کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ سجدے کا حکم ان کی رُوح کی وجہ سے تھا جو اللہ کی جانب سے ڈالی گئی تھی۔ شیطان نے جب آدمؑ کو سجدہ نہ کیا اور اپنے گناہ کا عذر پیش کیا اور اس کے گناہ کا عذر خود گناہ سے بھی بدتر تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب آیا: جب تو نے میرے امر کی نافرمانی کی ہے تو بہشت سے باہر نکل جا جس جگہ تو ابھی موجود ہے۔ تجھے جو

الٰہی کرامت اور مقام قرب حاصل تھا وہ ختم ہو گیا ہے، اب تو راندہ درگاہ الٰہی ہو گیا ہے، جا رحمت حق سے دُور ہو جا۔

پھر اللہ کی جانب سے آواز آئی کے اے ابلیس قیامت تک کے لئے تجھ پر لعنت ہے کیونکہ تو نے ایسی معصیت کی ہے جس کا کوئی ازالہ نہیں ہے اور تمام معصیتوں کا ریشہ اور سرچشمہ شیطانی وسوسے ہیں۔ حقیقت میں ہر معصیت اور ہر فساد کی جڑ شیطان ہے۔ لہٰذا ساری لعنتیں اور سارے بوجھ اور وبال جس طرح خود گناہگاروں کے اوپر ہیں یہ سب شیطان کے اوپر بھی ہیں۔ کیونکہ اس نے سب سے پہلے اللہ کی معصیت کی۔ لعنت کو یوم الدین سے اس لیے مقید کیا ہے کیونکہ لعنت گناہ کی نشانی ہے اور معصیت اسی دُنیا میں ہوتی ہے، آخرت بدلہ اور جزا کی جگہ ہے لہٰذا کہا گیا ہے قیامت کے آنے تک جب تک دُنیا ہے تجھ پر لعنت اور پھٹکار ہو گی۔ لیکن جب قیامت آئے گی تو وہاں اسے اس کے اعمال کی سزا ملے گی۔

قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۳۶﴾

”کہا اے میرے رب! تو پھر مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے۔“

ابلیس کی قیامت تک مہلت کی التجاء

یہاں پر شیطان نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگ لی اور رب کہہ کر پکارا تاکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کرے اور اسے مہلت مل جائے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سارا نظام کائنات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دُعا کو قبول کرلیا۔ آدمؑ کے لیے سجدے کا حکم نوع بشر کے لئے سجدے کا حکم تھا اور آدمؑ انسانی نوع کا نمائندہ اور قبلہ قرار پائے تھے جن میں نوع بشر مجسم ہوئی تھی۔ یہ سجدہ تشریفاتی عمل نہیں تھا بلکہ ایک حقیقی اور واقعی عمل تھا جس کے مطابق خلقت کے اعتبار سے فرشتوں کو بشر

کی نوع کے سامنے جھکنا تھا۔ لہٰذا فرشتے اپنی خلقت کی غرض کے اعتبار سے انسان کی خلقت کی غرض کے سامنے خاضع ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور انہیں انسان کی سعادت کی راہ میں انسان کے خدمت گزار اور معاون قرار دیا ہے۔ انسان کو اپنی قرب اور کمال کا وہ مقام اور منزلت عطا کیا ہے جو فرشتوں کے کمال اور ان کے قرب کے مقام سے بالاتر ہے۔ لہٰذا ابلیس کا نوع انسان کے سامنے خاضع ہونے سے انکار کرنا اور اس کی سعادت کے لیے عمل کرنا اس کے کمال مطلوب تک پہنچنے کی راہ میں مدد کرنے کے مترادف ہے۔ جبکہ فرشتوں نے اللہ کا حکم مانا اور نوع بشر کے سامنے خاضع ہوئے جبکہ ابلیس نے سجدہ نہ کیا اور اپنے آپ کو فرشتوں کی جماعت سے باہر نکال کھڑا کیا۔

انسان کا کمال فقط اس میں ہے کہ وہ نظام الٰہی کے تحت چلے اور اپنے آپ کو خداوند کے قوانین، احکام اور شریعت سے ہم آہنگ کرے۔ جبکہ ابلیس کی کوشش ہوتی ہے کہ انسان اپنے کمال مطلوب تک نہ پہنچے، اسی لیے وہ انسان کو حیوانی تمایلات کی طرف دھکیلتا ہے اور اسے معصیتوں کے ارتکاب پر آمادہ کرتا ہے اور اسے قراردادی نظامات کے انتخاب کرنے اور شرک اور نفسانی خواہشات پر مبنی سسٹم پر چلنے میں مصروف رکھتا ہے۔انسان کے خلاف ابلیس کے یہ اعمال اس کی انسان سے اس دشمنی اور عداوت کا نتیجہ ہیں جس کا اس نے خلقت بشر کے پہلے دن سے ہی اظہار کیا اور انسان کی نوع سے بیزاری کا اعلان کیا اور کہا کہ جب تک بشر کا وجود ہے وہ اس کی دشمنی سے نہیں ہٹے گا۔

در حقیقت ابلیس یہ کہنا چاہتا تھا کہ اے خدا! تو نے مجھے قیامت تک دھتکار دیا ہے پس مجھے اتنی لمبی عمر دے کہ میں قیامت تک باقی رہوں اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا مستجاب کی اور اسے مہلت ملی تو اس نے انسان کے ساتھ اپنی دشمنی کا کھلم کھلا اظہار کر

دیا اور کہا کہ میں یقینی طور پر انسانوں کو گمراہ کروں گا اور انہیں تیری طرف نہیں آنے دُوں گا، جس طرح تو نے مجھے اپنے دربار سے نکالا ہے میری کوشش ہو گی کہ انسانوں کو تیرے دربار سے نکالوں۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾

"فرمایا بے شک تجھے مہلت ہے"۔

اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾

"وقت معلوم کے دن تک"۔

ابلیس کی درخواست کی منظوری

خداوند تبارک و تعالیٰ نے ابلیس کی درخواست منظور کی اور اسے مہلت دی، اسے مہلت قیامت تک نہیں دی بلکہ روز معلوم تک دی۔ روز معلوم، قیامت اور مردوں کے اٹھنے سے پہلے ہے۔ ابن عباس کے قول کے مطابق " اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ " سے تکلیف کا آخری دن مراد ہے۔ نفخہ اول کا دن جس دن سارے خلائق مر جائیں گے۔ لیکن قرآن کریم کی صریح آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ظہور حضرت حجت علیہ السلام کے زمانے میں نوع بشر کی اصلاح ہو جائے گی اور اس عصر میں سب ہدایت پائیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کی مہلت کا دن اس وقت ختم ہو جائے گا جس دن انسان کی اصلاح کے لئے حضرت امام مہدی) عج (کا ظہور پرنور ہو گا اور زمین سے کلی طور پر فساد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لہٰذا آپؑ کی آمد کے بعد ابلیس کے وجود کا بھی خاتمہ ہو گا اور پھر انسان اللہ کی زمین پر نیک بن کر رہے گا اور کوئی معصیت نہیں ہو گی۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾

''کہا اے میرے رب ! جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے البتہ ضرور میں زمین میں انہیں ان کے گناہوں کو مرغوب کر کے دکھاؤں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا''۔

ابلیس کا اعلان

شیطان کا مقصود کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ کیا؛ آدم کے لیے اس کا سجدہ کرنے سے انکار کرنا نہ تھا کیونکہ خدا نے اس کا جواب بھی نہیں دیا بلکہ اس گمراہی سے اس کا مقصود وہ گمراہی ہے جو الٰہی خطاب سننے کے بعد ابلیس نے محسوس کیا اور یہ جان لیا کہ خدا کی مطلق لعنت اس پر ہے اور وہ رحمت حق اور راہ سعادت سے دور ہو گیا ہے اور اس کا گمراہ ہونا حتمی ہے۔ جیسا کہ باقی گمراہوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ابلیس کی گمراہی ابتدائی گمراہی نہیں تھی بلکہ یہ گمراہی سزا کے طور پر اسے ملی تھی۔

اسی بات سے شیطان کا اغواء لوگوں کو گمراہ کرنے کا معنی سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، اس وجہ سے کہ شیطان خود رحمت حق اور سعادت سے دُور ہوا، اللہ نے اسے دُور نہیں کیا لہٰذا ہر وقت وہ وسوسوں کے ذریعہ جب کسی کے دل میں راستہ پیدا کرتا ہے اور جس کے قریب ہو جاتا ہے تو وہ شخص خدا سے اور خدا کی رحمت سے دُور ہونے کا خود موجب بن جاتا ہے ۔ شیطان حقیقت میں اپنی گمراہی کا اثر اس شخص کے دل میں چھوڑتا ہے۔ بہرحال شیطان کہہ رہا ہے کہ خداوندا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے تو میں بھی دُنیا کی زندگی میں معصیتوں اور باطل کو زینت بنا کر لوگوں کے لئے پیش

کروں گا اور اُنہیں گمراہ کروں گا۔ جس طرح میں گمراہ ہوا ہوں انہیں بھی اسی طرح گمراہ کروں گا۔

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

''سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں سے مخلص ہوں گے''۔

مخلص بندوں کا استثناء

شیطان نے اعلان کیا کہ اے اللہ! میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا لیکن تیرے خالص بندوں کو گمراہ نہیں کر سکوں گا۔ مخلص وہ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کیا ہے، یقینی طور پر وہی لوگ اپنے آپ کو اللہ کے لیے خالص کر سکتے ہیں جنہیں اللہ نے اپنے لئے خالص کیا ہے، وہ سوائے اللہ کے کسی کی اطاعت نہیں کرتے اور اللہ کے سامنے تسلیم محض ہیں اور حق تعالیٰ کے لئے خالص ہوئے ہیں ۔ حق بندگی اور حق عبودیت بھی یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے مولا کے لئے خالص کرے اور اپنے مالک کے علاوہ کسی کا مِلک نہ بنے اور یہ امر اسی صورت میں محقق ہو گا جب آدمی خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنا مالک اور مولا نہ سمجھے، یہاں تک کہ خود کو اپنی ذات، اپنے اعمال اور اپنے آثار کا مالک بھی نہ سمجھے۔ مِلک اور مُلک سب فقط اللہ کی ذات کے لئے ہے اور جس کا عقیدہ حقیقی معنوں میں اس طرح کا ہو اس نے اپنے آپ کو اللہ کے لیے خالص کیا ہے، اور یہی مخلص لوگ ہیں جن کو شیطان نے اس آیت میں استثناء کیا ہے۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾

''فرمایا یہ راستہ مجھ پر سیدھا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ

تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ جس طرح دریا کا راستہ طے کرنے کے لیے کشتی کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح راہ شیطان کا خدا پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دوسری تمام چیزوں کی طرح راہ شیطان بھی اللہ کے حکم اور اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ سارے امور کا آغاز بھی اللہ تعالیٰ سے ہے اور سب امور نے اللہ کی جانب پلٹ کر جانا ہے۔ اللہ کے سواء کوئی بھی بندوں کے امور کا مالک نہیں ہے۔ اللہ کے سواء کسی کو بھی حکم جاری کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ کلام شیطان کی اس بات کا جواب ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ میں لوگوں کو گمراہ کروں گا، میں یہ کروں گا اور وہ کروں گا، میں ہر چیز کو زینت بنا کر پیش کروں گا۔ اگر تو نے خیال کیا ہے کہ تو ان اعمال کو انجام دینے میں مستقل ہو گا اور اپنی قوت سے ایسا کرے گا تو یہ تمہاری بہت بڑی غلطی ہے، (اللہ فرمارہا ہے) کیونکہ میں مدبر ہوں، میں ساری کائنات کا مالک ہوں اور کائنات میں جو بھی عمل ہو گا یا جس کا بھی اثر ہو گا تو وہ میری مشیت اور ارادے سے ہو گا، میں نے ہی یہ حکم جاری کیا ہے کہ توں لوگوں کو دھوکہ دے اور لوگوں کو اختیار دیا ہے کہ وہ تیرے دھوکے میں نہ آئیں، ان کو واضح بتایا ہے کہ ابلیس تمہارا سخت ترین دشمن ہے، اس کی پیروی مت کرو لیکن میری تنبیہ کے باوجود کوئی تیری پیروی کرتا ہے تو اس کی سزا اسے ملے گی اور جو کچھ اس نے اپنے لئے چنا ہے اس کی تاثیر میں نے رکھی ہے وہ اسے ملے گی، یہ تیرا اختیار نہیں ہے، یہ سارا اختیار میرا ہے۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾

”بے شک میرے بندوں پر تیرا کچھ بھی بس نہیں چلے گا مگر جو گمراہوں

میں سے تیرا تابعدار ہوا"۔

اللہ کے خالص بندوں پر شیطان کا اختیار نہیں

یہ وہی حکم ہے اور فیصلہ ہے جس کے متعلق پچھلی آیت میں بتایا گیا کہ شیطان کو انسان کو گمراہ کرنے کی اجازت دینے میں اللہ کے سوا کسی کی دخالت نہیں ہے۔ اس آیت میں جس چیز کو بتایا جارہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام بنی آدم اللہ کے بندے ہیں، ایسا نہیں ہے جیسا ابلیس نے خیال کیا ہے کہ فقط مخلصین اللہ کے بندے ہیں اور باقی اللہ کے بندے نہیں ہیں۔ مخلصین کیونکہ اللہ کے بندے ہیں، خداوند نے شیطان کو ان پر تسلط نہیں دیا ہے کہ جب چاہے وہ مستقل طور پر ان کے متعلق جو چاہے انجام دے اور ان کو گمراہ کرے، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ سارے افراد بشر اللہ کے بندے ہیں اللہ ان سب کا مالک ہے، اللہ سب کے امر کا مدبر ہے۔ شیطان ان پر مسلط ہوتا ہے جو خود شیطان کی پیروی میں آنا چاہیں اور اپنا انجام شیطان کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں تو شیطان ان پر مسلط ہوتا ہے۔

اس آیت میں تین لحاظ سے ابلیس کا جواب دیا گیا ہے اور اس کی بات رَد کی گئی ہے:۔

۱۔ ابلیس نے خدا کے بندوں کو مخلصین میں منحصر کیا ہے کہ فقط مخلصین ہی اللہ کے بندے ہیں باقی اللہ کے بندے نہیں ہیں۔ اللہ نے اس کے اس خیال کو رَد کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سارے انسان اللہ کے بندے ہیں۔ نافرمان بھی اللہ کے بندے ہیں اور فرمانبردار بھی اللہ کے بندے ہیں، خالص بھی اللہ کے بندے ہیں اور ناخالص بھی اللہ کے بندے ہیں۔

۲۔ ابلیس نے انسان کو گمراہ کرنے میں استقلال کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میں

انہیں گمراہ کروں گا۔ لیکن اللہ نے اس کے دعویٰ کی نفی کی ہے اور اسے سمجھایا ہے کہ سارے اعمال اللہ کے فیصلے کے تحت جاری ہوتے ہیں اور اگر اسے بعض بنی آدم پر تسلط حاصل ہے تو وہ اللہ کی مشیت سے ہے۔ جو گمراہ ہیں، گناہگار ہیں وہ شیطان کے پیرو ہیں اور شیطان ان پر مسلط ہوا ہے۔

۳۔ گمراہوں پر ابلیس کا تسلط ابتدائی گمراہی نہیں ہے بلکہ یہ ان کے لیے سزا ہے اگر کچھ لوگ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں تو یہ اُن کو سزا ملی ہے اس گمراہی کی جس کے وہ اس سے پہلے مرتکب ہوئے ہیں اور انہوں نے اللہ کے راستے کو چھوڑا ہے اور اللہ کی دعوت کو رد کیا ہے، اللہ کی آیات کو جھٹلایا ہے جس کے نتیجے میں وہ شیطان کے ہتھے چڑھے ہیں۔

وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٤٣﴾

"اور بے شک ان سب کا وعدہ دوزخ پر ہے"۔

جہنم، شیطان اور اس کے پیروکاروں کا ٹھکانہ

جہنم ایسی جگہ ہے جہاں پر اللہ نے شیطان اور اس کے پیروکاروں کو عذاب دینے کا وعدہ کیا ہے اور کہا ہے کہ توں اور تیرے پیروکار اسی جہنم میں پہنچو گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تمام امور کی بازگشت اسی کی طرف ہونے کی ایک اور دلیل ہے لہٰذا شیطان کے پیروکاروں کو اس دنیا میں گمراہی کی صورت میں سزا ملتی ہے اور آخرت میں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿٤٤﴾

"اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لیے ان کے الگ الگ حصے

ہیں"۔

جہنم کے سات دروازے

جہنم کے سات دروازوں سے سات قسم کے عذاب مراد ہیں (البتہ خداوند تبارک و تعالیٰ اس کے بارے زیادہ دانا اور آگاہ ہے)ان میں سے ہر قسم کا عذاب جہنم میں داخل ہونے والوں کے مطابق چند قسم کا ہوگا۔ آیت کے اس معنی میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ جہنم جانے کے گناہ سات قسم کے ہیں اور وہ راستے بھی سات ہیں جو انسان کو گناہ کی جانب کھینچ کر لے جاتے ہیں۔[1] آیت کے معنی کے متعلق ہم نے جو کہا کہ جہنم کے سات دروازوں سے، جہنم کے سات قسم کے عذاب اور عذاب کے سات درجے مراد ہیں،اس بارے روایات بھی نقل ہوئی ہیں۔[2]

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾

"بے شک پرہیزگار باغوں اور چشموں میں رہیں گے"۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾

"ان باغوں میں سلامتی اور امن سے جا کر رہو"۔

وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾

"اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب دور کر دیں گے سب بھائی

---

[1] ۔ بعض عرفاء کے نزدیک جہنم کے دروازوں کی تعداد انسان کے منافذ (جاری ہونے کی جگہ یا گزر گاہ کے معنی میں ہے) کی تعداد کے مطابق ہے آنکھ، کان، ناک، زبان، دل اور دو دیگر منافذ۔ (مصحح)

[2] ۔کتاب البعث میں عتبہ بن عبد اللہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ بہشت کے آٹھ دروازے ہیں اور جہنم کے سات دروازے ہیں جن میں سے بعض دوسرے بعض سے برتر ہیں۔ (مترجم)

بھائی ہوں گے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھنے والے ہوں گے"۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿٤٨﴾

"انہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے"۔

اہل بہشت کا تذکرہ

ان آیات میں اہل بہشت کا تذکرہ ہے جو تقویٰ اختیار کرنے والے اور اللہ کے احکام کی پیروی کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرنے والے ہیں، ان افراد کے لئے قیامت کے دن باغات اور بہشتوں میں جگہ ہو گی، جہاں چشمے جاری ہوں گے۔ وہاں ان سے کہا جائے گا کہ بہشت میں داخل ہو جاؤ جہاں تمہارے لئے سلامتی ہے، امن میں رہو، تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا، کوئی ضرر تمہارے لئے نہیں ہو گا۔

"غِلّ" حسد، بغض اور کینہ کو کہتے ہیں جو دوسروں کو تکلیف اور اذیت پہنچانے کا باعث بنتا ہے۔ ان آیات میں بہشت میں داخل ہوتے وقت متقین کی وصف بیان کی جا رہی ہے کہ کسی کے دل میں کوئی بغض و کینہ نہیں ہو گا، کسی سے کوئی نفرت نہیں ہو گی بلکہ سارے ایک دوسرے سے پیار اور محبت کر رہے ہوں گے، ایک دوسرے کو سلام کر رہے ہوں گے، ایک دوسرے سے خوش ہوں گے، آپس میں بھائی بھائی ہوں گے، ایک دوسرے کے سامنے تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اور ایک دوسرے کے لئے دعائیں دے رہے ہوں گے اور ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر رہے ہوں گے۔ وہاں پر کوئی تھکاوٹ نہیں ہو گی، کہیں سے انہیں تکلیف نہیں پہنچے گی اور جس جگہ پہنچیں گے وہاں سے خارج نہیں ہوں گے، وہیں پر رہیں گے اور ہمیشہ

سعادت و کرامت میں رہیں گے، خوشی میں رہیں گے۔ یہ متقین کے لیے اللہ تعالیٰ کا بدلہ ہے جنہوں نے دُنیا میں تقویٰ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت الفردوس عطا کی۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾

"میرے بندوں کو اطلاع دے کہ بے شک میں بخشنے والا مہربان ہوں"۔

وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

"اور بے شک میرا عذاب تو وہ دردناک عذاب ہے"۔

اللہ کی رحمت اور اس کا عذاب

اللہ تعالیٰ کا پیغمبرؐ اکرم سے خطاب ہے کہ میرے بندوں سے کہہ دو کہ میں بہت مہربان ہوں، بہت بخشنے والا ہوں اور میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب سارے بندوں کو ہے۔ان دو آیات میں کئی تاکیدیں لائی گئی ہیں جن میں دونوں جملوں کا اسمیہ لایا جانا، ضمیر کا منفصل لایا جانا، خبر پر الف لام کا داخل ہونا۔ ان ساری تاکیدات سے یہ سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفات جو ان آیات میں ذکر ہوئی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت بھی بے حساب ہے اور اس کا عذاب بھی نہایت دردناک اور سخت ہے اور دونوں صفتیں اپنی آخری حد کو پہنچی ہوئی ہیں اس طرح سے کہ اس کا نہ تو کوئی اندازہ لگا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں کسی معیار پر تولا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان کا کسی دوسری چیز سے تقابل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی بندے کو اللہ کی مغفرت و رحمت سے نااُمید نہیں ہونا چاہیے اور کوئی اللہ کے عذاب کو حقیر اور اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے محفوظ بھی نہ سمجھے کیونکہ خداوند ہر امر پر غالب ہے۔ ان دو آیتوں میں

خوف و رجاء دونوں حالتوں کی یاددہانی کرائی گئی ہے تاکہ بندے نہ تو اللہ کی رحمت اور بخشش سے ناامید اور مایوس ہوں اور نہ ہی اللہ کے عذاب کو معمولی شمار کریں۔

اس بارے (سورۂ زمر، آیت: ۵۳) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

ترجمہ: ”اے رسول کہہ دو: اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، اللہ سب گناہوں کو بخش دے گا، وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے“۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾

”اور انہیں ابراہیم کے مہمانوں کا حال سنا دو“۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾

”جب اس کے گھر میں داخل ہوئے اور کہا سلام، اس نے کہا بے شک ہمیں تم سے ڈر معلوم ہو رہا ہے“۔

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾

”کہا ڈرو مت بے شک ہم تمہیں ایک لڑکے کی خوشخبری سناتے ہیں جو بڑا عالم ہوگا“۔

ابراہیمؑ کیلئے بیٹے کی خوشخبری

ان تین آیتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے پاس آنے والے مہمان کا تذکرہ کیا گیا

ہے۔ در حقیقت وہ اللہ کے چند مکرم فرشتے تھے جو حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت دینے اور قوم لوط کی ہلاکت کی خبر دینے کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے حضرت ابرہیمؑ کو سلام اور تحیت پیش کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اُن کے لئے گوشت بھون کر کھانے کا انتظام کرلیا، لیکن جب دیکھا کہ وہ تو کچھ کھا نہیں رہے تو کہا ہم آپ سے ڈر رہے ہیں کیونکہ کسی کے گھر جاکر ان کے ہاں کھانا نہ کھانا دشمنی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ عجیب ہے تم ہمارا کھانا نہیں کھا رہے، ہمیں تو آپ سے ڈر لگ رہا ہے۔ تو اس پر فرشتوں نے کہا آپ مطمئن رہیں اور نہ ڈریں، ہم تو اللہ کی طرف سے نمائندے بن کر آئے ہیں اور تمہیں ایسے بیٹے کی خوشخبری دینے آئے ہیں جس کے پاس علم الٰہی ہو گا اور اس پر اللہ کی جانب سے وحی ہو گی۔ اس طرح انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کی پریشانی دُور کی اور بتادیا کہ ہم قوم لوط کی طرف جا رہے ہیں اور وہاں جا کر انہیں ان کی ہلاکت کی خبر دینی ہے۔ ان کے جرائم کی وجہ سے اس بستی کو الٹ پلٹ کر دینا ہے۔

قَالَ اَبَشَّرۡتُمُوۡنِیۡ عَلٰۤی اَنۡ مَّسَّنِیَ الۡکِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوۡنَ ﴿۵۴﴾

''کہا مجھے اب بڑھاپے میں خوشخبری سناتے ہو، سو کس چیز کی خوشخبری سناتے ہو''۔

حضرت ابراہیمؑ کا تعجب

حضرت ابراہیمؑ اگرچہ اللہ کے نبی تھے اور حق تعالیٰ کی رحمت سے نااُمید بھی نہیں تھے لیکن کیونکہ بڑھاپے کے آثار اپنے اندر مشاہدہ کر رہے تھے اور ان کی بیوی بھی بانجھ تھی اور جوانی میں بھی ان سے بچہ نہیں ہوا تھا اس لیے حیرانگی اور تعجب سے کہا کہ تمہاری اس بشارت سے مجھے حیرت ہوئی ہے کہ میں اس بڑھاپے میں کیسے

صاحب فرزند ہو جاؤں گا جبکہ جوانی میں نہیں ہوا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔ اگر وہ بانجھ نہ ہوتی تو اب تک بیٹا پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ طبیعی طور پر یہ امر محال تھا اور یہ بہت عجیب بات تھی اس لیے دوبارہ سوال کیا کہ کیا تم مجھے بیٹے کی بشارت دے رہے ہو؟

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿٥٥﴾

''انہوں نے کہا ہم نے تمہیں سچی خوشخبری سنائی ہے سو تم ناامید نہ ہو''۔

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿٥٦﴾

''کہا اپنے رب کی رحمت سے ناامید تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں''۔

اللہ کی رحمت سے نااُمیدی گمراہی ہے

جب حضرت ابراہیمؑ نے تسلی اور اطمینان کے لئے دوبارہ فرشتوں سے پوچھا تو انہوں نے جواب میں کہا ہم جو بشارت دے رہے ہیں یہ حق پر مبنی ہے اور یہ اللہ کی قدرت سے بعید بھی نہیں ہے اور تم رحمت خدا سے نااُمید ہونے والوں میں مت شامل ہو جاؤ۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ سن کر کہا تم بالکل ٹھیک کہتے ہو کہ اللہ کی رحمت سے کوئی بھی مایوس نہیں ہوتا مگر وہ جو گمراہ ہوتا ہے اور رحمت الٰہی سے نااُمیدی ایک قسم کا گناہ ہے اور میں گمراہوں میں سے نہیں ہوں۔ میرا سوال نااُمیدی کی وجہ سے نہ تھا کہ اللہ کی رحمت سے میں نااُمید ہوں بلکہ یہ بات مجھے عجیب لگی، میں نے تعجب اور حیرت کی وجہ سے آپ سے دوبارہ سوال کیا تھا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٥٧﴾

''کہا اے فرشتو! پھر تمہارا کیا مقصد ہے''۔

ابراہیمؑ کا فرشتوں سے دوسرا سوال

"خَطْبُ"بہت بڑا اور خطرناک امر۔ چونکہ انہوں نے بتایا تھا کہ ہم اللہ کی جانب سے آئے ہیں اسی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم کس بڑے کام کے لئے بھیجے گئے ہو؟

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٥٨﴾

"انہوں نے کہا ہم ایک نافرمان قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں"۔

اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥٩﴾

"مگر لوط کے گھر والے کہ ہم ان سب کو بچا لیں گے"۔

اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٦٠﴾

"مگر اس کی بیوی کو، ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہے"۔

مجرمین کی ہلاکت

حضرت ابراہیمؑ کے سوال پر فرشتوں نے جواب دیا کہ ہمیں گناہگار گروہ کی طرف بھیجا گیا ہے جو پلید، نجس اور غلط کار قوم ہیں اور گندے کاموں میں آلودہ ہیں۔ ہم اللہ کی طرف سے آئے ہیں تاکہ اس قوم کو تباہ و برباد کر دیں اور اُن کا صفایا کر دیں اور اس مجرم جماعت میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے، فقط لوط کا خاندان بچ جائے گا۔

" غابر" اسے کہتے ہیں جس کا ساتھی چلا جائے اور اس کے بعد وہ تنہا رہ جائے

یا وہ جس کی عمر طولانی ہو چکی ہو۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قوم لوط کو تباہ کیا جائے گا لیکن لوط کا گھرانہ استثناء کیا گیا ہے، وہ اس عذاب سے نجات پائیں گے۔البتہ نجات پانے والے لوط کے گھرانے میں لوط کی بیوی شامل نہیں تھی اور اسے نجات نہیں ملی۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے طے کیا تھا کہ وہ مجرم قوم کے پاس ہی باقی رہے اور قوم لوط کے ہمراہ وہ بھی فنا ہو۔اللہ کا حکم تھا کہ لوط اور اس کے باقی گھر والے شہر سے نکل جائیں تاکہ عذاب سے بچ جائیں لیکن لوط کی نافرمان بیوی جو سازشیوں اور مجرموں کے ساتھ تھی وہ نجات نہ پا سکی اور عذاب نے اس کو بھی گھیر لیا۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوۡطِ ۣالۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۶۱﴾

"پھر جب لوط کے گھر فرشتے پہنچے"۔

قَالَ اِنَّكُمۡ قَوۡمٌ مُّنۡكَرُوۡنَ ﴿۶۲﴾

"کہا بے شک تم اجنبی لوگ ہو"۔

لوطؑ کے پاس فرشتوں کی آمد

فرشتے حضرت لوط کے پاس بہت ہی خوبصورت جوان کی شکل میں آئے، ان کے خوبصورت بال تھے، چہرہ خوبصورت تھا، جسم بڑا مناسب تھا۔ حضرت لوط اپنی قوم کے پلید اور نجس اعمال سے آگاہ تھے کہ وہ کس طرح کھلی فحاشی کے مرتکب ہوتے ہیں، لواطت میں غرق ہیں تو ان خوبصورت جوانوں کو دیکھ کر حضرت لوط وحشت زدہ ہوئے اور اُن کی آپ کے ساتھ ملاقات آپ کے لئے بہت ہی پریشانی کا باعث بنی۔ ان سے کہا کہ تم اجنبی لگتے ہو۔

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾

"انہوں نے کہا بلکہ ہم تیرے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس میں وہ جھگڑتے تھے"۔

وَ اَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾

"اور ہم تیرے پاس پکی بات لائے ہیں اور بے شک ہم سچ کہتے ہیں"۔

قوم لوط کا معاملہ

حضرت لوط اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے لیکن ان کی قوم کو عذاب الٰہی کے آنے کے بارے میں شک تھا۔ "حق" سے اللہ کا حتمی فیصلہ مراد ہے جو قوم لوط کے بارے میں دے دیا گیا تھا، جس نے ہر صورت میں واقع ہونا تھا اور ان کے لیے یہ عذاب ناگزیر ہو چکا تھا۔ اس بارے (سورۂ ھود، آیت :٧٦) میں آیا ہے:

وَ اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿٧٦﴾

ترجمہ "اور ان پر واپس نہ پلٹنے والا عذاب آئے گا"۔

اس کے بعد اُنہوں نے کہا ہم جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کریں گے، ہم اپنی بات میں سچے ہیں اور اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ اتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّ امْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٥﴾

"پس تم اپنے گھر والوں کو کچھ رات رہے لے نکلو اور تو ان کے پیچھے چلو اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جاؤ جہاں تمہیں حکم ہے"۔

لوطؑ کے متعلق فیصلہ

"اسراء" رات کے وقت سفر کرنے کو کہتے ہیں۔ "بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ" رات کا ایک حصہ گزر جائے۔ اس آیت میں حضرت لوط کو حکم دیا گیا ہے کہ جب رات کاایک حصہ گزر جائے تواپنے اہل و عیال کو لے کر یہاں سے نکل کھڑے ہو اور اُن کو آگے آگے رکھو اور خود ان کے پیچھے چلو تاکہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے۔ خبردار پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔ تمہیں جو حکم ہوا ہے اسی کے مطابق آگے بڑھو، تمہارے سامنے اللہ کی طرف سے ہدایت ہے ایک ہادی اور الٰہی قائد اُن کو ہدایت دے رہا تھا اور انہیں آگے لے جا رہا تھا۔ اس طرح انہیں عذاب والی جگہ سے دُور لے جانا تھا۔ حضرت لوط اپنے گھر والوں کے ساتھ ان کے پیچھے چل رہے تھے۔

وَقَضَيۡنَآ اِلَيۡهِ ذٰلِكَ الۡاَمۡرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِيۡنَ ﴿٦٦﴾

"اور ہم نے لوط کو قطعی طور پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ صبح ہوتے ہی ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی"۔

مجرموں کے متعلق اللہ کا فیصلہ

اس آیت میں "قضا" وحی کے معنی میں ہے اور "امر" سے قوم لوط پر آنے والا عذاب مراد ہے اور "ذالک" اسم اشارہ ہے جو دُور کے اشارے کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہاں پر اس کے ذریعے قوم لوط پر آنے والے عذاب کی وحشت اور عظمت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرمارہا ہے کہ ہم نے لوط کو وحی کی کہ تیری قوم کے عذاب کے متعلق حتمی فیصلہ ہو چکا ہے اور اسی رات یہ عذاب آئے گا اور اُن کی نسل، عمارتیں اور ان کے اعمال سب مٹ جائیں گے اور ان کا نام و نشان تک

باقی نہ رہے گا۔

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾

”اور شہر والے خوشیاں کرتے ہوئے آئے“۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾

”لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں سو مجھے ذلیل نہ کرو“۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾

”اور اللہ سے ڈرو اور مجھے بے آبرو نہ کرو“۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾

”انہوں نے کہا کیا ہم نے تمہیں دنیا بھر کی حمایت سے منع نہیں کیا ہے“۔

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾

”کہا یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں اگر تم کرنے والے ہو“۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾

”تیری جان کی قسم ہے وہ اپنی مستی میں اندھے ہو رہے تھے“۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

”پھر دن نکلتے ہی انہیں ہولناک آواز نے آ لیا“۔

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾

”پھر ہم نے ان بستیوں کو زیر و زبر کر دیا اور ان پر کنکر کے پتھر برسائے

"۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ ﴿۷۵﴾

"بے شک اس واقعہ میں اہلِ بصیرت کے لیے نشانیاں ہیں"۔

وَ اِنَّہَا لَبِسَبِیۡلٍ مُّقِیۡمٍ ﴿۷۶﴾

"اور بے شک یہ بستیاں سیدھے راستے پر واقع ہیں"۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿ؕ۷۷﴾

"بے شک اس میں ایمانداروں کے لیے نشانیاں ہیں"۔

لوطؑ کے گھر پر مجرموں کا حملہ

جب مجرمین نے دیکھا کہ بڑے خوبصورت لڑکے حضرت لوطؑ کے گھر آئے ہیں تو فورا آگئے۔ حضرت لوطؑ نے کہا یہ میرے مہمان ہیں اور اپنے مہمانوں کے دفاع کے لئے جلدی سے آگے کھڑے ہوگئے اور کہا مجھے ان مہمانوں کے سامنے تم رسوا نہ کرو، ان کے ساتھ برا عمل انجام نہ دو، اللہ سے ڈرو اور مجھے اپنی اس بری خواہش کے تحت ذلیل و خوار نہ کرو۔ مجرموں نے حضرت لوطؑ کی اس درخواست پر کہا کہ ہم نے نہیں کہا تھا کہ اپنے گھر اجنبی لوگوں کو مت آنے دو؟ اور اگر کہیں سے کوئی بندہ تیرے گھر آگیا تو پھر اس کے حق میں سفارش نہ کرنا اور نہ ہی اس کا دفاع کرنا۔ حضرت لوط نے جب دیکھا کہ وہ اس حرکت سے باز آنے والے نہیں ہیں تو اپنی لڑکیوں کو ازدواج کے لئے پیش کیا اور کہاان مہمانوں کو کچھ نہ کہو، یہ میری بیٹیاں خوبصورت بھی ہیں ،ان سے شادی کر لو۔

حضرت لوطؑ چاہ رہے تھے مہمانوں کو بچا لیں جس کے لیے انہوں نے اپنی

بیٹیاں فدیہ کردیں۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی بات کے لئے پیغمبر اکرم ﷺ کی جان کی قسم اُٹھائی کہ یہ قوم اتنی غفلت کی مستی میں غرق تھی اور شہوت میں سرگرداں تھے کہ بالکل متوجہ نہیں ہوئے کہ وہ کیا کررہے ہیں۔ وہ اپنے جرم کی بڑی سزا سے غافل تھے۔ اچانک ایک خوفناک آواز چنگھاڑ آسمان سے آئی اور اس نے ان سب کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ یہ آواز صبح کے وقت آئی اور اس نے پورے شہر کو تہس نہس کرکے رکھ دیا، نیچے سے اوپر، اوپر سے نیچے ہر طرف سے پتھر برس رہے تھے اور یہ لوگ جو فطرت کے طریقے کو چھوڑ کر عورتوں کی بجائے مردوں سے اپنی جنسی خواہش پوری کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بھی آسمان اور زمین کے ان کے اوپر تہہ و بالا کر دیا اور ان کے اوپر پتھروں کی بارش کا عذاب اُتار دیا، ایسے پتھر جو زہریلے تھے جن پر نشان لگے ہوئے تھے اور بڑے پکے نشانے پر لگ رہے تھے ۔ وہ ایسے تھے کہ حقیقت حال اور باطن کو سمجھ رہے تھے۔ لوط کی قوم کی نشانیاں اور ان کے بقایا کچھ کو بھی باقی نہیں چھوڑا۔

یہ سب اس لئے بیان کیا جارہا ہے تاکہ سمجھدار مومنین کے لئے عبرت ہو اور وہ دعوت حقہ الٰہی پر ثابت قدم رہیں اور انذار اور ڈرانے کی حقیقت سے آشنا ہوں۔ یہ آثار اور یہ نشانیاں ہر راہ گزر کے لئے ہیں اور ابھی تک پوری طرح نابود نہیں ہوئیں اور ان کی تباہی کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی آیات کو جھٹلانے والوں اور پیغمبروں کی تائید نہ کرنے والوں کو سزا دے گا۔ تو یہ نشانی ہے کہ کس طرح وہ مجرموں کو سزا دیتا ہے اور دعوت الٰہی کی حقانیت پر دلیل ہے۔ یہ مومنین کے لئے عبرت ہے اور مومنین کو بتانا ہے کہ پیغمبر جو آتے ہیں اور لوگوں کو آکر انذار کرتے ہیں، ڈراتے ہیں یہ سب حقیقت ہے، یہ کوئی افسانہ اور مذاق نہیں ہے۔ جھٹلانے والوں کو سزا ملنی ہے۔ یہ قریش مکہ کے لئے ایک تنبیہ بھی تھی کیونکہ جب

وہ تجارت کے لیے مکہ سے شام کی جانب جاتے تو راستے میں اس تباہی والے منظر اور قوم لوط کی ویرانی کا منظر ان کو نظر آتا تھا۔ یہ اس لئے بتایا گیا ہے تا کہ وہ اس سے عبرت حاصل کریں اور اللہ کے پیغمبرؐ کی دعوت کو نہ جھٹلائیں۔

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿٧٨﴾

''اور بن کے لوگ بھی بدکار تھے''۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٩﴾

''پھر ہم نے ان سے بھی بدلہ لیا اور یہ دونوں بستیاں کھلے راستہ پر واقع ہیں''۔

اصحاب الایکہ کی داستان

''الْاَيْكَةِ'' ان درختوں کو کہا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور ان کی شاخیں ایک دوسرے سے چپکی ہوتی ہیں۔'' اصحاب الایکہ'' حضرت شعیبؑ کی قوم کے ہم عصر تھے اور ایک جنگل کی سرزمین پر زندگی گزارتے تھے جہاں بہت زیادہ گھنے درخت تھے جو ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ ان دو قوموں یعنی قوم لوط اور اصحاب ایکہ کی رہائش کی جگہ ایک شاہراہ پر تھی اس سے شام اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ مراد ہے۔ یہ راستہ قوم لوط اور قوم شعیبؑ کے ٹھکانے سے گزرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب'' الْاَيْكَةِ''، قوم شعیبؑ کا ہی ایک گروہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اُن کے کفر کی وجہ سے انہیں ہلاک کیا تھا۔ اس آیت شریفہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ ستمگار تھے انہوں نے کفر کرکے اور اللہ کے نبی کو جھٹلا کر ظلم کیا اور ہم نے انہیں ہلاک کرکے ان سے انتقام لیا۔ یہ دونوں گروہ تمہاری ہدایت کے لیے واضح دلیل ہیں جن

سے تم عبرت لے سکتے ہو۔[1]

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٨٠﴾

''اور بے شک حجر والوں نے رسولوں کو جھٹلایا تھا''۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٨١﴾

''اور ہم نے انہیں اپنی نشانیاں بھی دی تھیں پر وہ ان سے روگردانی کرتے تھے''۔

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿٨٢﴾

''اور وہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے کہ امن میں رہیں''۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿٨٣﴾

''پھر انہیں صبح کے وقت سخت آواز نے آ پکڑا''۔

فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٤﴾

''پھر ان کے دُنیاوی ہنر ان کے کچھ بھی کام نہ آئے''۔

اصحاب الحجر

اصحاب حجر سے قوم ثمود مراد ہے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے شہر کا نام حجر تھا۔ان کے متعلق قرآن فرما رہا ہے کہ یہ لوگ پہاڑوں کے اندر پتھر والے گھر بناتے تھے۔ اس قوم نے سارے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ حالانکہ یہ حضرت صالح علیہ

[1] ۔امام مبین سے بڑا راستہ اور بڑی شاہراہ مراد ہے اور بعض نے امام مبین کا معنی کھلی دلیل ذکر کیا ہے۔

السلام کے ہم عصر تھے لیکن چونکہ سارے نبیوں کی دعوت ایک ہی ہے، جب کوئی ایک پیغمبر کو جھٹلاتا ہے تو گویا اس نے سب پیغمبروں کو جھٹلایا ہے اسی لئے حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلانے کی وجہ سے گویا کہ انہوں نے سارے پیغمبروں کو جھٹلایا ہے۔ بہر حال انہوں نے الٰہی معجزات سے منہ موڑ لیا اور اُن کی پرواہ نہیں کی۔

یہاں پر آیات سے حضرت صالح علیہ السلام کی ناقہ اور اس کو قتل کرنے کا واقعہ ہے اور اس کے بعد ان پر آنے والا عذاب مراد ہے۔ یا اس سے وہ معارف حقہ مراد ہیں جن کی تعلیم حضرت صالح علیہ السلام دیتے تھے۔ بہر حال اس قوم نے معارف حقہ اور اللہ کی نشانیوں کی پرواہ نہیں کی، ان سے منہ موڑے رکھا۔ یہ قوم پہاڑوں میں رہتی تھی اور بڑے بڑے غار بناتے تھے اور وہاں پتھروں کو تراش کر اپنے لیے گھر تیار کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ان گھروں میں وہ ہر قسم کے حادثات سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن ان کا کفر اور اللہ کی آیات کو جھٹلانا اس بات کا سبب بنا کہ آسمان سے زوردار آواز آئی اور عذاب الٰہی نے ان کو صبح دم آگھیرا اور ان کی دُنیاوی زندگی جو انہوں نے تیار کر رکھی تھی وہ سب ختم ہو گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا اور ان کی کوئی خوشبختی نہ رہی اور جتنی بھی انہوں نے تیاریاں کر رکھی تھیں اور اُن کے پکے مکان انہیں محفوظ نہ رکھ سکے، ان کو بچا نہ سکے اور اللہ کے عذاب کے سامنے کوئی چیز نہ ٹھہر سکی۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝۸۵

"اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کی درمیانی چیزوں کو بغیر حکمت کے پیدا نہیں کیا، اور قیامت ضرور آنے والی ہے، پر توں ان سے خوش خلقی کے

ساتھ کنارہ کر"۔

آسمانوں اور زمین کی برحق خلقت

اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے تو یہ حق کے مطابق ہے، حق سے جدا نہیں ہے اور ان کے خلق کرنے کا ایک ہدف اور مقصد ہے اور یہ سب بہت جلد اپنے رب کی طرف پلٹیں گے۔

غایت سے قیامت اور اللہ کی بارگاہ میں حاضری مراد ہے۔ پس آسمانوں اور زمین کی خلقت بغیر غرض کے اور کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ ان کی خلقت حق کی بنیاد پر ہے اور ان کی ایک غرض اور غایت ہے۔ لہٰذا اے پیغمبرؐ! اب جبکہ پورے عالم کی خلقت برحق ہے اور سب کفار اور جھٹلانے والوں نے اللہ کے حضور حساب کے لئے پیش ہونا ہے تو ان کے غلط رویے کے بارے میں تم فکر مند مت ہو جاؤ، ان سے بے توجہی کرو اور اُن کے ساتھ جھگڑو مت، ان پر لعن طن کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں تیرے رب نے پیدا کیا ہے اور وہ ان کے حالات و واقعات سے آگاہ ہے اور آخرکار ان کا مواخذہ کرے گا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿٨٦﴾

"بے شک تیرا رب وہی تو پیدا کرنے والا جاننے والا ہے"۔

اللہ کی خالقیت

یہ آیت پچھلی آیت کی علت بتا رہی ہے جب ان کفار اور تجھے جھٹلانے والوں کو اللہ نے خلق کیا ہے اور وہ ان کے ظاہر اور باطن سب سے آگاہ ہے تو تم ان سے درگزرو کرو، خدا خود ہی ان کا حساب لے لے گا۔ درحقیقت یہ پیغمبر اکرم کے لئے

تسلی ہے اور آپ کا حوصلہ بڑھایا گیا ہے کہ آپ کفار اور دشمنوں اور آپ کو جھٹلانے والوں کی وجہ سے غمزدہ اور پریشان نہ ہوں۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ﴿۸۷﴾

"اور ہم نے تمہیں سات آیتیں دیں جو (نماز میں) دہرائی جاتی ہیں اور قرآن عظمت والا دیا"۔

پیغمبر اکرمؐ پر قرآن کا نزول

صحیح روایات میں ہے کہ "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ" سے سورہ حمد مراد ہے۔ یہاں پر "مِن" تبعیض کے لئے آیا ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے (سورۂ زمر، آیت : ۲۳) قرآن کی ساری آیتوں کو مثانی کہا ہے: "كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ"۔ ترجمہ: "یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات متشابہ ہیں اور اس کی تلاوت کے وقت خدا سے ڈرنے والوں کے بدن پر لرزہ طاری ہوتا ہے"۔ سورہ حمد مثانی میں سے بعض ہے نہ کہ سب۔ بظاہر "مثانی" ثنی سے لیا گیا ہے جو عطف کرنے اور موڑنے کے معنی میں ہے۔ قرآن کی آیات کو اس لیے مثانی کہا گیا ہے کیونکہ بعض آیتیں دوسری بعض کی تفسیر کرتی ہیں اور بعض دوسری بعض کی طرف پلٹ رہی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں دوسری آیات کی تصدیق کرتی ہیں۔

یہ آیت سورہ حمد اور پورے قرآن کی عظمت کو بیان کر رہی ہے کیونکہ اس میں قرآن کو عظیم کہا گیا ہے اور سورہ حمد کو کل قرآن کے مقابلے میں قرار دیا گیا ہے اور کل قرآن کو سورہ حمد پر عطف کیا گیا ہے۔ اس آیت کا مقصد حضور پاک ﷺ کو تسلی بھی دینا ہے اور آپؐ پر احسان جتانا بھی ہے کیونکہ بشر کی سعادت اور ہدایت کی

حامل جامع کتاب قرآن کریم رسول اللہ ﷺ پر اتاری گئی ہے جو آپؐ کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ جھٹلانے والوں سے درگزر کریں اور حق تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہیں۔[1]

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾

"اور توں اپنی آنکھ اٹھا کر بھی ان چیزوں کو نہ دیکھ جو ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو استعمال کے لیے دے رکھی ہیں اور ان پر غم نہ کر اور اپنے بازو ایمان والوں کے لیے جھکا دے"۔

پیغمبر اکرمؐ کے لیے خصوصی ہدایت

لوگوں کی دُنیاوی زندگی پر نظر نہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں دے رکھا ہے اسے حسرت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ ازواج سے مرد اور عورتیں یا لوگوں کی اصناف یا بت پرست، یہودی، نصاریٰ او رمجوسی مراد ہیں۔ بہرحال اس آیت میں پیغمبرؐ کو دو چیزوں سے منع کیا گیا ہے اور ایک چیز کا حکم دیا گیا ہے۔ پہلی چیز جس سے منع کیا گیا ہے یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی میں جو نعمتیں لوگوں کو دی گئی ہیں ان کی

---

[1] ۔قرآن عظیم، اُم الکتاب، سورہ حمد کے بغیر عظیم نہیں ہے۔ اگرچہ قرآن کا ہر کلام عظیم ہے۔ سورہ حمد کو اس لحاظ سے سبع مثانی کہتے ہیں کیونکہ اسے ہر نماز میں دو دفعہ پڑھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں چھ آیات ہیں اور تمام سورتیں کل ملا کر ۱۱۴ ہیں، سب کی سب اکٹھی مبارک ہیں۔ جیسا کہ جلد اول کے مقدمہ میں ہم نے اس مطلب کو بیان کیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اہمیت کے اعتبار سے اس کی مانند تورات، انجیل اور زبور میں نہیں آیا ہے۔ (مصحح)

طرف میلان مت رکھو اور ان پر دل مت لگاؤ اور انہیں حسرت کی نظر سے مت دیکھو۔ دوسری چیز جس سے آپؐ کو منع کیا گیا ہے یہ ہے کہ ان کے جھٹلانے اور آپؐ کا مذاق اڑانے اور ضد اور ہٹ دھرمی پر غم مت کھائیں۔ جس چیز کا آپؐ کو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مومنوں سے نرم رویہ اپناؤ، مومنوں کے ساتھ تواضع اور فروتنی سے پیش آؤ، جس طرح پرندہ اپنے چھوٹے بچوں کو اپنی آغوش میں لیتا ہے اسی طرح آپؐ بھی مومنوں کو اپنی آغوش میں لے لیں۔

وَقُلْ اِنِّیْٓ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ ﴿٨٩﴾ۚ

"اور کہہ دو بے شک میں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں"۔

پیغمبر اکرمؐ کیلئے ایک اور دستور

اس آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو ایک اور دستور دیا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں عذاب الٰہی سے ڈرانے اور جو چیز تمہارے لئے ضروری ہے اس کی وضاحت کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اس بناء پر ان دو آیتوں میں پیغمبر اکرمؐ کو دو امر اور دو نہی کی گئی ہیں۔ کفار کو دیے گئے دنیاوی مال و متاع سے رغبت رکھنے سے منع، ان لوگوں کا کفر پر غم کھانے سے منع۔ مومنوں کے ساتھ نرم رویہ اور انکساری سے پیش آنے کا حکم اور اپنے فریضے کو آشکار و واضح اور روشن انداز سے بیان کرنے کا حکم۔ یہ وہی صفح جمیل ہے جو پیغمبرؐ سے طلب کی گئی ہے۔ اگر پیغمبرؐ میں ان چار خصوصیات میں سے کوئی ایک نہ ہو تو ان کی دعوت میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ۙ

"جیسا ہم نے) عذاب (ان بانٹنے والوں پر بھیجا ہے"۔

الَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ ﴿۹۱﴾

''جنہوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے''۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۹۲﴾

''پھر تیرے رب کی قسم ہے البتہ ہم ان سب سے سوال کریں گے''۔

عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

''اس چیز سے کہ وہ کرتے تھے''۔

پیغمبر اکرمؐ کیلئے مزید وضاحتی بیان

پچھلی آیات میں بیان کی گئی بحث کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے اس آیت میں پیغمبر سے کہا گیا ہے کہ اس سے کہہ دو کہ میں تمہیں مُقْتَسِمِیْنَ پر آنے والے عذاب سے ڈرانے والا ہوں روایات کے مطابق ''مُقْتَسِمِیْنَ'' قریش کا ایک گروہ تھا جنہوں نے قرآن کو کئی حصوں میں تقسیم کیا تھا، کچھ نے کہا کہ یہ سحر ہے (جادو ہے)، کچھ نے کہا یہ پرانے زمانے کا افسانہ ہے، کچھ نے کہا یہ افتراء ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مکہ میں داخل ہونے کے راستوں کو حصوں میں تقسیم کیا اور حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے والوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ قرآن کریم ان کے متعلق بیان کر رہا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کو متفرق کر دیا اس کے حصے بخرے کیے اور اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کیں، حالانکہ دین الٰہی تفریق اور تجزیہ کے قابل نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ تیرے رب کی قسم بہت جلد ان سے سوال کیا جائے گا اور ان کے اعمال کے بارے میں بازپرس ہو گی۔ قرآن پر ان کے جھوٹ اور افتراء باندھنے اور اللہ تعالیٰ کی دعوت کا مذاق اڑانے پر ان کی گرفت ہو گی۔

بعض مفسرین[1] نے کہا ہے کہ "مُقۡتَسِمِیۡنَ" سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں جنہوں نے قرآن میں تفریق کی اور اسے مختلف حصوں میں تقسیم کیااور کہاکہ ہم اس کے کچھ حصے پر ایمان لاتے ہیں اور کچھ کے ہم کافر ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے کہ یہ سورہ مکہ میں اُتری ہے اور اوپر والا واقعہ مدینہ میں پیش آیا ہے لہٰذایہ دوسرااحتمال مناسب نہیں ہے۔ بہرحال یہ ایک مفسر کی رائے ہے۔

یہ آیات ایسی قوم کے بارے میں ہیں جو بعثت کے آغاز میں نور قرآن اور دعوت حقہ الٰہی کو بجھانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب نازل کیا اور انہیں ہلاک کیا اور قیامت کے دن بھی اُن کا مؤاخذہ کرے گا۔

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۹۴﴾

"سو تو کھول کر سنا دے جو تجھے حکم دیا گیا ہے اور مشرکوں کی پروا نہ کر"۔

اِنَّا كَفَیۡنٰكَ الۡمُسۡتَهۡزِءِیۡنَ ﴿۹۵﴾

"بے شک ہم تیری طرف سے ٹھٹھا کرنے والوں کے لیے کافی ہیں۔

الَّذِیۡنَ یَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۶﴾

"اور جو اللہ کے ساتھ دوسرا خدا مقرر کرتے ہیں سو عنقریب معلوم کر لیں گے"۔

وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ یَضِیۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ﴿۹۷﴾

[1]۔ تفسیر کشاف جلد ۲، صفحہ 589۔

"اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا دل ان باتوں سے تنگ ہوتا ہے جو وہ کہتے ہیں"۔

رسول اللہؐ کیلئے واضح حکم نامہ

پچھلی گفتگو کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرمارہا ہے کہ اے میرے حبیب! پیغام رسانی کے عمل کو کھلا بیان کرو، اپنی دعوت کا اعلان کرو اور مشرکین سے مت گھبراؤ جو قرآن کو افتراء یا سحر و جادو کہتے ہیں۔ اُن سے رُخ موڑ لو اور اُن کے متعلق پریشان بھی نہ ہوں۔

(اس آیت کا مضمون حضرت ابوطالب علیہ السلام کے ایک شعر میں بھی بیان ہوا ہے۔جب مشرکین مکہ مل کر آپ کے پاس آئے اور کہا کہ اے ابوطالبؑ !ان کو ہمارے خداؤں کے خلاف بات کرنے سے روک دیں۔جب حضرت ابوطالبؑ نے قوم کی تجویز رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھی تو آپؐ نے فرمایا کہ اے چچا! اگر یہ لوگ سورج کو میرے ایک ہاتھ میں اور چاند کو دوسرے ہاتھ پر رکھ دیں تو بھی میں اللہ کی دعوت چھوڑنے کے لئے راضی نہیں ہوں۔ اس وقت جناب ابوطالب نے ایک شعر کہا تھا جس کا مضمون اس آیت کے مضمون جیسا ہے۔اس شعر میں کہا گیا ہے کہ جو حکم دیا گیا ہے کر گزرو، ان کی پرواہ نہ کرو۔ حتی کہ حضرت ابوطالبؑ کے شعر کا لفظ بھی اس آیت میں بیان کر دیا گیا ہے)۔ (اردو مترجم)

استہزاء کرنے والوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ مطمئن رہو یہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، ہم ان کو ہلاک کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم ان کے لئے کافی ہیں۔ استہزاء کرنے والے مشرکین جو اللہ کے مقابلے میں معبود گھڑ رہے ہیں اور اپنے لئے علیحدہ خدا بنا رکھے ہیں اور جنہوں نے

شرک کیا اور ظلم کا ارتکاب کیا وہ اس کی عاقبت کو ضرور پہنچیں گے اور انہیں دُنیوی اور اخروی عذاب ملے گا۔ اخروی عذاب دنیوی عذاب سے زیادہ سخت ہے۔ پھر اپنے رسول ﷺ کو تسلی دینے کے لیے کہہ دیا کہ اگر تم خوش نہیں ہو، تمہارا دل تنگ ہو جاتا ہے اور تمہیں پریشانی ہوتی ہے، تمہارے سینے میں بوجھ آتا ہے کہ یہ قرآن کو افتراء کہتے ہیں اور تیرا ٹھٹھا مذاق اڑاتے ہیں اور تم افسردہ ہوتے ہو تو ہم تیرے حالات سے آگاہ ہیں اور تجھے ہم شرح صدر دیں گے، تیرے سینے کو کھول دیں گے، تجھے کامیابی عطا کریں گے، تیری ساری پریشانیاں دُور ہو جائیں گی، تجھے فتح و نصرت عطا کریں گے۔

فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ كُنۡ مِّنَ السّٰجِدِيۡنَ ﴿۹۸﴾

"سو توں اپنے رب کی تسبیح حمد کے ساتھ کیے جا اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو"۔

نبی مکرمؐ کو اللہ کی تسبیح کرنے کا حکم

اللہ تعالیٰ اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو بتا رہے ہیں کہ ان سب باتوں کا ہمیں علم ہے، جن باتوں سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے ان کا بھی ہمیں علم ہے۔ تمہارا کام صبر کرنا اور اللہ کی تعریف اور تسبیح کرنا ہے۔ وہ جو کچھ خدا کے بارے میں کہہ رہے ہیں تو تم خدا کو اُس سے پاک و منزہ قرار دو اور حق تعالیٰ کی عبادت میں سجدے میں جاؤ، نماز پڑھو۔ نماز کے سارے اجزاء میں اہم جزء سجدہ ہے، اسی لئے یہاں پر سجدے کا ذکر کیا ہے اور اپنے نبی کو اللہ کی عبادت کرتے ہوئے سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے جو نماز کے افضل اجزاء میں سے ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق سجدہ، اللہ تعالیٰ سے بندے کی نزدیک ترین حالت ہوتی ہے۔ اس آیت اور رسول اکرمؐ کی تاکید سے

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی تسبیح، حمد، سجدہ اور عبادت غم کو دُور اور مصیبت کو کم کرنے میں موثر ہیں۔ تسبیح اور حمد زبان سے "سبحان اللہ و الحمد للہ" کہنے کو کہتے ہیں۔ البتہ تسبیح اور حمد اس طرح عاجزی و انکساری کے ساتھ کہی جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کبریائی کے لائق ہو۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿٩٩﴾

"اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ تمہیں موت آجائے"۔

یقین آنے تک اللہ کی عبادت کرنے کا حکم

اگر اس آیت میں عبادت کا امر مطلوب ہو تو یہ آیت پچھلی آیت کی تفسیر ہوگی۔ گویا پیغمبر اکرمؐ سے کہا جارہا ہے کہ اللہ کی عبادت کو جاری رکھو۔ اور اگر اس آیت میں روش بندگی اور عبودیت اپنانا مقصود ہو جیسا کہ آیت کا سیاق اسی کی تائید کرتا ہے تو اس صورت میں اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اے ہمارے حبیب! مشرکین سے اعراض کرو اور ان سے درگزر کرو۔ جس کا لازمہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں صبر کرو اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے تسلیم ہو جاؤ، اطاعت اور عبودیت کے لوازمات کو انجام دے دو۔ اس آیت میں "یقین" سے مراد موت کے وقت کا پہنچ جانا ہے کیونکہ وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ انسان کے لیے غیب، شہود اور ظاہر میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے اور انسان یقین کے عالم میں وارد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ موت آنے تک اپنے رب کی اطاعت میں رہو اور رب کی اطاعت کے حوالے سے صبر سے کام لو۔